

حیاتِ امیرِ شریعت رحمۃ اللہ علیہ

تالیف جانباز مرزا

ناشر	خالد سعید جانباز
پبلشر	مکتبہ تبصرہ لاہور
طابع	چٹان پریس لاہور
کتابت	مقصود احمد
تعداد	ایک ہزار

محکمہ تعلیم مغربی پاکستان سے سکولوں اور کالجوں کی لائبریریوں کے لئے منظور شدہ

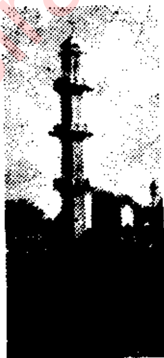
نمبر سی ڈی / ایجوکیشن / ۱۲ — ۲۸ / ۶۷

مورخہ ۷ جنوری ۱۹۷۰ء

قیمت : ۱۰۰ روپے

اُس عظیم ماں کے نام

جس کی کوکھ نے ایشیا میں ایک ایسے
سپوت کو جنم دیا، جس کی للکار سے برطانوی
سلطنت کا چراغ ہمیشہ کے لیے گُل ہوگیا



فہرست

۱۹۶۹ء میں جب پہلی بار "حیات امیر شریعت" منظر عام پر آئی۔ تو مجھے یقین نہیں تھا کہ لوگ میری طرز تحریر کو پسند کریں گے اس پر بھی شاہ جی (رحمۃ اللہ علیہ) کے عقیدت مندوں نے کتاب ہذا کو ہاتھوں ہاتھ خرید لیا۔ آخر جب نکہتِ بادِ بہاری کا صحنِ چمن سے گذر ہوا تو گل بوٹوں سمیت باغ کی ہر شاخِ گل فضا سے مہک اٹھی۔ پتے پتے کی زبان پر بہارِ نو کا تذکرہ تھا۔ صیاد بھی داد دیے بغیر نہ رہ سکا اور خزاں نے بھی بادلِ نخواستہ مسکراتی نظروں سے دیکھا۔

مجھ سے پیشتر متعدد دانشوروں نے امیر شریعتؒ کی سوانح حیات پر قلم اٹھایا۔ مگر ؎

نہ ہوا، پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب

ذوقؔ! یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

الحمدللہ کہ خونِ جگر کی آمیزش سے میں نے جو اشک پیازی کیے تھے وہی لالہ و گل کے چہرے کا غازہ قرار دیے گئے اور اس طرح "حیات امیر شریعت" کو عوام میں خاص اہمیت حاصل ہوئی۔

جنوری ۱۹۷۰ء کو پاکستان کے محکمہ تعلیم نے "حیات امیر شریعت" کو کالج اور سکولوں کی لائبریریوں کے لیے منظور کر لیا تو کتاب نئی نسل کے مطالعہ میں آئی۔ اس سے پیشتر اساتذہ سے طلبا تک کے دل اور ذہن حیات امیر شریعت سے بیگانہ تھے۔ وہ اس مردِ درویش کی آپ بیتی کو اجنبی سمجھتے رہے جس نے برصغیر کی آزادی کے لیے نصف صدی غیر ملکی سامراج سے لڑائی لڑی اور اس جرم کی پاداش میں اسے جیل خانوں سے دار و رسن تک پہنچنا پڑا۔ جیسے جیسے وہ کتاب کے اوراق پلٹتے گئے حقیقت نکھر کر سامنے آتی گئی ــــ اور قارئین کا ذوقِ تجسس بڑھتا گیا۔ لیکن کتاب بازار میں ختم ہو چکی تھی۔

قریباً چھ سال گزرنے پر حالات نے ذرا سنبھالا لیا اور اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو حیات امیر شریعت کا باتصویر ایڈیشن جو پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت، کتابت کی غلطیوں سے پاک قارئین کے سامنے ہے اس پر بھی اگر کہیں بھول محسوس ہو تو بلا حجاب مطلع کریں تاکہ اس پر آئندہ غور ہو سکے۔

والسلام:۔ آپ کا جانباز مرزا

مورخہ ۲۳ اپریل ۱۹۷۶ء

ابتدایہ

۱۹۳۰ء کا زمانہ ہندوستان میں اُن سیاسی سرگرمیوں کے عروج کا سال تھا جو آگے چل کر غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف پُرامن بغاوت کے حالات کو جنم دینے کا باعث بنیں اس سے پہلے ۱۹۲۹ء کے ڈوبتے سورج کی آخری کرنوں کے جلو میں دریائے راوی کے کنارے آل انڈیا کانگرس نے برطانوی سامراج سے مکمل گلو خلاصی کے لئے اپنی تاریخی قرارداد منظور کی۔ ورنہ پیشتر ازیں درجہ نوآبادیات کی خواہش تک تمام جدوجہد مرکوز تھی، شہید اشفاق اللہ بسمل کا یہ شعر اُس دور کی نشاندہی کرتا ہے

مجھ کو مل جائے چہکنے کے لئے شاخ میری

کون کہتا ہے کہ گلشن میں نہ صیاد رہے

تحریکِ خلافت و ترکِ موالات کے بعد مہاتما گاندھی کی قیادت میں غیر ملکی حکومت کے خلاف حصولِ آزادی کے لئے برصغیر کی یہ دوسری بڑی تحریکوں کی تیاری تھی غلاموں کے جذبات اُبھر کر بغاوت کے موڑ پر آن پہنچے تھے۔ ہندوستان کا ہر مرکزی شہر اس تحریک کا کیمپ قرار دیا جا چکا تھا، یہ نمکین ستیہ گرہ کی تحریک تھی۔ اِسی سلسلہ میں،

گوجرانوالہ میں مولانا ظفر علی خاں کی صدارت میں ستیہ گرہ کانفرنس منعقد ہوئی، ان دنوں میری عمر اٹھارہ اُنیس سال کے آس پاس تھی۔ گو غلام دیس کے نوجوان کے لیے زندگی کا یہ سن عقل و شعور سے عاری ہوتا ہے، تاہم فرنگی حکمرانوں کے خلاف میرے جذبات اس سال جوان اور بالغ ہو چکے تھے، اور انہیں تمناؤں کے سہارے مَیں امرتسر سے پیدل گوجرانوالہ پہنچا۔

اس کانفرنس کا آخری اجلاس تھا کہ سرِشام پنڈال میں خاص قسم کی ہماہمی، چہروں پر رونق، دلوں میں مسرتوں کا طوفان موجزن تھا کہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری تقریر کیلئے آ گئے۔

خوبصورت خدوخال کے ساتھ سُرخ و سپید چہرے پر سیاہ داڑھی، گٹھیلا جسم، بُوٹا سا قد، نیم آستین والا گاڑھے کا کرتہ، ٹخنوں سے اُونچا شرعی قسم کا کھدر کا پاجامہ سر پر گول دیوبند طرز کی ٹوپی، پاؤں میں دیسی ساخت کا چپل، یہ تھے سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری پنڈال سے باہر کثیر ہجوم نے ان کا استقبال کیا، گوجرانوالہ کی زمین نے اُن کے قدم چومے، آسمان نے بلائیں لیں، فضاؤں نے بہاروں کی بارش کردی، عوام کی نگاہیں فرشِ راہ ہوئیں، دل و دماغ نے ہم آہنگ ہو کر ہندوستان کے بہادر سپوت کا خیر مقدم کیا، وہ جیسے جیسے اپنی قیام گاہ کے قریب پہنچتے گئے، چاند ستاروں کا ہجوم اُن کی رہنمائی کرتا رہا۔ مَیں اُس اچھوت کی طرح جسے مندر کے دروازے پر کھڑے بھگوان کی مورتی دیکھنے کی اجازت تو ہے لیکن قریب جا کر اُن کے چرن نہیں چھو سکتا، دُور سے شاہ جی کو دیکھتا رہا۔

یہ تھی حضرت امیرِ شریعتؒ سے میری پہلی ملاقات!

"وے ایہہ کالا کلوٹرا کتھوں نے آندا ای ماجرا؟"

(یہ کالا سیاہ کہاں سے لے آئے عاجز!)

"اسے کالا لڑے گا، تے آپے ای پتہ لگ جائے گا!"

(یہ کالا جب ڈسے گا تو خود ہی معلوم ہو جائے گا۔)

امرتسر ریلوے اسٹیشن کے مسافر خانے میں بیٹھے خواجہ عبدالرحیم عاجز اور حضرت امیرِ شریعتؒ کے درمیان میرے متعلق یہ مختصر گفت گو تھی۔

مولانا عبدالرحمٰن نکودری کا سالانہ اجتماع تھا، یہ حضرات اس میں شمولیت کے لیے نکودر ضلع جالندھر جا رہے تھے۔ یہ دوسرا موقعہ تھا کہ میں حضرت امیرِ شریعتؒ کو قریب سے دیکھ رہا تھا، اِس سفر میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی سے بھی ملنے کا موقعہ ملا ـــــ چار دن کی یہ ہمراہی زندگی بھر کا ساتھ بن گئی۔

اخلاص و محبّت کا پیکر، زندہ دلی کا مجسمہ، مسکراہٹوں کا انبار، انجمنِ ہزار داستان جب وہ حلقۂ احباب میں رونق افروز ہوا، تو میرے مستقبل کی ساری کائنات اُس کے تابع ہو کر رہ گئی۔ اِس طرح دِلوں سے ہفتے، مہینے اور سال گزرنے لگے۔ پھر جفائیں بھی گواہ ہیں کہ وفاؤں میں کبھی دراڑ نہیں آئی۔ اِن راستوں میں پھول اور کانٹے ایک ساتھ ملے، اندھیرے اُجالوں سے بھی گذر ہوا، تو ایک دوسرے کا ہاتھ نہیں چھوٹا۔ جیل اور ریل کے طویل سفر مشترک اثاثۂ حیات بنتے رہے۔ مقاصد کی ہم آہنگی نے اِن واقعات پر سے تیئس سال گزار دیے۔

اِس وادیٔ پُرخار سے جب پہلے پہل میرا گزر ہوا، تو بچپنا جوانی کی اِبتدائی سرحدوں پر چھوڑ کر جا چکا تھا، اور اگست ۱۹۶۱ء میں حضرت امیرِ شریعت (رحمۃ اللہ علیہ) جب اس جہانِ سے رخصت ہوئے، تو میرا قدم بڑھاپے کی دہلیز پر تھا۔ حالات کی

ایک لمبی لکیر گزار کر جب رہنما کے بغیر مقاصدِ حیات کی راہوں سے گزرنا پڑا، تو اس بازار میں میرا قلم میرے ساتھ تھا۔ یہ ستمبر ۱۹۶۱ء کا ذکر ہے کہ حضرت امیرِ شریعتؒ کی سوانح حیات تاریخ کے دامن میں محفوظ کرنے کی سعی کی۔

یہ دستاویز مکمل کرنے میں آٹھ سال بیت گئے، تلاش و تجسس، حقائق و واقعات میں کن لوگوں سے راہ و رسم بڑھانے پڑے، یہ کہانی اس قدر طویل ہے کہ اس کے لیے پھر ایک کہانی کی ضرورت ہے۔

ستمبر ۱۹۶۱ء میں جب کتاب ہٰذا کا آغاز کیا، اور بہت سی منزلیں طے کرلیں تو فروری ۱۹۶۲ء میں دفتر تحفظ ختم نبوت لاہور سے تمام مسودہ چوری کرلیا گیا۔

سیپ ایک دفعہ موتی اُگلنے کے بعد بازیچۂ اطفال بن جاتا ہے۔ اسی طرح قلم سے ایک بار نکلی ہوئی عبارت اگر ضائع ہو جائے، تو دوبارہ اس میں وہ جان نہیں آتی۔ مسوّدہ کیا کھویا، میرا دل کھوہ گیا۔ ہارے ہوئے جواریے کی طرح بیکار ہو کر بیٹھ گیا، خیالات کی مجتمع عمارت ڈھیر ہو کر رہ گئی۔ عزم و ارادے کی پامالی چور کو دعائیں دینے لگی۔ اس طرح ایک سال بیت گیا، کہ میرے عزیز دوست ملک محمد رفیق مالک مکتبہ "ادبستان" جب روزنامہ "کوہستان" لاہور کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوئے تو انہیں اپنے پرانے دھندے کو ازسرِنو شروع کرنے کا خیال آیا، اور انہوں نے مجھے حضرت امیرِ شریعتؒ کی سوانح حیات مرتب کرنے کی دعوت دی، جسے میں نے بغیر کسی کاروباری معاہدے کے قبول کرلیا۔ گری ہوئی عمارت کی نیو پھر سے اٹھانی پڑی، اور میں تاریخ کے اوراق کھنگالنے میں مصروف ہو گیا۔

قریباً دو سو صفحات کی کتابت ہو چکی تھی کہ اچانک ایک روز ملک محمد رفیق نے

معذرت کے ساتھ کتاب کی اشاعتی ذمہ داریوں سے انکار کردیا، اس کے لیے انہوں نے خانگی پریشانیوں کا عذر تراشا۔ حقیقت اور افسانے کے درمیان کس قدر فاصلہ ہے، یہ اندازہ میں نہیں کرسکا، بہرحال مسودہ پوری ہونے کے بعد یہ دوسرا موڑ آیا کہ بحیثیت مصنف مجھے پھر مایوسی اور نامرادی کا سامنا کرنا پڑا۔

جاسوسی اور دوسرے فحاشی لٹریچر کی بہتات نے صاف ذہنوں کے مصنفین اور پبلشرز کو اپنی راہوں سے دور کردیا ہے، اور اس پر کاغذ کی گرانی کوہ ہمالیہ سے کہیں زیادہ بوجھل ہو کر گری ہے، جس کے نتیجے میں پاکستان میں ایسی کتب کا فقدان ہوتا جارہا ہے۔ جس کی انسانیت کو خواہش ہے۔

ایسے وقت میں رفیق ملک کا "حیات امیر شریعتؒ" کی اشاعت سے انکار میرے ارادوں کی موت کے ہم وزن تھا، لیکن اس لاش پر ماتم کرنے کی بجائے میں نے کشتی کو اپنے آنسوؤں کے طوفان میں چھوڑ دیا، اور کناروں کی تلاش میں ایک پتوار کے سہارے چلتا رہا، اور اکثر دفعہ ساحل پر پہنچ کر بھی مایوسی ہوئی۔

اقتدار زر انسان کے دل و دماغ پر جب قابض ہوجاتا ہے تو اصولِ آدمیت ریت کے گھروندے کی طرح گر جاتے ہیں۔ میں نے اس کتاب کی اشاعت کے لیے ایسے دروازوں پر دستک دی، جہاں دولت کی فراوانی سے انسان ابلیس کے بھی پر کترتا ہے، لیکن میری صدا، صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ اور انہیں دنوں

ع باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو میرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

یہ آگ پھر ایسی بھڑکی کہ سارا گھر جل کر راکھ کا ڈھیر بن گیا۔

انہیں حالات میں آٹھ برس گزر گئے، اور اُس مردِ درویش کی کہانی جس نے برِ صغیر کے کروڑوں اِنسانوں کی کہانی کو جِلا بخشی تھی، بے رنگ و روغن پڑی رہی، آخر بہار آئی اور نخلِ نومیدی سے ایسے پھول نکلے، کہ بے آب و گیاہ سرزمین کے کانٹوں نے لالہ زار کو شرمندہ کر دیا۔

یہ درست ہے کہ اکثر دانشوروں نے حضرت امیرِ شریعتؒ کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ ملک بھر کے اخبارات و رسائل نے اُن کی سیاسی اور مذہبی زندگی پر قلم اُٹھایا۔ تاہم اُن کی مکمل زندگی کے ادھورے نقش مستقبل کے مؤرخ کو بیحد مایوس کرتے رہے۔

برطانیہ ایسی سلطنت کے پرخچوں کی دھجیاں بکھیرنے والے اِنسان کی زندگی کے حالات و واقعات کو اُس کی بعض طبعی کمزوریوں تک محدود کر دینا اُس کی کروڑوں خُوبیوں سے ناانصافی ہے۔ اگرچہ زندگی میں اُس کے سیاسی اور مذہبی حریفوں نے اُس کے راستے میں کانٹے بکھیرے، اور اُس کی راہیں مسدُود کرنے سے گریز نہیں کیا، تو بعد از مرگ دوست نما دُشمنوں نے بھی کمی نہیں کی۔

لاریب کتاب ہذا میں مجھ سے امیرِ شریعتؒ کی تمام زندگی کا احاطہ نہیں ہو سکا اُن کی داستانِ حیات صحراؤں سے صحنِ چمن تک بکھری پڑی ہے، بُلبُل سے کرگسوں تک کو اُن کی کہانی یاد ہے، شمشیر و سناں کے تیز دھاروں سے چل کر غزل کے مطلع و مقطع تک کے اصُول و ضوابط ان سے آشنا ہیں۔ ایسے اِنسان کی کہانی کاغذ کے دامن میں کیوں کر محیط ہو سکتی ہے۔ اور پھر ماضیٔ قریب کے معماروں نے اِس راہ کے تمام مسافروں کے نقوش اِس بُری طرح مٹاتے ہیں کہ بادِ سمُوم کو بھی

ہدایت کر دی کہ ایسے کسی نشاں کو باقی نہ رہنے دے جس سے ماضی کے واقعات نمایاں ہو سکیں۔ ایسے میں حقیقت اور افسانے کے مابین امتیاز کے لیے جن دور رس نگاہوں کی ضرورت تھی، میرا وجود ہمیشہ اُس سے تہی رہا۔ اِس کے باوجود امیر شریعتؒ کی بہتّر سالہ زندگی کے تاریک اور روشن پہلو اُجاگر کرنے میں میری عمر کے آٹھ برس صرف ہوئے ہیں۔ اِس راستے میں مَیں نے کہاں کہاں ٹھوکر کھائی ہے، اُس کی نشاندہی کے لیے مَیں قارئین کا ممنون ہوں گا تاکہ دوسرے ایڈیشن میں اس کی تصحیح ہو سکے۔

یہ حقیقت ہے، کہ کتاب ہٰذا کی ترتیب میں میری یادداشتوں نے میرا بڑی حد تک ساتھ دیا۔ تاہم مَیں اُن مصنفوں کا شکر گزار ہوں جن کی تصانیف نے میری اکثر رہنمائی کی۔

ان میں ——

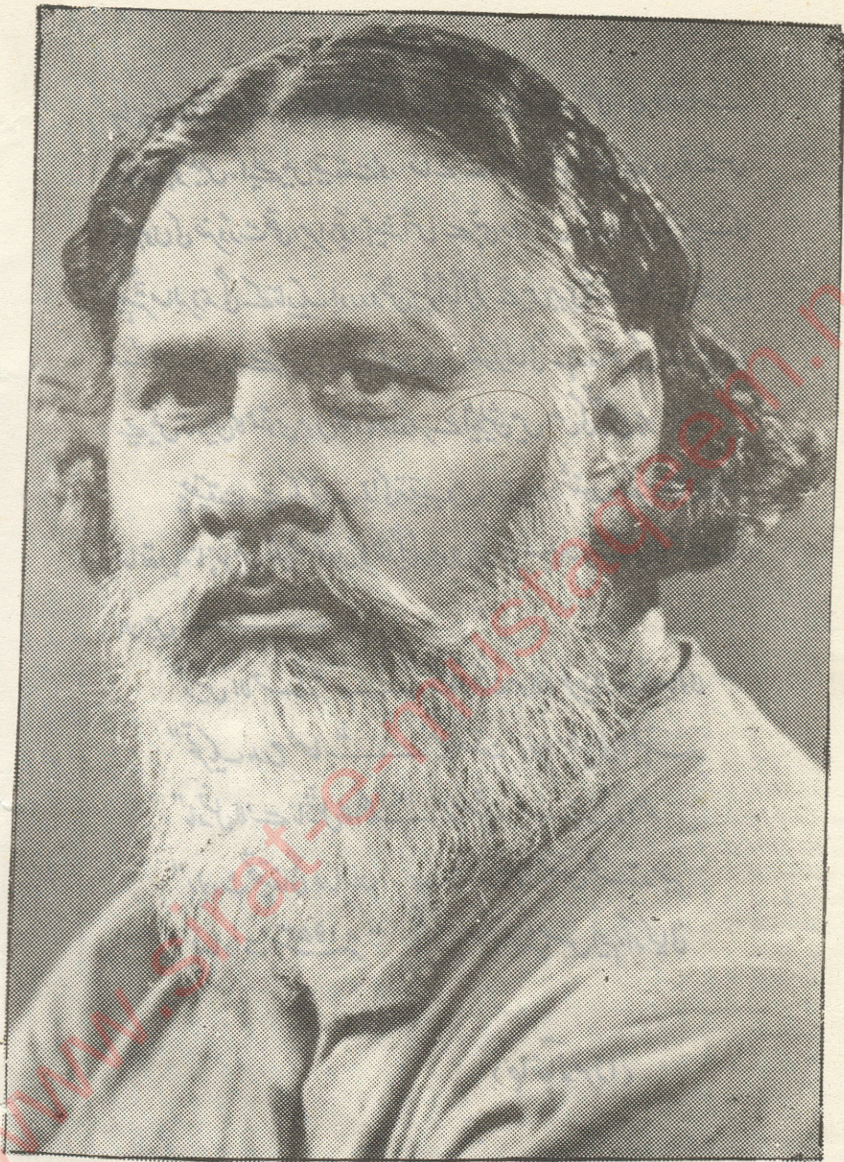
"رئیس الاحرار" —— کے مصنف مولانا عزیز الرحمٰن لدھیانوی

"تحریک مدح صحابہ" —— کے مصنف مولانا مظہر علی اظہر

"مارشل لا سے مارشل لا تک" —— کے مصنف سید نور احمد

"رپورٹ تحقیقاتی عدالت فسادات ۱۹۵۳ء" —— از مسٹر جسٹس محمد منیر، مسٹر جسٹس ایم، آر کیانی

(جانباز مرزا)



غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا



امیرِ شریعت ۱۹۳۰ء کی ایک یادگار تصویر۔ ع
ہم نے جب وادیٔ غُربت میں قدم رکھا تھا

۱۹۴۲ء کے تاریخی مقدمہ کے تین اہم کردار



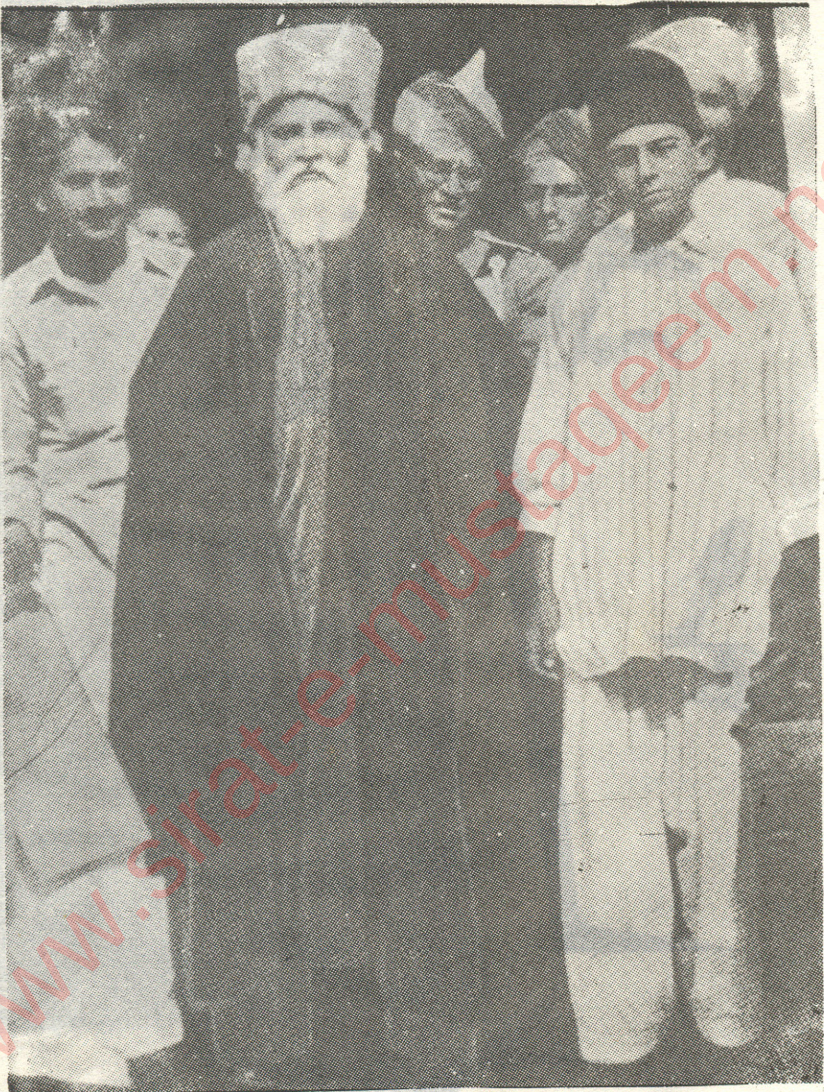
سر سکندر حیات خاں وزیر اعلیٰ پنجاب



چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ مسٹر ڈگلس ینگ



سرکاری رپورٹر مسٹر لدھارام



امیر شریعت ۱۹۴۲ء میں اپنے تاریخی مقدمہ سے رہائی کے بعد کورٹ سے باہر تشریف لا رہے ہیں۔



اثاثۂ حیات



بعد مرنے کے میرے گھر سے یہ ساماں نکلا



مصنّف

امیر شریعت کی آخری آرام گاہ



برمزارِ ما غریباں نے چراغ نے گُلِ

باسمہ تعالےٰ

باب اوّل ـــــ ۱۸۹۱ تا ۱۹۲۱ء

امیرِ شریعت رح

خالق کی ہر تخلیق میں کوئی نہ کوئی مصلحت کارفرما ہوتی ہے۔ انسانی وجود ہو یا حیوانی ڈھانچہ نگارِ خانۂ فطرت کے یہ حسین شاہکار کائنات کے لیل ونہار میں آرائش کیے ہوئے ہیں۔

ایک اگر نسیمِ سحری اور بادِ سموم کے درمیان پنکھ پھیلا کر اپنی زندگی کا مظاہرہ کرتا ہے تو دوسرا فکرِ معاش، عشقِ بتاں اور غمِ روزگار کے تارِ عنکبوت میں الجھا ہوا ہے اور یہی اس کی زندگی ہے موت دونوں کی منزل ہے۔ کچھ فاصلے پر چل کر دونوں دم توڑ دیں گے۔ زندگی دونوں سے وفا نہیں کرتی۔ لیکن حواسِ خمسہ کی سرحدوں سے آگے دونوں کی ذمّہ داریاں تقسیم ہو جاتی ہیں۔

اگر انسان کا ضمیر زندہ ہے اور اس کا آئینۂ فطرت ٹوٹ نہیں گیا، تو لحد سے مہد تک کی تمام ذمّہ داریوں کی تصویر صاف دکھائی دے گی۔ اسے اپنے راستے کے پھول اور کانٹوں میں کوئی الجھاؤ نظر نہیں آئے گا۔ وہ مستقبل پر اپنے کفِ پا موجود پائے گا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری ایسے ہی زندہ جاوید لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ آرائشِ کائنات میں ایسے چراغ کی طرح روشن رہے جس کی لَو میں آسمان کے ستاروں نے اپنی راہیں تلاش کیں اور گم کردہ راہ انسانوں نے انہیں راہِ انسانیت کا سنگِ میل جانا۔

وہ حریّت و مساوات کی جنسِ گراں بار اٹھائے زندگی کے بازاروں میں ربع صدی تک لوگوں کو ہر موڑ پر بلاتے رہے۔ انہوں نے گورستانوں میں برسوں اذانیں دیں لیکن غلام رگوں کے منجمد خون کو اپنی گرم گفتاری سے حرکت میں نہ لا سکے۔

اگر وہ پہاڑوں کو پکارتے تو شاید وہ خاکِ راہ بن کر اُن کے دامن سے لپٹ جاتے۔ اگر

ستاروں کو آواز دیتے تو یقیناً وہ اپنی قندیلیں زمین کے حوالے کر دیتے ۔ مگر آہ! بخاری نے ان دروازوں پر دستک دی جن کے دل خون سے تہی تھے، آنکھیں بینائی سے محروم اور کان صدائے حق سے ناآشنا۔

فرنگی قمار خانوں کی دیواروں پر کھڑے ہو کر اس نے حجازی نئے میں وہ گیت چھیڑا کہ صراحی و جام ٹکرا کر رہ گئے اور ساقی اپنے حواس کھو بیٹھا۔ وہ ایک ایسا قافلہ سالار تھا کہ راستے کا گرد و غبار بھی اس کی منزل اوجھل نہ کر سکا۔ وہ اپنے پیچھے جو نقش پا کر گیا ہے، مستقبل کے مسافروں کے لیے ان میں کئی منزلیں پوشیدہ ہیں۔

زندگی اور موت کے درمیان جب تک کشمکش جاری ہے، نظامِ کائنات جب تک متحرک ہے، زمین اور آسمان کے درمیان جب تک بہار و خزاں کی آمد و رفت جاری و ساری ہے سید عطاء اللہ شاہ بخاری زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔

سال ۱۸۹۱ء کے بیل و نہار پر فرنگی حکمرانوں کی جلوہ آفرینیاں ہنوز جنم لے رہی تھیں ہندوستان کے در و دیوار ۱۸۵۷ء کے غیر ملکی تشدّد کی صدائے بازگشت سے کبھی کبھار کپکپی محسوس کرنے لگتے تھے۔ غلامی کی زنجیریں سارے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھیں۔ ہندوستان کا بخت اقتدار فرنگی کے روبرو نظریں جھکائے کھڑا تھا۔

وقت نے ہمیشہ بخت کا ساتھ دیا ہے۔ زمانہ شاہی عروج کے جلو میں چلنے کا عادی ہے۔ غلام ہندوستان سے وقت اور بخت دونوں روٹھ چکے تھے۔ مغلیہ سلطنت کے آفتاب کو غروب ہوئے ۳۴ برس بیت چکے تھے کہ پٹنہ ضلع بہار کی سرزمین پر ربیع الاوّل ۱۳۱۰ھ (بمطابق ۱۸۹۱ء) چاند رات جمعہ کے دن نور کے تڑکے میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام ددھیال کی طرف سے عطاء اللہ اور ننہال کی جانب سے شرف الدّین احمد رکھا گیا۔

خدا کے سوا اس راز سے کون آشنا تھا کہ آج ایک ماں اپنی کوکھ سے جس بچے کو جنم دے رہی ہے وہ خون اور گوشت کا لوتھڑا نہیں بلکہ مستقبل کے ہندوستان کی پیشانی کا ایک جھومر ہے جس کی روشنی سے حکمرانوں کی آنکھیں چندھیا جائیں گی اور دنیائے انسانیت میں وہ وقت

کا عظیم خطیب ہوگا۔

سیاسی لحاظ سے ۱۸۹۱ء کا سال بڑا اہم سال تھا۔ اس سن میں بعض اور لوگ بھی عدم سے وجود میں آئے، جنھوں نے آگے چل کر تاریخ آدمیت کو اپنے خون سے جلا بخشی۔ جنونِ شوق سے عقل و خود کی راہیں ہموار کیں تاکہ آنے والوں کے پیچھے راستے کے نشیب و فراز پر ان کا ہر نقش پا سنگِ میل بن کر رہ جائے۔

اس سلسلے میں یوگوسلاویہ کے صدر جوزف بروز ٹیٹو، فرانس کے جنرل چارلس ڈیگال، جاپان کے شاہی خاندان کے شہزادہ گینوئی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نظامِ فطرت کی بوقلمونیاں دیکھیے کہ ایک ہی وقت، ایک ہی موسم اور ایک ہی سال میں ماں کی کوکھ سے دھرتی کی پیٹھ پر آنے والے یہ چاروں بچے کائنات کے بناؤ سنگار میں کس طرح مصروف رہے۔

آخرالذکر یورپ میں پیدا ہوئے۔ راج سنگاسن پر بیٹھ کر لوگوں پر حکومت کرتے رہے لیکن اوّل الذکر نے ایشیا کی گود میں جنم لے کر عوام کے دلوں پر حکمرانی کی۔

گھرانا تاریخ جن لوگوں کو اپنی تکمیل کے لیے منتخب کرتی ہے۔ لازم نہیں کہ ان کی نسبت کسی اونچے اور اعلیٰ خاندان سے ہو۔ بلکہ ماضی بعید میں جن لوگوں نے تاریخ کے صفحات پر اپنے نقش چھوڑے ان کے آباؤ اجداد کو وقت کے حاکمانہ وقار نے کبھی نظرِ التفات سے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ لیکن جھونپڑیوں میں پرورش پانے والوں نے جب محلات پر کمندیں ڈالیں تو شاہی تاج ان کے قدم چومنے لگا۔ اور فرماں روائی ان کی عبائیں اٹھائے پھری۔ سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ نے ایک ایسے گھرانے میں جنم لیا جو روحانی دنیا میں رشد و ہدایت کا صدیوں محور رہا۔ انسانی زیست نے فخر و مباحات کے سینکڑوں صنم خانے ویران کر کے انھی مے خانوں سے اپنی آنکھوں کے ڈورے سرخ کیے۔ ان کے لڑکھڑاتے قدم انھیں آستانۂ مراد تک لے آئے۔ یہیں سے انسانیت اپنی منزل کے لیے سفر شروع کرتی ہے۔

اس صدی کے مشہور کشمیری مؤرخ منشی محمد الدین فوق اپنی تصنیف "تاریخ کشمیر" کے دوسرے حصہ میں رقم طراز ہیں کہ:۔

"حضرت امام حسن مجتبیٰ کی چوبیسویں اور حضرت سید محی الدین عبدالقادر جیلانی رح کی تیرھویں پشت سے ایک بزرگ سید عبدالغفار بخاری المشہور قاضی خانقاہی بخارا سے اپنے والد سید محمد بخاری کے ہمراہ کشمیر تشریف لائے۔ یہ اسلامی حکومت کا زمانہ تھا۔ عہدہ درس وقضا پر فائز ہوئے۔ سرینگر میں اب بھی آپ کی قبر مزار بڈہ شاہ رح میں دیوار سے متصل شمال کی جانب موجود ہے۔

سید عبدالغفار رح کی اولاد کشمیر کے علاوہ پنجاب کے اضلاع گجرات اور امرتسر میں اکثر پھیلی اور اب بھی موجود ہے۔ انہی کی اولاد سے ساتویں پشت میں سید عبدالرسول رح جو کہ سید رحمت اللہ کے بیٹے تھے ایک خدا رسیدہ بزرگ گزرے ہیں۔ ان کا تقویٰ یہاں تک تھا کہ مرغی کا انڈہ اور مرغ صرف اس لیے نہیں کھاتے تھے کہ یہ دانہ دنکا لوگوں کے گھروں میں بھی جا کر کھالیا کرتے ہیں۔ اسی زمانے میں شاہ عبدالرحمان (جو رحمان شاہ کے نام سے ایک مشہور مجذوب گزرے ہیں) کے اشارے سے سید عبدالرسول نے اپنے دونوں بیٹوں سید حضور اللہ اور سید ولی اللہ کو دستکاری اور عوام کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔"

اس سلسلے میں آگے چل کر تاریخ اقوامِ کشمیر کے مصنف شجرہ نسب کو یوں ترتیب دیتے ہیں۔

حضرت امام حسن مجتبیٰ

سید محمد بخاری (چوبیسویں پشت) — حضرت محی الدین سید عبدالقادر جیلانی رح (تیرھویں پشت)

سید عبدالغفار بخاری

سید عطاء اللہ شاہ اوّل (چوتھی پشت)

سید رحمت اللہ — سید نعمت اللہ

سید عبدالرسول

سید حضور اللہ — سید ولی اللہ

سید عبداللہ — سید ضیاء الدین — سید بہاؤ الدین

حافظ سید عبدالصمد (لاولد) — سید احمد (لاولد) — سید محمد شاہ — سید امان اللہ

سید امیر شاہ — یوسف شاہ بلا اولاد نرینہ — مصطفےٰ شاہ — سید حسن شاہ — سید فضل شاہ بلا اولاد نرینہ — سید نظام شاہ

سید محی الدین — سید محمد سلیمان

سید عبدالحمید

سید فیض اللہ

سید عبدالوحید

سید نور شاہ — سید پیر شاہ لاولد — سید عبدالغنی — سید حیدر شاہ — سید حسام الدین بلا اولاد نرینہ

سید ضیاءالدین

سید محمد اسحاق

سید محمد مقیم

حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ

سید عبدالرسول کے والد سید رحمت اللہ کے دوسرے بھائی کا نام سید نعمت اللہ تھا۔ رحمت اللہ اور نعمت اللہ کے والد سید عطاء اللہ شاہ اول، حضرت سید عبدالغفار بخاری کی چوتھی پشت سے ہیں۔

سید عبدالرسول کے چچا سید نعمت اللہ کے چار فرزند تھے جن میں سے سید عبداللہ اور سید ضیاء الدین لاولد تھے۔ تیسرے لڑکے سید بہاؤ الدین تھے۔ جن کے چار بیٹے تھے۔ ان کے دو بیٹوں سید محمد شاہ اور سید امان اللہ کے ہاں اولاد تھی۔

سید امان اللہ کے چھ بیٹے ہیں، جن میں دو اولادِ نرینہ سے محروم رہے۔ چار اولادِ نرینہ سے سرفراز کیے گئے۔ سید محمد شاہ کے پانچ لڑکے تھے۔ سید پیر شاہ لاولد تھے اور سید حسام الدین کے ہاں عمر بھر اولاد نہ ہوئی، باقی تین صاحب اولاد تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ سید نور شاہ کے پوتے اور سید ضیاءالدین کے فرزند تھے۔

اس طرح سے یہ خاندان اب تک پاکستان کے اکثر علاقوں میں پھل پھول رہا ہے۔ لوگ انہیں عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

ننہال

لاریب آدمی کا سلسلہ نسب ددھیال سے شروع ہوتا ہے، لیکن عالی نسب ہونے کے لیے اس قدر سند ادھوری معلوم ہوتی ہے۔

ماں کی کوکھ میں اولاد بھی تبھی صالح پرورش پائے گی، جب ماں کا اپنا خون شریف النفس والدین کی بنیاد پر ہوگا۔ ورنہ یک طرفہ نیکی کے نتائج اکثر غیر صالح رہے ہیں۔

بلاشبہ سید عطاء اللہ شاہ کی عالی نسبی جس کے باعث ان کے ددھیال کی قبائے زندگی ہمیشہ روشن رہی، قدرے ادھوری معلوم ہوتی اگر اس میں ننہال کا پیوند برابر کا نہ ہوتا۔ چنانچہ سید عطاء اللہ شاہ کی والدہ محترمہ سیدہ فاطمہ اندرابی بنت مولانا حکیم حافظ سید احمد اندرابی کا نسب نامہ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔

حضرت خواجہ باقی باللہ کو روحانی دنیا میں بلند مقام حاصل ہے۔ ان کی نواسی سید عطاء اللہ کی نانی اماں تھیں۔

سید ضیاءالدینؒ

ہنوز غیر ملکی اقتدار کا سورج طلوع ہوئے چند ساعتیں گزری تھیں ابھی حالات نے وفا کے دامن کو گرہ نہیں دی تھی، دلوں کے تالے چابی کھو جانے پر بھی زنگ آلود نہیں ہوئے تھے کہ سید عطاء اللہ شاہ کے والد سید ضیاءالدین اپنے تایا سید پیر شاہ صاحب بخاری اور چچا حافظ سید حیدر شاہ صاحب بخاریؒ کے ساتھ پشمینے کی سوداگری کرنے اپنے گاؤں ناگڑیاں ضلع گجرات سے بہار کے مشہور شہر پٹنہ میں اکثر جایا کرتے تھے۔

ان دنوں یا ٹھارہ انیس سال کے پیٹے میں تھے۔ انہیں قرآن کریم پڑھنے اور سنانے کا اس قدر شوق تھا کہ ایک دفعہ محلہ چوک بازار (پٹنہ) میں ملک عنبر کی مسجد میں رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں شبینہ کے روز نماز عشاء کے وقت پتہ چلا کہ آج تین حافظ باہم مل کر قرآن کریم ختم کریں گے تو غصہ میں کہا

"یہ کیا حرکت ہے، ایک ہی آدمی کو قرآن کریم ختم کرنا چاہیے"؟

اس پر دوسرے حافظ نے طنزاً کہا "تو پھر یہ کام آپ ہی کریں"۔

"بہت اچھا"! یہ کہہ کر مسجد سے چلے آئے۔

گھر آئے تو چہرے پر "تغیر" کے آثار دیکھ کر سید حیدر شاہ نے فرمایا۔

"کیا بات ہے حافظ جی۔؟ کچھ کھوئے کھوئے سے دکھائی دیتے ہو"۔

اس پر مسجد کا سارا واقعہ کہہ دیا۔ حیدر شاہؒ نے فرمایا۔

"اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ اللہ کا نام لے کر شروع کر دینا"۔

چنانچہ رات جب قرآن کریم پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے تو پہلی رکعت میں چھبیس پارے ختم کر دیے۔ اسی طرح مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ کے دادا مولانا محمد رحمت اللہ کا بیان ہے کہ:۔

"۱۸۵۷ء کے بعد ایک مدت میں نے پٹنہ (گنگا کے کنارے) مسجد میں گزاری ان دنوں حافظ ضیاء الدین کی عمر انتیس سال تھی، اور انہوں نے ایک رات مجھے ایک ہی رکعت میں سارا قرآن کریم سنا دیا تھا"۔

شادی نیک سیدوں کا یہ خاندان ایک عرصہ پٹنہ میں رہ کر اس قدر مقبول ہوا کہ نہ صرف کاروبار میں برکت اور رحمت ہوئی، دنیوی قرابت داری کی خواہشیں بھی پروان چڑھنے لگیں۔ پٹنہ کے متمول اور دین دار صاحب فکر حکیم حافظ سید احمد اندرابی نے جن سے اکثر خاندانی تعلقات استوار ہو چکے تھے اپنی دختر نیک اختر حضرت حافظہ سیدہ فاطمہ اندرابی کی شادی

حافظ سید ضیا الدین سے کر دی۔

فاطمہ اندرابی ۱۸۵۷ء میں فرنگی سامراج کے ہاتھوں دلی کا جو سہاگ اُجڑا اگر جمنا کی لہریں آج تاریخ کے اوراق اگل دیں اور لال قلعے کی دیواریں ان خونی حادثات کی گوکشائی کریں تو ماضی کی ایک ایک لکیر ابھر کر سامنے آجائے۔ شرافت اور تمدّن کی برہنہ لاشیں دہلی کی شاہراہوں پر شرم وحیا کی بھیک مانگ رہی تھیں، آگ کے شعلوں میں لپٹی ہوئی عمارات غیر ملکی حکمرانوں کے ظلم وجور میں رنگ بھر رہی تھیں، گلیاں اور بازار خاندانوں کے لیے خانماں ہونے پر ماتم کناں تھے۔

اس پُر آشوب دور میں اُجڑے ہوئے گھروں میں ایک گھرانا حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی نواسی کا بھی تھا، جو دہلی سے صوبہ بہار کے شہر پٹنہ میں جا کر آباد ہوا۔ سیدہ فاطمہ اندرابیؒ اسی گھر کی نیک سیرت بیٹی تھیں۔

والدہ کی وفات انسانی ارادے دلوں میں جنم لیتے ہیں، ذہنوں میں پرورش پاتے ہیں اور عمل کی دنیا میں اکثر و بیشتر مات کھا جاتے ہیں۔ یہیں سے قدرت اور انسان کے درمیان حدِ فاصل قائم ہوتی ہے۔ اگر عزمِ انسانی کائنات کی تسخیر کے نقشے سوچتا ہے تو خالقِ کائنات ہر نقشے کو نقشِ فریادی بنا دیتے ہیں کہ آدمی کے تصورات کا ہیولیٰ پانی پانی ہو کر رہ جاتا ہے۔ والدین اولاد کے مستقبل کے لیے جو خاکے ترتیب دیتے ہیں۔ کبھی تو وہ ریت کے گھروندے ثابت ہوتے ہیں اور کبھی ان پر تاجِ شاہی کے گل بُوٹے کھلتے ہیں۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ بچپن کی چوتھی بہاریں سے گزر رہے تھے کہ ان کی والدہ محترمہ کو داعیٔ اجل کا پیام آگیا اور وہ اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ گو آغوشِ پدری میں ماں کا پیار جلوہ فگن نہیں تھا تاہم شفقتِ والد نے انہیں اس احساس سے دور رکھا۔

بلخیراں کے بچے کی زندگی اس پتے کی طرح ہوتی ہے جو شاخ سے ٹوٹ کر کبھی تو بادِ سموم کی جھولی میں جا گرتا ہے اور کبھی نسیمِ سحرگاہی اسے اپنے پالنے میں سنبھال لیتی ہے

تاہم شاخ سے محروم زندگی تلخ کامیوں میں بسر ہوتی ہے۔

بن ماں کے بچہ باپ کی تربیت کے سہارے پروان چڑھنے لگا۔ ۱۸۵۷ء کی صدائے بازگشت سے کبھی کبھار فضا میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوتا لیکن شاد عظیم آبادی کے نغمے فضا کا رُخ موڑ دیتے۔ ان دنوں پٹنہ میں حضرت شاد عظیم آبادی کا چراغ جل رہا تھا۔ شعر و ادب کی ساری رونقیں ان کے وجود کے گرد سمٹ کر رہ گئی تھیں۔

سید علی محمد شاد جو آگے چل کر شاد عظیم آبادی کے نام سے معروف ہوئے جنوری ۱۸۴۶ء کو پٹنہ کے محلہ پورب دروازہ میں پیدا ہوئے اور جنوری ۱۹۲۷ء کو انتقال کر گئے۔

محلہ پورب دروازہ، سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے محلہ کے برابر میں تھا۔ پڑوسی اور سید ہونے کے باعث شاد عظیم آبادی کا بچپن اکثر شاہ جی کی نانی اماں کے ہاں گزرتا۔ پٹنہ میں یہ گھرانا بھی علم و ادب کا مرکز تھا اسی لیے شاد عظیم آبادی نے بھی اس صحبت سے کافی فیض پایا۔ چنانچہ زبان کی نوک پلک اور شعر کہنے کا سلیقہ اسی گھر کا مرہونِ منّت ہے۔

شاد عظیم آبادی کی عمر اور شاعری اپنی جوانی کی سرحدیں عبور کر چکی تھیں کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو جھولنے سے نکال کر ان کی گود میں ڈال دیا اور مستقبل کا خطیبِ اعظم وقت کے عظیم شاعر کی جھولی میں شعر و ادب کے کھلونوں سے کھیلنے لگا۔

بچپن بچہ خواہ انسان کا ہو یا حیوان کا عادات و خصائل میں ترازو کے ایک ہی تول تلتا ہے۔ امتیازِ جنس دوسری بات ہے مگر شوخی دونوں کے خمیر میں ایک سی ہے۔ شرارت دونوں کی گھٹی میں ہے اور پھر جو بچہ یتیم ہو، عزیز و اقارب کا پیار اس کے بگاڑ میں خاصا معاون ہوتا ہے۔

والدہ کی موت کے بعد شاہ جیؒ کو ماں کا پیار اور ان کی ذمّہ داریاں صرف والد کے پیار میں تلاش کرنی پڑیں۔ چنانچہ باپ نے فرزند کے گرد پیار و محبت کا ایک ایسا حصار تعمیر کیا جس میں علم دین کی تکمیل ہو سکے۔ یہ دور تھا کہ اس میں انگریزی تعلیم مذہب سے لگاؤ رکھنے

والے لوگوں کے نزدیک اخلاقی طور پر جرم سمجھی جاتی تھی۔ نیز شرفا کے ہاں بچوں کی ابتدائی تعلیم گھروں میں تکمیل پاتی تھی۔ چونکہ عربی اور فارسی خود شاہ جی کے اپنے گھر کی تعلیم تھی۔ نانا اور نانی معلم بنے۔ ابا نے نگرانی کی اور پھر شاد کی ادبی محفلوں نے اس سونے کے نکھار میں سہاگے کا کام کیا۔

والد صاحب کا شوق تھا کہ بیٹا ان کی طرح حافظ قرآن ہو۔ چنانچہ کاروبار کے علاوہ وقت کا اکثر حصہ شاہ جی کو قرآن پڑھانے میں صرف کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ جی کو قرآن سے عشق ہو گیا اور ہمہ وقت کتاب اللہ کو سینے سے لگائے رکھتے۔

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت جلالی تھی۔ لہٰذا ان کے خوف اور قرآن سے لگاؤ کے درمیان کھیل کود کے لیے وقت نکالنا کار سے دارد تھا۔ تاہم گھر میں ماموں ہم عمر تھے۔ دونوں کی ملی بھگت سے یہ شغل بھی جاری رہتا۔ شاہ صاحبؒ خود فرمایا کرتے تھے کہ:

"مجھے پتنگ اڑانے کا بہت شوق تھا۔ قرآن کریم اور دوسری تعلیم سے ذرا فرصت ملتی اور والد صاحب کہیں کام کے لیے گھر سے نکلے تو ماموں کو ساتھ لیا اور جھٹ سے چھت پر جا چڑھے۔ پتنگ کا شغل شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ آمنے سامنے پیچ لڑ رہے ہیں اور دونوں طرف سے ڈور پلائی جا رہی ہے کہ اتنے میں والد صاحب تشریف لے آئے۔ بس پھر کیا تھا وہیں ہاتھ سے ڈور توڑ کر نیچے بھاگ آئے۔ اب ایک طرف پتنگ کٹی جا رہی ہے اور دوسری طرف مدِ مقابل شکست کی آوازیں لگا رہے ہیں۔ مگر ہم بھی کیا کر سکتے تھے۔ آنکھیں پتنگ کی طرف، کان دشمنوں کی آوازوں پر اور دل میں خوف کہ کہیں ابا نے دیکھ پایا ہو اور اگر کہیں پتہ چل گیا تو پھر جو پٹائی ہوئی وہ خدا ہی جانتا ہے۔"

بہرحال تعلیم کے ساتھ ساتھ بچپنے کی روائتی شوخیاں بھی اپنا کام کرتی رہیں۔

قرائت جنونِ شوق اگر خرد کا پاسبان ہو تو ناخن تدبیر دل کی گرہ کشائی میں رہنمائی کرتے ہیں۔ شاہ جی کو کتاب اللہ وراثت میں ملی تھی۔ ننہال کا گھرانا دین مبین سے ناآشنا نہیں تھا۔ والدہ محترمہ قرآن کی حافظہ، والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سینہ بھی اس خزینے سے مالا مال تو پھر بیٹا اس دولت سے کیوں کر تہی دامن رہ سکتا تھا۔ دو سال میں قرآن کریم ازبر کر لیا۔ خود شاہ صاحب فرماتے ہیں:۔

"میں اکثر فجر اور ظہر کے درمیان قرآن کریم ختم کر لیا کرتا تھا"

ان دنوں شاہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) اٹھارہ سال کے پیٹے میں تھے۔ محمد عمر عاصم نامی کویت کا ایک شخص جو سلطان عبدالحمید والیٔ ترکیہ کے بچوں کو قرآن کریم پڑھانے پر مامور تھا۔ سلطان کی اس سے قدرے ناراضگی ہو گئی اور وہ ترکیہ چھوڑ کر ہندوستان کی سیاحت کے لیے نکل آیا۔ سیر و تفریح کے دوران جب وہ پٹنہ آیا تو یہاں کی آب و ہوا نے اسے متاثر کیا اور ایک مدت وہ یہیں رہا۔ قدرت نے اس کے گلے میں رس اور آواز میں سوز عنایت کیا تھا۔ وہ جب کبھی موج میں آکر قرآن کریم پڑھتا تو غیر مسلم بھی مسجد کے گرد جمع ہو جاتے۔

شاہ جی کو اخذِ فن میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ وہ اکثر محمد عمر عاصم کے لہجہ میں قرآن کریم پڑھتے اور پھر گھر میں اس کی مشق کرتے۔ چنانچہ ایک دن شاہ جی قرآن کریم کی تلاوت کر رہے تھے کہ محمد عمر عاصم کا گزر اس راستے سے ہوا تو وہ شاہ جی کی آواز اور اپنا ہی لحن سن کر بہت متاثر ہوا۔ اسی شام محمد عمر عاصم نے حضرت شاہ جی کے والد سے درخواست کی کہ آپ اس بچے کو میرے پاس بھیج دیا کریں۔

فن قرأت میں عربی زبان کے تلفظ اور آواز کے زیر و بم کو ایک ساتھ چلنا ہوتا ہے لیکن اکثر قاری قرأت کے سفر پر ایک کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ شاہ جی کو فن قرائت کی یہ معراج حاصل رہی کہ قرآن کریم تلاوت کرتے وقت اِن راہوں سے عزم و احتیاط سے گزرتے۔ حجازی لَے میں ان کے گلے کی حلاوت ان کا پورا ساتھ دیتی اور یہی وجہ تھی کہ جب وہ قرآن کریم پڑھتے

تو یوں معلوم دیتا ہے جیسے آسمان سے ابھی نازل ہو رہا ہے۔ چنانچہ اکثر واقعات ہیں کہ غیر مسلم ان کے جلسے میں صرف قرآن حکیم سننے جایا کرتے تھے۔ اسی طرح کئی خاندان مسلمان ہوئے۔

امرتسر میں

سال ۱۹۱۲ء یورپ اور ایشیائی قوموں کی ہلاکت آفرینیوں کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ بنی نوع انسان کی تباہی کے نشانات اُبھر رہے تھے۔ یورپ کے سیاسی دانشوروں کے غلط فیصلوں نے براعظم کو مرگ و زیست کے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ جرمنی اور برطانیہ کی جنگ ایک تہذیب اور ضرورت کی لڑائی تھی۔ آگ اور موت کے اس کھیل میں برطانوی استعمار ایشیا کو استعمال کرنے کے نقشے بنا چکا تھا۔ غلام قوموں کے مردہ ضمیر پر کھڑے ہو کر پہلی جنگ عظیم لڑنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ شاہ جیؒ والد صاحب کی اجازت لیے بغیر گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔

سر پر بھاری قسم کی ریشمی سبز پگڑی، ریشمی اچکن، تنگ پائنچے کی شلوار اور بہاری طرز کی سرخ رنگ کی جوتی پہنے چھوٹا سا لوہے کا ٹرنک اٹھائے دن کے چار بجے ہال بازار امرتسر میں سید اسد اللہ شاہ بخاری کی دکان پر پہنچے۔ یہ بزرگ شاہ جی کے قرابت داروں میں سے تھے۔ ان دنوں شاہ جی کی عمر قریباً اکیس برس کے پیٹے میں تھی۔

"میرا نام عطاء اللہ ہے۔ میں حافظ ضیاء الدین کا بیٹا ہوں اور پٹنہ سے ان کی اجازت کے بغیر آیا ہوں۔"

اس سفر کی کہانی شاہ جی یوں بیان کرتے ہیں۔

"میں گھر سے نکل کر کچھ مدت بنارس چھنے والی مسجد کے زیر سایہ میاں شکر اللہ کے پاس ٹھہرا۔ یہ صاحب چاندی کے ورق کوٹنے کا دھندا کرتے تھے اور پہلوانی بھی۔ ان کی صحبت کا یہ اثر ہوا کہ میں نے ورزش کرنی اور ڈنٹر پیلنے شروع کر دیے۔ یہ سلسلہ کافی دنوں جاری رہا۔"

میر اسد اللہ بخاری کے برادر نسبتی سید پیر شاہ بخاری جو رشتہ میں شاہ جی کے والد کے چچا

تھے، انہیں دینی تعلیم کے لیے حضرت مولانا مفتی غلام مصطفٰے کے ہاں چھوڑ آئے مفتی غلام مصطفٰے ان دنوں کٹڑا کمہاراں کی مسجد کے خطیب اور مدرسہ نصرت الحق میں مدرس تھے۔ ان کا شمار اپنے علم اور تقویٰ کے اعتبار سے اس دور کے ممتاز علماء میں تھا۔

شاہ جی نے ۱۹۱۴ء تک اس درس گاہ میں "صرف و نحو" اور فقہ کی کتابوں کی تعلیم مکمل کی۔

ناگڑیاں

گجرات سے قریباً پندرہ میل کشمیر سے ملحق پہاڑ کے دامن میں یہ مختصر سی تاریخی بستی مہاراجہ اشوک کے دور میں "ناگنی" کے نام سے مشہور تھی۔ تاریخ کا دامن اس سے آگے تہی ہے کہ یہ بستی کس نے آباد کی اور اس کا نام کیوں کر بگڑا؟ ہاں اس قدر پتہ چلتا ہے کہ ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء میں جب مہاراجہ گلاب سنگھ نے انگریزوں سے کشمیر کا سودا کیا تو کشمیر کے چند مسلمان گھرانے یہاں آکر آباد ہو گئے۔ سیدوں کا یہ گھرانا بھی انہی میں شمار ہوتا ہے۔ جن کے ہاں آگے چل کر سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے جنم لیا۔ یہ لوگ ہنوز اس گاؤں کی سرزمین کو اپنے نیک اور پاک وجود سے قبروں میں آرام کرنے کے باوجود منور کیے ہوئے ہیں۔

شفقتِ پدری بیٹے کی جدائی کو زیادہ دیر گوارا نہ کر سکی اور ۱۹۱۴ء کو حافظ ضیاء الدین اپنے بیٹے کو امرتسر سے ناگڑیاں لے گئے۔

شادی

یہ سال پہلی جنگ عظیم کا ابتدائی سال ہے۔ اس سن میں یورپ کی مہذب قوموں نے ایک دوسرے کے گریبانوں سے کھیلنے کی مشق ایجاد کی تھی اور انہی دنوں تہذیب مغرب عریاں ہو کر ایشیا اور وسطِ ایشیا کے آزاد رسم و رواج کے گرد غلامی کا حصار تعمیر کرنے کو سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

۱۸۵۷ء کے بعد گو غلام ہندوستان کا نہ تو کوئی تمدّن رہا تھا اور نہ تہذیب کے پاس ایسا کوئی پیرہن تھا جس کی گرہ کشائی سے گمشدہ تہذیب کی نشان دہی ہوتی۔ لیکن بجھتی ہوئی قندیلیں ابھی ایسی روشنی دے رہی تھیں جن کے جلو میں چند حُدی خواں دکھائی دیتے تھے، جو ویران صحراؤں میں حجازی لَے پر تہذیب کُہنہ کے گیت الاپ رہے تھے۔ اسی دور میں شاہ جی کی

شادی کی رسم سید میر مرتضیٰ شاہ صاحب کی دختر نیک اختر سے ہوئی۔ سید میر مرتضیٰ شاہ صاحب سید ضیاالدین کے عم زاد بھائی تھے۔

لہلہاتے کھیتوں کے کنارے قدیم وضع کے دیہاتی کنوؤں نے سیدزادے کی تقریب سعید پر خوشی سے دفیں بجائیں۔ گاؤں کے پیڑ باراتیوں پر اپنے دامن سے ہوا کر رہے تھے۔ بڑی بوڑھیوں نے دعاؤں کے ساتھ سہاگ کے گیت گائے۔ دیہات کی الھڑ دوشیزائیں اس آئینے میں اپنے مستقبل کی تصویریں دیکھنے لگیں۔ گاؤں کے گٹھیلے جوان جذبات کی پگڈنڈیوں پر سفر کرتے ہوئے اس شادی میں شریک ہوئے۔ ان سادہ اور اسلامی رسم ورواج کو دیہات کی سادگی نے اور جلا بخش دی، جسے دیکھ کر تہذیب مشرق دور کھڑی مسکراتی رہی۔

دوبارہ امرتسر میں

۱۹۱۵ء گزشتہ سال کی طرح یورپ کی لڑائی کا دوسرا سال تھا۔ محکوم قومیں یورپ کی ہاتھا پائی میں اپنی غلامی کی زنجیریں پختہ ہوتی دیکھ رہی تھیں۔ اسی سن میں شاہ جی شادی کی رسم سے فارغ ہو کر نصاب تعلیم مکمل کرنے پھر امرتسر آن پہنچے۔ یاد رہے اسی زمانے میں شاہ جی نے اپنی روحانی تربیت کے لیے حضرت پیر مہر علی شاہ صاحبؒ گولڑہ شریف کے ہاتھ میں ہاتھ دیا تھا۔

شباب کے دن اور جوانی کی بہاریں —— آدمی کی عمر جب ان دونوں کے درمیان سے گزرتی ہے تو راستے کی ہر شے دعوت دیتی ہے۔ نیکی اپنی طرف کھینچتی ہے تو برائی اپنی طرف مائل کرتی ہے۔ اس کھینچا تانی میں کبھی برائی کا دامن تار تار ہو جاتا ہے اور کبھی نیکی اپنی کم مائیگی کا ماتم کرتی ہے، لیکن جسم میں اگر روح سعید ہو تو برائی کو شکست دینا بڑی بات نہیں ہوتی مگر نیکی کے حصول میں عمر کے اس موڑ سے گزرنا بڑا کڑوا گھونٹ ہے جسے بہت کم حلق قبول کرتے ہیں۔

یہی کشمکش کے دن تھے جب شاہ جی کو ازدواجی بندھنوں میں باندھ دیا گیا نیز حالات نے تاکید بھی کر دی کہ "دامن تر مکن ہشیار باش"۔ لہٰذا اس سال جب دوبارہ شاہ جی امرتسر آئے

نوچہرے پر سبزے کا آغاز تھا۔ جسم اگرچہ اکہرہ تھا مگر مضبوط، رنگ گندمی، کشادہ پیشانی، اٹھی اٹھی چمکدار آنکھیں اور پانچ فٹ چھ انچ قد نے اس پر وہ بہار لگا رکھی تھی کہ حسن و شباب کا یہ خوبصورت گلدستہ جن راہوں سے گزرتا اپنی مہک چھوڑتا چلا جاتا شہر کے لوگ انہیں "حافظ جی" کہہ کر پکارتے۔

حضرت مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی کے درس میں دوبارہ شامل ہو کر ادھورے سبق کی تکمیل شروع کر دی گئی۔ استاد اور شاگرد کے مابین محبت کا ایسا رشتہ قائم ہوا کہ اعتماد نے دونوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ مولانا قاسمی جمعہ شاہ جی سے پڑھوایا کرتے تاکہ انہیں تقریر کے ایچ پیچ سے آگاہی ہوتی رہے۔ درحقیقت یہی وہ دن ہیں جب مستقبل کا خطیب اعظم فنِ خطابت کی ابتدائی منزلوں میں داخل ہوا۔

جب کلی پھول بن کر اپنی پتیاں بکھیرتی ہے تو باغ کے گل بوٹے ہی اس کی مہک سے معطر نہیں ہوتے بلکہ نسیم سحری اپنی جھولیاں بھر کر اڑوس پڑوس میں اپنا رنگ جماتی پھرتی ہے۔

شاہ جی کے قرآن کریم پڑھنے کا انداز جب عام ہوا تو شہر کے گلی محلوں میں ان کا چرچا ہونے لگا۔ لوگ انہیں شبینوں پر بلانے لگے۔ گھروں سے نکل کر یہ آواز گلی کوچوں اور پھر بازار تک آن پہنچی۔ ع دل سے نکلی در جاناں تک پہنچی۔

آخر وقت آیا کہ مسجد کے ارد گرد کے لوگوں نے مولانا غلام مصطفےٰ کو مجبور کیا کہ شاہ جی کو کھلے میدان میں تقریر کرنے کی اجازت دیں۔ چنانچہ پہلی تقریر اندرون گلوالی دروازہ بازار کمہاراں میں ہوئی۔ دوسری تقریر کے لیے سید گلاب شاہ نامی شخص جو مولانا غلام مصطفےٰ کے معتقد تھے، شاہ جی کو امرتسر کی نواحی بستی سلطان ونڈ لے گئے۔ اس طرح یہ کلی کھلی، پھول بنا اور اس کی مہک نے ساری فضا کو معطر کر دیا۔

اِمامت

نکہتِ باد بہاری نے چمن بردوش ہو کر لالہ و گل سے سرگوشیاں کیں اور صحن چمن سے بوئے لالہ و گل اڑا کر لے گئی۔ شبنم کے آنسو چھنتے رہے۔ نسیم صبحگاہی سر پیٹ کر رہ گئی۔ گل بوٹوں نے لاکھ حصار کیے مگر بوئے گل اسیر نہ ہو سکی۔ کوچہ جیل خانہ کے عوام اپنی مسجد

کے لیے پیہم اصرار کے ساتھ مولانا غلام مصطفےٰ سے شاہ جی کو مانگ کر لے گئے۔ یہ ۱۹۱۹ء کا واقعہ ہے۔

ہال بازار کے وسط سے شروع ہو کر کوچہ جیل خانہ رام باغ پولیس تھانہ کے سامنے ختم ہوتا تھا۔ دوسری طرف میوہ منڈی کی پشت اس کی ہمسایہ تھی۔ اس طرف رام باغ کا بازار بھی اس کے سامنے تھا۔ اس قدر وسیع آبادی کو مسجد کی تنگ دامنی پر ہمیشہ گلہ رہا۔ لیکن شاہ جی کے خطیب منتخب ہونے پر مسجد کی وسعتیں اور مسدود ہو گئیں۔ یہ زمانہ لاسلکی کا نہیں تھا اور نہ آلۂ مکبر الصوت کا رواج تھا لیکن شاہ جی کی آواز دل اور کانوں کو مطمئن کرتی رہی۔ نمازیوں نے مکان کی چھتوں تک کو اپنی ضرورت کے لیے اپنا لیا تھا۔

استاد کا اصرار تھا کہ سبق یہاں آکر پڑھا کریں لیکن کوچہ جیل خانہ اور بازار کمہاراں کے درمیان کا فاصلہ طے کرنے میں خاصی دقت رہتی۔ کچھ دنوں تو یہ سلسلہ رہا۔ آخر استاد محترم کی اجازت سے شاہ جی نے ہال بازار کی مسجد خیر الدین میں مولانا نور احمد اور مفتی محمد حسن سے پڑھنا شروع کر دیا۔ مولانا نور احمد سے قرآن کی تفسیر اور مفتی محمد حسن سے مشکوٰۃ شریف کا سبق لیتے۔

غیر اسلامی رسمیں

انسانی حرکات سے انسانیت کی قدریں جس بری طرح ہلاک ہوئی ہیں زمانہ کے موجودہ چلن کے پاس اس کا کوئی مداوا نہیں ہے۔ وقت جیسے جیسے اپنا سفر طے کر رہا ہے ان پگڈنڈیوں پر کانٹے ہی کانٹے بکھرتے چلے جا رہے ہیں۔ اس میں زیادہ مجرم وہ ہیں جن پر اسلام کا لیبل چسپاں ہے۔ مذہب جس قدر شفاف ہے مسلمان کا کردار اتنا ہی گدلا اور داغدار ہے۔ تاریخ کا سینہ ان زخموں سے اٹا پڑا ہے۔

صراطِ مستقیم سے ٹھوکر کھا لینے کے بعد مسلمان جن غلط راستوں پر گامزن ہوا ان میں اسلام سے انحراف کی راہ اسے زیادہ پسند آئی۔ سماج کے غلط رسم و رواج اس راستے کے خوبصورت پھول تھے جن سے مسلمان نے اپنی جھولیاں بھریں لیکن بعد میں انہی پھولوں نے کانٹے بن کر اس کے کردار کو زخمی کر دیا۔ ۱۹۱۹ء سے پیشتر کا امرتسر خلافِ اسلام رسوم کی آماجگاہ تھا۔ گھر کے

ہر طانچے میں رسم و رواج کے بُت نصب تھے۔ برادری میں برتری حاصل کرنے کی دوڑ دھوپ میں مصروف مسلمان نے اپنا اثاثہ حیات داؤ پر لگا دیا تھا۔

کسی کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو اس کے ختنوں پر گھوڑی اور باجا لازمی تھا کیونکہ برادری میں "فلاں" نے ایسا کیا تھا۔ گرہ اس کی متحمل ہے یا نہیں لیکن "سنت" کے اس موقع پر خلافِ سنّت حرکات لازمی تھیں۔

اگر کسی کے ہاں موت واقع ہو جائے تو میّت کے آخری مقام پر پہنچنے سے پہلے ماتم پرسی کرنے والے عزیزوں کی خاطر داری، برادری کا ضروری قانون تھا اور یہ سلسلہ چار دن تک جاری رہتا۔ جہلا کی ان حماقتوں کے باعث ملاؤں کے ہاں چالیس روز تک گھی کے چراغ جلتے۔ عورت بیوہ ہو جائے، بچے یتیم رہ جائیں لیکن رسومات کے آئین میں سُقم نہیں آنا چاہیے۔ مرنے والے کے کفن دفن پر خرچ ہو اور رہا سہا برادری چٹ کر جائے۔ گویا گھر کا ایک فرد کیا مرا سارا گھر مر گیا۔

لحد سے مہد تک کے درمیان ایک اور حادثہ گزرتا ہے جسے بیاہ شادی کا نام دیا جاتا ہے۔ بلاشبہ ابنِ آدم کے لیے یہ منزل ضروری ہے لیکن یہ کہاں ضروری ہے کہ ایسے موقع پر برادری میں ناک رکھنے کے لیے آدمی خاک ہو جائے۔ اگر امرتسر کے مسلمان نے زمانہ سازی کے لیے اس تقریب پر اپنی چادر سے زیادہ پاؤں پھیلائے۔ چند سالوں کے بعد قرض لی ہوئی رقم سود در سود میں مسلمانانِ امرتسر کی بیشتر جائداد غیر مسلموں کے قبضے میں چلی جاتی۔ ان حالات نے مسلمانوں کو ملکیت سے محروم کر کے یا تو ہندو کا کرایہ دار بنا دیا یا پھر انہیں شہر سے باہر کی طرف رُخ کرنا پڑتا۔ اس طرح امرتسر پر ہندو کا قبضہ ہوتا چلا گیا۔ پہلو میں دلِ آگاہ رکھنے والے مسلمان کے لیے خون کے آنسو رونے کے سوا اور تھا ہی کیا۔ انہی دنوں شاہ جی نے کوچہ بجیل خانہ کی مسجد سے نکل کر محلہ وار تقریروں کا آغاز کیا۔ قلعِ رسوم پر یہ پہلی یلغار تھی جو مسجد کے ایک درویش نے کی جس کے پاس زبان اور قرآن کی قوّت کے سوا تیسری طاقت نہیں

تھی کردہ مسلمان کو غارت گری کے راستوں پر چلنے سے منع کرتا۔

وہ دن بھر اساتذہ سے جو پڑھتے شام ہوتے ہی کسی نہ کسی محلہ میں وعظ کی صورت میں سنا آتے۔ ان دنوں مولانا ثناء اللہ کا امرتسر میں خاصا اثر تھا لیکن مخصوص عقیدت کی بنا پر وہ بات پیدا نہ ہو سکی جو شاہ جی کے طرز تکلّم نے پیدا کر دی۔

علم محض پڑھائی سے نہیں طلب اور خدمت سے ملتا ہے۔ شاہ جی کا علم اگرچہ ہنوز خام تھا لیکن اساتذہ کی محبّت اور کتاب اللہ کی برکت سے وہ جاہلوں میں عالم اور عالموں میں عزّت کی نظروں سے دیکھے جانے لگے۔ امرتسر کے درودیوار انہیں سننے اور دیکھنے کو چشم براہ رہتے۔ قبیح رسموں کے خلاف جہاد نے شاہ جی کو وہ احترام دیا کہ جس محلے میں وہ وعظ فرماتے انسانوں کے سمندر اُمڈ آتے۔

اس طرح شہر کے اندر ایک نئی تحریک نے جنم لیا۔ رسم و رواج اور عُلماءِ سوء کے درمیان راہ و رسم بڑھنے لگے۔ مذہب کے گرد حصار کی نئی استوار ہونے والی دیوار کو گرانے پر شب و روز مشورے ہونے لگے اور شاہ جی کے خلاف ایک ایسے گروہ کی تنظیم ہوئی، جس کے رزق کا انحصار جھُوٹ کے چراغ روشن کرنا اور کذب کو حقیقت ظاہر کرنا تھا۔

یہ تحریک ابھی اپنے پر پرزے نکال رہی تھی کہ یورپ کے سیاسی اُفق پر پہلی جنگ عظیم میں محوریوں کے ڈوبتے ہوئے سورج کی سُرخیاں دکھائی دیں۔

جلیانوالہ باغ کا حادثہ

۱۹۱۴ء کی لڑائی ختم ہوتے ہی اتحادی طاقتیں فتح و نُصرت کے علم لیے سمندر کی چھاتی پر رقص و سرود میں کھو گئیں۔ اس محویّت میں وہ یہ بھول گئیں کہ انہوں نے غلام ہندوستان کے ساتھ کسی رشتہ اتحاد کو گرہ دی تھی، کسی وعدہ کی وفا ان کے ذمّے ہے۔

۱۶۔ اگست ۱۹۱۸ء کو برطانوی حکمرانوں نے ایک اعلان کیا کہ ہندوستانیوں کو آئندہ فوجی کمیشن میں اعلیٰ عہدے دیئے جائیں گے حالانکہ جنگ کے اختتام پر ہندوستان کو

ذمے دار گورنمنٹ دیے جانے کا وعدہ تھا۔ اس آئینہ میں ہندوستان کو اپنے حکمرانوں کی نیت صاف دکھائی دی اور ان کا شبہ نکھر کر سامنے آگیا۔ چنانچہ وہ زنجیر ٹوٹ گئی جس سے برطانوی سامراج نے اپنے غلاموں کو باندھ رکھا تھا۔

ہندوستان کی پریشان قومیں پھر سے متحد ہوئیں اور انہیں اپنے مقدر کا از سر نو جائزہ لینا پڑا۔ دسمبر ۱۹۱۸ء کو مولوی اے۔ کے۔ فضل حق کی صدارت میں دہلی مسلم لیگ کا اجلاس ہوا، جس میں استقبالیہ کی صدارت ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے کی۔ گو ڈاکٹر صاحب کا خطبہ استقبالیہ حکومت نے ضبط کر لیا لیکن اس اجلاس میں مطالبہ کیا گیا کہ ۱۹۱۴ء میں ہندوستان نے انگریزوں سے وفاداری کا عہد پوری ذمہ داری سے نبھایا ہے، لہٰذا برطانوی حکمرانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے وعدوں کی روشنی میں ہندوستان کو درجہ نوآبادیات دیں۔ اس قرارداد کی تائید میں مفتی کفایت اللہ مولانا احمد سعید، مولانا عبدالباریؒ فرنگی محل (لکھنؤ)، مولانا آزاد سبحانی (لکھنؤ) مولانا ثناء اللہ امرتسری نے تقریریں کیں۔ اس طرح پورے ملک میں انگریز حکمرانوں کے خلاف وعدہ شکنی کی آگ بھڑک اٹھی۔ اندرونِ یورپ ترکوں سے صلح کے بعد بھی برطانوی دانشوروں نے ایسا ہی سلوک کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محکوم و حاکم کے درمیان دلوں کی بھٹیاں اس قدر شعلہ فشاں ہوئیں کہ ہندوستان کا امن، دُودِ چراغِ محفل بن کر رہ گیا۔

حادثات و واقعات کی مسلسل کڑیاں کچھ اس ترتیب سے پیہم ہوئیں کہ ایوانِ افرنگ کی دیواریں اسی سلاسل میں جکڑی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

آخر انگلینڈ کی سپریم کورٹ کے جج مسٹر ایس، اے، ٹی رولٹ کی زیر کمان ایک کمیٹی نے (جو برطانیہ کے یہودی وزیر اعظم مسٹر لارڈ جارج نے مقرر کی تھی) اپنی دانست میں بغیر تحقیق کے ہندوستان پر تشدد اور دہشت انگیزی کے [illegible] الزامات تراشے، جنہوں نے جلتی پر تیل چھڑکا (مسٹر رولٹ کی یہی رپورٹ ماضی کی سیاسی تاریخ میں رولٹ ایکٹ کے نام سے مشہور ہے) اس رپورٹ کے نتیجے میں ہندوستان نے ایک نئی سیاسی کروٹ لی اور کانگریس

کی باگ ڈور جو پہلے مسٹر تلک راج گوکھلے کے ہاتھوں میں تھی مہاتما گاندھی کے سپرد کر دی گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مہاتما گاندھی ہندوستانی سیاست میں براہ راست دخیل ہوئے تھے۔ انہوں نے آتے ہی رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاجاً ۶۔اپریل ۱۹۱۹ء کو ہندوستان بھر میں ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ اس موقع پر آریہ سماجی رہنما مسٹر شردھانند جیسے کٹر ہندو نے دہلی کی جامع مسجد میں ہندو مسلم اتحاد پر تقریر کی اور امرتسر میں ہندو مسلمانوں نے ایک ہی برتن میں پانی پیا۔ یہ رام نومی کے تہوار کا دن تھا۔

دو مختلف قوموں کے درمیان انگریز کی نفرت نے ایسا میل لگایا کہ فرنگی سامراج کا وقار کھلونے کی طرح ٹوٹ کر رہ گیا۔ ہڑتال جاری تھی مگر انگریز کا تشدد شہر میں اپنا کام کرتا رہا۔ اس ظلم و جور کے خلاف شہریوں کا ایک جلوس ڈپٹی کمشنر امرتسر کی کوٹھی پر جاتے ہوئے جب ریلوے کے بڑے پُل پر سے گزرا تو انگریز سپاہیوں نے بغیر وارننگ دیے اس ہجوم پر گولی چلا دی جس کے نتیجے میں چھ ہندوستانی شہید ہوئے۔

خدمتِ خلق

شاہ جی ان دنوں حصولِ تعلیم، مسجد کی امامت اور خلافِ شرع رسوم کے خلاف جہاد میں مصروف تھے۔ فرنگی تشدد کے شہدا کی لاشیں موقع واردات سے اٹھا کر ہال بازار خیر الدین کی مسجد میں لائی گئیں تو شاہ جی نے ان سب کو غسل دیا، کفن پہنائے۔ مسلمانوں کا جنازہ پڑھایا اور تمام لاشوں کو خود مسجد سے رخصت کیا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ شاہ جی نے غیر ارادی طور پر خدمت خلق سے مرنے والوں کی تجہیز و تکفین کی۔ اتنے سے کام نے شاہ جی کا نام غیر مسلموں کے دلوں میں نقش کر دیا۔ حالانکہ وہ سیاسیات سے قطعاً ناآشنا تھے۔ انہیں صرف یہی دھن تھی کہ امرتسر کا مسلمان فضول رسم و رواج سے باز رہے لیکن ان کی ہمدردی نے انہیں کافی شہرت دی اپنے اور پرائے انہیں احترام کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

مارشل لاء

امرتسر کے عوام انگریز سامراج کے خلاف اپنا امن کھو چکے تھے۔ دلوں کی سلگتی ہوئی بھٹیوں کے الاؤ اس قدر روشن ہو چکے تھے کہ غلامی کی زنجیریں صاف پگھلتی دکھائی دے رہی تھیں۔ بنکوں اور دوسری سرکاری عمارات کی جلی ہوئی راکھ سے بغاوت کی بو پھیل رہی تھی۔

۱۰۔اپریل کو طلوع ہونے والے آفتاب نے امرتسر کو ماتمی لباس میں دیکھا۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد غلاموں پر آقاؤں کا تشدد اور نکھرا۔ شہر پر فوج نے قبضہ کر لیا اور مارشل لاء کا اعلان کر دیا گیا۔ امرتسر کے شب و روز فوجی آئین کے تحت بسر ہونے لگے۔ شہر میں گورکھا سپاہیوں کا راج تھا۔ ہر موڑ پر ٹکٹکی باندھ دی گئی۔ صرف ہندوستانی ہونے کے جرم میں بید زنی کی سزائیں عام دی جانے لگیں۔ ہر راہگیر کو پیٹ کے بل چلنے پر مجبور کیا جانے لگا۔ ان واقعات نے خوف و ہراس کو جنم دیا۔ بازار اور گلیاں ویران صحرا کی طرح نظر آنے لگیں۔ گھروں کے دروازوں اور کھڑکیوں پر جانوروں نے رین بسیرے بنا لیے۔ اس جمود کو کبھی کبھار فوجی سپاہیوں کے بوٹوں کی چاپ توڑ دیتی تھی لیکن دلوں پر جمود بدستور رہا۔

جلیانوالہ باغ

۱۳۔اپریل ۱۹۱۹ء کا دن تاریخ کے دامن پر ایسی گرہ دے چکا ہے کہ یہ گرہ جب بھی کھولی جائے گی، ناکردہ گناہ انسانوں کا خون اپنے قاتل پر مسکراتا نظر آئے گا۔

مرحوم پنجاب میں یکم بیساکھ دیہاتی عوام کی خوشیوں کا دن ہوتا تھا۔ اس تہوار پر گاؤں کے جیالے جوان کندھوں پر لاٹھیاں لیے رنگا رنگ لباس پہنے، دیہاتی گیت گاتے امرتسر کی سڑکوں پر سے گزرتے تو شہری عوام کو بھی اپنی ٹولیوں میں شامل کر لیتے۔ ماجھے دا جٹ "پنجاب کے صحت مند حسن کا ہراول دستہ تھا۔ بیاس اور دریائے ستلج کے پانی نے مل کر اس کی پرورش میں رنگ بھر دیا تھا۔ ۱۳۔اپریل ۱۹۱۹ء کا یہی دن تھا جب دیہاتی عوام اور شہری لوگ اپنے رہنماؤں کی گرفتاری کے خلاف احتجاجاً جلیانوالہ باغ میں جمع ہوئے تو جنرل ڈائر نے اچانک ان پر گولی چلا دی۔ اس کے نتیجے میں پانسو سے زائد بے گناہ ہندوستانی شہید ہوئے اور زخمیوں کی تعداد

کہیں زیادہ تھی۔

۶۔اپریل کو جس کہانی کا آغاز ہوا تھا۔ ۱۳۔اپریل کو جب مکمل ہوئی تو تاریخ اور انسانیت کے سینے پر گہرا گھاؤ چھوڑ گئی۔ اب جب کبھی یہ زخم رستے ہیں، تو انسانوں کے دل اور تاریخ کے اوراق فرنگی حکمرانوں کے لیے نفرین کیے بغیر نہیں رہتے۔

احساس ابھر آیا

چوٹ کھایا ہوا دل جب سنبھالا لیتا ہے تو وارفتہ انتقام کی راہیں تلاش کرتا ہے۔ خرد لاکھ آڑے آئے مگر جنون اپنا کام کر جاتا ہے۔ جلیانوالہ باغ کا حادثہ اہلِ دل پر بادِ سموم کی طرح گزر گیا جس سے وہ سانپ کی طرح بل کھا کر رہ گئے مگر وقت کے ساتھ ساتھ یہ درد گھاؤ بنتا چلا گیا۔

شاہ جی انہی لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ۶۔اپریل کو جن ہاتھوں نے شہدائے وطن کو کفن پہنائے تھے وہی ہاتھ حکمرانوں کے لیے کفن سینے کی تیاری میں لگ گئے۔ شاہ جی ان واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ چنگاری ہوا کی منتظر تھی۔ ؎

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

آغازِ سفر

پہلی جنگِ عظیم میں ہندوستان سے کیے گئے وعدوں سے انحراف کے بعد انگریز حکمرانوں نے ترکوں سے بھی عہدِ وفا توڑ دیا۔ اس کی صدائے بازگشت جب ہندوستان پہنچی تو مسلمان خلافت کے مسئلہ کو مذہب کی بنیاد پر سوچنے لگے۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء کو دہلی میں مؤتمر اسلامی کے عنوان سے مسلمان رہنما جمع ہوئے۔ ان کے علاوہ مہاتما گاندھی اور سوامی شردھانند کو بھی دعوت دی گئی۔ اس اجلاس میں "ترکِ موالات" اور سودیشی مال کے بائیکاٹ کی تحریک کی بنیاد رکھی گئی۔

مولانا سید محمد داؤد غزنوی (رحمۃ اللہ علیہ) پنجاب میں پہلے عالم دین تھے، جنہوں نے تحریک خلافت کو ہوا دی اور محلہ وار تقریروں سے عوام پر یہ مسئلہ روشن کیا۔

شاہ جی ان دنوں صرف مذہبی واعظ تھے لیکن کبھی کبھار ان کی مڈبھیڑ سرِ راہ مولانا داؤد غزنوی سے ہو جاتی۔ یہاں تک کہ مولانا داؤد غزنوی اگر کہیں تقریر کرتے تو دوسرے دن شاہ جی اسی جگہ جلسہ

کر کے ان کی تردید کر دیتے۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ مولانا داؤد غزنوی نے شاہ جی کو دعوت دی کہ یا تو مجھے اپنے مکان پر بلائیں یا میرے مکان پر تشریف لائیں۔ میں آپ سے مسئلہ خلافت پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ آخر مولانا داؤد غزنوی خود شاہ جی کے دولت کدہ پر چل کر گئے اور خلافت عثمانیہ کا خاتمہ، ترکوں سے انگریزوں کی عہد شکنی اور عالم اسلام پر فرنگی حکمرانوں کی چیرہ دستیاں کچھ اس انداز سے بیان کیں کہ آخر شاہ جی مولانا داؤد غزنوی کے ہم آہنگ ہو گئے۔ اس گفتگو کے بعد شاہ جی نے روزانہ اخباروں کا مطالعہ شروع کر دیا۔ جس سے حالات اور واضح ہو کر سامنے آ گئے۔

پھر کیا تھا، آبگینے کو ٹھیس لگنے کی دیر تھی، وہ ساری مستی بہہ نکلی بزم عشاق جس کی منتظر تھی۔ وہ آتش فشاں پھٹ گیا جس کی راکھ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ وہ لاوا بہہ نکلا جو فرنگی سامراج کو تنکے کی طرح بہا کر لے گیا۔

پہلی سیاسی تقریر

بعض دفعہ فرد، برائی پوری قوم کو لے ڈوبتی ہے۔ جنرل ڈائر کی حرکت نے نہ صرف جلیانوالہ باغ کو ہی بے گناہوں کے خون سے رنگین کیا بلکہ یہ چھینٹے اقوام یورپ کے دلوں تک بھی پہنچے جس سے ان کی نگاہیں انسانیت کے سامنے شرمندہ رہیں گی۔ اس زخم پر مرہم کے لیے یورپین جراحوں نے نسخہ تجویز کیا کہ تمام ہندوستانی راہنماؤں کو جیلوں سے رہا کر دیا اور ساتھ ہی ہندوستان کو آزادی کی چوتھی قسط دینے کا اعلان کیا۔ ان اصطلاحات کا نمایاں پہلو یہ تھا کہ صوبوں کی عنانِ حکومت ہندوستانی وزیروں کو سونپ دی جائے گی مگر مالیات کا محکمہ انگریز گورنروں کے پاس رہے گا۔

اس برطانوی تجویز پر غور کرنے کے لیے دسمبر ۱۹۱۹ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس امرتسر میں پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ علی برادران بھی رہا ہو کر سیدھے امرتسر پہنچے۔ مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس بھی اسی موقع پر حکیم محمد اجمل خاں (رحمۃ اللہ علیہ) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ خلافت کانفرنس بھی انہی تاریخوں میں امرتسر (گول باغ) میں مولانا شوکت علی کی صدارت

میں منعقد ہوئی جس میں پہلی دفعہ شاہ جی نے سیاسی تقریر کی اور حاضرین کو اس قدر متاثر کیا کہ خلافت کمیٹی کے لیے دس لاکھ روپے کے چندے کی اپیل کی ۔ مولانا محمد علی جوہرؔ نے پہلی مرتبہ اس اجتماع میں شاہ جی کو سنا اور دیکھا تو قافلے میں نئے ساتھی کی شرکت پر خوش ہوئے اور ساتھی بھی ایسا کہ نہ صرف سالارِ کارواں رشک کرنے لگے بلکہ غبارِ کارواں نے بھی قدم لیے اور خوش آمدید کہی۔

ترکِ موالات

۱۹۲۰ء کا سال حریت پسند عوام کے لیے جدوجہد کا اہم سال تھا اس سال مئی میں کانگریس نے اپنے بنارس سیشن میں برطانوی سامراج سے ترکِ موالات کا فیصلہ کیا۔ اسی ہفتے ناگپور میں مسلم لیگ نے بھی ترکِ موالات کی قرارداد منظور کر کے کانگریس اور خلافت کمیٹی کی تائید کی۔ اس قرارداد کی مزید تشریح جب کلکتہ کانگریس کے سیشن فروری ۱۹۲۱ء کو مہاتما گاندھی نے کی تو مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا شوکت علی کے سوا ساری ورکنگ کمیٹی گاندھی جی کے خلاف ہوگئی ۔

کانگریس کے کھلے اجلاس میں مولانا آزاد نے قرارداد کے حق میں تقریر کی تو شاہ جی اس اجلاس میں موجود تھے ۔ وہ تقریر سے بے حد متاثر ہوئے اور آخر میں جب انہوں نے قرارداد کے مؤید کے طور پر تقریر کی تو سارا ہال ترکِ موالات کے حق میں ہوگیا ۔

یہ پہلا موقع تھا کہ شاہ جی اور گاندھی جی ایک دوسرے سے متعارف ہوئے اس تحریک کے نتیجے میں بچوں نے سکول، نوجوانوں نے کالج اور وکلاء نے عدالتوں میں حصہ لینا چھوڑ دیا۔ ولائتی مال کے بائیکاٹ کی تحریک زور پکڑ گئی ۔

لاہور خلافت کمیٹی

سارے ملک میں ان دنوں خلافت کمیٹیاں قائم کی جا رہی تھیں لاہور کے اعتدال پسندوں نے بھی خلافت کمیٹی کی بنیاد رکھی ۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد اقبال جو ان دنوں "سر" نہیں تھے) اور میاں محمد شفیع (جو بعد میں سر شفیع کے نام سے مشہور ہوئے) دونوں بالترتیب صدر اور سیکرٹری منتخب ہوئے ۔

اس زمانہ میں جنرل سرائیکل ایڈوائر پنجاب کے گورنر تھے۔ ان کے اشارے پر لاہور کے ڈپٹی کمشنر نے دونوں کو کچھ کہا سنا تو دوسرے دن یہ خلافت کمیٹی توڑ دی گئی۔

ان دنوں شاہ جی کے جذبات اور انگریز کا تشدد دونوں شباب پر تھے۔ دونوں کے ٹکراؤ نے نوجوانوں کے ہاتھ فرنگی سامراج کے گریبان تک پہنچا دیئے۔ حکیم عبدالمجید عتیقی (مرحوم) اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں کہ :-

"جب پہلی خلافت کمیٹی انگریز حاکموں کے خوف سے دم توڑ چکی تو میں امرتسر میں مولانا ثناء اللہ کے ہاں پہنچا۔ عرض حال کیا تو انہوں نے شاہ جی کو میرے ساتھ لاہور جانے کا حکم دیا۔"

لاہور ان سے ناآشنا تھا۔ موچی دروازہ کے شمال کی جانب باغ میں دن کے گیارہ بجے جلسے کا اعلان کیا گیا۔ باغ میں موسم سرما کے باعث اوباش قسم کے لوگ دھوپ تاپ رہے تھے لیکن جلسہ کے شائق بہت کم تھے۔ کوئی اسٹیج کا انتظام نہیں تھا۔ تین چار سو کے قریب حاضری تھی۔ شاہ جی نے ایک گھنٹہ تک صرف قرآن کریم پڑھا اور ظہر تک تقریر کی۔ نماز کے بعد دوبارہ جلسہ کا اعلان کیا گیا۔ اب کے حاضری پہلے سے زائد تھی۔ اس جلسے میں فیروز کاڑے والا (یہی شخص بعد میں میاں فیروزدین احمد کے نام سے مشہور ہوا) کہیں سے ایک کرسی اور میز اٹھا لایا۔ یہ اجلاس عصر کی نماز کے لیے ملتوی کیا گیا اور جب دوبارہ جلسہ شروع ہوا تو حاضری پانچ ہزار کے قریب تھی۔ شاہ جی قرآن حکیم کی آیات پڑھتے اور ساتھ ساتھ اس کی تفسیر بیان کرتے جاتے اور لوگ تھے کہ اس طرح بیٹھے تھے جیسے کسی نے سحر پھونک دیا ہو۔ مولانا سید حبیب (روزنامہ سیاست کے مالک و مدیر) اس اجلاس میں شریک تھے۔ یہ اجلاس مغرب اور عشا کی نماز کے لیے ملتوی ہوا۔

اب ناقہ کی خوشبو لاہور کی گلیوں اور بازاروں میں پھیل چکی تھی۔ ایک نے سنا دوسرے کو سنایا "کوئی ڈانڈے والا پیر آیا ہوا ہے۔" (شاہ جی اس زمانہ میں اپنے ہاتھ میں ایک موٹا

ساڈنڈار کھتے تھے اور ایک مدت تک اسی نام سے مشہور رہے)

"وہ قرآن پڑھتا ہے تو ایسا معلوم دیتا ہے جیسے ابھی آسمان سے نازل ہو رہا ہے۔ اس کی آواز میں جادو ہے۔ آج اس نے سارے لاہور کو مسحور کر دیا ہے۔"

پھر کیا تھا۔ عشاء کی نماز کے بعد جو اجلاس ہوا۔ اس میں بیس ہزار سے زائد لوگوں نے شرکت کی۔ شاہ جی نے صبح تین بجے تک عوام سے خطاب کیا اور آخر میں کہا

"کون ہے جو کہتا ہے لاہور میں خلافت کمیٹی نہیں بن سکتی۔ میں کہتا ہوں کس مائی کے لال میں ہمت ہے کہ اس کو توڑ کر دکھائے۔"

اسی اجلاس میں سید حبیب کو خلافت کمیٹی لاہور کا صدر اور میاں فیروزدین احمد کو جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ نیز چندے کی اپیل کی تو لوگوں نے دل کھول کر روپیہ دیا۔ عورتوں نے اپنا زیور تک اتار کر بھیج دیا۔ آخر شاہ جی کو اعلان کرنا پڑا کہ آپ اور روپیہ نہ دیں۔ کل صبح جب خلافت کمیٹی کا دفتر قائم ہو جائے گا تو آپ اس روپیہ کی رسید بھی لے لیں اور دوسرا روپیہ جو دیں اس کی بھی رسید لیں۔

چنانچہ دہلی دروازہ کے باہر میاں سراج دین پراچہ کے مکان میں خلافت کمیٹی کا دفتر قائم ہوا اور مدت تک یہی دفتر رہا۔

مرزا بشیر الدین محمود سے پہلی ٹکر

ترکِ موالات کی تحریک نے سارے ہندوستان کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا۔ بچے، جوان، بوڑھے اور مستورات غیر ملکی غلامی سے نجات کے لیے ایثار و قربانی کے تمام ارادوں سے مسلح ہو کر حالات سے مقابلے کے لیے تیار تھے۔ گرفتار ہونے والے رہنماؤں سے جیل خانوں کی وسعتیں تنگ ہو چکی تھیں۔ فرنگی سامراج اپنے اقتدار کے ڈھلتے ہوئے سورج کا تماشا کر رہا تھا کہ قادیانی مذہب کے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود انگریزوں سے اپنی جنسِ وفاداری کا بھاؤ بڑھانے اور انگلستان

کی منڈیوں میں اس سودے کو مزید جلا دینے کے لیے ہندوستان کے اتحاد میں زہر گھولنے کو آموجود ہوا۔

آریہ سماجی لیڈروں کے خلاف اسلام کی آڑ میں جھگڑا مول لیا اور ساتھ ہی مسلمانوں سے اعتقادی لڑائی بھی چھیڑ دی۔ قادیانیوں نے یہ حرکت ایسے موڑ پر کی جب حکمرانوں کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ قریب تھا کہ یہ آگ پھیل کر اتحاد آزادی وطن کو راکھ کر ڈالے کہ شاہ جی نے آگے بڑھ کر اپنے آپ کو اس آگ میں جھونک دیا۔

۱۹۲۵ء کے وسط کی بات ہے کہ بندے ماترم ہال امرتسر میں دن کے گیارہ بجے مرزا بشیر الدین محمود نے اپنے جلسے کا اعلان کیا اور شہر کے مسلمانوں کو شمولیت کی دعوت دی۔ عوام کے ساتھ شاہ جی بھی اس اجتماع میں شامل ہوئے۔ جلسے کے گرد مرزائیوں نے انتظام کا پورا جال پھیلا رکھا تھا۔ سی۔ آئی۔ ڈی انتظامی امور سے لیس تھی۔

مرزا بشیر الدین محمود نے تقریر کے دوران کسی حدیث کے الفاظ غلط پڑھ دیے۔ اس پر شاہ جی نے مجمع سے اٹھ کر بشیر الدین محمود کو حدیث کے غلط الفاظ پڑھنے پر ٹوکا لیکن مرزائی لیڈر اپنی ضد پر اڑا رہا اور شاہ جی اپنے مؤقف پر قائم رہے۔ یہ ہنگامہ آرائی تقریباً بیس منٹ تک جاری رہی تو مرزائیوں نے پولیس کو طلب کر لیا۔ اس پر شاہ جی نے عوام سے کہا کہ جس قدر مسلمان جلسہ میں ہیں وہ ہال سے باہر آجائیں۔ چنانچہ مرزائیوں کے سوا مسلمان شاہ جی کے حکم کی تعمیل میں ہال سے باہر نکل آئے۔ باہر شاہ جی نے مرزائیوں کے خلاف تقریر شروع کر دی۔ اس پر بشیر الدین محمود کو اپنی پارٹی سمیت ہال کے عقبی دروازہ سے پولیس کی حفاظت میں نکلنا پڑا لیکن شاہ جی بدستور تقریر کرتے رہے۔

اس ایک ہلکی سی چپقلش کا اثر یہ ہوا کہ مرزائیوں کے منصوبے ختم ہو گئے اور ان کے حوصلے اس قدر پست ہوئے کہ تحریک ترک موالات کے دوران مرزائیوں کا نام بھی سننے میں نہ آیا۔ اور نہ ہی ملک کے سیاسی حالات اس قسم کی تحریکات کی اجازت دیتے تھے۔

خلافت اور ترک موالات کی مشترک ایجی ٹیشن نے سارے ہندوستان کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ایک کر دیا تھا۔ غیر ملکی قانون اپنی ساری قوت کے باوجود کمزور اور بےکار سمجھا جانے لگا۔ اسی زمانہ میں ۲۲ مئی ۱۹۲۰ء کو حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا عزیر گلؒ مالٹا سے رہا ہو کر ہندوستان پہنچ گئے۔ ان کی رہائی سے تحریک آزادئ وطن کو مزید تقویت ملی۔ خلافت کمیٹی کی شاخیں ہر شہر اور قصبہ میں قائم ہونے لگیں۔

آزاد ہائی سکول گجرات

اسیرانِ مالٹا وطن واپس پہنچ کر اپنے مقاصد میں مصروف ہو گئے۔ حضرت مدنیؒ تحریک خلافت میں شامل ہو گئے اور حضرت شیخ الہندؒ کو جمعیۃ العلمائے ہند نے اپنا صدر منتخب کر لیا۔ انہی دنوں مولانا محمد علی جوہرؒ نے دہلی میں جامعہ ملیّہ کی بنیاد رکھی جس کے تحت ملک کے اکثر شہروں میں تعلیمی درسگاہیں قائم ہوئیں۔ جس میں وہ بچے داخل ہوئے جنہوں نے تحریک ترکِ موالات کے سلسلے میں سرکاری سکول چھوڑ دیئے تھے۔

شاہ جی نے گجرات میں آزاد ہائی سکول کی بنیاد رکھی، جس کا افتتاح مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا۔ چوہدری فیض محمد ایم۔ اے ہیڈ ماسٹر اور ملک نصر اللہ خاں عزیز سیکنڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔

آزاد ہائی سکول کی تمام تر ذمہ داری شاہ جی پر تھی۔ وہ ضلع گجرات میں خلافت کمیٹیاں قائم کرتے اور آزاد ہائی سکول کے لیے روپیہ فراہم کرتے تھے۔ شاہ جی کو ضلع بھر میں اس قدر مقبولیت ہوئی کہ ۱۳۰۰ خلافت کمیٹیاں اسی ایک ضلع میں قائم ہوئیں۔ عورتوں نے اپنے زیور اور مردوں نے اثاثہ حیات تک ان کے قدموں میں ڈھیر کر دیے۔

شب و روز کی محنت اور شاہ جی کی تقریروں نے ضلع بھر کے مرد و زن کو ستاروں کی طرح ان کے گرد جمع کر دیا۔ ضلع گجرات کا ڈپٹی کمشنر کنور دلیپ سنگھ جس نے عیسائیت چھوڑ کر سکھ مذہب اختیار کر لیا تھا، لباس تبدیل کر کے شاہ جی کی ہر تقریر میں شامل ہوتا۔ آخر اسے حکومت نے مجبور کیا کہ وہ شاہ جی کو گرفتار کر لے لیکن اس نے ہمیشہ

مپلو تھی کی۔ اس کی رائے تھی کہ عطا اللہ شاہ بخاری نے ضلع گجرات کے عوام پر جادو کر رکھا ہے۔ وہ ان کے دل و دماغ پر قابض ہے۔ اگر اسے ان دنوں گرفتار کیا گیا تو ضلع بھر میں حکومت کے خلاف بغاوت پھیل جانے کا ڈر ہے۔

ضلع گجرات باقی ہندوستان کی طرح بغاوت کی سلگتی ہوئی آگ کو ہوا دے رہا تھا۔ آزاد ہائی سکول کے طلباء کے دلوں میں انگریز حکمرانوں کے خلاف نفرت کی تخم ریزی اندر ہی اندر اپنا کام کر رہی تھی۔ اس دوران میں شاہ جی کبھی کبھار پنجاب کے دوسرے اضلاع میں جاتے رہے لیکن گجرات ان کی سرگرمیوں کا محور تھا جس کے باعث ہزاروں طلباء نے تعلیم حاصل کی اور گجرات کے عوام آزادی وطن کے لیے کفن بردوش ہو کر میدان کارزار میں نکل کھڑے ہوئے۔

تحریکِ ہجرت

دن گزرتے گئے۔ تحریک خلافت اور ترک موالات کے منہ زور گھوڑے برطانوی سامراج کا نظم و نسق روندتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ لیکن انگریزی راج کے تشدد نے وقت اور حالات میں ایسا زہر گھولا کہ ۱۷۶۵ء میں شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فتویٰ کہ

"انگریزی حکام اگر ان (مسلمانوں) کے کسی معاہدے کو توڑ ڈالیں یعنی نماز باجماعت یا جائز شرعی رسومات یا مسجد کی تعمیر یا ادائے حج یا اسلامی قانون میں دخل انداز ہوں تو پھر ان سے جہاد فرض ہو جائے گا لیکن اگر جہاد ناقابل عمل ہو تو پھر ہر دین دار مسلمان پر ہجرت لازم آتی ہے۔"

علمائے ہند کی آنکھوں میں تیرنے لگا۔ چنانچہ مولانا عبدالباری (فرنگی محل لکھنؤ) نے اپریل ۱۹۲۰ء کو فتویٰ دیا کہ

"فرنگی حکومت نے اپنی مسلمان رعایا سے جو وعدے کیے تھے وہ ان سے منحرف ہو چکی ہے۔ نیز ہندوستان کی مسلمان رعایا پر ان کا تشدد بڑھ کر مذہب میں بےجا مداخلت کرنے لگا ہے۔ بدیں حالات ہندوستان دارالحرب ہو چکا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے کسی ایسے ملک چلے جائیں جہاں کی

قدیں اسلام سے ملحق ہوں۔"

اس فتوی کا شائع ہونا تھا کہ والئے افغانستان غازی امان اللہ خاں نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ افغانستان ہندوستانی مہاجروں کو اپنے ہاں پناہ دینے کے لیے تیار ہے۔

خلافت اور ترک موالات ایسی تحریکات کی موجودگی میں ہجرت کی تحریک نے علماء اور دوسرے رہنماؤں کو پریشان کر دیا۔ مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر مختار احمد انصاری ان دنوں لندن میں ہندوستانی وفد کی قیادت کر رہے تھے۔ مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور خود مہاتما گاندھی تحریک ہجرت کو آزادئ وطن کے لیے مضر خیال کر رہے تھے۔ ان کی رائے تھی کہ آزادی کی لڑائی ملک کے اندر بیٹھ کر لڑی جانی چاہیے، وطن کو چھوڑ کر چلے جانا مفید نہیں۔ دوسری طرف علمائے فرنگی محل اور شاہ جی تحریک ہجرت کو کامیاب بنانے میں سرگرم عمل تھے۔ پنجاب میں مولانا محمد بخش خطیب جامع مسجد راولپنڈی، مولانا احمد علی لاہوری، عزیز ہندی، خان عبدالغفار خاں، علامہ حسین میر کاشمیری، اقبال شیدائی اور دوسرے رہنما عوام کو ہجرت کی دعوت دے رہے تھے۔

انہی دنوں ترک، جرمنی اور روس کے فوجی جرنیل، غازی امان اللہ سے افغانستان میں گفتگو کر رہے تھے کہ اگر ہندوستان میں برطانیہ کے خلاف وہاں کے عوام بغاوت کر دیں تو ان کی فوجی امداد کی جائے تاکہ ہندوستان انگریزی تسلط سے آزاد ہو جائے۔

اس مشورے کے پس منظر میں مولانا عبیداللہ سندھی کا ہاتھ تھا جو پہلی جنگِ عظیم کے شروع میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے حکم پر افغانستان چلے گئے تھے۔

اس تحریک کی موجودگی میں برطانوی حکومت نے ہجرت کی تحریک کو خلافت اور ترک موالات سے زیادہ خطرناک سمجھا اور اس کی روک تھام میں حیلے بہانے تراشے۔ چنانچہ کئی قسم کے لوگ اس تحریک کے راستے کے روڑے بنے۔ ان میں لاہور کے مولوی عبدالحق اور عبدالرحمٰن نامی شامل تھے۔ جنھوں نے غیر ملکی حکومت کی جاسوسی کی اور ہجرت کے رہنماؤں پر بداعتمادی کا اظہار کیا۔

بعد میں یہ دونوں خود فرنگی کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اترے۔

تحریک ہجرت خوفناک قسم کے دو گروہوں کے درمیان چلنے لگی۔ اول وہ جو دیانت داری سے اس تحریک کو آزادیٔ وطن کے لیے غیر مفید سمجھتا تھا۔ دوسرا وہ جنہیں حکومتِ وقت کی خریدکردہ جنس کہا جاسکتا ہے۔ اس گروہ کے پاس دلائل اوّل الذکر گروہ سے مستعار لیے ہوئے تھے یا پھر جن کی پشت پر رائج الوقت سکے کی جھنکار تھی۔

ایسے میں علمائے فرنگی محل کا فتویٰ اور شاہ جی کی آواز کو اپنوں اور پرایوں کے درمیان سے گزر کر عوام تک پہنچنا مشکل ہو رہا تھا۔ تاہم مئی جون کے مہینوں میں ہجرت کی تحریک اپنے جوبن پر تھی۔ لوگ گھر اور سامان چھوڑ کر اللہ کے راستے پر وطن عزیز کے لیے افغانستان پہنچنے لگے۔ مولانا احمد علی لاہوری (رحمۃ اللہ علیہ) عزیز ہندی، خان عبدالغفار خاں اور ان کے ساتھ ہزاروں مسلمان کابل پہنچ چکے تھے کہ ۱۱۔ جولائی ۱۹۲۰ء کو کراچی خلافت کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں مولانا حسین احمد مدنی نے مندرجہ ذیل قرارداد پیش کی۔

"حکومت برطانیہ کی فوج میں ملازمت کرنا، کسی کو بھرتی کروانا، کسی کو بھرتی ہونے کی تلقین کرنا اور ہر قسم کی دوسری اعانت کرنا شرعاً حرام ہے۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ یہ بات ہر مسلمان فوجی تک پہنچا دے۔"

یہ قرارداد منظور ہوتے ہی انگریزوں کے خلاف بغاوت کی آگ شعلہ فشاں ہوئی۔ رہنماؤں کی گرفتاریاں شروع ہوئیں۔ کراچی کا مشہور مقدمہ چلا جس میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا حسین احمد مدنی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو شامل تھے۔ اس مقدمہ میں رہنماؤں کو دو دو اور تین تین برس قید کی سزائیں ہوئیں۔

اس وقت چالیس ہزار کے قریب مسلمان افغانستان جا چکے تھے۔ اور دوسری طرف ہندوستان کے جیل خانے عوام اور لیڈروں سے بھر چکے تھے۔ ملک کے اندر افراتفری کا عالم تھا۔ انگریزی قانون اپنی عافیت کے لیے ہر طرح لیس ہو کر غلاموں کے مقابلے پر صف آرا ہو چکا تھا۔

لوہے کی زنجیریں، بندوقوں کی سنگینیں، جیل خانوں کی کوٹھڑیاں، عدالتوں کے کٹہرے اور پھانسی کے رسّے سب کے سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ غلام اور آقاؤں کے درمیان جنگ کے بادل اس تیزی کے ساتھ برسے کہ سارا ملک لہو سے داغدار ہو گیا۔ آسمان اور زمین کے درمیان خونِ بے گناہ کی لکیر کھنچ گئی جس کے دونوں جانب قانون زنگ کے نخچیر تڑپتے نظر آنے لگے۔ راعی اور رعایا کے مابین اعتماد کی ساری گرہیں ڈھیلی پڑ گئیں۔ قریب تھا کہ غلاموں کے ہاتھ آقاؤں کے گریبان نوچ ڈالتے اور تار گریبان کی دھجیاں اڑ کر ایوانِ فرنگی پر برق بن کر گرتیں کہ فرنگی دانشوروں نے نئی نہج پر سوچنا شروع کیا اور تحریک ہجرت کی موت کے اسباب پر فکر و نظر کی طرح ڈالی۔

جیسے کہ اوپر بیان کیا گیا افغانستان ان دنوں ایک ایسی بساط تھی جس پر مختلف حکومتوں کے مہرے کام کر رہے تھے۔ ہر کھلاڑی اپنے داؤ پر تھا۔

ترکیہ، جرمنی اور روس، برطانیہ کے خلاف ایک محاذ پر جمع تھے۔ گو برطانیہ کے ہاتھ اپنی رعایا پر اٹھ رہے تھے لیکن اس کی نگاہیں اور کان افغانستان کے پہاڑوں پر مرکوز تھے جس کے دامن میں اس کی موت کے مشورے ہو رہے تھے۔

غازی امان اللہ نے ہندوستانی مہاجروں کو جس جذبے کے تحت دعوت دی تھی بلاشبہ وہ جذبہ ایک محبِ ملت مسلمان بادشاہ کا جذبہ تھا، جس میں خلوص کی سینکڑوں بہاریں جلوہ فرما تھیں لیکن افغانستان کے اقتصادی اور سیاسی حالات چالیس ہزار مہاجروں کے بوجھ کے متحمل نہیں تھے۔ انگلستان ان واقعات و حالات سے ناآشنا نہیں تھا۔ افغانستان کی اس کمزور اور ریتلی دیوار کا سہارا لے کر اس نے کابل کو ایک ایسی نظر سے دیکھا کہ غازی امان اللہ اپنے عزم کی سیڑھیوں سے پھسلتا دکھائی دیا۔

"اگر والیِ افغانستان چاہے تو اس کا تمام ملک پابندیوں سے آزاد کر دیا جائے گا بشرطیکہ انگریزوں کے خلاف افغانستان سے غیر ملکی اڈے ختم کر دیے

جائیں اور ہندوستانی مہاجروں کو واپس کر دیا جائے"۔

افغانستان نے بغیر کسی تردد کے ۲۰ جون ۱۹۲۰ء کو انگریزوں کی یہ دونوں شرطیں منظور کرلیں۔ اگرچہ اس مسودے کی تصدیق انگلستان نے ۲۲ نومبر ۱۹۲۲ء کو دی لیکن حالات کی آنکھیں جون ۱۹۲۰ء سے سرخ ہونی شروع ہو چکی تھیں۔ جن مہاجروں کی آمد پر افغانستان فرشِ راہ تھا آج ان مہاجروں کے لیے کابل کے بام و در، کوچہ و بازار اپنا دامن سکیڑ رہے تھے۔ کل جن پہاڑوں نے پھول برسائے تھے آج انہیں پتھراؤ کرنا مشکل نہیں ہو رہا تھا۔ افغانستان کے دل و نگاہ میں کل کے مہمان آج کے مجرم تھے۔

افغانستان کے حکمران اور عوام کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر جرمنی، روس اور ترکیہ کے نمائندوں کو اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ وہ اپنے ہی بنائے ہوئے منصوبوں کو روندتے ہوئے اپنی چھوڑی ہوئی راہوں پر پلٹ گئے۔ مولانا عبیداللہ سندھی خود غازی امان اللہ کے تعاون سے روس پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔

ان حالات میں تحریک ہجرت کے رہنماؤں کو اپنے ماضی پر غور کرنا اور قدم روکنے پڑے راستے کی تھکاوٹ محسوس ہونے لگی، حالات شرمندہ کر رہے تھے۔

اس مسافر کی محرومئ دل کا اندازہ کون کر سکتا ہے، جسے منزل پر پہنچ کر بھی منزل نہ ملے۔ وہ نگاہیں کتنی بدنصیب ہیں جنہیں آستانۂ یار پر جا کر بھی دیدار کی سعادت سے محروم رہنا پڑے۔

شاہ جی اور دوسرے زعمائے ملت جنہیں تحریک ہجرت کا خضرِ راہ کہا جا سکتا تھا، تحریک کی ناکامی اور چالیس ہزار مہاجر مسلمانوں کی کابل سے نامراد واپسی پر سکونِ دل کھو بیٹھے۔ دوستوں کے گلے اور دشمنوں کے غصے نے شاہ جی کو دل برداشتہ کر دیا۔ اور وہ اپنی تمام سرگرمیاں چھوڑ کر پھر آزاد ہائی سکول کی دیکھ بھال کے لیے گجرات واپس چلے گئے۔

پہلی گرفتاری اور سزا

تحریک ہجرت کی ناکامی کے بعد خلافت اور ترک موالات کی ہنگامہ آرائیوں میں پھر سے توانائی پیدا ہونے لگی۔ ادھر انگریز

افغانستان کے خوف سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ چنانچہ ۵۔ نومبر ۱۹۲۰ء کو دہلی میں مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں بدیشی مال کا بائیکاٹ اور فوجی بھرتی کے خلاف عام لڑائی کا اعلان کر دیا گیا۔

ہندوستان کی ان دونوں تحریکوں میں انگریزوں کو اپنی موت دکھائی دینے لگی۔ ہر شہر میں روزانہ ریشمی کپڑے بازاروں میں نذرِ آتش ہونے لگے۔ ہندو، مسلمان عورتیں اپنا قیمتی لباس خوشی سے جلانے کے لیے رضا کاروں کے سپرد کر دیتیں۔ مرد گرم کپڑوں کو اپنے ہاتھ سے آگ لگا دیتے۔

اس تحریک نے انگلستان کی ملوں اور کارخانوں کو معطل کر دیا۔ یورپین مال سے ایشیائی منڈیاں خالی ہو گئیں اور روزانہ ہزاروں کی تعداد میں رضا کار گرفتار ہونے لگے۔

سال ۱۹۲۰ء کی عمر اسی ہاہاکار میں تمام ہو گئی۔ اس سال کے غروب ہونے والے آفتاب کی زریں شفق کی سرخیوں پر ایک ایسا عنوان چھوڑ گئیں جس سے ظلم و جور کی سینکڑوں کہانیاں مرتب ہو سکتی ہیں۔ یہ بھی اس سال کی کہانی ہے کہ افسانہ ہائے جرم و سزا کے رنگ و روغن کو کائنات کے دامن میں محفوظ کرا لیا۔ تاریخ کے اوراق پریشان ہو کر بھی اس سال کے واقعات کو ضائع نہیں کر سکتے۔

۱۹۲۱ء کے شروع میں آزاد ہائی سکول میں پھر سے بہار آ گئی۔ شاہ جی نے دوسری جدوجہد سمیٹ کر سکول کی طرف توجہ دی۔ دلوں کے دروازوں پر از سرِ نو دستک سن کر عوام باہر نکلے۔ حالات پر خوف و ہراس کا عالم تھا۔ حکومت نے شاہ جی کی سیاسی سرگرمیوں کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ سکول کی نگرانی بھی شروع کر دی تھی۔ بظاہر سکول کی عمارت تعلیم تک محدود تھی لیکن حکومت کو ہر طالب علم کا بستہ خلافت کمیٹی کا دفتر معلوم ہوتا تھا۔

شاہ جی کی شخصیت اب امرتسر اور گجرات سے نکل کر راوی اور چناب کی لہروں پر تیرنے لگی۔ بیاس اور ستلج کی موجوں نے انہیں اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ پنجاب کی آب و ہوا نے شاہ جی کے مزاج میں نکھار پیدا کیا۔ پھول کی خوشبو نے چمن سے نکل کر گیسوئے یار کو بہار آفرین کر دیا۔ دہلی سے اٹک کے کنارے تک شاہ جی کے پرچے ہونے لگے۔ دل و نظر کے احترام نے

دوستوں کے حلقے کو وسعت دی۔ انہی دنوں شاہ جی کا سیاسی مزاج بھی پختہ ہوا اور ان کی تقریروں میں مذہب کے ساتھ برطانوی سامراج پر کھلی تنقید ہونے لگی۔ غلامی کا احساس جوان ہو کر حاکموں سے متصادم ہوا۔

خلافت اور ترک موالات کی تحریکات کے باعث انگریزوں کے خلاف ہندوستان میں نفرت پھیل چکی تھی۔ انگریزوں کی فوج میں بھرتی کو شرعاً حرام قرار دیا جا چکا تھا۔ گجرات چونکہ افواجِ فرنگی کا مرکز تھا اس کی حفاظت سلطنت برطانیہ کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ لہٰذا شاہ جی کو باغی قرار دے کر ان کی سرکاری طور پر نگرانی میں لیل و نہار کی تمیز اٹھا دی گئی۔ انگریزی قانون شکاری کتے کی طرح ان کے نقش پا کی تلاش میں مصروف ہو گیا۔

پنجاب خلافت کانفرنس منعقدہ ۱۸۔ مارچ ۱۹۲۱ء راولپنڈی میں شاہ جی نے تقریر کی جو ۲۰۔ مارچ کے "زمیندار" میں شائع ہوئی۔ یہ شاہ جی کی پہلی تقریر تھی جو اخبارات میں شائع ہوئی۔

"برادرانِ ملت! میں آج تقریر کرنے کے لیے نہیں آیا تھا، بلکہ آپ کی طرح سننے والوں میں سے تھا۔ سخت ہی تحیر اور تعصب کا مقام ہے کہ کوہاٹ کے جبہ پوش تو اس جلسہ میں شریک ہوں اور باشندگان راولپنڈی جلسے میں دکھائی نہ دیں۔ کیا ان میں نورِ ایمان زیادہ ہے؟ کیا وہی قرآن کریم پر عمل پیرا ہیں؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ عدالتوں میں توُ توُ بول رہے ہیں۔ وکالت پیشہ احباب اپنی وکالت کیوں ترک کرنے لگے۔ دراصل وہاں کے باشندوں نے عدالتوں کا بائیکاٹ کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وکالت پیشہ احباب کو اپنی وکالت ترک کرنی پڑی۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سنو۔ بدمستی چھوڑ دو۔ جن کے صدقے میں تمہیں آرام تھا وہ بے آرام ہیں۔ جن کی وجہ سے تم عیش و عشرت کرتے تھے وہ آج کل نہایت کس مپرسی کی حالت میں ہیں لیکن تم ہو کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ تم ہی کوئی تجویز بتاؤ کہ ہم بھی تمہارے قائل ہو جائیں۔

ترکوں نے خلافت اسلامیہ کے لیے اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کر دیا لیکن تم ہندوستانیوں پر قرآن اور کعبہ لعنت بھیجتا ہوگا۔ فرشتے ترکوں کو ذبح کرنے کیلئے آسمانوں سے نہیں اترے۔ حرمین شریفین کے ان محافظوں کو اگر قتل کیا تو تم نے ہندوستان میں سب سے بڑا مرکز راولپنڈی کا ضلع ہے، جس نے انگریزی فوج میں بھرتی دی۔ جنگی قرضے میں تم نے اپنا سب کچھ دے دیا۔ ارے تم میں تو اتنی غیرت بھی نہیں۔ اگر تمہاری لڑکیوں کو یورپین مانگیں تو تم ان کو بھی دینے پر آمادہ تھے۔ اب بھی تم مصطفےٰ کمال کو ذبح کرنے کے لیے تیار ہو۔ سفید خداؤں سے ڈرتے ہو۔ جس کعبہ کی طرف تم منہ کر کے نماز پڑھتے ہو، اسی پر ہاتھ صاف کرتے ہو۔ ارے تم میں تو ذرہ بھر بھی غیرت نہیں۔ تم تماشا دیکھتے ہو گے کہ ابو الکلام آزاد محمد علی، شوکت علی جیل چلے جائیں تو کام بند ہو جائے گا۔ ارے آزادی کس چیز کا نام ہے، قید کس چیز کا نام ہے۔ قید اور آزادی میں کیا فرق ہے؟ اگر ہمارا گھر آزاد ہے تو ہم آزاد ہیں۔ اگر وہ آزاد نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ کیا ترک مٹ جائیں گے تو مکہ اور مدینہ کو بچا لوگے؟ کیا کالا غلاف جس میں اس وقت سوراخ ہے اسے بچا لوگے؟۔ ارے دیکھو! ترکوں کا جو بچہ پیدا ہوتا تھا وہ حرمین شریفین پر بھینٹ چڑھا دیا کرتے تھے۔

میں تم سے ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں ہم انشاء اللہ ضرور کامیاب ہوں گے۔

(اس پر اللہ اکبر کے نعرے بلند ہوئے)

تمہارے لیے سکھ اپنی جانیں دے رہے ہیں۔ غیر، نوحہ خوانی کر رہے ہیں لیکن تم ہو کہ شادمانی کر رہے ہو۔ تم کہتے ہو محمد علی نہیں آئے، شوکت علی نہیں آئے صدر صاحب نہیں آئے۔ ارے سنو اور غور سے سنو! کہ اللہ ہمارا صدر ہے اور قرآن کریم ہمارا دستور العمل ہے۔ تمہارا قافلہ بہت دور جا چکا ہے اور تم پھر اس

قافلے کو واپس لا رہے ہو جہاں سے چلا ہے۔ تم اللہ کی مدد نہ کرو گے۔ اللہ تم پر عذاب نازل کرے گا۔ تمہارا دل پتھر کا ٹکڑا ہے گوشت کا لوتھڑا نہیں۔ اگر تم ان باتوں سے منحرف ہو تو نیا خدا بنا لو۔ نیا قرآن لے آؤ۔ تم اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہو تو میرے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ تمہارے نعرے بے روح ہیں۔

مولوی ظفر علی خاں، مولانا فاخر، مولوی ثناء اللہ کے لیے تم نے کیا کیا؟ تم نے ان سے کون سی ہمدردی کی؟ تمہارے مولوی تو سی آئی ڈی کے اندر موجود ہیں۔ تم نے ہی ان تک اطلاعیں بھجوائیں۔ اگر یہ نہ ہوتے تو میں دیکھ لیتا کہ انگلستان یا آئرلینڈ کے لوگ اس قسم کی اطلاعوں کو پہنچانے میں کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں۔

تم نے مولانا محمود الحسن کے کہنے پر عمل کیا؟ اس بزرگ کے اقوال کا اتباع کہاں تک کیا؟ ارے مسلمانو! تمہاری اس حالت پر مجھے افسوس آتا ہے اور حسرت بھی۔ مجھے سیال شریف کے پیر ضیاء الدین سے پچھلے دنوں ملنے کا اتفاق ہوا۔ اس نیک بخت بزرگ نے اپنے مریدوں کے نام یہ حکم صادر فرمایا ہے "کہ جو شخص میری حلقہ مریدی میں رہنا چاہتا ہے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ افواج یا گورنمنٹ انگلشیہ کی نوکری ترک کر دے، ورنہ وہ میرا مرید نہ ہو گا۔"

اخبارات کے ذریعے عوام میں ابھی اس تقریر کے چرچے ہو ہی رہے تھے کہ ۲۵۔ مارچ کو نماز جمعہ کے بعد امرتسر خلافت کمیٹی کے جلسہ عام میں جو خیر الدین کی مسجد میں ہوا۔ شاہ جی نے دوسری تقریر کی۔ اس تقریر کے بعد حکومت نے شاہ جی کو مزید ڈھیل دینا نامناسب سمجھا اور ۲۷۔ مارچ ۱۹۲۱ء کو رات دو اور تین بجے کے درمیان کوچہ موہر کنداں کرموں ڈیوڑھی امرتسر سے دفعہ ۱۲۴ الف کے تحت گرفتار کر لیا۔

شاہ جی ان دنوں گجرات سے اپنی ہمشیرہ[1] کی شادی کے سلسلے میں امرتسر آئے ہوئے تھے۔

---

[1] شاہ جی کی یہ ہمشیرہ باپ کی طرف سے حقیقی اور والدہ کی طرف سے سوتیلی تھی لیکن شاہ جی ان سے ہمیشہ حقیقی بہنوں کا سا پیار کرتے

امرتسر میں ہڑتال

طلوعِ آفتاب سے پیشتر سارے شہر میں شاہ جی کی گرفتاری کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ دکانیں کھلنے سے پہلے بند ہونے لگیں۔ گلی کوچوں نے ماتمی لباس پہن لیا۔ گھروں میں جلتے ہوئے چولہوں کی آگ سرد کر دی گئی۔ یہاں تک کہ سارا شہر امڈ کر کوتوالی آن پہنچا۔ حکومت برطانیہ مردہ باد! سید عطاء اللہ شاہ بخاری زندہ باد! کے پیہم نعروں نے پولیس افسروں کو مجبور کر دیا کہ وہ عوام کی مرضی دریافت کریں۔ "ہم شاہ صاحب سے ملنا چاہتے ہیں یا انہیں ہمارے سامنے لاؤ"!

ہجوم کا یہ مطالبہ افسرانِ بالا تک پہنچا۔ آخر طے پایا کہ ہجوم اپنے چند آدمی منتخب کرے۔ چنانچہ ۵ ہندو ۵ مسلمان کوتوالی کے اندر حوالات میں شاہ جی سے ملنے گئے۔ واپسی پر ان کا بیان ہے کہ "یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی شیر کچھار میں ٹہل رہا ہے۔ انہیں اپنی گرفتاری کا ذرہ برابر خوف نہیں۔ چہرہ اسی طرح سُرخ اور آنکھیں اسی طرح مسکرا رہی ہیں۔ زبان پر قرآن کریم کی آیات جاری ہیں"۔

ہم نے ضمانت کے لیے عرض کیا تو ناراض ہو کر فرمانے لگے: "آپ نے مجھے بزدل یا وطن کا غدار سمجھا ہے۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا اگر آپ نے ایسا کیا تو میں کوتوالی سے باہر آتے ہی وہی کچھ کروں گا جس کی وجہ سے میں یہاں لایا گیا ہوں۔

پھر شاہ جی کے والد ملنے آئے تو دیکھا "سورۂ یوسف" کی تلاوت کر رہے ہیں۔ حوالات کے آس پاس پولیس افسروں کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہیں۔ والد صاحب کو دیکھ کر شاہ جی نے "السلام علیکم" کہا۔ والد صاحب نے جواب میں "وعلیکم السلام" کے بعد کہا،

"میں اس دن کا منتظر تھا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں استقامت دے۔ آمین"!

پھر شاہ جی نے کہا،

"ابا جی! میں آپ کی دعائیں اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی چاہتا ہوں اور بس"!

گرفتاری کی خبر جب دوسرے شہروں میں پہنچی تو ہر جگہ برطانوی حکومت کے خلاف جلسے

ہوئے۔ شاہ جی کو حق گوئی کی پاداش میں گرفتاری پر مبارک باد کی قرار دادیں منظور کی گئیں۔

تحریکاتِ آزادیٔ وطن کے چلتے ہوئے ۱۹۲۱ء میں شاہ جی کی گرفتاری نے ایسا تیل چھڑکا کہ اس آگ کے شعلے ایوانِ فرنگی تک جا پہنچے جس سے غلامی کی زنجیریں پگھلنے لگیں۔ ان دنوں شاہ جی کی عمر تیس سال کے قریب تھی۔

مقدمہ کی سماعت

۲۔ اپریل ۱۹۲۱ء پہلی دفعہ شاہ جی کو مسٹر ایف اے کانر (F.A. CANER) ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ کچہری میں عوام کی اس قدر بھیڑ تھی کہ باقی عدالتوں کو اپنا کام جاری رکھنا مشکل ہو گیا۔ دس بجے سے ذرا بعد شاہ جی کو پولیس کی لاری میں کچہری لایا گیا۔ شاہ جی کو دیکھتے ہی عوام نے برطانوی راج مردہ باد کے نعرے لگائے۔ انتظام کے لیے گورکھا فوج کا دستہ پہلے سے متعین تھا لیکن ان دنوں عوام کے جذبات فوج اور پولیس کے رعب سے بے نیاز تھے۔ عدالت کا کمرہ وکلاء اور دوسرے معززین سے بھرا پڑا تھا۔

مجسٹریٹ۔ (شاہ جی سے مخاطب ہو کر) آپ نے ۲۷۔ مارچ کو خیرالدین کی مسجد میں تقریر کی تھی؟

شاہ جی۔ میں نے وہاں بھی قرآن کریم پڑھا تھا اور یہاں بھی قرآن کریم کی ایک آیت پڑھتا ہوں۔

مجسٹریٹ۔ آپ لکھ کر دے دیں۔

شاہ جی۔ جس نے وہاں میرا قرآن نوٹ کیا ہے وہی لکھے۔ اگر یہاں درست نہیں نوٹ کر سکتے تو وہاں کس نے درست نوٹ کیا ہو گا۔ میں لکھنا نہیں جانتا پڑھنا جانتا ہوں۔

مجسٹریٹ۔ آپ کا بیان؟

شاہ جی۔ میرا بیان وہی ہے۔

سرکاری وکیل نے استغاثہ پڑھ کر سنایا۔

"مولوی عطا اللہ صاحب ایک ذی عزت آدمی ہیں۔ آپ کے والد بھی ذی عزت آدمی ہیں۔ انہیں معلوم تھا کہ جو لفظ میرے منہ سے نکلتے ہیں۔ ان کا اثر ہو گا۔ ان کو

علم تھا کہ ایسی تقریروں کا کیا اثر ہوتا ہے۔

پہلے بھی ان کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ایسی تقریروں سے منع کیا تھا۔ یہ تقریر جو انہوں نے جمعہ کے دن وعظ کی صورت میں کی تھی۔ قرآن شریف کی آڑ میں انہوں نے اپنی سیاسی خواہش کو پورا کرنا چاہا تھا۔ انہوں نے جو کچھ کہا اس سے ان لوگوں کے دلوں میں جو سننے والے تھے برے خیالات پیدا ہونے کا احتمال ہے۔

انہوں نے مسجد میں قسم کھا کر کہا کہ مکہ معظمہ پر گولیاں چلائی گئیں۔ اس طرح ان لوگوں کے دلوں میں مذہبی نفرت اور جوش پیدا کیا گیا۔

انہوں نے کہا کہ عورتوں کی بے حرمتی کی گئی اور وہ بطور راشن کے سپاہیوں کو دی گئیں۔ دس دس آدمیوں کو ایک عورت دی گئی اور ہم جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے دلوں میں عورت کی عزت و حرمت بہت بڑی ہے۔

انہوں نے کہا جو روپیہ لڑائی کے لیے ہم سے لیا گیا اس سے گولیاں خریدی گئیں اور ہمارے اپنے بھائی ان سے مارے گئے۔

یہ ایسی تقریر تھی جو بے علم لوگوں پر جن کو واقفیت نہ ہو ان پر برا اثر کر سکتی تھی اور گورنمنٹ کے خلاف تھی۔

جب شاہ جی وعظ کے طور پر جمعہ میں یہ لفظ کہہ رہے تھے۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ مبالغہ قابلِ معافی اور جھوٹ بولنا واجب اور جائز ہے۔ ان کو معلوم تھا کہ وہ کس قسم کے آدمیوں کو سنا رہے ہیں۔ ایسی بات سن کر وہ فساد کرنے لگتے ہیں جس سے حکومت کے خلاف بغاوت کا احتمال ہے۔

لہٰذا حسب ذیل امور اس تقریر میں جرم تحت ۱۲۴ - الف تعزیرات ہند عائد ہوتے ہیں۔

۱ ــــ فرعون اور حکومت کے مابین مقابلہ کیا گیا۔ یہ کہ انگریز چاہتے ہیں کہ کل

دنیا کو عیسائی بنائیں" انگریز" کا لفظ استعمال کیا گیا" یہ برٹش گورنمنٹ آف انڈیا کے لیے استعمال کیا گیا ہے کیونکہ لارڈ کچز وغیرہ کا ذکر کیا گیا۔

۲ ـــــ موسیٰؑ اور فرعون کا ذکر کیا گیا۔ موسیٰؑ نے فرعون کی سلطنت کو تباہ کر دیا تھا۔ وہ بچوں کو قتل کرتا تھا۔ یہ حکومت طریقہ تعلیم سے وہی بات کرتی ہے۔

۳ ـــــ پولیس والے نو نو روپے لے کر اپنے بھائیوں کے گلے کاٹتے ہیں۔ فرعون کے مخبر بھی تھے لیکن انہیں تنخواہ زیادہ ملتی تھی۔ موسیٰؑ نے ایک شخص کو مارا خدا کو غصہ پسند ہے۔ سُرخ رنگ، سُرخ چہرے، سُرخ کپڑے بھی خدا پسند کرتا ہے۔ میری تعلیم بھی یہی بناتی ہے کہ سُرخ کپڑے ہوں اور میں حسینؓ کی گود میں چلا جاؤں۔

۴ ـــــ ہمارے بھائی برطانوی فوج میں بھرتی ہو کر مدینہ منورہ گئے اور اپنے ہی بھائیوں کو مار، خانہ کعبہ کے غلاف میں چھید کیے۔ حج کے لیے غربت کا عذر پیش کیا جاتا ہے لیکن مذکورہ بالا کام قلیل تنخواہ پر کر رہے ہیں۔

۵ ـــــ زنانہ مدارس لڑکیوں کو تباہ کرتے ہیں۔ چائے، انڈے اور انگور کھلا کر خراب کرتے ہیں۔ وہ گھر کے کام کے قابل نہیں رہتیں۔ وہ بے شرم ہو جاتی ہیں۔ ملیشیا میں عورتوں کو راشن کے طور پر تقسیم کیا گیا۔

۶ ـــــ انگریز مکھیوں کی طرح ہیں۔ اگر تم ان سے لڑو گے تو وہ تمہیں ڈنک ماریں گی۔ ان کو ہڑتال کی دھونی دو اور اس طرح وہ بوریا اٹھا کر چل دیں گے اور بمبئی کی بندرگاہ سے سوار ہو کر چلے جائیں گے اور ہم کنارے پر کھڑے ہو کر غرق ہونے کی دعا کریں گے اور شہد کھائیں گے۔

۷ ـــــ افسوس ہے کہ ہمارے بچے ابھی تک انجمن اسلامیہ کے سکول میں پڑھتے ہیں جس نے پچھتر ہزار روپیہ انگریزوں کو دیا جس سے گولیاں خریدی گئیں اور یہ گولیاں ہمارے ہی بھائیوں پر چلائی گئیں۔

۸ ـــــــ انگریزوں نے جس طرح دباؤ میں رکھنا چاہا بھرتی کیا، لڑائی میں مروایا جلیانوالہ باغ میں گولیاں چلائیں، قید کیا، پھانسیاں دیں، لڑائی کا چندہ لے کر ہم کو لوٹ لیا۔ چونکہ سڈیشن میٹنگ ایکٹ (STRATION MEETING ACT) نافذ ہے، مسجد ہی امن کی جگہ ہے۔

۹ ـــــــ منتروں وغیرہ کا حوالہ دیتے ہوئے ملزم نے انگریزوں کو شیطان کی نانیاں کہا ہے۔

یہ تمام الفاظ تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۲۴۔ا کی زد میں آتے ہیں۔

فردِ جرم مجسٹریٹ۔ (شاہ جی سے) آپ نے ۲۵۔ مارچ کو ایک تقریر کی جس کی رپورٹ A.B.C. میں درج ہے کہ آپ نے حکومت کے خلاف نفرت یا حقارت پیدا کی یا اس کا اقدام کیا یا دشمنی کے خیالات پھیلائے اور برٹش گورنمنٹ آف انڈیا کے خلاف لوگوں کے دلوں میں حقارت پیدا کی۔ کیا آپ نے یہ جرم کیا ہے؟

شاہ جی۔ میں نے جرم ہرگز نہیں کیا۔ قرآن کریم پڑھا ہے، قرآن کریم پڑھنا جرم نہیں۔

مجسٹریٹ۔ جرح کے لیے گواہ بلانے ہیں یا صفائی کے گواہ۔

شاہ جی۔ میں ترکِ موالات کا حامی ہوں۔ قرآن میری صفائی ہے۔ قرآن میرا گواہ ہے۔ قرآن ہی میرا مذہب ہے اور قرآن ہی میرا دین۔ اس کے علاوہ میں اور کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

فیصلہ مقدمہ مقدمے کی یہ کارروائی مسلسل جاری رہی۔ آخر ۸۔ اپریل ۱۹۲۱ء کو حسب ذیل فیصلہ دیا گیا۔

"قیصرِ ہند بنام مولوی عطاءاللہ ولد حافظ ضیاء الدین، قوم سید، سکنہ ناگڑیاں جرم زیر دفعہ ۱۲۴ الف مجموعہ تعزیرات ہند۔ تاریخ اجراء مقدمہ ۲۔ اپریل ۱۹۲۱ء

اس مقدمہ میں امرتسر شہر کا ایک مولوی عطاءاللہ ملزم ہے۔ یہ شخص زیر دفعہ ۱۲۴۔ا تعزیرات ہند ایک وعظ کی بناء پر گرفتار کیا گیا ہے، جو اس نے شیخ

خیرالدین کی مسجد واقع ہال بازار امرتسر بروز جمعہ مورخہ ۲۵۔ مارچ ۱۹۲۱ء کو کثیرالتعداد جماعت کے سامنے بیان کی۔ استغاثہ کا بیان ہے کہ اس وعظ سے اس حکومت کے خلاف جو بروئے قانون قائم ہے، نفرت اور حقارت پھیلنے کا احتمال ہے۔ یہ استغاثہ حکومت کی منظوری لینے کے بعد دائر کیا گیا۔ استغاثہ کے دس گواہوں نے یہ وعظ سنا۔ ان میں سے ایک غلام محی الدین ہیڈ کانسٹیبل گواہ استغاثہ نمبر ۲ تھا۔ جو وعظ سننے کے بعد کوتوالی پہنچا اور اس نے وعظ کے نوٹ تیار کر کے اپنے حکام کے پاس بھیجے۔ وعظ کا ترجمہ مختصر درج ذیل ہے۔

ا ——— ہندوستان کی موجودہ حکومت کا مقابلہ فرعون سے کیا گیا اور مسٹر گاندھی کی مثال موسیٰؑ سے دی گئی۔ فرعون کی سلطنت برطانیہ کی نسبت بڑی اور طاقتور تھی۔ فرعون منجموں سے صلاح اور مشورے کیا کرتا تھا اور انگریز ڈاکٹروں سے مشورے لیتے ہیں۔ اگر ڈاکٹر اتنا کہہ دے کہ فلاں جگہ رہنا صحت کے لیے مضر ہے تو انگریز اس جگہ کو چھوڑ دیتا ہے۔ خدا، انگلستان میں کوئی ایسا ڈاکٹر پیدا کر دے جو ہندوستانیوں سے تین چار لاکھ روپیہ لے کر انگریزوں کو یہ مشورہ دے کہ ہندوستان کی آب و ہوا ان کے لیے ٹھیک نہیں۔

ب ——— فرعون تو یہ دعویٰ کرتا تھا کہ وہ کائنات کا خدا ہے اور انگریز یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں امن و امان پھیلانے کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ تمام نسلِ انسانی کو عیسائی بنا لیا جائے۔

ج ——— ان انگریزوں کے صلاح کار۔ لارڈ جارج، کمشنر، گورنر اور اسی طرح کے دوسرے لوگ ہیں۔

د ——— فرعون کے منجموں نے پیش گوئی کی تھی کہ ایک لڑکا پیدا ہوگا جو فرعون کی سلطنت کو تباہ کر دے گا۔ اس پر فرعون نے موسیٰؑ کو تباہ کرنے کے لیے

یہ تجویز سوچی کہ جو لڑکا پیدا ہو اسے مار ڈالا جائے۔ فراعنہ یورپ (ہندوستان کی انگریزی حکومت سے مراد) نے اخلاق کو تباہ کرنے اور غلام بنانے والے نظامِ تعلیم سے ہندوستانیوں کی قومی روح اور مذہبی سرگرمی کو برباد کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے بھائیوں نے نو نو روپے کی ذلیل تنخواہ پر فوج میں بھرتی ہو کر مکہ اور مدینہ میں نیز خانہ کعبہ میں اپنے ہی بھائیوں کے سینوں کو گولیوں سے چھلنی کیا لیکن جب حج کا سوال پیدا ہو تو مفلسی اور ناداری کا سوال پیش کرتے ہیں۔

لڑکیوں کے لیے سکول کھول رکھے ہیں۔ یہ سیاہ منتیں (شیطان کی نانیاں) سفید لباس میں دیہات کی لڑکیوں کو انگور کھلاتی ہیں اور لپٹن کی چائے پلاتی ہیں اور لپٹن کی لپیٹ میں لا کر گھر کے کام کاج کے ناقابل بنا دیتی ہیں یہاں کی ابتدائی تعلیم اور کالج کی پڑھائی انسان کو غلام بنا دیتی ہے۔ یورپ کا فرعون ہندوستانی عورتوں کو ذلیل کرنا چاہتا ہے تاکہ ان کی اولاد غلام بنی رہے۔

ایشیا میں ہماری عزت و حرمت کو اس طرح ذلیل کیا گیا کہ ایک ایک مسلمان عورت دس دس سپاہیوں کو راشن کی طرح تقسیم کی گئی۔

نمبر۱ ——— فرعون کو خبر نہ تھی کہ وہ بچہ جس کی تباہی کو اس نے اپنا مقصد قرار دے رکھا ہے خود اسی کے محل میں پرورش پائے گا۔ اور اس کی داڑھی نوچے گا۔ اسی طرح مہاتما گاندھی بھی برطانوی ہند میں پیدا ہوئے۔ یہیں تعلیم پائی، یہیں کے تعلیمی اعزازات حاصل کیے اب انگریزوں کو ہی برباد کرنے پر کمربستہ ہیں۔

س ——— فرعون نے سی۔ آئی۔ ڈی کی مدد سے ایک ایسی دایہ تلاش کی جسے شیرخوار نے پسند کیا۔ موجودہ سی۔ آئی۔ ڈی کے آدمی نو روپلے کی ذلیل رقم کے لیے اپنے ہی بھائیوں کا گلا کاٹتے ہیں۔ خدا کرے ان کے ہاتھوں میں جذام

ہو جائے۔ قیامت کے دن ان کا سیاہ نامۂ اعمال ان کی گردنوں میں لٹکایا جائے گا۔ (اس موقع پر پولیس کے ان سفید پوش آدمیوں کی طرف اشارہ کیا، جو اس وقت مجمع میں موجود تھے) اگر یہ لوگ اس قسم کا کام چھوڑ دیں تو انگریزوں کو یہی کام خود کرنا پڑے۔

ش ـــــ جب موسیٰؑ جوان ہوئے تو انہوں نے ایک مصری کو جوشِ جلالت میں مار ڈالا۔ خدا ایسے جلال کو پسند کرتا ہے۔ خدا سُرخ رنگ، سُرخ کپڑے، سُرخ چہرے اور سُرخ گریبان پر خوش ہوتا ہے۔ میری تمنا ہے کہ میں بھی اپنے کپڑوں پر سرخ چھینٹے دیکھوں تاکہ مجھے جنت الفردوس میں جگہ ملے۔

ملزم کے وعظ میں مندرجہ ذیل اشارات بھی تھے۔

۱ ـــــ جرمنوں نے چالیس سال تک جنگ کی تیاری کر کے بالآخر شکست کھائی۔ کاش! انگریزوں کو بھی کسی کے ہاتھوں شکست کھانی پڑے۔ ہندوستانی جرمنوں کی طرح جنگ کی تیاری نہیں کر سکتے۔ اس لیے انہیں چاہیے کہ ناک دھونی کا طرزِ عمل اختیار کریں۔ انگریز شہد کی مکھیوں کی مانند ہیں۔ ان پر کوئی چیز نہ پھینکو ورنہ یہ مکھیاں کاٹنے دوڑیں گی۔ اگر تمہارے چہرے پر بیٹھ جائیں تو انہیں ہٹا سکتے ہو اور دو ایک کو مار بھی سکتے ہو۔ لیکن یہ بڑی طاقتور ہوتی ہیں۔ انسان کا خون پی لیتی ہیں۔ سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ انہیں عدم تعاون اور ہڑتال کی دھونی دو۔ بس پھر یہ اپنا بوریہ بستر باندھ کر بمبئی سے روانہ ہو جائیں گے اور ہم کہیں گے۔ غرقنا آلِ فرعون

۲ ـــــ اگر ہندوستانی صرف کھدر کا کپڑا پہننا شروع کر دیں تو انگریزوں کا دیوالہ نکل جائے۔

۳ ـــــ نہایت افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں کے بچے اب تک

انجمن اسلامیہ کے سکول میں جاتے ہیں حالانکہ اس انجمن نے سرمایہ جنگ میں پچھتر ہزار روپیہ دیا تھا تاکہ اس روپے سے گولیاں خریدی جائیں جو کہ مسلمانوں ہی کے سینے چھلنی کریں۔

۴ ——— انگریزوں نے ہر ممکن طریق سے ہندوستانیوں کو تباہ کرنے کی کوشش کی۔ بہت سے فوج میں بھرتی کر لیے گئے تاکہ مارے جائیں بعض جلیانوالہ باغ میں ذبح کر دیے گئے۔ بعض مارشل لا میں قید کر دیے گئے اور پھانسی پر لٹکائے گئے، جو باقی رہ گئے ان کا مال و متاع جنگ کے لیے لوٹ لیا گیا اور انہیں افلاس کے گڑھے میں پھینک دیا۔

۵ ——— جب سے قانون امتناع مجالس باغیانہ نافذ ہوا ہے صرف مسجد ہی ایک مقامِ امن ہے۔ لہٰذا عوام کو چاہیے کہ مسجدوں کی مرمت کے لیے دل کھول کر چندہ دیں۔

یہ اقتباسات کافی ہوں گے۔ میرے روبرو ملزم نے بیان کیا ہے کہ اس نے محض قرآن کریم پڑھا ہے۔ ملزم نے کوئی جواب استغاثہ کو اس بنا پر پیش نہیں کیا کہ وہ عدم تعاون کا پابند ہے۔

فیصلہ کے لیے پہلا سوال یہ ہے کہ آیا ملزم نے یہ وعظ کہا تھا جو اس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ گواہانِ استغاثہ نے جو کچھ سنا اس کو مبالغہ کے ساتھ بیان کرنے میں ان کا کوئی مقصد نہیں اور جس طریق میں انہوں نے اپنے بیانات دیے ہیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ وہ دانستہ ایک ناگوار فرض انجام دے رہے ہیں۔ گواہ استغاثہ نمبر ۱ مولوی نور احمد نے جو ملزم کا ہم پیشہ مولوی بھی ہے، حتی الامکان ملزم کو مدد دینے کی کوشش کی اور اس واقعہ پر از خود زور دیا کہ سامعین کی جماعت دورانِ وعظ جوش سے بھری معلوم نہ ہوتی تھی لیکن

یہ امر خارج از بحث ہے کیونکہ جرم زیر غور یہ نہیں کہ تقریر کا اثر کیا ہوا بلکہ سوال یہ
ہے کہ الفاظ سے کس قسم کا جذبہ پیدا کرنا مقصود تھا۔ گواہ مذکور اس امر کو تسلیم کرتا ہے
کہ سامعین مولوی عطاء اللہ کا وعظ توجہ سے سن رہے تھے۔ ملزم نے قرآن کریم سے چند
آیات پڑھیں اور حاضرین مسجد کو اس کی تشریح اور تفسیر کرکے سنائی۔ گواہ نے یہ بھی تسلیم
کیا کہ وعظ کا مضمون فرعون اور موسیٰؑ سے متعلق تھا۔ نیز ملزم نے کہا تھا کہ مہاتما گاندھی
کا نام بھی موسیٰؑ کی طرح میم سے شروع ہوتا ہے۔ گواہ نے تسلیم کیا کہ ملزم نے حکومت کا
مقابلہ شہد کی مکھیوں سے کیا تھا۔ گواہ نے سودیشی دھوتی کے الفاظ بھی سنے ہیں اس
کے علاوہ گواہ مذکور نے ڈاکٹروں کی رشوت کے متعلق بھی کچھ سنا تھا۔ گواہ نے یہ خود
بیان کیا ہے کہ اس نے کوئی ایسی بات نہیں سنی جس سے بدنظمی پیدا ہونے کا احتمال
ہو۔ لیکن ساتھ ہی گواہ نے بیان کیا کہ وہ ملحق کمرے میں پچھلی طرف بیٹھا تھا اور وعظ
کے پہلے حصے میں موجود نہ تھا۔ سب سے آخر میں وہ کہتا ہے میں بیمار ہوں اور میری
طاقت سماعت کمزور ہے۔ اس کا بیان دوران تحقیقات اول درجہ کے مجسٹریٹ نے قلم بند
کیا تھا۔ وہ کہتا ہے میں انگریزوں کا لفظ زبان پر نہیں لایا ہوں۔ جیسے کہ بیان مذکور
میں درج ہے وہ بیان صحیح ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس بیان میں گواہ نے کہا کہ
ملزم نے فرعون کے ہمراہیوں کی غرقابی کا تذکرہ کیا۔ مگر چونکہ گواہ مولوی ہے یہ قدرتی
بات ہے کہ اسے اس قسم کی شہادت خلاف مرضی دینی پڑی ہو اور ممکن ہے اسے
ڈرایا دھمکایا بھی گیا ہو۔ چونکہ وہ وعظ میں موجود تھا، استغاثہ نے مناسب نہیں سمجھا کہ
اسے شہادت میں پیش نہ کرے۔ شہادت دیتے ہوئے اسے جو دماغی کوفت
ہوئی وہ بھی اس طرز عمل اور اس بات سے بخوبی ظاہر تھی کہ اس نے کئی مرتبہ برفاب
کے جرعے پیئے اور گواہوں کے کٹہرے میں ایک خادم بھی ساتھ رکھا۔ یہ حالت نیز
گواہ کا یہ عذر کہ میری سماعت میں فرق ہے۔ میں بیمار ہوں اور مسجد میں دیر سے

پہنچا تھا ۔۔۔ کچھ معنی خیز ہیں۔

میں بلا تامّل اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ملزم نے اسی طرح وعظ کیا جس طرح سے نقشہ جات ای/بی/ اورسی میں درج ہے اور گواہانِ استغاثہ نمبر ۲ سے دس تک نے بیان کیا۔ پس یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے۔

دوسرا تصفیہ طلب امر یہ ہے کہ ملزم نے جو کلمات کہے وہ باغیانہ ہیں یا نہیں۔ ان سے نفرت و حقارت کے جذبات پھیلتے ہیں یا نہیں؟ ان سے اُس حکومت کے خلاف جو بروئے آئین برطانیہ، ہند میں قائم ہو چکی ہے بددلی پھیلتی ہے یا نہیں؟ وہ جذبات نفرت وحقارت جو برانگیختہ کیے گئے بغیر حکومت پر معقول نکتہ چینی کی حد میں آسکتے ہیں یا نہیں؟ فرعون کے ہاتھوں بچوں کے اتلاف کا جو مقابلہ حکومت کے مروجہ طرزِ تعلیم کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس سے بظاہر حکومت کی حقارت مقصود ہے۔ پھر اس کا یہ کہنا کہ انجمن نے سرمایہ جنگ میں جو چندہ دیا تھا اس سے گولی یا بارود خرید کر ہمارے بھائیوں کو ہلاک کیا گیا اور مقاماتِ مقدسہ کی بے حُرمتی کی گئی۔ اس غلط بیانی اور دروغ بیانی کی مثال ہے جو اس شخص نے مذہب کی آڑ میں منبر سے تلقین کی تاکہ حکومت کے خلاف نفرت اور بددلی پھیلائی جائے۔ اس طرح وہ اپنے مُسلمان سامعین سے استدعا کرتا ہے جن کے نزدیک عورت کی عزّت اور حُرمت سب چیزوں سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ اس غلط بیانی سے کام لیتا ہے کہ ہندوستانی عورتوں کے اخلاق بگڑتے جا رہے ہیں تاکہ ان کی اولاد حلقہ بگوشِ عیسائیت ہو۔

نیز وہ کہتا ہے کہ مُسلمان عورتیں شہوت رانی کے لیے سپاہیوں کو مہیا کی جاتی ہیں۔ سامعین میں زیادہ تر جاہل لوگ تو اس کا یہی مطلب سمجھیں گے کہ حکومت نے نہایت ہی مذموم کارروائی کی ہے اور چونکہ ملزم یہ باتیں وعظ میں

کہہ رہا تھا، اس لیے وہ یہ عذر بھی پیش نہیں کر سکتا کہ مبالغہ قابلِ عفو اور دروغ بیانی جائز ہوتی ہے۔

پولیس کے متعلق بھی اس کے الفاظ عیاں طور پر ایسے ہیں جس سے پولیس کے دلوں میں حکومت کی طرف سے بددلی پھیل سکتی ہے اور اس کا اثر خود غلام محی الدین ہیڈ کانسٹیبل نے محسوس کیا ہے پھر اس نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ حکومت ہر ممکن ذرائع سے ہندوستانیوں کا استیصال چاہتی ہے یعنی ان کے مروانے کے لیے فوج میں بھرتی کرتی ہے۔ جلیانوالہ باغ میں کشت و خون گرم کرتی ہے، مارشل لاء کے تحت قید کرتی ہے، پھانسیاں دیتی ہے اور روپے پیسے سے محروم کرتی ہے۔

یہ باتیں بھی صریحاً غلط بیان کی گئی ہیں جن سے حکومت کے خلاف نفرت اور بددلی پیدا کرنا اور سامعین کو عمل کے لیے ابھارنا مقصود ہے۔

مسٹر گاندھی اور موسیٰؑ کے تقابل سے متعلق اس شرمناک اشارے کی بابت کچھ لکھنا غیر ضروری ہے جس سے اس نے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسٹر گاندھی کس طرح حکومت کو دق اور پریشان کر رہا ہے۔ یاد رکھنے کے قابل بات یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ موسیٰؑ کا ایک مصری کو مار ڈالنا اور سرخ رنگ کا حوالہ دینا صاف طور پر خونریزی اور اشتعال انگیزی کی طرف اشارہ ہے اور اس کے وعظ کے دوسرے مضمون کی طرح یہ باتیں بھی اس ملک کی موجودہ حکومت کے خلاف کہی گئی ہیں۔ اس کی یہ آرزو کہ انگریزوں کو جرمنوں کی طرح شکست ہو اور "اغرقنا آلِ فرعون" کی بددعا جو بقول ملزم کے اس وقت زبان پر لائی جائے جس وقت انگریز ساحلِ ہند سے روانہ ہوں گے، حقارت اور بددلی کی حقیقی مثالیں ہیں جو اس نے سامعین کے دلوں میں پیدا کیں۔

ملزم کا اپنے برادرانِ دین کو یہ ملامت کرنا کہ جب حج کے لیے کہا جاتا ہے تو غربت کا عذر پیش کرتے ہو حالانکہ ملزم نے خود حج نہیں کیا۔

اپنے بھائیوں کے ساتھ خلوص کی ایک اور مثال وہی ہے۔ اس کا مسجد کے لیے چندے کی درخواست کرنا جس میں وہ خود وعظ کر رہا تھا۔ اور یہ کہنا کہ قانونِ مجالس باغیانہ کی وجہ سے مسجد ہی ایک پناہ کی جگہ رہ گئی ہے ظاہر کرتا ہے کہ وہ قرآن شریف کی تعلیمات کو سیاسی اغراض کے لیے برت رہا ہے اور یہی نیت اس کی اس کے وعظ سے مترشح ہوتی ہے۔ تخیل کو خواہ کتنی ہی وسعت کیوں نہ دیں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ملزم کا وعظ محض سوراج کے حصول کی خواہش پر مبنی تھا اور نہ ملزم نے خود اس کی طرف اشارہ کیا۔

چنانچہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ملزم نے جو تقریر کی ہے اس سے ایک ایسی حکومت کے خلاف جو برطانوی ہند میں بروئے قانون قائم ہو چکی ہے نفرت و حقارت اور بددلی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ وعظ مذکور حکومت یا کسی سرکاری افسر کے خاص فعل یا کاروائی کے خلاف نہ تھا بلکہ اس کے ذریعے سے کوشش کی گئی تھی کہ لوگوں کے دلوں میں اس نظامِ ترکیبی کے خلاف نفرت پیدا کی جائے جس کے تحت وہ رہتے ہیں اور اسے بدل دیا جائے۔

موجودہ نازک ساعت میں مذہب کے نام سے ایک غیر تعلیم یافتہ اور اشتعال انگیز مجمع کے سامنے کوئی تقریر کرنا ایسا ہے کہ اس سے بحیثیت مجموعی دلوں میں ایسی تلخی پیدا ہو سکتی ہے اور ایسے جذبات برانگیخت ہو سکتے ہیں کہ لوگ فوراً عملی کاروائی شروع کر دیں۔

سامعین میں سے اگر کوئی شخص ملزم کا وعظ سننے کے بعد باہر آتا اور پہلا انگریز جو اسے ملتا اس پر وہ سرِ بازار حملہ کر دیتا تو یہ امر چنداں باعثِ تعجب نہ تھا

میں بالآخر ملزم کو زیر دفعہ ۱۲۴ الف تعزیرات ہند مجرم قرار دیتا ہوں۔ جون ۱۹۲۰ء میں انہیں تنبیہ ہو چکی ہے۔ اس لیے وہ اس قسم کی تقریر کرنے کے نتائج و عواقب اور سزا سے بخوبی آگاہ تھا۔ قانون کی رو سے زیادہ سے زیادہ سزا حبس دوام عبور دریائے شور ہو سکتی ہے لیکن میں ملزم کو تین سال قید بامشقت کی سزا دیتا ہوں جس میں تین ماہ کی قید تنہائی ہوگی۔

دستخط ———— ایف۔ اے۔ کانر

۸۔ اپریل ۱۹۲۱ء — ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ

عدالت کا فیصلہ سننے کے بعد شاہ جی نے مجسٹریٹ کی طرف دیکھتے ہوئے فی البدیہہ کہا ؎

دار کے حق دار کو قید سہ سالہ ملے
ہائے مشکل آساں ہوتے ہوتے رہ گئی

کمرہ عدالت سے باہر نکلے تو ہجوم میں سے اکثر احباب کے رونے کی آواز آئی۔ شاہ جی نے غصے میں آکر کہا۔

"کون بزدل رو رہا ہے؟ تعلق بخاری سے اور رونا عورتوں کی طرح۔ چلے کہیں کے۔"

اس کے بعد السلام علیکم کہا اور پولیس کی لاری میں سوار ہو گئے۔

امرتسر جیل سے روانگی

۱۱ اپریل کو حسب دستور ڈسٹرکٹ جیل امرتسر سے شاہ جی کو لاہور سنٹرل جیل میں تبدیلی کا حکم ملا۔ یہ کام پولیس اور دوسرے حکام نے بڑی رازداری سے کرنا چاہا لیکن نہ جانے اہل شہر کو کس طرح پتہ چل گیا کہ سینکڑوں کی تعداد میں لوگ ریلوے سٹیشن پر شاہ جی کی آمد سے پہلے پہنچ گئے۔

گاڑی چلنے میں کچھ منٹ باقی تھے کہ پولیس کی بھاری معیت میں شاہ جی کو اسٹیشن پر

لایا گیا۔ پاؤں میں لوہے کی بیڑیاں، ہاتھوں میں ہتھکڑی۔ اس حالت میں یہ مردِ درویش جب اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوا تو پتھر بھی آبدیدہ ہو گئے۔ برطانوی سامراج کا مجرم، وطن کا سپاہی، قرآن کا مبلغ، آزادیٔ وطن کے جرم میں آہنی زنجیروں میں جکڑا ہوا پرزنر ویگن PRISONER WAGON) کی طرف یہ کہتے ہوئے بڑھا۔ ؎

عشق اپنے مجرموں کو پا بجولاں لے چلا

آخر سینکڑوں انسانوں نے آنسوؤں کے ہار، دل کی دعائیں اور حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْل کہہ کر تین سال کے لیے اپنے سے جدا کیا۔

گاڑی نے منزل کی طرف سفر شروع کیا تو شاہ جی نے کھڑکی سے باہر منہ نکال کر کہا ؎

در و دیوار پہ حسرت کی نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں



بابِ دوم ــــ ۱۹۲۱ تا ۱۹۳۰ء

فرنگی عہدِ اقتدار کی داستان حقیقت کے اس قدر قریب ہے کہ واقعات کسی بھی زمانے کے مؤرخ کے لیے الجھاؤ پیدا نہیں کرتے۔ آئینہ ہر تصویر کو وقت کے چوکھٹے میں محفوظ کیے ہوئے ہے۔ ماضی کی راہوں سے گزرنے والا ہر مسافر اپنے پاؤں کی ٹھوکر میں نہ جانے کس قدر نشانِ پا لیے ہوئے ہے کہ جس پر زمانے کی بے اعتنائیوں کا گلہ ثبت ہے، زمانہ اپنے قلم سے جن کہانیوں کو رقم کر رہا ہے غروبِ آفتاب کی ہر شام انہیں شفق سے ڈھانپتی چلی جا رہی ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ ہر کہانی کو اپنے عنوان کے لیے کسی عطاء اللہ کے خون کی ضرورت ہو گی لیکن مستقبل کا دامن تہی ہو گا۔

ماضی نے جس عطاء اللہ کو جنم دیا تھا۔ اپنے اور پرائے سامراج نے اسے اس طرح روند ڈالا کہ شاید نصف صدی کے بعد دلوں سے اس کی یاد محو ہو جائے۔ لیکن رات کے بعد دن طلوع ہوتا ہے یا جس طرح خزاں کے بعد بہار جنم لیتی ہے۔ بھولے ہوئے دلوں کو اسی طرح عطاء اللہ کے کارنامے آزادیٔ وطن کے لیے ان کی مساعیٔ جمیلہ تبلیغِ دین میں ان کے مصائب کو اجاگر کرنا پڑے گا۔ ورنہ زمانے کو اپنی تہی دامنی پر تا حشر گلہ رہے گا۔

لاہور سنٹرل جیل قومیں اپنے راہنماؤں کی یادگاریں قائم کرتی ہیں زمانہ جن پر گرد و غبار ڈال دیتا ہے۔ وہ انہیں تلاش کرنے میں کھو جاتی ہیں۔ لیکن عہدِ رواں کے تن آسان ہاتھوں نے بنے بنائے نشان مٹا دیے۔ لاہور سنٹرل جیل بھی ایک ایسا ہی نشان تھا اس جیل کی ایک ایک اینٹ پر غلامی کے خلاف لڑنے والوں کے نام ثبت تھے۔ اس جیل

کی ہر کوٹھڑی اسیرانِ فرنگ سے واقف تھی۔ اس جیل کے پھانسی کے تختے شہیدانِ وطن کے خون سے ہر صبح ناشتہ کرتے رہے ہیں۔ ان چشم دید گواہوں کو مٹانے میں وقت کے عاجلانہ فیصلے نے بڑی جانبداری سے کام لیا۔ کاش وہ حالات کا انتظار کرتا۔

شاہ جی کو اس جیل کی گورا وارڈ میں رکھا گیا۔ یہ وارڈ سیاسی قیدیوں کے لیے مخصوص تھی۔ اس دور میں سیاسی قیدیوں کے لیے کوئی امتیازی کلاس متعین نہیں تھی تاہم دو قسم کے قیدیوں کو امتیاز حاصل تھا۔ اول جو انکم ٹیکس گذار تھے۔ دوسرے سٹوڈنٹس۔ لیکن شاہ جی پہلے سیاسی قیدی تھے جنہیں شہرت کی بنا پر یہ کلاس دی گئی۔

معافی کی درخواست شاہ جی کو لاہور سنٹرل جیل میں آئے ہوئے دو ہفتے ہوئے تھے کہ اچانک ایک دن انہیں جیل کے دفتر میں بلوا کر ان کے سامنے انگریزی میں لکھی ہوئی ایک درخواست پیش کی جس میں درج تھا کہ

"اگر اس دفعہ حکومت مجھے معاف کر دے تو میں یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ میری کوئی حرکت ایسی نہیں ہو گی جس سے حکومت کو کسی قسم کی شکایت پیدا ہو"

اس درخواست کے نیچے کسی کا نام درج نہیں تھا اور نہ تحقیق پر کسی کا نام مل سکا۔ شاہ جی نے اس درخواست کا ترجمہ سن کر اسے سپرنٹنڈنٹ کے ہاتھ سے لے لیا اور ہزار ٹکڑے کر کے اپنے پاؤں تلے روندا اور تین دفعہ اس پر تھوکا، پھر غصے کی حالت میں واپس چلے گئے۔ اس واقعہ کے تھوڑے دنوں بعد شاہ جی کو میانوالی ڈسٹرکٹ جیل میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس دور میں اور آج بھی میانوالی جیل عادی مجرموں کے لیے مخصوص ہے۔ یہاں کی آب و ہوا اور موسم گرما کی تپش کی بنا پر یہ جیل پنجاب کا "کالا پانی" کہلاتی ہے۔ ترکِ موالات اور تحریک خلافت کے قیدیوں کے لیے یہی جیل مناسب سمجھی گئی۔ چنانچہ ہندوستان بھر کے سیاسی رہنماؤں کو آہستہ آہستہ اسی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ جن میں یہ نام قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔ مولانا محمد داؤد غزنوی۔ ۲۔ مولانا احمد سعید دہلوی۔ ۳۔ مولانا ثناء اللہ پانی پتی۔

۴۔ صوفی محمد اقبال۔ ۵۔ اختر علی خاں (زمیندار لاہور) ۶۔ عبدالمجید سالک (ایڈیٹر روزنامہ انقلاب لاہور) ۷۔ مولانا عبداللہ چوڑی والے (دہلوی)۔ ۸۔ مولانا سید حبیب (ایڈیٹر روزنامہ سیاست لاہور) ۹۔ پنڈت نیکی رام شرما۔ ۱۰۔ ڈاکٹر ستیہ پال۔ ۱۱۔ لالہ تریلوک چند محروم۔ ۱۲۔ دیش بندھو داس گپتا (ایڈیٹر روزنامہ تیج دہلی) ۱۳۔ بابا گوردت سنگھ۔ ۱۴۔ سردار منگل سنگھ[۱۵] سردار سردول سنگھ کولیشر (لاہور) ۱۶۔ بابا کھڑک سنگھ (سیالکوٹ) ۱۷۔ سوامی شردھانند (دہلی) ۱۸۔ منشی احمد دین (امرتسر) ۱۹۔ خواجہ عبدالرحیم عاجز (امرتسر) ۲۰۔ راجہ غلام قادر (وزیر آباد)

یہ وہ لوگ ہیں جن میں چند ایسے ہیں جو آگے چل کر صحافت اور ملکی سیاسیات میں غیر ملکی حکمرانوں کے باغی اور متحدہ ہندوستان کے رہنما بنے۔

جیل خانے کے شب و روز باہر کی دنیا سے مختلف ہوتے ہیں۔ گھر بار اور اولاد سے لاتعلق ہو کر قیدی یہاں رہ کر اپنی دنیا آپ آباد کرتا ہے۔ خیالات میں بچپنا اور جذبات میں جوانی لوٹ آتی ہے۔ اونچی دیواروں کے سائے میں رہنے والے سیاسی قیدی بہار و خزاں کے موسم اپنے ماحول میں آپ ڈھالتے ہیں۔ بلاشبہ میانوالی جیل کا ہر سیاسی قیدی اپنے اندر جوہر قابل کا خزانہ لیے بیٹھا تھا۔ لیکن آزادئ وطن کی پاداش میں برطانوی سامراج کا باغی قرار دیئے جانے پر اس کا جسم قید تھا۔ تاہم روح کی افتادگی اسی طرح آزاد تھی۔ اس کی سوچ اور فکر میں کوئی دیوار یا لوہے کا کوئی دروازہ حائل نہیں تھا۔

اسیران فرنگ جنہیں رائج الوقت قانون نے اپنا دشمن قرار دے کر تین تین برس، دو دو برس، اور ایک ایک برس کے لیے یہاں ڈال دیا تھا قفس کی تیلیوں میں بیٹھ کر شاخ گل کی بہاروں کے گیت الاپنے شروع کیے۔ چنانچہ مشاعرے، قوالیاں، جلسے اور علمی بحثوں کا آغاز ہوا۔ اگر ان لوگوں کے وجود سے جیل کے باہر فرنگی حکمران پریشان تھے تو جیل کے اندر حکام جیل اور دوسرے قیدی عاجز آ چکے تھے۔ آخر میانوالی ڈسٹرکٹ جیل کے سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر رام جی داس اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ چوہدری فرید احمد کو اپنی سخت گیر پالیسی کو تبدیل کرنا پڑا

---

[۱۵] مولانا ظفر علی خاں کے چچا تھے۔

ورنہ باغیوں کا یہ گروہ اپنے ساتھ دوسرے قیدیوں کو بھی خراب کر دیتا۔
شاہ جی ان ہنگامہ آرائیوں کے باوجود جیل میں بھی اپنے تبلیغی مشن سے غافل نہیں رہے۔ راجہ غلام قادر، اختر علی خاں، منشی احمد دین، خواجہ عبدالرحیم عاجز نے قرآن کریم انہی دنوں شاہ جی سے پڑھا۔

آزاد ہائی سکول کا خاتمہ

شاہ جی کی گرفتاری نے ایک طرف گجرات کی سیاسی زندگی کا رخ تبدیل کیا تو دوسری طرف آزاد ہائی سکول کی عمارت بھی اپنا تمام وقار ضائع کر بیٹھی۔ حکومت نے فوراً سکول کا نام اسلامیہ ہائی سکول رکھ کر اسے پنجاب یونیورسٹی کے تحت کر دیا۔ یہ سکول آج بھی اسی نام سے چل رہا ہے لیکن اب اس کا جامعہ ملیہ یا شاہ جی سے کوئی تعلق نہیں۔

تحریک ترکِ موالات کا خاتمہ

ترکِ موالات اور خلافت کی مشترک تحریکات نے ہندوستان بھر کو پرامید کر دیا تھا کہ اب غیر ملکی حکمران یہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔ ہندوستان سے باہر بھی یہی چرچا تھا۔ حالات کی بو سونگھنے والے سیاست دان اور خود انگریز بھی اپنے قدموں کے نشان گن رہے تھے۔ پرنس آف ویلز نے اپنا دورہ ہندوستان ملتوی کر دیا تھا کہ صوبہ یوپی کے ضلع گورکھ پور کے دیہاتی عوام نے اپنے گاؤں "چورا چوری" کے پولیس تھانہ پر حملہ کر کے اسے آگ لگا دی۔ جس میں پولیس کے سپاہی اور افسر جل کر راکھ ہو گئے۔ اس واقعہ نے گاندھی جی کو اس قدر متاثر کیا کہ انہوں نے ۵ فروری ۱۹۲۲ کو تحریک ترک موالات بلا کسی مشورہ کے بند کر دی۔ تحریک کا بند ہونا تھا کہ سارا ہندوستان گاندھی جی کے خلاف ہو گیا۔
۵ نومبر ۱۹۲۱ء کو جو آگ لگی تھی۔ ۵ فروری ۱۹۲۲ء کو جب یہ بجھائی گئی تو مغربی طاقتیں اپنی کامیابی پر مسکرائیں۔ ان کے بجھتے ہوئے چراغوں میں پھر سے روشنی آ گئی۔ وقت نے بخت کو مبارکباد دی۔ یونین فلیگ کی اڑانیں نیشنل فلیگ پر غالب آ گئیں۔

جیل خانوں میں سیاسی قیدیوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ مقصد کی ناکامی نے شاخِ ثمر کی بہاروں کو آگ لگا دی۔ قفس کی تیلیاں پاؤں کی بوجھل بیڑیاں بن گئیں۔ لیکن عزم نے ہمت نہ ہاری۔ ناکامیوں نے ارادوں کے آنسو پونچھے تو آنکھیں چمک اٹھیں۔ دل اور زبان نے ہم آہنگ ہو کر کہا "ہم پھر لڑنے کا عہد کرتے ہیں"۔ اسی طرح ایک سال چار ماہ کی جدوجہدِ آزادی ایک موڑ پر آ کر رک گئی۔

تحریکِ خلافت کا حشر

قوموں کی زندگی کا انحصار ہمیشہ ان کی اپنی ہمت پر رہا ہے۔ جو قومیں اس دور میں بچھڑ جاتی ہیں زمانہ ان کے ساتھ انصاف نہیں کرتا۔ "ترک" اقوامِ یورپ سے اگر اپنی زندگی کی بھیک مانگتے تو شاید اس مردِ بیمار کو بھیک سے بھی محروم رکھا جاتا لیکن تلوار کی نوک سے حاصل کیا ہوا "ترکی" آج بھی زندہ ہے، اور زندہ رہے گا۔

پہلی جنگ جیت کر اتحادی قوموں نے اپنی نوآبادیات سے جو سلوک کیا اور پھر ترکیہ کو مردِ بیمار سمجھ کر قسطنطنیہ کے بازاروں میں خلیفۃ المسلمین کے حرم کو رسوا کیا۔ اگر اس وقت مصطفےٰ کمال کی تلوار بے نیام ہو کر درۂ دانیال پر سامنے نہ آتی تو شاید یورپ کا یہ مردِ بیمار مدت سے دم توڑ چکا ہوتا۔ غازی عصمت انونو نے برطانوی وزیرِ اعظم لائیڈ جارج کو ٹھیک کہا تھا کہ "جو فیصلے تلوار کی نوک سے نہیں لکھے جاتے ان کی کوئی قیمت نہیں ہوتی"۔

ترک اپنی تاریخِ آزادی خون سے مرتب کر رہے تھے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے خون نے جوش مارا۔ مسلمان مسلمان کی امداد کے لیے نکل آیا۔ ہندوستان کا مسلمان غلامی کی حالت میں جو کر سکتا تھا اس نے کیا۔ آخر ۲۱۔ نومبر ۱۹۲۲ء کو جزیرہ لوزان میں برطانیہ اور ترکیہ کے درمیان صلح ہوئی جس میں برطانیہ نے ترکوں کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔ اس کے ساتھ ہی تحریکِ خلافت نے ہندوستان میں دم توڑ دیا۔

تحریکِ شُدھی

افراد، قومیں اور سلطنتیں ایک دوسرے کو کبھی معاف نہیں کرتے۔ انتقام کی آگ پہلے دلوں میں سلگتی ہے، پھر انسانوں کو جلاتی اور عمارتوں کو خاک کا ڈھیر بناتی ہے۔ ہندوستان کی سیاسی تحریکات دم توڑ چکی تھیں۔ افغانستان سے انگریز مطمئن ہو چکا تھا، روس کی اندرونی خلفشار بھی انگریز سیاستدانوں کے لیے مفید تھی۔ ترکوں سے معاہدہ لوزان کے بعد کوئی مزید جھگڑا نہیں تھا۔ ہندوستان کے رہنماؤں میں انگریز سامراج کا مخالف عنصر ہنوز جیل خانوں میں تھا۔ انگریز دانشوروں کا ذہن وقتی طور پر فارغ ہوا اور انہیں ہندوستان سے انتقام کی سوجھی۔ ماضی قریب میں جس ہندوستان نے ایوان برطانیہ میں آگ لگا دی تھی، غلامی سے نجات کے لیے جن قوموں نے متحد ہو کر آزادی کی لڑائی لڑی تھی، دشمن اب ان دوستوں کی لڑائی کا تماشہ دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۲ء کے وسط میں میانوالی جیل سے سوامی شردھانند کو ان کی میعادِ اسیری سے پیشتر رہا کر کے دہلی وائسرائے لاج میں لایا گیا۔ سوامی شردھانند کا اصل نام منشی رام تھا۔ ایک مدت یہ پنجاب پولیس میں بطور تھانیدار ملازم رہ چکے تھے۔ دوسری طرف پنڈت مدن موہن مالوی کو یہ خوف تھا کہ سرحد کا پٹھان ہندوستان پر حملہ کر دے گا۔ اس نے سوامی شردھانند سے مل کر ایک ایسی فرقہ وارانہ تحریک کو ہوا دی جس نے آگے چل کر خوفناک صورتِ حال پیدا کر دی۔

پہلا ہندو مسلم فساد

یوں تو سارے ہندوستان کی فضا مکدر ہو چکی تھی۔ نگاہوں میں میل اور دلوں میں کدورت بیٹھ گئی۔ لیکن ستمبر ۱۹۲۲ء کو ملتان میں محرم کے موقعے پر ہندو مسلم فساد نے سارے پنجاب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ فساد جس مقام پر ہوا اس کے ایک طرف مسجد، دوسری طرف مندر اور درمیان پولیس تھانہ ہے۔ تعزیہ حرم گیٹ سے شہر میں داخل ہو کر چوک بازار مسجد کے سامنے رکھا گیا۔ اچانک اس پر ایک اینٹ لگی۔ چونکہ تحریک شدھی کے باعث شہر کی فضا پیشتر ہی مسموم تھی، لہٰذا بغیر تحقیق کے کہ اینٹ مندر سے آئی ہے یا تھانہ کی طرف سے ماتم گو ساروں نے تعزیہ کی بے حرمتی کے سلسلہ میں ہنگامہ کر دیا۔ تیاری دوسری طرف سے بھی مکمل تھی۔ مقامی ڈپٹی کمشنر مسٹر ایمرسن[1] خود تھانہ میں موجود تھا۔ یہ اینٹ خود اس نے

---

[1] یہی مسٹر ایمرسن ۱۹۲۵ء میں پنجاب کا گورنر ہوا اور مسجد شہید گنج گرانے میں اس کا پورا ہاتھ تھا۔

پھینکی تھی (غیر سرکاری تحقیقات میں اس کی تصدیق ہو گئی تھی)

غلامی میں صرف آزادی ہی سلب نہیں ہوتی بلکہ عقل انسانی بھی اپنی صلاحیتوں سے محروم ہو جاتی ہے اور مذہب کی پاکیزگی غلامی کے گناہوں سے آلودہ ہو کر اپنا دامن داغدار کر لیتی ہے۔ غلام ہندوستان اپنا وقار تو کھو چکا تھا، لیکن فرقہ وارانہ فضا میں کھو کر عقل و دانش سے بھی دور چلا گیا۔ آخر حکمران قوم کا جادو سر پر چڑھ کر رہا۔ نسیم سحر گاہی کا ہر جھونکا بادِ سموم بن گیا۔ چمن کا ایک ایک پتا صیاد کا معاون بن کر لالہ و گل کی پتیاں بکھیرنے لگا۔

سوامی شردھانند جو کبھی دہلی جامعہ مسجد کے منبر پر ہندو مسلمان کو اتحاد کی دعوت دیتے تھے، آج غلامی کی رسیاں مضبوط کر رہے تھے۔

جیل سے رہائی

چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا
وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

باغبان جب پودوں کی تخم ریزی اور پھر آبیاری کرتا ہے، تو ان کے جوان ہونے تک لیل و نہار کی محنت اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ روز و شب کی ستم ظریفیوں سے انہیں محفوظ رکھے۔ موسم کے نشیب و فراز بھی پھول آنے تک سدِ راہ ہوتے ہیں۔ باغبان کی تمنائیں موسم سے بھی دست و گریبان ہوتی ہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

۱۹۲۰ء میں ہندوستانی رہنماؤں نے جس بہار کی آرزو کے لیے لالہ و گل کو اپنا خون دیا تھا، نرگس کی رنگت سورج مکھی کو بانٹ دی تھی اور خزاں سے بہار چھین کر گل و گل چیں کے رشتے کی نیو اٹھائی تھی۔ جب قفس کی تیلیاں ٹوٹیں تو بہاران سے روٹھ چکی تھی۔ شبنم کے آنسو ہچکیاں لے رہے تھے۔ پھر بادِ نسیم نے موت کی مضراب سے آنے والوں کا استقبال کیا۔ اس بھیانک منظر نے غلامی کی عمر بڑھا دی۔ وقت نے غیر ملکی حکمرانوں کا ساتھ دیا اور حالات اس قدر ناگفتہ بہ

ہوئے کہ آس ٹوٹ گئی اور مقدر روٹھ گیا۔ ایسے حالات میں شاہ جی کٹوتی کے پانچ ماہ لے کر دو سال سات ماہ اسیر فرنگ رہ کر ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو میانوالی جیل سے رہا ہوئے۔ پنجابی کے مشہور شاعر محترم خواجہ عبدالرحیم عاجز بھی شاہ جی کے ساتھ میانوالی جیل سے رہا ہوئے۔ ان کی پنجابی نظم کا ایک مصرحہ اسی زمانے کی یاد ہے ؎

واہ عاجز قسمت دیا وَلیا - پکی کھیر تے ہوگیا دَلیا

پھڑدیاں پھڑدیاں چڑیاں نوں - توں ہتھوں باز گوا لیا

رہائی کے بعد شاہ جی امرتسر محلہ کوچہ عارف ڈار چوک فرید میں رہائش پذیر ہوئے۔ مالکِ مکان بابا رحیم خاں کو شاہ جی سے دلی عقیدت تھی۔ جتنی دیر شاہ جی اس مکان میں رہے مالک مکان خادموں کی طرح سلوک کرتا رہا۔

۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۴ء کے حالات میں نمایاں فرق آچکا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں جب شاہ جی جیل گئے تو ہندوستان کے عوام انگریزوں کے خلاف بغاوت کی آگ کو ہوا دے رہے تھے اور جب واپس آئے تو وہی عوام آپس کی آگ میں جل رہے تھے۔ ہندو مہا سبھا اور آریہ سماج کے اشتراک نے شدھی و سنگھٹن کی تحریک کو ایسی ہوا دی کہ سارے نقشے ہی مٹ گئے۔

شدھی کا عملی پہلو

ضلع آگرہ کے ملکانہ نامی گاؤں کے راجپوت مذہبًا مسلمان تھے لیکن رسم و رواج اور شکل و صورت میں ہندو نظر آتے تھے۔ ایسے مسلمان کو ہندو بنا لینا کوئی دشوار نہیں تھا۔ چنانچہ شدھی کے بانیوں نے اس گاؤں کو اپنا مرکز بنا لیا۔ مسلمان رہنما ان دنوں عجیب الجھاؤ میں تھے۔ وہ اپنی شہرت جو انہیں غیر مسلموں میں حاصل تھی ضائع کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ دوسری طرف شدھی کی تحریک کو انگریز کی سازش سمجھ رہے تھے۔ ان دوگونہ مشکلات میں پھنسے ہوئے مسلمان رہنماؤں کے دو حصے ہو گئے۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کی پارٹی گوشۂ تنہائی میں چلی گئی۔ پنجاب میں شاہ جی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، میر غلام بھیک نیرنگ اور مولانا ظفر علی خاں

الگ الگ شدھی کا مقابلہ کرتے رہے۔ موضع ملکانہ کے راجپوت بھی ان دنوں عجیب الجھن میں تھے۔ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کا آپس کا کردار انہیں مطمئن نہ کر سکا لیکن ہندوؤں کی دولت تقریباً بیس راجپوتوں کو ہندو بنانے میں کامیاب ہوگئی۔

۹۔ اور ۱۰۔ ستمبر ۱۹۲۴ء کی درمیانی رات کو کوہاٹ میں ہندو مسلم فساد ہو گیا یہ ملتان اور دوسرے شہروں میں فساد کی صدائے بازگشت تھی، جس نے سیاسی رہنماؤں کو پریشان کر دیا ؟۔ مہاتما گاندھی نے جو ان دنوں دہلی میں مولانا محمد علی جوہر کے ہاں مہمان تھے، اکیس دن کے مرن برت کا اعلان کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی مولانا محمد علی جوہر کے مشورے سے ۲۶۔ ستمبر ۱۹۲۴ء کو اتحاد کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا۔

بگڑے ہوئے تیور اور بدلی ہوئی نگاہوں نے دل و دماغ کے درمیان کانٹے ہی کانٹے بچھا دیئے تھے جس سے اتحاد کا دامن الجھتا ہی چلا گیا۔ گاندھی جی نے ۱۸۔ ستمبر کو اپنا برت شروع کیا۔ یہ برت ہندوؤں کے طرزِ عمل کے خلاف بطورِ احتجاج تھا۔

۲۶۔ ستمبر کو مجوزہ اتحاد کانفرنس میں دوسرے رہنماؤں کے ساتھ شاہ جی بھی شریک ہوئے۔ دو دن کی بحث کے باوجود تمام رہنما بغیر کسی فیصلہ پر پہنچے دہلی سے چلے گئے، مگر گاندھی جی نے اپنا برت ۱۸۔ اکتوبر تک جاری رکھا۔ شاہ جی ان حالات و واقعات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ بغیر کسی مشورے کے ملک کے موجودہ بگاڑ کی ساری ذمہ داری انگریز حکمرانوں کے سر ڈال کر وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر سامنے آکھڑے ہوئے اور اپنی شعلہ بیانی سے سارے ہندوستان کو اس پس منظر سے آگاہ کیا۔

شردھانند کی اچانک رہائی، پنڈت مالوی کا پٹھانوں کے خوف سے ہنگامہ، ملتان کا فساد یہ ایسی چیزیں تھیں کہ عوام انہیں سن کر اپنی حرکتوں پر شرمندہ ہوئے۔ برطانوی حکومت کو شاہ جی نے ایسا ننگا کیا کہ جب اس سے کوئی جواب بن نہ آیا تو جنوری ۱۹۲۵ء میں شاہ جی کو دفعہ ۱۰۸ کے تحت گرفتار کر لیا۔ یہ مقدمہ دہلی کی ایک تقریر پر چلایا گیا۔ اس میں مسٹر آصف علی

وکیل تھے۔ دورانِ مقدمہ شاہ جی نے ضمانت دینے سے انکار کر دیا اور مقدمہ میں بھی کوئی دلچسپی نہ لی۔ دو ماہ کی مسلسل کاروائی کے بعد مسٹر عبدالصمد کی عدالت سے شاہ جی کو چھ ماہ قید با مشقت یا پانچ سو روپے جرمانہ کی سزا ہوئی۔

جرمانہ کی یہ رقم اہلِ محلہ نے ادا کر دی اور شاہ جی رہا کر دیے گئے۔ رہائی کے بعد گھر آئے تو جرمانے کی ادائیگی پر سخت ناراض ہوئے۔ کئی دن محلہ کے کسی دوست سے علیک سلیک نہیں کی۔ آخر انہوں نے ایک جگہ جمع ہو کر شاہ جی سے معافی مانگی۔ شاہ جی کو گلہ تھا کہ آپ نے حلال کی کمائی فرنگی خزانے میں کیوں دی۔ ان دنوں شاہ جی کٹڑہ مہا سنگھ کوچہ رنگریزاں میں رہتے تھے۔

بہار کے دنوں میں پھولوں سے لگاؤ مشکل نہیں ہوتا لیکن خزاں کے موسم میں کانٹوں سے گزر کر منزل کو حاصل کرنا دشوار ہوتا ہے۔ شاہ جی جیل سے رہا ہوئے تو ہندوستان گیر شہرت نے ان کے قدم لیے۔ زمین کے ذرات آسمان کے ستاروں کی طرح ان کے پاؤں چومنے لگے۔ محبت میں نگاہوں کے آنسو پھولوں کی طرح نچھاور ہوئے۔ شاہ جی نے یہ گراں قدر دولت اپنے ہاتھوں ضائع کر دی۔ وقت کا تقاضا یہی تھا۔ امڈے ہوئے طوفانوں اور تیز رو آندھیوں کے درمیان شاہ جی تمناؤں کا چراغ لے کر نکلے تھے اور جب لوٹ کر آئے تو یہ چراغ ہنوز روشن تھا۔

شدھی و سنگھٹن کی تحریکات نے خلافت اور کانگریس کے تمام رہنماؤں کو وقت کی چادر میں لپیٹ کر گوشہ عافیت میں چھپا لیا۔ ہندو رہنما مسلمانوں میں اور مسلمان لیڈر ہندوؤں میں اپنی عزت، وقار کا جنازہ دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے، حالانکہ سبھی راز ہائے درونِ پردہ ان ہاتھوں کو جھانک رہے تھے جنھوں نے فرقہ وارانہ آگ روشن کی تھی۔ لیکن زبانیں گنگ اور ہاتھ سمٹ کر رہ گئے تھے۔ ایسے میں شاہ جی نے انگریز اور ہندو دونوں کے خلاف بڑے استقلال کے ساتھ اپنا کام جاری رکھا۔ ۱۹۲۲ء میں جیل سے رہا ہو کر ۱۹۲۵ء کے وسط تک تحریک شدھی و سنگھٹن کے خلاف شاہ جی نے جس جوشِ ایمانی سے اسلام اور مسلمانوں کی وکالت کی، یہ وقت کا عظیم

کارنامہ ہے۔

حالانکہ شدھی کوئی تحریک نہیں تھی لیکن غیر ملکی حکمرانوں کی ضرورت نے اسے ایسے سانچوں میں ڈھال دیا تھا کہ اگر یہ سانچے اس وقت توڑ نہ دیے جاتے تو ممکن ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے راستے میں کفر حائل ہو جاتا۔ ہندو مسلمان رہنما جو حال ہی میں جیلوں سے رہا ہو کر آئے۔ اس قسم کی تحریک سے وابستگی پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ مولانا محمد علی جوہر، مہاتما گاندھی، ڈاکٹر انصاری، پنڈت موتی لال نہرو ایسے لوگ دہلی میں بیٹھ کر ہندو مہاسبھا کی حرکات کے خلاف تجویزیں تو کرتے رہے لیکن بادِ سموم کے تھپیڑے ان کے دامن کو اس قدر اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ اپنی دھجیاں بکھیرنے کے لیے صحنِ چمن میں قدم رکھتے۔ لیکن شاہ جی نے اپنی شہرت کو شدھی کے مقابل تبلیغ اسلام کر کے ہندوؤں میں ضائع کر لیا۔ پنجاب کے مسلم اخبارات میں صرف "زمیندار" نے اس تحریک میں شاہ جی کی پوری معاونت کی۔

فرقہ وارانہ تحریکات نے ہندوستان کی متحدہ قومیت کا تصوّر نہ صرف دلوں سے بلکہ ذہنوں سے بھی زائل کر دیا۔ ہندو مسلم اتحاد کی چلتی ہوئی گاڑی ایسی جگہ آ کر رکی کہ غیر ملکی حکمرانوں کو گھی کے چراغ جلانے کا موقع ملا۔ اس کی تمام تر ذمہ داری ہندو قوم پر ڈالنا انصاف سے بغاوت کے مترادف ہو گا اور جن غیر مسلم رہنماؤں نے انگریز کو خوش کرنے اور غلامی کی عمر بڑھانے کی سعی کی انہیں ہندو قوم سے الگ کرنا بھی اپنے کو فریب دینا ہے۔ تاہم سوامی شردھانند، پنڈت مدن موہن مالوی اور پنجاب کے مہارشی لالہ لاجپت رائے نے ۱۹۲۴ء میں شدھی و سنگھٹن کی پرورش کر کے متحدہ قومیت سے غداری کی۔ اگر ایسی زہریلی تحریکات کے مقابل میں شاہ جی کی پر جوش تقریریں اور مولانا ظفر علیخاں کی ہنگامی تحریریں نہ ہوتیں تو من حیث القوم مسلمان سخت خسارے میں رہتے۔

تحریکِ قبہ

۱۹۲۵ء سے ایک ... بیشتر جب کہ ہندوستان کے مذہبی اور سیاسی رہنما انگریز اور ہندو کے پیدا کردہ طور و اطوار میں اُلجھے ہوئے تھے، برطانوی حکومت

۔نے ایک نیا کھیل شروع کیا۔

ہندوستان کے تمام مسلمان والئی حجاز سلطان عبدالعزیز ابن سعود کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، جنہوں نے مکہ اور مدینہ میں بزرگانِ دین کے مزارات سے عمارات (قبے) گرا کر انہیں زمین سے ہموار کر دیا تھا۔

شریفِ مکہ کے زوال کے بعد جب نجدیوں نے اس پاک سرزمین پر قدم جمائے تو ترکوں کی دی ہوئی مذہبی آزادی کے پیشِ نظر عوام نے بزرگوں کے مزارات کو دینی اور دنیوی ضرورتوں کا حاجت روا جان کر انہیں سجدوں کی آماجگاہ بنا لیا تھا لیکن نئے حکمران سلطان عبدالعزیز ابن سعود نے اپنے عقیدہ کی بنا پر ان تمام حرکات کو خلافِ دین اور بدعت سمجھ کر مزارات سے قبے گرانے کا حکم دے دیا۔ اس کی صدائے بازگشت جب ہندوستان کے ساحل سے ٹکرائی تو مسلمان آپے سے باہر ہو گیا۔

ہوا سازگار نہ ہو تو موسم کا چلن بھی درست نہیں رہتا۔ بادل اٹھتے ہیں تو پھاگن کے دنوں میں بھی ساون بھادوں کا سا گمان ہوتا ہے۔ رہنمایانِ ملک و ملت تین تین برس کی سزا کاٹ کر ابھی جیل خانوں سے رہا ہوئے ہی تھے کہ برطانوی سامراج نے ان کے لیے ایسی فضا پیدا کر دی کہ وہ دل و دماغ کے تصادم میں الجھ گئے۔ شدھی و سنگٹھن کے ہنگامے ہنوز جاری تھے کہ برطانوی سیاستدانوں نے مکہ اور مدینہ کی حرمت کا واسطہ دے کر مسلمانوں کو سلطان ابن سعود کے خلاف بغاوت پر ابھارا اور ہندو سرمایہ دار نے مسلمانوں کا رُخ بدلا ہوا دیکھ کر فائدہ اٹھایا لیکن دیوبند مدرسۂ فکر کے علماء نے آگے بڑھ کر سلطان عبدالعزیز کی حمایت کی۔ چنانچہ شاہ جی نے ان دنوں اپنا مؤقف واضح کرتے ہوئے کہا۔

"میں حنفی العقیدہ مسلمان ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ نفع و نقصان کی وارث صرف اللہ کی ذات ہے۔ حالات کا تغیر بھی اسی کے اختیار میں ہے۔ اولاد دینا، نہ دینا، دے کر چھین لینا اسی کو زیبا ہے۔

اگر مکہ اور مدینہ کے مقدس مزارات پر جا کر مسلمان سجدہ کرتا تھا۔ ان مزارات سے مرادیں مانگتا تھا یا انہیں حاجت روا خیال کرتا تھا تو میری رائے ہے کہ سلطان عبدالعزیز نے ان قبوں کو گرا کر ان میں آخری نیند سونے والوں کی روح کو آرام پہنچایا ہے۔ یہی وہ نیک لوگ تھے جنہوں نے لات و ہبل اور عزیٰ کی پوجا سے بنی نوع انسان کو منع کر کے صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر تکیہ کرنے کا درس دیا تھا۔ اگر آج انہی کے مزارات کی پرستش ہونے لگ جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کے مشن سے یا مقصد سے انحراف کر کے توحید باری تعالےٰ سے بغاوت کرنا ہے۔

شاہ جی نے اس طرزِ استدلال پر سارے ہندوستان میں تقریریں کیں۔ قرآن کریم، حدیث نبویؐ اور اپنی قوتِ بیان سے کروڑوں انسانوں کو اسی عقیدے کا درس دیا۔

پنجاب کے پیرانِ عظام نے بدیں وجہ شاہ جی پر "وہابی" ہونے کے علاوہ دوسرے مختلف اقسام کے فتوے لگائے۔ حضرت پیر جماعت علی شاہ کا فتویٰ اس سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ مولانا سید حبیب اور ان کا اخبار روزنامہ "سیاست" پیروں کے مؤید تھے۔ دوسری طرف مولانا ظفر علی خاں اور "زمیندار" شاہ جی کے ہمنوا تھے۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی جمعیت العلمائے ہند، چودھری افضل حق، مولانا عبداللہ قصوری، مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی نے بھی سلطان عبدالعزیز ابن سعود کی حمایت میں شاہ جی کا ساتھ دیا۔

ایک سوال اسی تحریک کے دوران لاہور میں ایک اجتماع ہوا۔ جس میں ایک سوال کیا گیا:۔

"آپ کے نزدیک اگر قبر پر قبہ بنانا بدعت ہے تو پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار مبارک پر گنبدِ خضرا سے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟"

جواب اس سوال پر سارے مجمع میں ایک ارتعاش پیدا ہوا۔ دوستوں کی پریشانی بڑھی۔

دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ مخالفین نے تالیوں سے اس سوال کا استقبال کیا۔ لیکن شاہ جی کو قدرت نے ذہن رسا عطا کیا تھا۔ سوال پر ذرا مسکرائے اور ارتجالاً فرمایا۔

"اگر ان معماروں نے جرأت کر لی ہے، جنہوں نے نبی کریمؐ کی آخری آرام گاہ سے بھی اونچے ہو کر اس پر قبہ تعمیر کیا ہے تو پھر میری رائے ہے کہ گنبدِ خضرا کے مقابلے میں کوئی گنبد تعمیر نہیں کرنا چاہیے۔ اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین ہوتی ہے۔"

شاہ جی کا یہ جواب سن کر مجمع نعروں سے گونج اٹھا۔

علی برادران کا روحانی تعلق مولانا عبدالباری فرنگی محل (لکھنؤ) سے تھا اور وہ تحریک قبہ میں سلطان ابن سعود سے اختلاف رکھتے تھے حالانکہ ان کی جماعت "خادم حرمین" سے عوام کو توقع تھی کہ وہ تحریک قبہ کی حمایت کریں گے لیکن ان کے ساتھ ہی علی برادران بھی اس تحریک سے تعاون نہ کر سکے تاہم شاہ جی سے متعلق انہوں نے اپنے اخبار "ہمدرد" میں مندرجہ ذیل رائے کا اظہار کیا۔

"بھائی! میں تمہاری تقریر سے بہت خوش ہوا مگر اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ جو رنج ہوا اس کا بھی ذکر کر دوں۔ تم نے سامعین کو بالکل مسحور کر دیا تھا اور اگر اس کے بعد تم ان سے کوئی غلط کام بھی کرانا چاہتے تو وہ تمہاری تقریر کے کیف سے اس قدر بے خود تھے کہ فوراً کر بیٹھتے۔ جو قدرت تم کو اپنی زبان پر ہے وہ خداداد ہے اور خدا کی ایک بڑی نعمت ہے مگر ایک بڑی خطرناک نعمت ہے۔

تمہاری مقبولیت بہت بڑھ گئی ہے، جب تک تم اسے حق کی راہ میں استعمال کرو گے فلاحِ دارین حاصل کرو گے لیکن اگر کبھی یہ باطل کی راہ میں استعمال کی گئی تو ہزاروں بندگانِ خدا کو گمراہ کرنے کے لیے کافی ہو گی۔

میرا منصب نصیحت کرنے کا نہیں مگر تم سے جو محبت مجھے اور مجھ سے تم کو ہے اس کی بنا پر اس قدر کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ لوگوں کو مسحور کرنا اچھا نہیں سحر کاری میں نہ ساحر کاروں کے لیے نہ مسحوروں کے لیے فلاح ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہر مسئلے کے دونوں پہلو سامعین کے سامنے پیش کر دو اور ان ہی سے اس مسئلہ کا حل اور فیصلہ کراؤ۔ اس طرح تم عوام کی قوتِ فیصلہ کو ترقی دے سکو گے ورنہ "کالانعام" مشہور ہیں۔ آج تم نے انہیں مسحور کر دیا تو کل اسی چرب زبانی اور ظرافت کے باعث ان پر کسی دوسرے کا جادو بھی چل سکے گا اور اس طرح حق و باطل کی تمیز تا قیامت نہ آئے گی۔ کبھی تمہارے ساتھ ہو گی اور کبھی تمہارے مخالفین کے۔ آج تمہیں تخت پر بٹھائیں گے کل تمہیں اتار کر کسی دوسرے کو سریر آرا بنا دیں گے"

شدھی اور سنگٹھن کے دوران اگرچہ قبوتوں کی تحریک بڑی خطرناک تھی، اس تحریک نے مسلمانوں کو آپس میں اُلجھا دیا تھا لیکن چند ماہ کی ہمت اور اتحادِ ذہنی نے برطانیہ اور اس کی ایجنٹ طاقتوں کو شکست دے دی۔

مرزائیت کے خلاف فتویٰ

غیر ملکی دورِ اقتدار کو اپنی زندگی کے لیے جن افراد یا جماعتوں کا سہارا لینا پڑا ان میں آریہ سماج اور قادیانی نمایاں نظر آتے ہیں۔ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۵ء کے دوران ہندو مسلم کشیدگی نے متحدہ قومیت کا جو جلیبہ لگا رکھا۔ یورپین سیاست گروں نے اس بساط پر کس کس طرح اور کون کون سے مہرے آگے بڑھائے گذشتہ اوراق ان واقعات کی گواہی دے رہے ہیں لیکن ہنوز اس مقدمے کا ایک اہم گواہ باقی ہے جس کے بغیر یہ روئداد نامکمل رہے گی اور شاہ جی کی جدوجہد میں ان کے اس کردار کی تعمیر بھی ادھوری سمجھی جائے گی۔

آریہ سماج جب شدھی کی تحریک میں سرگرم تھے اور مسلمان ان کا دفاع کر رہے

تھے انہی دنوں مرزائیوں نے بعض ایسی کتب شائع کیں جن میں آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند کی زندگی پر رکیک حملے کیے جس کے جواب میں آریہ سماج نے قادیانیوں کی بجائے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کو ہدفِ تنقید بنایا۔ آریہ سماج اور قادیانیوں کی ان مقابلے کی عبارتوں نے طرفین میں جلتی پر تیل چھڑکا اور حالات بد سے بدتر ہو گئے۔

آخر ہندوستان کے علما نے حکومت سے آریہ سماج کی کتب کی ضبطی کا مطالبہ کیا تو ساتھ ہی مرزائیوں کی کتب کا ازسرِنو مطالعہ کر کے حسب ذیل فتویٰ دیا۔

"مرزا غلام احمد قادیانی نے علی الاعلان دعویٰ نبوت کیا اور دیگر انبیائے کرام کی توہین کی ہے۔ نیز بعض کو گالیاں دیں اور بعض ایسے دعوے کیے کہ جن کی بنا پر وہ خود کافر ہو کر مرا اور اسی طرح اس کے ماننے والے بھی کافر اور مرتد ہیں۔ لہٰذا ان (مرزائیوں) سے ہر قسم کا قطع تعلق کیا جائے، خواہ وہ دنیوی ہو یا دینی۔"

امرتسر — رسالہ "الفیض" ایڈیٹر مولانا محمد داؤد

۱۹۲۵ء — پسر مولانا نور احمد

اس پر شاہ جی کے علاوہ اڑھائی سو سے زائد علماء نے دستخط کیے، جن میں علمائے فرنگی محل، علمائے دیوبند، علمائے بریلوی قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۲۰ء کے بعد یہ دوسرا موقع تھا کہ شاہ جی نے مرزائیت کے خلاف اپنے دلی احساسات کھلم کھلا اجاگر کر کے مرزائیوں کو بھی اپنے دشمنوں کی صف میں شامل کر لیا۔

پنجاب کے پیروں سے ٹکر

پنجاب کے بعض روحانی پیشواؤں کی گزشتہ تاریخ اس قدر میلی ہے کہ اس کے گندے چھینٹے مذہب کی پاک اور صاف چادر کو بھی داغدار کر گئے۔ بزرگانِ دین کے مزارات پر بیٹھ کر ان مہنتوں نے نہ صرف اسلام کی متعین راہوں کے درمیان گڑھے کھود دیے بلکہ دنیوی جاہ و حشمت کے لیے

اپنے درباروں کی رونق بھی کفر سے مستعار لی۔ اپنے طرۂ دستار کی جوانی ترکوں کے خون سے قائم رکھی۔ اس کے پیچ وخم میں عرب کے یتیم اور معصوم بچوں کی آہ و بکا زینت بنی۔ ان کی دعائیں اور تعویذ ہمیشہ کفر کے ساتھ رہے۔

مقاماتِ مقدسہ کی بربادی، جزیرۃ العرب پر برطانیہ کا بالواسطہ قبضہ اور خلافت اسلامیہ کی تباہی کے بعد ۱۹۱۸ء میں جب انگریز کو فتح ہوئی اور وہ بغداد کی گلیوں اور قسطنطنیہ کے بازاروں میں محو رقص تھا ان دنوں پنجاب کے پیرانِ غلام نے لاہور میں غیر سرکاری دربار کے موقع پر جس میں پنجاب کے گورنر مسٹر ایڈوائر[۱] اور لیڈی ایڈوائر کو مہمانِ خصوصی کے طور پر شمولیت کی دعوت دی گئی تھی حسب ذیل سپاسنامہ گورنر اور لیڈی گورنر کو پیش کیا گیا۔

سپاسنامہ | بحضور نواب ہز آنر سر مائیکل فرانسس ایڈوائر جی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ کے۔ سی۔ آئی۔ ایس گورنر بہادر پنجاب۔

حضور والا! ہم خادم المفتقرار سجادہ نشیناں وعلماء مع متعلقین شہر کائے حاضر الوقت مغربی حصہ پنجاب نہایت ادب وعجز وانکسار سے یہ ایڈریس لے کر خدمت عالیہ میں حاضر ہوئے ہیں اور ہمیں یقین کامل ہے کہ حضور انور جن کی ذاتِ عالی صفات میں قدرت نے دل جوئی، ذرہ نوازی اور انصاف پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہے ہم خاکسارانِ باوفا کے اظہار دل کو توجہ سے سماعت فرما کر ہمارے کلاہ فخر کو چار چاند لگادیں گے۔

سب سے پہلے ہم ایک دفعہ پھر حضور والا کو مبارک باد کہتے ہیں کہ جس عالمگیر اور خوفناک جنگ کا آغاز حضور کے عہد حکومت میں ہوا، اس نے حضور ہی کے زمانے میں بخیر وخوبی انجام پایا اور یہ بابرکت وباحشمت سلطنت جس پر پہلے بھی کبھی سورج غروب نہیں ہوا تھا اب آگے سے زیادہ روشن اور اعلیٰ عظمت کے

---

[۱] مسٹر ایڈوائر وہی ہیں جن کے حکم سے اپریل ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ میں گولی چلائی گئی تھی۔

ساتھ جنگ سے فارغ ہوئی۔ جیسا کہ شہنشاہ معظم نے اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمایا ہے، واقعی برطانوی تلوار اس وقت نیام میں داخل ہوئی جب دنیا کی آزادی امن و امان اور چھوٹی چھوٹی قوموں کی بہبودی مکمل طور پر حاصل ہو کر بالآخر سچائی کا بول بالا ہو گیا۔

حضور کا زمانہ ایک نہایت نازک زمانہ تھا اور پنجاب کی خوش قسمتی تھی کہ اس کی عنانِ حکومت اس زمانہ میں حضور جیسے صاحب استقلال، بیدار مغز عالی دماغ حاکم کے مضبوط ہاتھوں میں رہی جس نے نہ صرف، اندرونی امن ہی قائم رکھا، بلکہ حضور کی دانشمندانہ رہنمائی میں پنجاب نے اپنا ایثار، وفاداری اور جانثاری کا وہ ثبوت دیا جس سے شمشیر سلطنت کا قابل فخر و عزت لقب پایا۔ بھرتی کا معراج صلیب احمر کی اعجاز دست گیری، قیام امن کی تدبیر التعلیم کی ترقی سب حضور کی بدولت ہمیں حاصل ہوئیں۔ حضور ہی ہیں کہ جنہوں نے ہر موقع و ہر وقت پنجاب کی خدمات و حقوق پر زور دیا۔ صرف جناب والا کو ہی ہماری بہبودی مطلوب نہ تھی بلکہ صلیب احمر نسواں کے نیک کام میں حضور کی ہمدم و ہمراز جنابہ لیڈی ایڈوائر صاحبہ نے جن کو ہم مروت کی زندہ تصویر سمجھتے ہیں، ہمارا ہاتھ بٹایا اور ہندوستانی مستورات پر احسان کر کے ثواب دارین حاصل کیا۔ ہماری ادب سے التجا ہے، کہ ہمارا دلی شکریہ قبول فرمائیں۔

حضور انور! جس وقت ہم اپنی آزادیوں کی طرف خیال کرتے ہیں جو ہمیں سلطنت برطانیہ کی طفیل حاصل ہوئی ہیں، جب ہم ان دخانی جہازوں کو سطح سمندر پر اٹھکیلیاں کرتے دیکھتے ہیں، جن کی طفیل ہمیں اس مہیب جنگ میں امن و امان حاصل رہا، جب ہم تار برقی کے کرشموں پر علی گڑھ و اسلامیہ کالج لاہور، پشاور جیسے اسلامی کالجوں اور دیگر قومی درسگاہوں پر نظر ڈالتے ہیں اور پھر جب ہم

بے نظیر برطانوی انصاف کو دیکھتے ہیں، جس کی حکومت میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پی رہے ہیں تو پھر ہر طرف احسان ہی احسان دکھائی دے رہا ہے

بہشت آں جا کہ آزارے نہ باشد
کسے را با کسے کارے نہ باشد

باوجود فوجی قانون کے جو، خود فتنہ پردازوں کی شرارت کا نتیجہ تھا۔ مسلمانوں کے مذہبی احساس کا ہر طرح سے لحاظ رکھا گیا۔ شب برات کے موقع پر انہیں خاص رعائتیں دیں ۔ رمضان مبارک کے واسطے حالانکہ اہل اسلام کی درخواست یہ تھی کہ فوجی قانون ساڑھے گیارہ بجے شب سے دو بجے تک مسدود کیا جائے۔ لیکن حکام سرکار نے یہ وقت بارہ بجے سے دو بجے کر دیا۔ مسجد شاہی جو فی الاصل قلعہ سے متعلق تھی، جو ابتدائی عمل داری سرکار ہی میں واگذار ہوئی تھی، اہالیانِ لاہور نے اس مقدس جگہ کو ناجائز سیاسی امور کے واسطے استعمال کیا۔ جس پر متولیانِ مسجد نے جو خود مفسدہ پردازوں کو روک نہیں سکتے تھے، سرکار سے امداد چاہی۔ یہی وجہ تھی کہ سرکار نے ایسا ناجائز استعمال بند کر دیا۔ ہم تہ دل سے مشکور ہیں کہ حضور والا نے پھر اس کو واگذار کر دیا ہے۔

سرکار نے حج کے متعلق جو مہربانی کی ہے اس سے ہم ناآشنا نہیں اور مشکور ہیں۔ ہم سچ عرض کرتے ہیں کہ جو برکات ہمیں اس سلطنت کی بدولت حاصل ہوئیں اگر ہمیں عمر خضر بھی نصیب ہو تو بھی ہم ان احسانات کا شکریہ ادا نہیں کر سکتے۔ ہندوستان کے لیے سلطنت برطانیہ ابر رحمت کی طرح نازل ہوئی اور ہمارے ایک بزرگ نے جس نے پہلے زمانہ کی خانہ جنگیاں اور بدامنیاں اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں اس سلطنت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا [1]

ہوئیں بدنظمیاں سب دور انگریزی عمل آیا
بجا آیا، بہ استحقاق آیا، برمحل آیا

ہم وہ احسان کبھی نہیں بھول سکتے جب ترکوں نے ہمارے مشورے کے خلاف کوتاہ اندیشی سے دشمنوں کی رفاقت اختیار کی تو ہمارے شہنشاہ نے ازراہِ کرم ہم کو یقین دلایا کہ ہمارے مقدس مقامات کی حرمت میں سرِمُو فرق نہیں آئے گا۔ اس الطافِ خسروانہ نے ہماری وفا میں نئی روح پھونک دی۔ ھَلْ جَزَاءُ الاحسان اِلّا الاحسان (احسان کا بدلہ احسان کے سوا نہیں ہے)

ہم ان احسانوں کو کبھی نہیں بھول سکتے۔ اب اس جنگ کے خاتمے پر صلح کانفرنس سلطنتِ ترکیہ کی نسبت جلد فیصلہ ہونے والا ہے۔ ممکن ہے یہ فیصلہ مسلمانوں کی امیدوں کے برخلاف ہو لیکن ہم بخوبی جانتے ہیں کہ اس فیصلہ میں سرکارِ برطانیہ اکیلی مختار کار نہیں ہے بلکہ بہت سی طاقتوں کا بھی اس میں ہاتھ ہے۔ شہنشاہِ معظم کے وزراء جو کوششیں ترکی کے حق میں کرتے رہے ہم اس کے واسطے سے ان کے بہرحال مشکور رہیں۔ یہ امر مسلّمہ ہے کہ یہ جنگ مذہبی اغراض پر مبنی نہ تھی اور اپنے اپنے عمل کا اور اس کے نتائج کا ہر ایک ذمہ دار ہے ؎

رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند
گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

مگر ہمیں پوری توقع ہے کہ ہماری گورنمنٹ اس بات کا خیال رکھے گی کہ مقاماتِ مقدسہ کا اندرونی نظم ونسق مسلمانوں ہی کے ہاتھوں میں رہے اور ہم حضور سے درخواست کرتے ہیں کہ جب حضور وطن کو تشریف لے جائیں تو اس نامور تاجدار ہندوستان کو یقین دلائیں کہ چاہے کیسا ہی انقلاب کیوں نہ ہو۔ ہماری وفاداری میں سرِمُو فرق نہ آیا ہے اور نہ آسکتا ہے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ ہم اور ہمارے پیروان اور مریدان فوجی وغیرہ جن پر سرکارِ برطانیہ کے بے شمار احسانات ہیں ہمیشہ سرکار کے حلقہ بگوش اور جاں نثار رہیں گے۔

ہمیں نہایت رنج و افسوس ہے کہ ناتجربہ کار نوجوان امیر امان اللہ خاں والئی کابل نے کسی غلط مشورے سے عہدناموں کے اور اپنے باپ دادا کے طرزِ عمل کی خلاف ورزی کر کے خداوند تعالیٰ کے صریح حکم

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا — یعنی وعدے کا ایفا کرو۔ ضرور وعدے کے متعلق پوچھا جائے گا۔

کی نافرمانی کی۔ ہم جناب والا کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم امیر امان اللہ کے اس طرزِ عمل کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

ہم اہالیانِ پنجاب احمد شاہ کے حملوں اور نادر شاہی قتل و غارت گری کو نہیں بھول سکتے۔ ہم اس غلط اعلان کی جس میں اس نے سراسر خلاف واقعہ لکھا ہے کہ اس سلطنت کی مذہبی آزادی میں خدانخواستہ رکاوٹ واقعہ ہوئی تردید کرتے ہیں۔ امیر امان اللہ خاں کا خاندان سرکارِ انگلشیہ کی بدولت بنا اور اس کی احسان فراموشی کفرانِ نعمت سے کم نہیں۔

ہم کو ان کوتاہ اندیش دشمنانِ ملک پر بھی سخت افسوس ہے جن کی سازش سے تمام ملک میں بدامنی پھیل گئی اور جنہوں نے اپنی حرکاتِ ناشائستہ سے پنجاب کے نیک نام پر دھبّہ لگایا۔ مقابلہ آخر مقابلہ ہی ہے اور کبھی خموش نہیں رہ سکتا۔ یہ حضور والا ہی کا زبردست ہاتھ تھا جس نے بے چینی و بدامنی کا اپنے حُسنِ تدبّر سے فی الفور قلع قمع کر دیا۔ ان بدبختوں سے ازراہِ بدبختی فاش غلطیاں سرزد ہوئیں لیکن حضور ابرِ رحمت ہیں اور ابرِ رحمت زرخیز اور شور زمین دونوں پر یکساں برستا ہے۔ ہم حضور کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم ان گمراہ لوگوں کی مجنونانہ و جاہلانہ حرکات کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے قرآن کریم میں بھی تلقین کی گئی ہے۔ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ۔ یعنی دنیا میں فساد

اور بدامنی مت پیدا کرو اور اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ ۔ یعنی بے شک خدا فساد کرنے والوں سے محبّت نہیں کرتا۔

حضورِ انور! اگرچہ آپ کی مفارقت کا ہمیں کمال رنج ہے ؎

سر غم سے جھکے کیوں نہ سردار ہمارا
لو ہم سے چھٹا جاتا ہے سردار ہمارا

لیکن ساتھ ہی ہماری خوش نصیبی ہے کہ حضور کے جانشین سر ایڈورڈ میکلیگن بالقابہم جن کے نام نامی سے پنجاب کا بچہ بچہ واقف ہے، جن کا حسن اخلاق رعایا نوازی میں شہرہ آفاق ہے۔ جو ہمارے لیے حضور کے پورے نعم البدل ہیں۔ ہم ان کا دلی خیر مقدم کرتے ہیں اور ان کی خدمت میں یقین دلاتے ہیں کہ ہم مثل سابق اپنی عقیدت و وفاداری کا ثبوت دیتے رہیں گے۔

حضور اب وطن کو تشریف لے جانے والے ہیں۔ ہم دعا گویاں جناب باری میں دعا کرتے ہیں کہ حضور مع لیڈی صاحبہ و جمیع متعلقین مع الخیر اپنے پیارے وطن پہنچیں، تا دیر سلامت رہیں اور وہاں جا کر ہم کو دل سے نہ اتار دیں۔ ع این دعا از ما و از جملہ جہاں آمین باد

المستدعیان

مخدوم حسن بخش قریشی، مخدوم غلام قاسم سجادہ نشین خانقاہ، مخدوم شیخ محمد، نواب حسن، مخدوم سید حسن علی، سید ریاض الدین شاہ، پیر غلام عباس شاہ، دیوان سید محمد پاکپٹن، خان بہادر مخدوم حسن بخش آف ملتان، مخدوم صدر الدین شاہ آف ملتان، میاں نور احمد سجادہ نشین، پیر محمد رشید، شیخ شہاب الدین، خان بہادر شیخ احمد، سید محمد حسین شاہ شیر گڑھ ضلع منٹگمری، مخدوم شیخ محمد راجو آف ملتان، دیوان محمد غوث، محمد مہر علی شاہ جلالپور، پیر محمد خضر حیات شاہ، صاحبزادہ محمد سعد اللہ آف سیال شریف، سید غلام محی الدّین خلف الرشید سید مہر علی شاہ آف گولڑہ شریف، سید قطب علی

شاہ آف ملتان، پیر چراغ علی آف ملتان، پیر ناصر الدین شاہ آف شاہ پور، پیر غلام احمد شاہ آف شاہ پور، مخدوم غلام قاسم سجادہ نشین، سید نوازش حسین شاہ آف شیر گڑھ ضلع منٹگمری، مولوی غلام محمد خادم گولڑہ شریف، سید فدا حسین ضلع کیمبل پور، محمد اکبر شاہ آف شیر شاہ ملتان، غلام قاسم شاہ آف شیر شاہ ملتان، مولوی سید زین العابدین شاہ آف ملتان، پیر چراغ شاہ کوٹ سدھانہ جھنگ محبوب عالم خادم گولڑہ شریف، منشی حیات محمد گولڑہ شریف، برہان الدین خادم گولڑہ شریف۔

۱۹۲۶ء میں جب پنجاب خلافت کمیٹی نے ڈاکٹر محمد عالم کو اپنے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کے لیے ملتان کے حلقے سے نامزد کیا تو اس سلسلہ میں شاہ جی کو پہلی دفعہ ملتان جانے کا موقع ملا۔ اہالیانِ شہر نے مندرجہ بالا سپاسنامہ شاہ جی کو دکھایا، جسے پڑھ کر شاہ جی کو بے حد صدمہ ہوا۔ دنیا کی روحانی اصلاح کرنے والے کافر حکومت کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ چنانچہ بارغ لنگے خان میں مسلسل تین دن اسی سپاسنامے کے ساتھ ساتھ پیرانِ عظام سے کہا:۔

”اے پیران طریقت! یہ سپاسنامہ فرنگی کے حضور پیش کر کے آپ نے اپنے آباؤ اجداد کی تعلیم، ان کے اصول، ان کی روحانی زندگی پر وہ کالک مل دی ہے کہ قیامت تک یہ داغ نہیں دھویا جا سکتا اور نہ یہ سیاہی مٹ سکتی ہے۔

اگر میں ابن سعود کی حمایت کروں تو کافر اور تم ترکوں کے قتل پر دستخط کرو تو مومن، تم فتح بغداد پر چراغاں کرو تو مسلمان اور میں فرنگی سے آزادی کے لیے لڑوں تو مجرم۔ تمہارے تعویذ، تمہاری دعائیں کافر کی فتح کی آرزومند رہیں اور میں سلطنت برطانیہ کی بنیاد اکھاڑنے کے درپے رہا۔ تم نے انسانوں سے زیادہ کتے اور سوروں کی قدر کی اور گناہ کو ثواب کا درجہ دیا۔ تمہاری قبائیں خونِ مسلم سے داغدار ہیں۔

اے دُم بریدہ سگانِ برطانیہ! صورِ اسرافیل کا انتظار کرو کہ تمہاری فردِ جرم تمہارے سامنے لائی جائے اور تم اپنے نامۂ اعمال کو ندامت کے

آئینے میں دیکھ سکو۔

تمہاری تسبیح کا ایک ایک دانہ تمہارے فریب کا آئینہ دار ہے۔ تمہاری دستار کے پیچ و خم میں ہزاروں پاپ جنم لیتے ہیں اور تم انہیں دیکھتے ہو مگر تمہاری زبانیں گُنگ ہیں کہ ان کی موت پر آنسو تک نہیں بہتے۔ وقت کا انتظار کرو کہ شاید تمہاری پیشانیوں کے محراب کی سیاہی تمہارے چہروں کو مسخ کر دے اور تمہارا زہد و تقویٰ ہی تمہاری رسوائی کا باعث بن جائے۔"

پھر شاہ جی نے لنگے خاں کے باغ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"اس باغ کے گل بوٹے گواہ رہیں کہ میں نے تین دن کی مسلسل تقریروں سے باغبانِ قوم و وطن کے فریب سے بنی نوع انسان کو آگاہ کر دیا ہے۔ باغ کی روشیں میری گفتگو کو اپنے دامن میں محفوظ کر لیں، شاید قیامت کے دن میں اپنی نجات کے لیے ان سے طلب کروں۔

اے بادِ بہاری کے خوشگوار جھونکو! شہادت دینا کہ میں نے اہلِ ملتان کے سامنے حق و باطل کے درمیان دیوار کی نشاندہی کر دی ہے۔

ڈاکٹر محمد عالم ووٹوں کی کافی اکثریت سے پنجاب اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔

ان تقریروں سے شاہ جی نے ملتان میں اپنا ایک حلقہ پیدا کیا اور دوستوں کی خاصی تعداد ان کے گرد جمع ہو گئی۔ لیکن دوسری طرف پنجاب کے پیروں نے لڑائی کی نیو اٹھائی۔ حالانکہ اس سپاسنامے کے نیچے شاہ جی کے روحانی پیشوا حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب کے صاحبزادہ کے دستخط تھے لیکن برطانوی استعمار سے نفرت کے باعث شاہ جی نے اپنی عقیدت کی یہ رسی بھی توڑ دی۔

زمانہ اپنے ساتھ نہ چلنے والوں سے ہمیشہ دور رہا اور خفا بھی۔ پہاڑوں کی بلندیاں اور سمندر کی گہرائیاں اپنے وفاق سے ان لوگوں کی منزل روکتی رہیں، جنہوں نے وقت اور زمانے

سے بے پروائی برتی۔

جلالِ پادشاہی سے تو بیر تھا ہی مگر خلوصِ فقیر بھی بے اعتنار ہا۔ جنونِ شوق میں جب دیوانے بادہ پیمائی کو نکلے تو بادِ سحر گاہی بادِ سموم سے ہم آہنگ ہوئی کہ ریت کے ذرات دیوانوں کی پیشوائی نہ کر سکے۔ لیکن جن کے سامنے منزل ہوتی ہے وہ آبلہ پائی کے نشانوں پر سفر کرتے ہیں۔ انہیں نہ زمانہ روک سکتا ہے، نہ وقت کا کوئی فیصلہ ان سے متصادم ہوتا ہے۔

شاہ جی جب گھر سے چلے تھے نہ قالین ان کے پاؤں تلے تھے نہ سونے کا چھتّر سر پر تھا۔ درویش جب تاجِ شاہی سے ٹکراتا ہے تو قباؤں کے پیوند ہی اس کا ساتھ دیتے ہیں۔

۱۹۲۷ء کا سال شاہ جی کی زندگی میں مصروف ترین سال تھا۔ انگریز، ہندو، مرزائی اور پنجاب کے پیر اس آزاد منش انسان سے اپنے اپنے انتقام کے لیے وقت سے ہم آہنگ رہے لیکن فطرت اس کا احاطہ کیے ہوئے تھی کہ وہ طوفان اور آندھیوں کے درمیان چراغِ مصطفویؐ کو ہتھیلی پر روشن کیے چلا جا رہا تھا۔

محلہ داروں کا کہنا ہے کہ اندرونِ خانہ شاہ جی کے حالات اس قدر ناگفتہ بہ تھے کہ ذوں کے بعد محلہ داروں کو معلوم ہوتا تھا کہ کئی دنوں سے چولہے میں آگ نہیں جلی لیکن کبھی حرم سے آواز نہیں نکلی، نہ دستِ سوال دراز ہوا۔ صبر و استقلال سے گھر کے ماحول نے پیغمبروں کے گھرانوں کی یاد تازہ کر دی۔

تحریک شاتمِ رسولؐ

غلامی کا ہر سال جدوجہد "آزادی" کے لیے مصائب و آلام کے کوہِ گراں لے کر آیا۔ ان دنوں ہر صبح کا طلوع ہونے والا آفتاب اپنی کرنوں میں محبانِ وطن کے لیے ایسے فیصلے لے کر طلوع ہوتا کہ جن میں دار و رسن کے فیصلے جلی طور پر رقم ہوتے۔

لیکن ۱۹۲۶ء کا سورج عجب انداز سے ابھرا کہ غیر ملکی استعمار اگر ایک طرف آتشیں اسلحہ سے لیس تھا تو دوسری طرف سیاسی بساط کے مُہرے اس رُخ پر چلائے کہ ان کی ہر چال شہ کو مات دیتی ہوئی چلی گئی۔

سائمن کمیشن میں ہندوستان کی عدم شمولیت، لارڈ برکن ہیڈ کا چیلنج اور ہندوستانی رہنماؤں کے فیصلے ہنوز متصادم تھے کہ آریہ سماج اور مرزائیوں کی چپقلش نے ہندوستان میں تحریک شاتم رسولؐ کو جنم دیا۔

۱۸۷۵ء میں پنڈت دیانند کی کتاب "ستیارتھ پرکاش" پہلی بار بنارس میں شائع ہوئی قادیانی مذہب کے بانی مرزا غلام احمد نے "ستیارتھ پرکاش" کے شائع ہوتے ہی کتاب ہذا کے مصنف اور دوسرے رہنماؤں کو چیلنج کیا کہ "جو کتاب میں (مرزا غلام احمد) مستقبل قریب میں لکھنے والا ہوں اگر ہندو اور سوامی دیانند مجھے اس کا جواب دیں تو میں انہیں دس ہزار روپیہ انعام دوں گا"۔ اس کے بعد مرزا غلام احمد کی کتاب "براہین احمدیہ" کا سلسلۂ شائع ہونا شروع ہوا جس میں ہندو دھرم (وید، آریہ سماج، پنڈت دیانند) پر اعتراضات و الزامات تراشے گئے۔

اکتوبر ۱۸۸۳ء میں پنڈت دیانند کی موت واقع ہوئی اور ۱۸۸۴ء میں "براہین احمدیہ" کی چوتھی جلد شائع ہوئی۔ اس میں پنڈت دیانند کی موت پر اس کے خلاف زورِ قلم کا مظاہرہ دیکھا گیا۔ آخر اسی سال ستیارتھ پرکاش کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو اضافی طور پر جن دو ابواب کو شامل اشاعت کیا، ان میں داعئ اسلام حضور خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی پر براہِ راست حملے کیے گئے تھے، جنہیں مسلمان برداشت نہ کر سکا اور کتاب ہذا کے خلاف ہندوستان بھر میں احتجاجی مظاہرے اور جلسے ہوئے نیز حکومت سے اس کتاب کی ضبطی کا مطالبہ کیا گیا۔

انہی دنوں قاسم علی (مرزائی) کی کتاب "انیسویں صدی کا مہارشی دیانند" شائع ہوئی جس میں پنڈت دیانند کو ہدفِ تنقید بنایا گیا تھا۔ اس کتاب کے بازار میں آتے ہی ہندو

مسلمان پھر ایک دوسرے کے آمنے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ قاسم علی (مرزائی) کے جواب میں آریہ سماجی لیڈر پنڈت چمپا وتی ایم، اے پروفیسر ڈی، اے، وی کالج لاہور نے (نعوذ باللہ) "رنگیلا رسول" ایسی رسوائے عالم کتاب لکھی۔

یہ سارا تماشہ ان دنوں ہوا جب لارڈ برکن ہیڈ وزیر ہند کا چیلنج قبول کرتے ہوئے رہنمایانِ ہند نے سائمن کمیشن کے بائیکاٹ نیز باہم مل بیٹھنے کی تجویزیں پاس کی تھیں۔

ان واقعات کے یہاں پہنچنے تک ۱۹۲۷ء کا سال اپنے سفر کی ایک تہائی منزل طے کر چکا تھا۔ لیکن آریہ سماجی اور مرزائیوں کی باہم تلخ نوائی نیز ان کی تحریری جنگ نے ہندوستان کے سنبھلتے ہوئے حالات کو از سر نو پلٹا دیا۔ گو شدھی و سنگھٹن کی بادِ سموم کے باعث صحن چمن کی ہر روش اپنی نگاہوں کے ڈورے سرخ کیے بیٹھی تھی۔ تاہم احساس ہو رہا تھا کہ شبنم کے آنسو اور بادِ صبح گاہی کے معانقے سے فضاؤں میں انقلاب رونما ہو گا اور صیاد کے ظلم و جور کی بجلیوں سے جلتے ہوئے آشیانوں کو پھر سے تنکے جمع کرنے کا موقع ملے گا۔ مگر بکھرے ہوئے زہر نے دریا کے ہر قطرے کو مسموم کر دیا۔

شاتم رسول واجبِ قتل ہے

اس مسموم فضا میں امرتسر کے ایک ہندی رسالہ "ورت مان" نے بھی خاتم الانبیاء علیہ السلام کی ذاتِ گرامی پر کیچڑ اچھالا جسے رائج الوقت قانون نے چھ ماہ کی سزا دی۔ لیکن کتاب "رنگیلا رسول" (نعوذ باللہ) نے حالات کو بد سے بدتر کر دیا۔ علمائے دین کی توجہ جب کتاب ہذا کی طرف ہوئی تو جمعیۃ العلمائے ہند نے شاتمِ رسول کو واجب القتل قرار دیا۔ اس فتویٰ کے شائع ہوتے ہی عبدالعزیز نامی شخص نے کتاب ہذا کے ناشر مہاشہ راجپال پر، جس نے کہ مصنف کی ذمہ داری بھی قبول کر لی تھی، لاہور میں قاتلانہ حملہ کیا، جس سے راج پال زخمی ہوا اور حملہ آور کو چودہ سال کی سزا ہوئی۔

اس کے بعد خدا بخش نامی (المعروف اکو تجیا) نے حملہ کیا، مگر یہ وار بھی جان لیوا

بت نہ ہوا۔ خدا بخش کو چھ سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔

ہندوستان کے مسلمانوں نے حکومت ہند سے مطالبہ کیا کہ راج پال کو گرفتار کر کے اس پر مقدمہ چلایا جائے۔ آخر مسلسل قاتلانہ حملوں اور مسلمانوں کے اضطراب کے ردِ عمل پر حکومت نے ناشر راج پال کو گرفتار کر لیا۔ عدالت نے تین سال قید اور جرمانے کی سزا دی لیکن سیشن جج نے جرمانہ معاف کر دیا اور سزا بحال رکھی۔ ہائی کورٹ میں اپیل پر جسٹس کنور دلیپ سنگھ (عیسائی) نے راج پال کو بری کر دیا۔ اس فیصلے پر لاہور کے انگریزی روزنامہ "مسلم آؤٹ لک" نے تبصرہ کیا تو اسے توہین عدالت پر سزا ہوئی۔ جسٹس کنور دلیپ سنگھ کے اس رویّہ پر عوام کا احتجاج اس قدر عام ہوا کہ حکومت کو عدالت عالیہ کی پوزیشن محفوظ کرنا مشکل ہو گئی۔

شاہ جی کا موقف

۴ اور ۵۔ جولائی ۱۹۲۷ء کی درمیانی رات کو مسلمانان لاہور کی طرف سے دہلی دروازہ کے باغ میں ایک جلسے کا اعلان کیا گیا، جس میں شاہ جی، مولانا احمد سعید، مولانا مفتی کفایت اللہ، چودھری افضل حق، خواجہ عبدالرحمٰن غازی نے تقریریں کرنی تھیں۔ لیکن اسی روز لاہور کے ڈپٹی کمشنر مسٹر اوگلوی نے دفعہ ۱۴۴ لگا کر جلسے کو ممنوع قرار دے دیا۔ مگر شاہ جی کی تجویز پر جلسہ میاں عبدالرحیم کے احاطہ میں منعقد کیا گیا۔ (یہ احاطہ موجودہ مزار حضرت شاہ محمد غوثؒ بیرون دہلی دروازہ کے بالمقابل واقع ہے) اس وسیع احاطہ میں ہزاروں لوگ جمع ہو گئے اور جلسے کی صدارت چودھری افضل حق نے کی۔ فوج اور پولیس کے علاوہ مسٹر اوگلوی ذاتی طور پر بھی احاطہ کے باہر موجود تھے اور اندر آ کر اعلان کیا کہ:۔

> "دفعہ ۱۴۴ کے باعث یہ مجمع خلافِ قانون ہے۔ آپ لوگ پانچ منٹ کے اندر یہاں سے چلے جائیں ورنہ مجھے گولی چلانے کا حکم دینا پڑے گا"

ڈپٹی کمشنر کے اس اعلان پر خواجہ عبدالرحمٰن غازی نے ڈپٹی کمشنر کو انگریزی میں کہا:۔

> "ہم اس قانون کو اپنے پاؤں تلے روندتے ہیں، جو قانون ہمیں ناموسِ پیغمبر کی حفاظت کی ضمانت نہیں دیتا۔ تم جو چاہو کرو ہم یہ جلسہ کریں گے"

اس کے بعد شاہ جی نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"آج ہم سب فخرِ رُسل صلی اللہ علیہ وسلم کی ناموس کو برقرار رکھنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ بنی نوع انسان کو عزّت بخشنے والے کی عزّت خطرے میں ہے۔ آج اس جلیل القدر ہستی کا ناموس معرضِ خطر میں ہے جس کی دی ہوئی عزّت پر تمام موجودات کو ناز ہے۔

آج مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب کے دروازے پر ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور اُمّ المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا آئیں اور فرمایا کہ ہم تمہاری مائیں ہیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ کفار نے ہمیں گالیاں دی ہیں؟ ——— ارے دیکھو تو! ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا دروازے پر تو کھڑی نہیں؟"

یہ سن کر حاضرین میں کہرام مچ گیا اور مسلمان ڈھاریں مار مار کر رونے لگے۔ شاہ جی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

"تمہاری محبت کا تو یہ عالم ہے کہ عام حالتوں میں کٹ مرتے ہو، لیکن کیا تمہیں معلوم نہیں کہ آج سبز گنبد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تڑپ رہے ہیں اور خدیجہؓ اور عائشہؓ پریشان ہیں۔ بتاؤ! تمہارے دلوں میں امہات المومنینؓ کی کیا وقعت ہے؟ ——— آج ام المومنین عائشہؓ تم سے اپنے حق کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ وہی جنہیں رسول اللہ حمیرا! کہہ کر پکارتے تھے۔ جنہوں نے سیّد دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو رحلت کے وقت مسواک چبا کر دی تھی۔

اگر تم خدیجہؓ اور عائشہؓ کی ناموس کی خاطر جانیں دے دو تو کچھ کم فخر کی بات نہیں۔ یاد رکھو! یہ موت آئے گی، تو پیامِ حیات لے کر آئے گی۔"

(روزنامہ زمیندار، ۔جولائی ۱۹۲۷ء)

یہ تقریر اس قدر موثر اور جذباتی تھی کہ تمام مجمع میں حشر بپا تھا۔ شاہ صاحب کی تحریک پر لوگوں کے جتھے باغ میں جلسہ گاہ جاتے اور گرفتار ہو جاتے۔ ان پر لاٹھی چارج بھی کیا جاتا۔ یہ سلسلہ تھوڑی دیر جاری رہا۔ بعد ازاں شاہ جی نے عوام کو اپنے جذبات پر قابو رکھنے کی اپیل کی اور کہا،

"ہمارا مؤقف قتل و غارت گری نہیں۔ بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ برطانوی حکومت تعزیرات ہند میں ایک ایسی دفعہ کا اضافہ کرے جس کی رو سے بانیانِ مذاہب کے خلاف تقریر و تحریر کی پابندی ہو اور اس کی خلاف ورزی کرنے والا مجرم قرار پائے۔"

اس قرارداد کے بعد جلسہ برخاست کر دیا گیا لیکن عوام کو پرامن طور پر احاطہ سے باہر نکالنے کے لیے شاہ جی خود دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ ان کے سامنے مسٹر اوگلوی کھڑا تھا۔ شاہ جی اپنے مخصوص انداز میں لوگوں کو پرامن رہنے کی تلقین کر رہے تھے اور ساتھ ہی مسٹر اوگلوی سے پنجابی میں کہا:۔

"اوگلوی! اوکھے گھر نیو ندرہ پایا ای" (اوگلوی! تم نے مشکل گھرانے سے ٹکر لی ہے)

تیسری گرفتاری

ڈپٹی کمشنر لاہور نے قانون کی آڑ میں اپنی شکست کا انتقام لیتے ہوئے ۱۱۔ جولائی ۱۹۲۷ء اڑھائی بجے بعد دوپہر شاہ جی اور خواجہ عبدالرحمان غازی کو دفتر پنجاب خلافت کمیٹی حجازی بلڈنگ بیرون دہلی دروازہ سے زیر دفعہ ۱۰۷ گرفتار کر لیا۔ گرفتاری سے پیشتر شاہ جی دہلی، لاہور، امرتسر اور لدھیانہ کے اضلاع میں تقریریں کر کے پنجاب کے مسلمانوں کو توہین پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقام پر آمادہ کر چکے تھے۔

دفعہ ۱۰۷ کے تحت قانون کا منشا ادھورا دیکھ کر شاہ جی پر دفعہ ۱۰۸ کے تحت بھی مقدمہ چلایا گیا۔ انہیں حکم ہوا کہ تین ہزار کی ضمانت اور تین ہزار کا مچلکہ دے کر دورانِ مقدمہ رہا ہو سکتے ہیں۔ لیکن شاہ جی نے نہ صرف فرنگی قانون کی یہ رعایت ٹھکرا دی بلکہ عدالت میں اپنا

بیان اور مقدمہ میں صفائی دینے سے بھی انکار کردیا۔ سماعت مقدمہ تک شاہ جی اور خواجہ عبدالرحمٰن غازی لاہور بورسٹل جیل میں رہے۔ مسلسل چار روز کی یک طرفہ کارروائی کے بعد شاہ جی اور خواجہ عبدالرحمٰن غازی کو ایک ایک سال کی قید بامشقت کی سزا دے کر شاہ جی کو رہتک جیل منتقل کردیا گیا۔

مولانا ظفر علیخاں کی ایک نظم کا شعر انہی دنوں کی یادگار ہے ؎

بنو غازی کی غیرت لاج رکھ لی جس نے ملّت کی
عطاء اللہ کا ہیبت رُبا ایمان ہو جاؤ

سوامی شردھانند کا قتل

شاہ جی کی گرفتاری اور سزا کے بعد فرنگی اور ہندو کے خلاف نفرت کو مزید ہوا ملی اور یہ تحریک سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔ ان دنوں مسلمانانِ ہند کے حسب ذیل مطالبات تھے۔

۱۔ حکومتِ برطانیہ ایک ایسا قانون وضع کرے۔ جس سے بانیانِ مذاہب کی عزت محفوظ ہو۔

۲۔ جسٹس کنور دلیپ سنگھ کو اس کی ذمہ داریوں سے فوراً علیحدہ کردیا جائے۔

۳۔ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری اور ان کے دوسرے ساتھیوں کو جیلوں سے رہا کیا جائے۔

اس ہنگامی تحریک کے نتیجہ میں والئی افغانستان غازی امیر امان اللہ خان نے حکومت برطانیہ کو حسب ذیل مفہوم کا ایک خط لکھا۔

"اگر برطانوی ہند میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی عزت محفوظ نہیں رہ سکتی تو ہمیں برطانیہ کے ساتھ کیے گئے معاہدوں پر از سر نو غور کرنا پڑے گا۔"

مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی کو بھی انہی دنوں گرفتار کیا گیا۔

شدھی وسنگھٹن کے برگ و بار پھر ابھر کر سامنے آ گئے۔ سوامی شردھانند نے اپنے

روزنامہ "تیج" دہلی میں یہ جذباتی نعرہ لگایا کہ میں عنقریب دہلی جامعہ مسجد کے منبر پر شدھی کا جھنڈا لہراؤں گا۔ اس اعلان پر مسلمانوں میں اضطراب بڑھا۔ آخر مولوی عبدالرشید نے جو جامعہ مسجد کی سیڑھیوں پر پرانی کتب فروخت کیا کرتا تھا، سوامی شردھانند کو قتل کر دیا اور اسی جرم میں اسے ۱۴۔ نومبر ۱۹۲۷ء کو دہلی جیل میں پھانسی پر لٹکایا گیا۔

الغرض ان واقعات نے ہندوستان کو ایسی ڈگر پر ڈال دیا کہ خارِ مغیلاں بھی خونِ انسانی سے لالہ و گل کو رنگت بخشتے رہے اور اس راہ کی ہر شے نے خاتم الانبیاء کے ناموس کی حفاظت کی۔

تعزیراتِ ہند میں ترمیم

غیر ملکی نظامِ حکومت غلام رعایا کو باہم دست و گریباں دیکھ چکا۔ آدمی کے لہو سے آدمیت کی ذلت جھلکنے لگی۔ دلوں کے انگارے بدبو دینے لگے، تو شاطرانِ فرنگ نے محکوم رعایا پر دستِ کرم کیا کہ تعزیراتِ ہند میں ترمیم کر کے دفعہ ۱۹۵ کا اضافہ کیا جس کی رو سے ہر ایسی تحریر و تقریر قانوناً جرم قرار دے دی گئی، جس سے کسی مذہب کے بزرگ یا بانی (REFORMER) کی اہانت کا پہلو نکلتا ہو۔ لیکن پہلے کی متنازعہ فیہ کتب کو ممنوع قرار نہ دیا۔

نہرو رپورٹ

۱۲۔ فروری ۱۹۲۸ء کو لارڈ برکن ہیڈ اور سائمن کمیشن کے جواب میں ہندوستانی رہنما دہلی میں جمع ہوئے۔ پنجاب کی نمائندگی چودھری افضل حق، مولانا داؤد غزنوی اور مولانا ظفر علی خاں نے کی۔ اس اجتماع میں سر علی امام، مسٹر شعیب قریشی، مسٹر اینے، مسٹر جیکر، سردار منگل سنگھ، سر تیج بہادر سپرو پر مشتمل ایک کمیٹی ترتیب دی گئی جس کے صدر پنڈت موتی لال نہرو مقرر ہوئے۔ اس کمیٹی کی رپورٹ آگے چل کر نہرو رپورٹ کے نام سے مشہور ہوئی۔

اگرچہ سائمن کمیشن کی آمد پر مسلم لیگ اور کانگریس کے اتحاد سے ہندوستانی رہنماؤں کی مساعی جمیلہ نے بگڑے ہوئے ماحول کو سنوارنے کی شب و روز سعی کی لیکن فضا میں تلخی بدستور

زہر گھول رہی تھی ۔ انہی دنوں مئی ۱۹۲۸ء میں شاہ جی، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی اور غازی عبدالرحمن امرتسری ایک ایک سال میعادِ اسیری گزار کر رہا ہوئے ۔ ان کی آمد پر امرتسر شہر کو دلہن کی طرح سجایا گیا ۔ مسلمانوں کے دلوں کے آئینوں میں شوق و محبت کی تصویریں آویزاں تھیں ۔ سقف و بام پر خوشی کے آنسوؤں کی جھاریں لٹکا دیں ۔ کوچہ و بازار محبوب رہنماؤں کی آمد پر مسکراہٹ کے موتی بکھیرنے لگے ۔ گھروں میں عید اور دکانوں پر میلے لگ گئے ۔ اس استقبال کی تیاریوں کی اطلاع نہ جانے کس طرح شاہ جی کو ملی کہ وہ اچانک یوں غائب ہوئے کہ ان کے ساتھی بھی انہیں تلاش نہ کر سکے ۔ شاہ جی رات کے اندھیرے میں چھپ کر گھر پہنچ گئے ۔

امرتسر ریلوے اسٹیشن پر استقبال کرنے والے ہجوم کو شاہ جی کی یہ بے اعتنائی پسند نہ آئی ۔ وہ مایوس بھی ہوئے اور ناراض بھی ۔ اس کے باوجود مولانا حبیب الرحمن اور غازی عبدالرحمن کا جلوس اپنے وقار سے نکلا ۔ ناموسِ رسالت کے محافظ جن راستوں سے گزرے نگاہیں فرشِ راہ اور دلوں نے عقیدت کے پھول برسائے ۔

شاہ جی کی جلوس سے غیر متوقع غیر حاضری نے ان کے حلقہ احباب پر بھی اثر کیا ۔ چنانچہ عام دوستوں نے باہم فیصلہ کیا کہ شاہ جی سے تعلقات منقطع کر لیے جائیں ۔ اس فیصلے کے تحت احباب نے رخ پھیر لیا ۔ شاہ جی جس دوست کے مکان پر جاتے وہ خدمت تو کرتے آؤ بھگت بھی کرتے لیکن خاموشی سے ۔ چاہے گھنٹوں اس کے پاس بیٹھے رہیں ۔ سارے گھر میں اور سارے حلقہ احباب میں بھی بے رخی اور بے نیازی کا عالم رہا ۔ بازار سے گزرتے تو السلام علیکم کا جواب نہ ملتا ۔ گھر سے نکل کر محلے میں آتے تو بچوں اور بوڑھوں تک میں مقاطعہ کی فضا پاتے ۔

اسی طرح پندرہ دن گزر گئے ۔ لیکن لبوں پر مہرِ خاموشی بدستور رہی ۔ گو یہ غصہ، ناراضگی، بے نیازی، بے رخی احباب کی ایک [illegible] کا نتیجہ تھی لیکن شاہ جی ایسے باغ و بہار آدمی کے لیے وبالِ جان بن گئی اور وہ اس قدر پریشان ہوئے کہ مرنے مارنے پر اتر آئے ۔ جن

دوستوں سے زیادہ قرابت تھی، وہاں زیادہ رنج ظاہر کرتے۔ آخر دوستوں نے بھی اتنی ہی سزا کافی سمجھ کر کٹڑہ مہاسنگھ کے میونسپل کمشنر میاں محمد شریف ٹھیکیدار کے گھر دعوت کا انتظام کیا اور اس مجلس میں شاہ جی نے جلوس سے غیر حاضری کے لیے حلقہ احباب سے معذرت چاہی یہ رنگین محفل جس میں اردو اور پنجابی کے شعرا بذلہ سنج حضرات شامل تھے، رات دو بجے تک جاری رہی۔

حیدر پہلوان کا مقدمہ باوجودیکہ نہرو رپورٹ کے ذریعے حسب ذیل فرقہ وارانہ فیصلے ہوئے۔

۱۔ جداگانہ انتخاب کو ہندوستان سے ختم کر دیا جائے۔

۲۔ مخلوط انتخاب کے ساتھ نشستوں کا تعین غیر مفید قرار دیا جائے۔

۳۔ پنجاب اور بنگال میں انتخاب کھلا رکھا جائے۔ نیز کسی فرقہ کے لیے نشستیں مخصوص نہ کی جائیں۔

۴۔ مرکز میں مسلمانوں کو ایک تہائی نمائندگی دینے سے انکار کر دیا گیا۔ البتہ اس تناسب پر فیصلہ ہوا جو صوبجاتی نشستوں کے فیصلے کی رو سے مرکز میں مسلمانوں کو حاصل ہو سکیں گی۔

لیکن ہندو مسلم کشیدگی برابر بڑھتی رہی اور سائمن کمیشن اپنا کام کرتا رہا۔ یہ دور قانونی موشگافیوں کا دور تھا۔ شاہ جی ان دنوں کچھ دیر کے لیے خانگی معاملات کی دیکھ بھال میں مصروف رہے۔

متحدہ ہندوستان میں مسلمان قومی کارکنوں کی زندگی ہمیشہ ایک المیہ رہی ہے، بشرطیکہ وہ کارکن ہوں سوداگر نہ ہوں۔ گو پروان وہی لوگ چڑھے جنہوں نے دماغ اور ضمیر کا سودا کیا اور وقت نے بھی انہی کو حقیقت جانا۔ حالانکہ وہ افسانہ تھے لیکن آئینہ ٹوٹ کر بھی دیکھنے والے کو مایوس نہیں کرتا۔

انسان کا اگر اپنا ضمیر مطمئن ہو تو حالات کا بگاڑ راستے کی دیوار نہیں بنتے۔ کانٹے لاکھ سر

پھوڑیں پھول نکل ہی آتے ہیں۔ شاہ جی اگر مقبول ہو رہے تھے، یا شہرت ان کی پیشوائی کر رہی تھی تو ان کے سہارے تعلیم، دولت یا کوئی دوسرا طلسم نہیں تھا بلکہ خلوص، جذبۂ ایثار اور ایمان کی پختگی ایسی چیزیں تھیں، جو انہیں زمانہ پر فوقیت دے رہی تھیں۔ درویش کی زندگی کا مدار اس کی گوڈری تک ہوتا ہے۔ شاہ جی نے گھریلو حالات کو جلا دینے کے لیے وقت سے عارضیتاً مہلت مانگی اور امرتسر پرانی گندم منڈی مائی والی مسجد میں صبح کا درس اور جمعہ کے خطبہ پر متعین ہو گئے۔ یہ گاڑی ایک معینہ مدت تک چلی۔

امرتسر میں سونا چاندی یا گوٹا کناری خریدنے والے زرگر محلوں میں عام گشت کیا کرتے تھے۔ اسی طرح ایک غیر مسلم زرگر کوچہ حیدر پہلوان میں پھر رہا تھا کہ حیدر پہلوان کے بھائی محمد سرور نے اچانک اس کے سر پر لوہے کا ہتھوڑا دے مارا۔ آدمی کمزور تھا۔ ضرب کاری لگی اور وہ موقعہ پر ہلاک ہو گیا۔ ملزم محمد سرور کا دماغی توازن گزشتہ کئی برسوں سے درست نہیں تھا۔ اس کی اس حرکت نے سارے شہر کا امن خراب کر دیا۔ ملزم موقع پر گرفتار کر لیا گیا۔ واقعہ سے تیسرے روز ہمسایہ قوم نے حیدر پہلوان کو اصل ملزم قرار دے کر گرفتار کرا دیا۔

حیدر پہلوان سیرت اور صورت کے لحاظ سے اپنے فن میں منفرد پہلوان تھا۔ پنجاب اپنے اکھاڑے کے اس جیالے جوان پر جی جان سے فریفتہ تھا۔ ہندوؤں نے جیسے ہی حیدر کو قاتل ٹھہرا کر قانون کے حوالے کیا امرتسر کا مسلمان فریق بن کر سامنے آگیا۔ عید کا تہوار بھی قریب تھا اور عید کے دوسرے روز حیدر نے کشتی لڑنی تھی۔ مقامی حکام اس حادثے کے باعث تعطل میں تھے۔ ہندو قوم نے دولت کے سہارے قانون کے سارے راستے مسدود کر دیے۔ پولیس کی ابتدائی رپورٹ میں حیدر پہلوان کا نام درج نہیں تھا اور یہی ایک راستہ ایسا تھا، جہاں ہندوؤں کی دولت کوئی رکاوٹ نہ بن سکی۔

مقدمے کی سماعت ڈپٹی کمشنر نے خود سنبھالی۔ ہمسایہ قوم نے لندن کے مشہور بیرسٹر مسٹر بیٹ مین کو وکالت کے لیے پیش کیا اور مسلمانوں نے سر محمد شفیع کو پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔

مگر تہی دامنی اور خالی ہاتھ سر شفیع کے اونچے محل تک پہنچنے سے قاصر تھے۔ غریب جان تو دے سکتا ہے مگر ایثار زر اس کے بس کا روگ نہیں۔ ایثار پیشہ جب دنیوی سرمائے سے عاری ہو جاتا ہے تو جذبات کا سودا کرنے لگتا ہے۔ کٹڑہ مہا سنگھ کے لوگوں نے شاہ جی سے گزارش کی کہ:۔

"حیدر پہلوان کے مقدمہ میں مسلمانوں کی غربت کہیں اسلام کی شکست کا نشان نہ بن جائے۔"

تو شاہ جی آبدیدہ ہو کر چندہ مانگنے محلے میں نکل کھڑے ہوئے۔ شام تک امید نے ڈھارس بندھائی لیکن دریا خشک ہو جائے تو آنسوؤں کی روانی اس کی پیاس ختم نہیں کر سکتی۔ اگلے روز باغبانپورہ لاہور میں میاں سر محمد شفیع کے مکان کے سامنے چوک میں تقریر کرنے کا ارادہ لے کر شاہ جی لاہور پہنچے۔ منادی ہوئی۔ ہزاروں کا مجمع تھا۔ شاہ جی نے عشاء کی نماز کے بعد تقریر شروع کی تو صبح کے چار بج گئے۔ تقریر کے دوران حیدر پہلوان کی شخصیّت، مقدمے کی نوعیت مسلمانوں کی بے بسی اور ہندوؤں کے اتحاد و دولت پر تبصرہ کیا، لیکن سر شفیع کا نام تک نہ لیا۔ آخر اذان کے وقت میاں سر شفیع بے اختیار ہو کر شاہ جی کے قدموں پر آگرے اور اسی وقت امرتسر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ دوسرے روز مقدمے کی پہلی پیشی تھی اور اس مقدّمے کی چشم دید گواہ محلے کی لکھی دھوبن نامی ایک عورت تھی جس نے اپنی شہادت میں حیدر پہلوان کو موقع واردات پر غیر حاضر قرار دیا۔

ولایت سے آئے ہوئے مڑسٹ مین اور میاں سر محمد شفیع بیرسٹر ایٹ لار آمنے سامنے کھڑے تھے، عدالت سے باہر ہزاروں مسلمان جمع تھے کہ حیدر پہلوان ہتھکڑی کے ساتھ عدالت میں لائے گئے، ایسے دیکھتے ہی مسلمانوں کی چیخیں نکل گئیں اور ساتھ ہی ہندوؤں نے اتنی سی کامیابی پر "ہر ہر مہا دیو" کے نعرے بلند کیے۔

شاہ جی عدالت میں نہیں آئے تھے بلکہ ان کا کہنا ہے کہ "میں اپنے اللہ کے حضور سر بسجود

ہوکررد تارہا اور مسلمانوں کی کامیابی کے لیے دعا کرتا رہا۔"

لکھی دھوبن کی گواہی کے بعد میاں سر محمد شفیع نے کہا کہ استغاثہ کی ابتدائی رپورٹ اور چشم دید گواہ کے بعد میرا عدالت سے صرف ایک ہی سوال ہے۔

"کیا عدالت کے نزدیک پولیس زیادہ معتبر ہے یا کوئی دوسرا گواہ؟

عدالت۔"پولیس"!

سر شفیع۔" تو پھر پولیس کی ضمنی یا ابتدائی رپورٹ میں حیدر پہلوان کا نام بطور ملزم کے درج نہیں بلکہ محمد سرور کا نام ہے۔ لہٰذا میری عدالت سے درخواست ہے کہ ملزم حیدر پہلوان نہیں بلکہ محمد سرور ہے اور بس"۔

استغاثہ کے ایک گواہ کی شہادت اور سر محمد شفیع کے دلائل سننے کے بعد عدالت نے دوسرے فریق کے دلائل سنے بغیر حیدر پہلوان کو مقدمے کی پہلی پیشی پر باعزت بری کر دیا اور محمد سرور کو پاگل قرار دے کر غیر معینہ عرصہ کے لیے پاگل خانے بھیج دیا۔

حیدر پہلوان کو عدالت سے بری ہوتے ہی پچھلے دروازے سے نکال کر گھر بھیج دیا۔ جب مسلمانوں کو یہ خوشخبری ملی تو وہ دیوانے ہو گئے لیکن اس دیوانگی میں انہوں نے کوئی غیر قانونی حرکت نہیں کی۔

شاہ جی اور مسلمانانِ امرتسر اپنی اس کامیابی پر بہت مسرور ہوئے۔ یہ ستمبر ۱۹۲۸ء کا واقعہ ہے۔

پیر کرم شاہ

جب قوموں کا گزر انحطاط کے دور سے ہوتا ہے تو راستے کی ہر پگڈنڈی انہیں منزل کا نشان دکھائی دیتی ہے۔ حالانکہ پگڈنڈی محض راستہ ہوتا ہے منزل نہیں۔ لیکن بھٹکے ہوئے راہی ہر موڑ کو سنگِ میل سمجھتے ہوئے اپنے قیاس میں کھو جاتے ہیں۔

اس دور کا مسلمان عقیدے کی پختہ چٹان سے پھسل کر ان پتھروں پر آگرا ہے جن سے تراشے ہوئے صنم خدائی کے دعویدار ہیں۔ مخلوق اپنے خالق سے انحراف کر کے بغاوت کے اس دستور

کو اپنا رہی ہے، جس کی ہر تجویز انسانیت سے ماورا معلوم ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر شعبدہ باز
صرف ہاتھ کی صفائی سے دل و نظر کو فریب دینے میں کامیاب ہو رہا ہے۔

۱۹۲۸ء کی نبضیں چھوٹ رہی تھیں کہ امرتسر کا مسلمان پیر کرم شاہ کے آستانے پر سجدہ ریز تھا۔
مسلمان عورت کا آئینہ عصمت اس دہلیز سے ٹکرا کر چور چور ہو چکا تھا۔ ایمان و توحید کی قندیلیں لٹا
کر کفر کے تارِ عنکبوت میں اُلجھ رہا تھا۔

تیس بتیس کا سن، سرو قد، سُرخ و سپید رنگت جیسے میدے میں سندھور گوندھ کر بنایا گیا ہو۔
کشادہ پیشانی، چشم آہو میں بلا کی چمک، جیسے کسی نے موتی کوٹ کر بھر دیے ہوں، تیکھی ناک،
جیسے تلوار کی دھار، عناب کی طرح سرخ ہونٹ، سر پر لمبے اور سنہری بال ایسے جال تھے، جن
میں راہ چلتی جوانیوں کا پھنس جانا معجزہ نہیں تھا۔ ان سب پر سیاہ ریشم کے عربی کاٹ کے
لباس کی سج دھج۔ یہ تھا پیر کرم شاہ! جس کی شہرت نے گھروں کے گھر اس کے قدموں میں لا
ڈالے تھے۔ یہ اکثر چہرے پر نقاب رکھتا اور ملنے والوں کو دیدار کی ہوس رہتی تھی۔ امرتسر
قلعہ بھنگیاں کو چہ پستاریوں میں رہائش کے دنوں اس کا چرچا خوشبو کی طرح پھیل گیا۔ امرتسر
کا سرکاری خطاب یافتہ طبقہ، شال مرچنٹ، پشمینہ کے سوداگر اس کے میزبان تھے۔ لباس
گفتگو، نقش و نگار اور سرکاری رکھ رکھاؤ نے کرم شاہ کے متعلق مختلف قیاس آرائیوں
کو ہوا دی۔ کمزور اعتقاد مسلمان روحانی پیر سمجھ کر پوجا کرنے لگا۔ اور اکثر کی رائے تھی کہ کرم شاہ
درحقیقت وہی "کرنل لارنس" ہے جس نے عربوں میں انقلاب برپا کیا تھا۔ اس رائے کے
باعث سرکاری خطابات کی چاہت کے لوگ کرم شاہ کے گرد زیادہ تعداد میں جمع ہو گئے تھے۔
امیروں کی بھیڑ دیکھ کر غریبوں کے ایمان بھی متزلزل ہو گئے۔ فریب خوردہ عوام نے
آستانہ کرم شاہ پر جبہ سائی کی انتہا کر دی۔ اولاد سے محروم عورتوں کی ٹولیاں صف باندھے
شب و روز کھڑی رہتیں۔ اس طرح جب سارا امرتسر حواس کھو بیٹھا تو شاہ جی خواجہ عبدالرحیم
عاجز کی ہمراہی میں کرم شاہ سے ملنے گئے۔ معلوم ہوا آج یوم خواتین ہے مردوں کے لیے

اجازت نہیں۔ گو شاہ جی کا ماتھا یہیں سے ٹھنکا لیکن بادلِ نخواستہ دوسرے دن کا قصد لے کر واپس لوٹ آئے۔ دوسرے روز گئے تو موصوف سے دو گھنٹے تنہائی میں سیر حاصل گفتگو کے بعد شاہ جی مسکراتے ہوئے باہر آئے اور اگلے روز چوک خراسیاں (متصل ڈیرہ کرم شاہ) میں اہلِ امرتسر کو خطاب کرتے ہوئے شاہ جی نے کہا:۔

"راہِ مستقیم سے بھٹکے ہوئے مسلمانو! ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتی۔ جس آدمی کو تم نے روحانی پیشوا یا انگریزی جاسوس خیال کر لیا ہے یہ دونوں میں سے کچھ نہیں، برطانوی جاسوس نہ تو گلی محلوں میں قیام کرتے ہیں اور نہ اس طرح کی بھیڑ انہیں راس آتی ہے، یہ روحانی آدمی بھی نہیں۔ یہ محض نفس پرست انسان ہے۔ ممکن ہے آج میری باتیں تمہیں کڑوی معلوم ہوں، لیکن عنقریب سنو گے کہ یہ کسی معصوم لڑکی کو اغوا کر کے لے بھاگا۔ اگر تم اپنے ایمان نہیں بچا سکتے تو گھروں کی عزت کی حفاظت کرو۔ عورتوں کو وہاں جانے سے منع کر دو۔

مجھ سے پوچھتے ہو تو میری نظروں نے فسق و فجور کے علاوہ وہاں اور کسی چیز کا اندازہ نہیں لگایا۔ وہاں روحانیت کی نہیں عصبیت کی تربیت دی جاتی ہے۔ جس شخص کو تم نے پیر بنا رکھا ہے، یہ بہت بڑا بدمعاش ہے ان شاء اللہ میں بہت جلد اس کا سارا طلسم ختم کر دوں گا۔ تم چاہے آج میرا ساتھ نہ دو لیکن کل میرے ساتھی ضرور بنو گے۔

شاہ جی کی یہ تقریرات دو بجے تک جاری رہی اور دوسرے دن اس سے تھوڑی دور چوک کٹڑہ سفید میں جلسے کا اعلان کیا گیا۔ اس جلسے میں حاضرین کا اندازہ دو لاکھ سے اوپر بیان کیا جاتا ہے۔ پنجابی کے مشہور انقلابی شاعر خواجہ عبدالرحیم عاجز نے "دو سہیلیوں کی باہم تکرار" کے عنوان سے ایک تمثیلی نظم اس جلسہ کے آغاز میں پڑھی، جس کے دو شعر یاد ہیں:۔

چل درشن کریے نی اج رل کرم شاہ پیر دے
نین گھر گھر وچ اڑ نیسے اج پوچھے جن بے پیر دے

مردنگفن او تھے پچھ کے اندر اتے تینویاں لنگدیاں کھلیاں
اساں سنیا او تھے انج او کھیڈن جینوے ڈنڈے نال گلیاں
او تھے نقشے دسدے نیں اساں سنیا رانجھن ہیر دے
چل درشن کریے نی اج رل کرم شاہ پیر دے

شاہ جی کی تقریر صبح اذان کے وقت ختم ہوئی (افسوس ہے کہ تلاش کے باوجود یہ تقریر نہ مل سکی)

ان تقاریر کے بعد کرم شاہ نے اچانک امرتسر چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا اور بمبئی چلا گیا۔ وہاں اس نے چند تجارت پیشہ لوگوں پر اپنا وار کیا۔ لیکن بہت جلد شراب نوشی اور دوسری بدمعاشیوں کا انکشاف ہونے کے بعد یہ لاہور چلا آیا۔ یہاں اس کے گرد اسی قماش کے لوگوں کا ہجوم رہنے لگا۔ پھر یہ اس قدر بدنام ہوا کہ لاہور میں لالہ لاجپت رائے کی ارتھی کے جلوس کے موقع پر (جو سائمن کمیشن کے خلاف احتجاجی جلوس میں لاٹھیوں سے زخمی ہو کر فوت ہوئے تھے) کرم شاہ کو عوام نے کار میں دیکھ لیا اور اس قدر پٹائی کی کہ بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا۔ اس ہنگامے کے بعد یہ کشمیر چلا گیا۔

کرم شاہ کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ کہاں چلا گیا؟ یہ خاک کہاں سے اڑی اور کہاں جا کر بیٹھ گئی۔ اس اندھیر گردی میں کتنی عصمتیں لٹیں؟ کتنے ایمان ضائع ہوئے؟ انسانیت کو کہاں کہاں شرمندہ ہونا پڑا؟ زمانے کے پاس اس کی کوئی فائل نہیں۔ حالات واقعات پر اسی طرح خندہ زن رہے۔ لیکن شاہ جی کی آواز سے جو گونج پیدا ہوئی تھی، اس کی صدائے بازگشت ہنوز سنائی دیتی ہے "مسلمانو ——— ! ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتی"

۱۹۲۹ء

زندگی کے سن وسال جیسے جیسے آگے بڑھتے ہیں، آدمی کی ذمہ داریاں بھی اسی قدر ترقی پذیر ہوتی ہیں۔ انسانی شعور کے بالغ ہونے تک گزشتہ زندگی کے راہ و رسم احساس کے سہارے پروان چڑھتے ہیں۔ اگر یہ کڑی درمیان میں نہ ہو تو ساری زنجیر ٹوٹ کر رہ جائے۔

اس سال شاہ جی کی عمر اڑتیس سال کے قریب تھی لیکن تبلیغی اور سیاسی ذمہ داریوں کا بوجھ اس شدت سے آن پڑا کہ ان کے احساس نے انہیں جوانی کی سرحدوں سے دور کر دیا تھا۔ حالانکہ یہی دن ایّام بہاراں کہلاتے ہیں۔ جو راستہ روزِ ازل سے انہوں نے منتخب کیا تھا وہاں بہاروں کا گزر ناممکن تھا۔ اگر ۱۹۲۹ء کے سیاسی اور مذہبی واقعات میں سے شاہ جی کے کردار کو الگ کر لیا جائے، تو اس سال کی تاریخ رنگ و روغن سے تہی معلوم ہوتی ہے یہی سال دراصل شاہ جی کی شہرت کو کابل کی دیواروں سے راس کماری تک لے گیا ورنہ اس سے پیشتر پنجاب، سرحد اور یوپی کے چند اضلاع تک ہی متعارف تھے۔

شاتمِ رسُولؐ کا قتلِ عام

ایک طرف سائمن کمیشن کے ارکان ہندوستان کی سیاسی فضا میں ایسی بُو سونگھ رہے تھے جس سے انہیں اپنے لیے سکون میسر نہیں تھا، دوسری طرف مہاشہ راج پال کے بری ہونے پر فرقہ پرست ہندوؤں نے منظم سازش کے تحت تحریک شاتم رسول کو ہندوستان میں ہوا دی، جس سے آریہ سماجی ہندوؤں کے حوصلے بڑھے اور انہوں نے پیغمبر آخرالزماں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف پہلے سے زیادہ تحریر و تقریر پر ہنگامہ شروع کر دیا۔

ہندوستان کے سیاسی حالات گو ان حرکات پر نفرین بھیج رہے تھے، اگر ہندو اکثریت کے رہنما مسلمانوں کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کے منصوبے باندھ رہے تھے اور ان دنوں اس قسم کی گفتگو کھلم کھلا سننے میں آ رہی تھی۔

۱ ـــــــ جب مسلمانوں کا تعلق عرب سے ہے تو یہ کیوں وہاں نہیں چلے جاتے۔

یہاں ان کا کیا رکھا ہے۔

۲ ——— ہندو جاتی نے فیصلہ کر لیا ہے کہ مسلوں کو سمندر پار بھیج کر ہی دم لے گی۔

۳ ——— شدھی کا جھنڈا اب دہلی کی جامعہ مسجد پر لہرائے گا۔

۴ ——— (شہنشاہ) اورنگ زیب عالمگیر نے جس تلوار سے یہاں کے ہندوؤں کو بھرشٹ (مسلمان) کیا تھا ہم پرماتما کی سوگند (قسم) کھا کر کہتے ہیں کہ وقت آنے پر اسی تلوار سے مسلوں کو شدھ (ہندو) کریں گے۔ وغیرہ!

دوسری طرف مسلمان رہنما چودھری افضل حق، مولانا داؤد غزنوی، مولانا ظفر علی خاں، سکھ رہنماؤں کو ناراض کر کے نہرو رپورٹ پر لکھنؤ میں دستخط کر چکے تھے جس کے نتیجے میں پنجاب کا مسلمان ان پر ناراض تھا۔ روزنامہ "سیاست" کے ایڈیٹر سید حبیب مخالفت میں پیش پیش تھے۔ گو یہ تحریک صرف لاہور تک محدود رہی لیکن صحافت کا مرکز ہونے کے باعث اس کے اثرات سارے ہندوستان میں پھیلے۔ چودھری افضل حق، مولانا ظفر علی خاں، مولانا داؤد غزنوی، شیخ حسام الدین، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور شاہ جی نے سارے پنجاب میں نہرو رپورٹ کے اثرات سمجھائے۔

مسلمانوں کے دو گروہوں میں یہ چپقلش جاری تھی کہ مہاتما گاندھی اور پنڈت مدن موہن مالویہ نے ایک مشترکہ اعلان میں کہا۔

"نہرو رپورٹ کے فیصلے میں سکھوں سے ناانصافی کی گئی ہے"

اس اعلان سے سکھوں اور ہندوؤں میں اتحاد کی ایک نئی لہر اٹھی اور سارے ملک میں پھیل گئی۔ انہی دنوں مسلمان رہنماؤں نے بھی جو نہرو رپورٹ پر دستخط کر آئے تھے اعلان کیا۔

"چونکہ مسلمان قوم نہرو رپورٹ کے فارمولے کو قبول نہیں کرتی لہٰذا ہم اس کی ذمہ داری سے دستبردار ہوتے ہیں"

گاندھی اور مالویہ کے اعلان کے بعد پنجاب کے رہنماؤں کے نہرو رپورٹ سے انکار پر

سائمن کمیشن کا منشا پورا ہو چکا تھا۔ لیکن وہ ہندوستانیوں کا مزید تماشا دیکھنے کے لیے یہاں ٹھہرے رہے۔ ان واقعات سے ایک طرف ہندوستان کے مشترک مقصد کو نقصان پہنچا، دوسری طرف انگریز حکمرانوں کی سیاست گری کامیاب رہی۔

ایسے حالات میں اوّل الذکر گروہ (آریہ سماج) نے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرنے کا فیصلہ پختہ کر لیا۔ اس سلسلے میں وہ ایسی ایسی تحریریں سامنے لائے کہ مسلمانوں کے دل بیٹھ گئے۔ غلامی کا جوا ان کی گردنوں پر کوہ ہمالہ سے بھی زیادہ بوجھل معلوم ہونے لگا۔ غم اور غصے کے ملے جلے جذبات سے وہ ہندوؤں کا مقابلہ کرتے رہے۔ آخر انہی دنوں شاہ جی نے عصمتِ انبیاء کے تحفظ کا فیصلہ کیا۔ درویش اپنی گودڑی سنبھال کر بے سروسامانی کے عالم میں نکل کھڑا ہوا۔ قانونِ افرنگ اور دولتِ ہنود اس کے ارادوں میں نہ تو کانٹے بکھیر سکی اور نہ ہی ان کے قدموں کی رفتار مدھم ہو سکی۔

"مسلمانو! میں تمہاری سوئی ہوئی غیرت کو جھنجھوڑنے آیا ہوں۔ آج کفار نے توہینِ پیغمبرؐ کا فیصلہ کر لیا ہے۔ انہیں شاید یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ مسلمان مر چکا ہے۔ آؤ اپنی زندگی کا ثبوت دیں۔ عزیز نوجوانو! تمہارے دامن کے سارے داغ صاف ہونے کا وقت آ پہنچا ہے۔ گنبدِ خضرا کے مکین تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ اُن کی آبرو خطرے میں ہے۔ اُن کی عزّت پر کتے بھونک رہے ہیں۔ اگر قیامت کے دن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے طالب ہو تو پھر نبیؐ کی توہین کرنے والی زبان نہ رہے یا سننے والے کان نہ رہیں۔"

ان خیالات کو شاہ جی نے برصغیر کے مسلمانوں میں بیان کیا۔ وہ شب و روز دیوانوں کی طرح تقریریں کرتے۔ گاؤں، قصبات، شہر اور بستیوں کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے منجمد خون میں حرارت پیدا ہوئی۔ بس پھر کیا تھا، شیر کی طرح بپھرا ہوا مسلمان گستاخ ہندوؤں کی تلاش کرنے لگا۔ نگاہیں جنت کی تلاش میں موت سے ہمکنار ہونے کو

بیقرار نظر آنے لگیں۔ دلوں میں شوقِ شہادت کی لذت محسوس ہونے لگی۔ خرد مسکراتی رہی مگر عشق منزل کی جانب رواں دواں رہا۔ اس طرح شاہ جی نے مسلمان نوجوان کو ابھار کر ایسے مقام پر لاکھڑا کیا کہ اس کے آگے دو ہی راستے تھے، یا تو ہندوستان میں داعیِ اسلام کی عزت ہمیشہ کے لیے نابود ہو جائے یا پھر غیر مسلموں کو آئندہ جرأت نہ ہو کہ وہ حضورؐ کی ذاتِ گرامی پر زبانِ طعن دراز کریں۔

دلوں کے اس فیصلہ کن مقام پر پہنچ کر سب سے پہلے ۶ اپریل ۱۹۲۹ء کو لاہور کے ایک بڑھئی نوجوان غازی علم الدین نے دوپہر کے وقت لاہور میں کتاب "رنگیلا رسول" (نعوذ باللہ) کے ناشر مہاشہ راج پال کو اس کی دکان (ہسپتال روڈ) میں قتل کر دیا۔

اس مقدمہ میں شاہ جی کی خواہش پر علم الدین نے راج پال کے قتل کا اقرار کر لیا تھا۔ حالانکہ مسٹر محمد علی جناح سمیت تمام وکلاء جو اس اہم کیس کی پیروی کر رہے تھے کی خواہش تھی کہ علم الدین ایسا نہ کرے۔

ایک خوفناک دھماکہ

غازی علم الدین کی گرفتاری کی سرخیاں ابھی اخبارات سے ماند نہیں پڑی تھیں کہ ۸ اپریل ۱۹۲۹ء کو دہلی سنٹرل اسمبلی میں بم کا ایک خوفناک دھماکہ ہوا۔ جب اس دھوئیں کے بادل چھٹے تو اسمبلی ہال کی گیلری پر دو نوجوان کھڑے تھے۔ سردار بھگت سنگھ اور بنگال کے مسٹر بی، کے، دت۔ اسمبلی ہال کی عمارت کو کافی نقصان پہنچا۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے۔ ممبران جو اس بات سے ہو کر کچھ تو فرنیچر کے نیچے پناہ گزین تھے اور باقی ہال چھوڑ کر بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔

۸ اپریل ۱۹۲۹ء کو سنٹرل اسمبلی میں جس کی صدارت مسٹر وٹھل بھائی پٹیل کر رہے تھے، پبلک سیفٹی بل پیش ہونے والا تھا کہ یہ حادثہ پیش آیا۔ دونوں ملزم گرفتار کر لیے گئے۔

ان مذہبی اور سیاسی قسم کے تشدد آمیز واقعات نے ہندوستان کے رہنماؤں اور عوام کو الگ الگ دھڑوں میں تقسیم کر دیا۔ عدم تشدد کی پالیسی کالعدم قرار دی جانے لگی اور نوجوان

جو سیاسی رہنماؤں کی نرم پالیسی سے تنگ آ چکے تھے، آتشیں اسلحہ کی تلاش میں مصروف ہو گئے۔ ہندوستان کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر ہر انگریز کو جان کے لالے پڑ گئے چنانچہ ۱۳-اپریل کو سائمن کمیشن کے ارکان حالات کا مزید انتظار کیے بغیر لندن واپس چلے گئے۔

خلیفہ قادیاں کا خطبہ

انہی افرا تفری کے دنوں خلیفہ قادیاں مرزا بشیر الدین محمود کو بھی سوجھی کہ انہوں نے جمعہ کے خطبہ میں غازی علم الدین کے متعلق حسب ذیل خطبہ دیا۔

"وہ خبیث الفطرت اور گندے لوگ جو انبیاء کو گالیاں دیتے ہیں ہرگز اس قابل نہیں کہ ان کی تعریف کی جائے۔ ان کی قوم اگر اپنے اندر دین داری اور اخلاق رکھنے کی مدعی ہے تو اس کا فرض ہے کہ ایسے افعال کی پورے درد کے ساتھ مذمت کرے۔ اسی طرح اس قوم کا، جس کے جوشیلے آدمی قتل کرتے ہیں خواہ انبیاء کی توہین کی وجہ سے ہی وہ ایسا کریں، فرض ہے کہ پورے زور کے ساتھ ایسے لوگوں کو دبایا جائے اور ان سے اظہار براءت کرے۔ انبیاء کی عزت کی حفاظت قانون شکنی کے ذریعے نہیں ہو سکتی۔ وہ نبی بھی کیسا نبی ہے، جس کی عزت بچانے کے لیے خون سے ہاتھ رنگنے پڑیں۔ جس کو بچانے کے لیے اپنا دین تباہ کرنا پڑے۔ یہ سمجھنا کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عزت کے لیے قتل کرنا جائز ہے، سخت نادانی ہے۔ وہ لوگ جو قانون کو ہاتھ میں لیتے ہیں وہ بھی مجرم ہیں اور اپنی قوم کے دشمن ہیں اور جو ان کی پیٹھ ٹھونکتا ہے وہ بھی قوم کا دشمن ہے۔ میرے نزدیک تو اگر یہی شخص راجپال کے قاتل سے جو گرفتار ہوا ہے تو اس کا سب سے بڑا خیر خواہ وہی ہو سکتا ہے جو اس کے پاس جائے اور اسے سمجھائے کہ دنیوی سزا تو اب تمہیں ملے گی ہی لیکن قبل

اس کے کہ وہ ملے تمہیں چاہیے کہ خدا سے صلح کرو۔ اس کی خیر خواہی اسی میں ہے کہ اسے بتایا جائے کہ تم سے غلطی ہوئی ہے۔"

(۱۹۔ اپریل ۱۹۲۹ء اخبار الفضل قادیان)

ان دنوں جب کہ مسلمان نوجوان تحریک شاتم رسول کی بیخ کنی کے لیے کفن بردوش ہو کر میدانِ عمل میں آچکے تھے خلیفہ قادیان کا مندرجہ بالا بیان ان نوجوانوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کے مترادف تھا جو توہین رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہندوانہ سازش کو بے نقاب اور ختم کرنا چاہتے تھے۔

اپریل کا پورا مہینہ اسی ہماہمی میں گزرا اور مئی کے شروع میں غازی علم الدین کا مقدمہ زیر دفعہ ۳۰۲ عدالت میں پیش ہوا۔ استغاثہ کی ابتدائی شہادتوں کے بعد غازی علم الدین نے اپنے بیان میں کہا۔

"میں اس عدالت میں اپنے جرم کا اقرار کرتا ہوں۔ میں نے کتاب رنگیلا رسول کے ناشر راجپال کو قتل کیا ہے۔ اس لیے کہ کتاب مذکور سے میرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت توہین ہوئی تھی۔ راج پال کو اپنے اس فعل پر نہ ندامت تھی اور نہ افسوس۔

اگر میں اس مقدمے میں بری کر دیا گیا تو میں توہین رسول کرنے والے کو پھر قتل کروں گا۔"

اس اقبالِ جرم کے بعد ۲۲ مئی ۱۹۲۹ء کو سیشن جج کی عدالت سے غازی علم الدین کو سزائے موت کا حکم ہوا۔

۱۵۔ جولائی کو ہائی کورٹ نے بھی اپیل خارج کر دی۔ پھر پریوی کونسل نے بھی فیصلہ بحال رکھا۔ آخر ۳۱۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو میانوالی جیل میں غازی علم الدین کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

مسلمانانِ لاہور کے مطالبے پر ۱۷ ۔ نومبر کو لاش لاہور لائی گئی اور لاکھوں مسلمانوں نے نمازِ جنازہ کے بعد اشک بار آنکھوں سے عاشقِ رسولؐ کو قبرستان میانی صاحب میں سپردِ خاک کیا۔

شردھانند کے بعد راج پال کے قتل نے گستاخ زبانوں کو قدرے لگام دے دی ۔ مگر کفر کے منظم فیصلے میں کوئی لچک نہ آئی ۔ غازی علم الدین کی شہادت نے قتل کے واقعات کو ہندوستان بھر میں مسلسل ہوا دی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قصور میں محمد صدیق نے پالے شاہ کو، کلکتہ میں محمد عبداللہ اور عبدالعزیز نے لاہور سے جاکر بھولارام کو، کراچی میں عبدالقیوم نے نتھورام کو، جہلم میں غلام محمد نے اپل سنگھ کو، پلول ضلع حصار کے سکھ ڈاکٹر کو معافی مانگنی پڑی اور کیمبل پور میں عبدالمنان نے پیارے لال کو قتل کیا۔

مندرجہ بالا تمام نوجوانوں کو سزائے موت ہوئی اور حرف آخرالذکر عبدالمنان کو سیشن جج مسٹر ڈی ایچ اکھوسلہ نے سات سال کی سزا دی اور فیصلے میں لکھا کہ کوئی مسلمان توہینِ رسولؐ برداشت نہیں کر سکتا۔

تحریک شاتمِ رسول میں قتال کا یہ سلسلہ ۱۹۳۴ء تک جاری رہا۔ ان مسلسل اور پیہم واقعات نے کفر کو اپنے فیصلوں پر نظرِ ثانی کے لیے مجبور کر دیا۔

شاہ جی کی یہ تحریک کہ "توہین رسول کرنے والی زبان نہ رہے یا توہین رسول سننے والے کان نہ رہیں"۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۴ء تک گاہے گاہے اپنا کام کرتی رہی ۔ یہاں تک کہ گستاخ زبانیں ہمیشہ کے لیے خاموش کرا دی گئیں ۔ وہ پھانسی کے رسّے اور دار کے تختے چوم لینے کے قابل ہیں جن کے ذریعے ان نوجوانوں کو موت کی سزا دی گئی جنہوں نے شاتمِ رسول کے ناپاک جسم کو ہمیشہ کے لیے خاک میں ملا کر اپنے لیے شہادت کا جام قبول کیا۔ ؏

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ڈیرہ غازی خاں

تحریک شاتم رسول اندر اندر اپنا کام کر رہی تھی کہ شاہ جی کو ڈیرہ غازی خاں جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ ۱۹۲۹ء کے وسط کی بات ہے۔ شاہ جی اس علاقہ کے اندرونی حالات سے ناواقف اور بے خبر تھے۔ غیر ملکی اقتدار کے باعث اس ضلع کی مسلم آبادی ایک طرف تمن داروں اور دوسری طرف ہندو ساہوکاروں کے چنگل میں پھنسی ہوئی تھی۔

سردار احمد خاں پتافی اس ضلع کے مشہور زمیندار اور اہل دل مسلمان تھے۔ اللہ کا دیا بہت کچھ تھا لیکن اپنے ضلع کے مذہبی حالات سے غیر مطمئن تھے۔ جب انہیں شاہ جی کی آمد کا علم ہوا تو اپنے گھر (راجن پور ڈیرہ غازی خاں) سے چند مخلص نوجوانوں کا ایک وفد لے کر شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔

۱ ـــــ اس ضلع کی دور افتادہ بستیوں میں یہ رواج پڑ چکا ہے کہ غریب مسلمان اپنی ضرورتوں کے لیے ہندو ساہوکار کے پاس معمولی رقم کے عوض اپنی بیٹیاں رہن رکھتا ہے اور قرض مع سود کی واپسی تک لڑکی ہندو ساہوکار کے پاس رہتی ہے اور اکثر ایسا ہوا کہ وہاں اس کے ہاں اولاد بھی پیدا ہوئی۔

۲ ـــــ ڈیرہ غازی خاں کے مسلمانوں نے ۱۸۷۲ء کے بندوبست میں فرنگی عدالتوں میں اپنے آپ کو قرآن کریم کی بجائے رواج کا پابند لکھوایا، جس کے باعث انہوں نے اپنی بیٹیوں کو جائداد سے محروم قرار دیا ہے جب کہ قرآن کریم سورہ نساء میں بیٹی کو بھی باپ کی جائداد کا وارث قرار دیتا ہے۔

۳ ـــــ ضلع کے تمن داروں نے اپنی تفریح طبع کے لیے کتے اور سؤر پال رکھے ہیں۔ جب یہ لوگ موج میں آتے ہیں تو ان جانوروں کے درمیان لڑائی کا تماشہ دیکھتے ہیں۔ اگر کتا جیت جائے تو اس کا جلوس نکالتے ہیں اور سؤر کو مار کر اس کے گوشت میں بہترین قسم کے بیگمی چاول ڈال کر پلاؤ پکا کر کتے کو کھلاتے ہیں۔

(شاید یہی وجہ ہے کہ اس علاقے میں ایک مدت سے اچھی قسم کے چاول کی پیداوار ناپید ہو چکی ہے)

مندرجہ بالا واقعات کے بعد سردار احمد خاں تیپانی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دل کے ساتھ زبان اور نظر بصیرت عطا کی ہے۔ اگر آپ نے اس ضلع کی ناگفتہ بہ حالت کی طرف توجہ نہ کی تو عنداللہ آپ مجرم ہوں گے۔ میری دولت اس کام کے لیے آپ کی پوری طرح معاون ہو گی۔

شاہ جی حالات سن کر زار و قطار رونے لگے اور سردار احمد خاں سے وعدہ کیا کہ میں جب تک زندہ رہوں گا، اس علاقہ کے مسلمانوں کی اصلاح میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کروں گا۔ چنانچہ شاہ جی ہر سال جون اور جولائی کے تپتے ہوئے موسم میں جب کہ یہاں کا کسان اور مزدور پیشہ طبقہ فصل کی کٹائی اور بٹائی سے فارغ ہوتا تھا اس ضلع میں تشریف لے جاتے۔ شہری آبادیوں سے دور آبادکاروں کی بستیوں میں دوپہر کے وقت ان کی زبان میں خطاب کرتے۔ دس دس اور بیس بیس کوس سے آئے ہوئے دیہاتی شاہ جی کی باتیں سنتے۔ گھنٹوں خطاب کرنے کے بعد شاہ جی ان سے سوال کرتے۔

"میڈھی کائی گال سمجھ گدھی ہا" (میری کوئی بات آپ کی سمجھ میں آئی ہے)

اگر جلسے میں ایک دیہاتی نے بھی کہہ دیا،

"سائیں کو" یعنی کوئی نہیں

تو شاہ جی پھر اس ایک دیہاتی کو سمجھانے کے لیے سارے مجمع سے اسی طرح گفتگو خطاب کرتے۔ جب تک پورا مجمع بات سمجھ نہ لیتا تقریر ختم نہ کرتے۔

اس طرح زندگی کے تیس برس مسلسل ڈیرہ غازی خاں کے عوام کو مختلف اوقات میں خطاب کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمن داروں نے کتنے اور سوروں کی پرورش سے توبہ کر لی۔ اس علاقہ کے وڈیروں سے روپیہ لے کر غریب مسلمان لڑکیوں کو ہندو ساہوکاروں کے

چنگل سے نجات دلائی۔ شہری اور دیہاتی مسلمان کو مجبور کیا کہ شریعت کی رو سے اپنی جائیداد میں سے لڑکیوں کو بھی حصہ دیں۔ قانون تو تبدیل نہ ہوسکا لیکن ڈیرہ غازی خاں اور ضلع مظفر گڑھ کے اکثر لوگوں نے شریعت کے اس قانون کی پیروی شروع کردی۔ شاہ جی جن دنوں اس علاقے کا دورہ کرتے، گرمی کی شدت سے ان کے تمام جسم پر پھوڑے پھلسیاں نکل آتیں اس کے باوجود دور دراز ایسی بے آب وگیاہ بستیوں میں جاتے جہاں کے لوگ پانی کی قلت کی وجہ سے مجبور ہوکر جوہڑ کا پانی پیتے اور کھانے کے لیے انہیں پیاز، اچار یا مسور کی دال میسر تھی۔ جن گھروں میں گوشت یا دوسری بہتر خوراک میسر آسکتی تھی، شاہ جی نے ان گھرانوں سے یہ کہہ کر ہمیشہ اجتناب کیا۔

"میں جن لوگوں کو سمجھانے آیا ہوں، اگر ان کے ساتھ گھل مل نہ جاؤں تو ان پر میری بات کا اثر نہیں ہوسکتا۔"

حالانکہ یہ ضلع پیر پرستی میں پنجاب کے تمام اضلاع پر سبقت رکھتا ہے اور شاہ جی چاہتے تو یہاں کی غربت اور عوام کی سادگی سے پورا فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ علاقے کے تمن دار انہیں سونے کے برابر وزن کرتے لیکن وہ دیہاتیوں کے ساتھ کھاتے پیتے اور انہی کے گھروں میں ٹھہرتے، جہاں ایک طرف ڈھور ڈھنگر بندھے ہوتے اور تمام کمرہ گوبر کی بدبو سے اٹا ہوتا مگر شاہ جی کی پیشانی پر کبھی شکن نہ پڑتی۔ تیس برس اسی جدوجہد میں گزرے جس نے اس اسلام اور انسانیت کے حق میں بہتر نتائج پیدا کیے۔

ایک واقعہ ڈیرہ غازی خاں سے چالیس میل دور حاجی پورہ نامی گاؤں میں ایک بزرگ کی خانقاہ پر عرس کے دنوں لوگ بُرے افعال کے مرتکب ہوتے تھے اتفاقاً شاہ جی کا گزر ڈیرہ غازی خاں سے ہوا تو آپ نے مذکورہ گاؤں میں جانے کا فیصلہ کیا۔ اس ارادے کی اطلاع جب ضلع کے انگریز ڈپٹی کمشنر مسٹر ایل، اے، اگل کو ہوئی تو اس نے شاہ جی پر پابندی عاید کردی کہ وہ حاجی پورہ نہیں جاسکتے۔ شاہ جی نے ڈپٹی کمشنر کا یہ حکم

مان لیا لیکن شہر میں اپنی تقریر کی منادی کرادی اور رات جلسے میں ڈپٹی کمشنر بھی معہ اپنی بیگم کے شاہ جی کی تقریر سننے آیا۔ شاہ جی کو اس کا پتہ چل گیا۔ دورانِ تقریر ڈپٹی کمشنر کو خطاب کرتے ہوئے کہا،

> "مسٹر ڈپٹی کمشنر! گو آپ نے مجھے حاجی پورہ جانے سے روک دیا۔ اگر میں وہاں جاتا تو لوگوں کو بھنگ، چرس اور اسی قسم کی دوسری منشیات سے منع کرتا کہ بزرگوں کے مزارات فاتحہ خوانی کے لیے ہوتے ہیں، نہ کہ اس قسم کی بری چیزوں کے لیے۔ خیر اب میں تمہیں اسلام سمجھاتا ہوں۔ اگر تم مع اپنی بیوی کے مسلمان نہ ہو جاؤ تو میرا نام بخاری نہیں"

یہ سن کر ڈپٹی کمشنر فوراً جلسہ گاہ سے چلا گیا۔

ہتھکڑی

۱۹[illegible]ء میں شاہ جی ڈیرہ غازی خاں گئے تو حلقہ احباب سے پوچھا کہ یہاں مستری دوست محمد لوہار کون ہیں! میں انہیں ملنا چاہتا ہوں، دوستوں نے وجہ پوچھی تو کہا "ان کے ہاتھ کی بنی ہوئی ہتھکڑی نے مجھے ہمیشہ آرام پہنچایا اور وہ میرے ہاتھ میں پوری اترتی ہے۔ جنوب مغربی پنجاب پولیس کے لیے ہمیشہ مستری دوست محمد نے ہتھکڑیاں مہیا کیں اور ہر ہتھکڑی پر انگریزی کے حروف ایم۔ڈی۔ایم کندہ ہوتے ہیں جنہیں پڑھ کر شاہ جی نے انہیں ملنے کی خواہش کی۔ چنانچہ بڑی مشکل سے مستری صاحب کو تلاش کیا گیا۔ شاہ جی ان سے ملے تو وہ بہت خوش ہوئے اور شاہ جی ہتھکڑی کے موضوع پر ان سے گھنٹوں گفتگو کرتے رہے۔

ہتھکڑی کے لیے کس قسم کا لوہا استعمال ہوتا ہے؟ اس کے سانچے کیسے تیار کیے جاتے ہیں؟ اس پر کوئی سرکاری پابندی ہے یا نہیں؟ بعض مجرم پولیس کی موجودگی میں ہتھکڑی اتار کر فرار ہو جاتے ہیں، یہ کیسے؟۔

ان سوالات میں شاہ جی نے اس قسم کا مزاح پیدا کیا کہ تمام محفل کشت زعفران بنی رہی

ملتان کا محرّم

حادثہ کربلا انسانیت کے دامن پر اس قدر عظیم داغ ہے کہ دریائے فرات، دجلہ اور نیل مل کر بھی اس داغ کو دھونا چاہیں تو اپنا سامنہ لے کر رہ جائیں گے۔ اسلام نے جو اصول وضع کیے تھے خانوادہ نبوت نے اپنے خون سے ان اصولوں کی پالنا کی اور قیامت تک کے لیے ضابطہ حیات میں ایسا سنگ میل نصب کیا کہ آنے والا ہر مسافر اسی پگڈنڈی پر گامزن رہ کر منزلِ حیات کا نشان پا سکتا ہے۔

صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ بنی نوع انسان نے اس جانکاہ حادثہ کو شدید رنج و غم سے محسوس کیا لیکن دو قسم کے عوام نے واقعہ کربلا کو بظاہر زیادہ محسوس کیا۔ اول وہ جنہیں احکامِ شریعت سے ناآشنائی رہی اور اس طرح سے وہ نمائشی جذبات کا مظاہرہ کرنے میں زیادہ کامیاب ہوئے، دوسرے وہ جنہوں نے امام حسین علیہ السلام کی قربانی کو بطور پیشہ کے اپنایا۔ محرم الحرام کے دنوں میں تعزیہ داری میں جو لوگ نالہ و شیون کے طریقے اختیار کرتے ہیں۔ ان میں بعض ایسے افراد بھی شامل ہوتے ہیں جن کے پیش نظر مندرجہ بالا مقاصد کے سوا کوئی دوسرا اصول کارفرما نہیں ہوتا۔

سال ۱۹۲۹ء کی آخری ششماہی میں جب شاہ جی ملتان گئے تو محرم کی رسم تعزیہ داری کو دیکھ کر بے چین ہو گئے۔ تیرہ روز تک شہر کے مختلف محلوں میں اس رسم کے خلاف تقریریں کیں۔ جس کی بناء پر مخصوص عقائد رکھنے والے لوگ اس قدر مشتعل ہوئے کہ شاہ جی کے خلاف شہر میں باقاعدہ محاذ قائم کر لیا گیا اور اس قدر اشتعال پھیلایا کہ آخری دن جب "عام خاص باغ" میں جلسے کا اعلان ہوا تو شہر کے خان بہادر آنریری مجسٹریٹ اور سرکاری قسم کے دوسرے لوگوں نے انگریز ڈپٹی کمشنر سے کہا کہ اگر آج عطاء اللہ شاہ نے ملتان میں تقریر کی تو وہ قتل ہو جائے گا۔ اس پر ڈپٹی کمشنر نے خان بہادر سید حسن بخش گردیزی آنریری مجسٹریٹ سے کہا۔

"اگر تمہارے اس اشارے کے بعد عطاء اللہ شاہ قتل ہو گیا تو میں تمہیں بطور

مجرم کے گرفتار کروں گا۔

ملتان کی فضا شیعہ سنی منافرت سے گدلی ہو چکی تھی اور واقعی اس دن یہ خوف تھا کہ شاہ جی قتل کر دیے جائیں گے۔ جماعتی دوستوں نے بھی شاہ جی کی خدمت میں درخواست کی کہ آج شہر میں آپ کے خلاف حالات اس قدر زہریلے کر دیے گئے ہیں کہ آپ کی جان خطرے میں ہے، لہٰذا آپ اگر آج جلسہ میں کوئی ایسی بات نہ کہیں تو بہتر ہے۔ اس پر شاہ جی نے کہا:۔

"میرا جواب وہی ہے جو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے زکوٰۃ کے معاملہ میں حضرت عمر فاروقؓ کو دیا تھا۔ اگر تم سب ڈرتے ہو تو میں آج اکیلا جلسے میں جاؤں گا اور وہی بات کہوں گا، جو میرا ضمیر کہے گا۔

"ملتان کی عوامی تاریخ میں اس قدر اجتماع دوبارہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ پولیس جلسہ کے چاروں طرف ہر طرح کے کیل کانٹوں سے لیس کھڑی ہے۔ تمام فرقے اپنی اپنی حفاظت کے لیے تیار ہیں۔ دلوں میں جذبات، آنکھوں میں خون، سینوں میں انتقام کے شعلے موجزن ہیں کہ شاہ جی اپنے حلقہ احباب کی معیت میں جلسہ گاہ پہنچے۔

دن کی روشنی آج پھر ایک سید کے ایمان کا امتحان لینا چاہتی ہے۔ شاہ جی نے اسٹیج پر آتے ہی کلام پاک کی تلاوت شروع کی۔ تقریباً پون گھنٹہ قرأت کے بعد داستان کربلا اس انداز سے بیان کی کہ سارا مجمع آہ و فغاں کرنے لگا۔ جیسے جیسے دھوپ کی تمازت بڑھتی جاتی، شاہ جی کا زورِ بیان نکھرتا جا رہا تھا۔ دورانِ تقریر آپ نے کہا:۔

" ان پاک شخصیتوں کے دن ضرور مناؤ! جو قومیں اپنے آباؤ اجداد کے نشان چھوڑ دیتی ہیں، ان کی تاریخ بے نشان ہو کر مٹ جاتی ہے۔"

شیعہ حضرات سے خطاب کرتے ہوئے کہا،

"کون بدبخت تمہیں اپنے عقیدے سے منع کرتا ہے لیکن میرے عزیزو! میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ امام حسینؓ، فاطمۃ الزہرہؓ، بی بی زینبؓ اور معصوم سکینہؓ

کے ماتم کے لیے تمہیں یا زاری حورتیں ہی ملتی ہیں؟ اس طاہر خاندان کے پاک
اور صاف لباس پر گندی نالی کے چھینٹے اڑاتے ہو؟ تم کیسے حسینؓ کے نام لیوا ہو
اپنے ہاتھ سینوں پر نہیں اللہ کے آگے پھیلاؤ کہ وہ ہمیں ان پاک روحوں کے
نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے۔ میں تو تمہیں نیکی کی بات بتا رہا ہوں اور
تم ہو کہ میرے قتل کا سامان کر رہے ہو۔ اگر واقعی عطا اللہ شاہ قتل کے قابل
ہے تو یہ سینہ حاضر ہے۔"

اس موقع پر شاہ جی نے جذبات سے اپنا گریبان چاک کر لیا۔ بس پھر کیا تھا، سارا مجمع
بے اختیار چیخیں مارنے لگا۔ اور شاہ جی بار بار کہہ رہے تھے:۔

"نکالو اپنے اپنے خنجر! سیّد کا سینہ حاضر ہے۔ تم نے پہلے بھی ایک سیّد
مسافر کو قتل کیا تھا، آج پھر اس سُنّت کو تازہ کر دو! میں سیّد بھی ہوں اور مسافر بھی"۔

شاہ جی اس وقت قرآن کریم کی بار بار تلاوت کر رہے تھے۔ آخر جب سارا جلسہ
اپنے آنسو ختم کر چکا تو آپ نے جلسہ ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔

جلسہ کے اختتام پر خان بہادر چودھری ناظر خاں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ملتان
اور حاجی رانجھا خاں مال آفیسر ملتان نے آگے بڑھ کر شاہ جی کے گھٹنوں کو چھوا اور کہا:۔

"آج شہر کا امن آپ کے ایک ایک بول کا محتاج تھا۔ اللہ آپ کو
جزائے خیر دے کہ آپ نے امن بحال رکھنے میں ہماری امداد کی"۔

اس جلسہ کے بعد کئی سال تک تعزیہ داری کے جلوس میں "اس بازار" کا داخلہ بند رہا۔

شارِدا بِل عیسائی قومیں عالم اسلام کے خلاف ابتدائے آفرینش سے عجیب و غریب
حربے استعمال کرتی آئی ہیں۔ کہیں اپنی اکثریت کے سہارے اور کہیں
حکمرانی کے زور پر۔ لیکن اسلام باوجود مظلوم ہونے کے صرف اپنی حقانیت کی بنا پر
پروان چڑھتا رہا۔

متحدہ ہندوستان میں عیسائی حکمرانوں نے نئے نئے حیلے بہانوں سے اسلام اور مسلمانوں کو دوسری اقوام کی نظر میں اپنی غلامی کے زور پر رسوا کرنے میں ایسی حرکتیں کیں کہ جن سے خطرہ ہونے لگا کہ مسلمان اپنی قدریں مٹا کر کفر کی آغوش میں امان ڈھونڈنے جا رہے ہیں، لیکن دیوبند سے فارغ التحصیل رہنماؤں نے فرنگی حکمرانوں کی قلبی کیفیت کا اندازہ کرتے ہوئے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح سامنے آکر حکمران جماعت کے تمام ہتھیار بیکار کر دیے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد تو اکثر قانون ہندوستان میں ایسے وضع کیے گئے جن کی براہ راست زد اسلام پر پڑتی رہی، لیکن غیر ملکی نظام حکومت ان سے بیگانہ رہ کر اپنا کام کرتا رہا۔

۲۳ ستمبر ۱۹۲۹ء کو دہلی سنٹرل اسمبلی کے ہندو ممبر مسٹر ہربلاس شاردا نے ایک مسودہ قانون پیش کیا جو آگے چل کر شاردا بل اور شاردا ایکٹ کے نام سے مشہور ہوا۔

شاردا بل بظاہر ہندو سوسائٹی کی اصلاح سے متعلق تھا لیکن اس کے پس منظر میں ایک ایسا اوچھا وار تھا کہ جس کی ضرب سے احکامِ شریعت براہِ راست متاثر ہوتے تھے۔ چنانچہ بل پر بحث سے قبل یہ سوال سامنے آیا کہ یہ بل صرف ہندو عوام تک رہے گا یا ہندوستان کے تمام مذاہب اس سے متاثر ہوں گے۔ اور اکثر مسلمان ارکان اسمبلی نے بغیر علماء کے مشورہ کے اس بل کی تائید کر دی۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۲۹ء کو یہ بل پاس کر دیا گیا نیز یکم اپریل ۱۹۳۰ء سے اس بل پر عملدرآمد ہونا منظور کیا گیا۔

جمعیۃ العلمائے ہند نے قرآنِ کریم کے واضح ارشاد کی روشنی میں شاردا بل کو مداخلت فی الدین قرار دے کر اس کے نفاذ سے پیشتر اس قانون کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ انبالہ سے پرلی طرف مولانا احمد سعید اور پنجاب سے سرحد تک کے اضلاع شاہ جی کے سپرد کیے گئے۔

۲۸ ستمبر ۱۹۲۹ء سے یکم اپریل ۱۹۳۰ء تک دونوں رہنماؤں نے اپنی اپنی ذمہ داریوں

کے پیشِ نظر ہزاروں نابالغ بچوں کے نکاح پڑھا کر اور عوام کو اس کی ترغیب دے کر انگریز کے اس قانون کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا۔ آج بھی پنجاب اور سرحد میں سینکڑوں گھرانے ایسے ملیں گے جنہیں شاہ جی نے اس زمانے میں آباد کیا تھا۔

شاردا ایکٹ جس کا محرک بظاہر غیر مسلم تھا۔ جس کی رو سے اٹھارہ سال سے کم عمر لڑکی اور اکیس سال سے کم عمر لڑکے کی شادی قانوناً جرم قرار دے دی گئی تھی، عیسائی حکومت کی قانونی قوت نے اسے ایسی زندگی بخشی کہ اگر اس پر عمل درآمد ہوتا تو اسلام کے اصول بری طرح مجروح ہوتے۔

سرگودہا، میانوالی، گجرات، جہلم ایسے اضلاع ہیں کہ انگریزی عملداری میں یہ علاقے فوجی مرکز سمجھے جاتے تھے۔ ان پر کسی انگریزی قانون کا عاجلانہ اطلاق مشکل نہیں تھا، مگر شاہ جی نے شب و روز کی تقریروں سے ان علاقوں میں شاردا ایکٹ کو ناکارہ بنا دیا۔ ہر فرد نے شاہ جی کی آواز پر لبیک کہا اور شاردا ایکٹ کی دھجیاں بکھیر دیں۔

مجلسِ احرار کی صدارت

نہرو رپورٹ کی ناکامی کے باعث ہندوستان کے سیاسی افق پر واقعات کے نئے بادل اُمڈ آئے۔ ہواؤں کا رخ اس انداز سے تبدیل ہوا کہ سارا ہندوستان تلخی محسوس کرنے لگا۔ سائمن کمیشن کی ناکام واپسی کے بعد گاندھی جی نے انگریزوں کو چیلنج کیا کہ اگر ۱۹۲۹ء کے آخر تک نہرو رپورٹ کے فارمولا کو منظور نہ کیا گیا۔ اور اسے سرکاری حیثیت نہ دی گئی تو میں عدم تشدد کی لڑائی شروع کر دوں گا۔ برطانوی حکومت گاندھی جی کی اس تجویز کو ہواؤں میں اڑا کر مستقبل کا انتظار کرنے لگی۔ انگریزی حکومت کی اس بے اعتنائی کے سبب دسمبر ۱۹۲۹ء کو لاہور میں دریائے راوی کے کنارے آل انڈیا کانگریس کے سالانہ اجلاس کے موقع پر گاندھی جی نے نہرو رپورٹ کو دریائے راوی کی لہروں کے سپرد کر دیا۔

مسلمان رہنماؤں نے گاندھی جی اور کانگریس کی اس حرکت کو سکھوں کی بے جا حمایت اور مسلمانوں سے ناانصافی قرار دے کر اپنی علیحدہ تنظیم کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد

کی تجویز پر نیشنلسٹ مسلمانوں نے آل انڈیا کانگریس کے پنڈال میں چودھری افضل حق کی صدارت میں ایک اجلاس منعقد کیا۔ جس میں شاہ جی کے علاوہ مولانا ظفر علی خاں، مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی، شیخ حسام الدین، خواجہ عبدالرحمان غازی، مولانا مظہر علی اظہر اور دوسرے مسلمان رہنما شامل ہوئے۔ اس اجلاس میں مجلس احرار کی بنیاد رکھی گئی اور شاہ جی کو پہلا صدر منتخب کیا گیا۔

نمک ستیہ گرہ

مجلس احرار کی بنیاد کے ساتھ ہی کانگریس نے اپنے سالانہ اجلاس میں مکمل آزادی کی قرار داد منظور کر کے اقوامِ ہند کو آزادیٔ وطن کیلئے ایثار و قربانی کی نئی دعوت دی۔ مسلمان جس نے سلطان حیدر علی ٹیپوؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ، رانی آف جھانسی اور ۱۸۵۷ء جیسی تحریکات میں فرنگی سامراج کے خلاف جہادِ آزادی میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ کانگریس کی اس دعوت کو بھی قبول کر لیا۔ مجلس احرار کے رہنماؤں نے نئی عمارت کی تعمیر کو عارضی طور پر روک دیا اور سب کے سب کانگریس کے ہم نوا ہو کر آزادی کی نئی جدوجہد میں شامل ہو گئے۔

۱۹۲۹ء کے ڈوبتے ہوئے آفتاب کی آخری شعاعوں نے شفق میں ایسا رنگ بھر کر ۱۹۳۰ء کا سال غلام ہندوستان کے لیے مصائب و آلام کی بے شمار آزمائشیں اپنے ساتھ لایا۔ شدھی اور سنگھٹن، تحریکِ شاتمِ رسولؐ، شاردا ایکٹ ایسی فرقہ وارانہ تحریکات ہنوز ہندوستان میں اپنے کام میں مصروف تھیں۔ شاہ جی ان کے فیصلوں سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ مجلس احرار کی صدارت نے شاہ جی کی ذمہ داریوں میں مزید اضافہ کر دیا۔ جماعت نے جنگِ آزادی میں کانگریس کے دوش بدوش لڑائی لڑنے کا فیصلہ کر کے شاہ جی کو مزید الجھا دیا۔

غلام غیر ملکی آقاؤں سے آزاد ہونے کے لیے زندگی کا آخری اثاثہ لے کر میدانِ کارزار میں اپنی صفیں درست کرنے لگے۔ کفن بردوش مجاہد شہادت کی لَے پر موت کے گیت چھیڑ کر شہادت گاہِ الفت کی طرف رواں دواں ہونے۔ جیل خانے، ہتھکڑیاں، پھانسی کے

تختے، مشین گنیں، بید زنی، لاٹھی چارج، پولیس، فوج، انگریزی سامراج اپنے ظلم و جور کی یہ ساری پونجی جمع کرنے میں مصروف ہو گیا۔ یہ وہی دن تھے جب لاہور میں سردار بھگت سنگھ اور مسٹر بی۔ کے۔ دت کو موت اور عبور دریائے شور کی سزائیں سنائی جا چکی تھیں۔ اور پورا ملک انگریزی حکومت کے خلاف اپنی ناراضگی کا اظہار کر رہا تھا۔ مہاتما گاندھی نے ۱۲۔ مارچ ۱۹۳۰ء کو ڈانڈی ضلع گجرات (کاٹھیاواڑ) میں نمک بنا کر انگریزی قانون کی خلاف ورزی کرنے کا اعلان کیا اور بہتر آدمیوں کا جتھہ لے کر اپنے مرکز سے روانہ ہوئے اور گرفتار کر لیے گئے۔ اس گرفتاری کے ساتھ ہی سارے ہندوستان میں نمک ستیہ گرہ کی تحریک شروع ہو گئی۔

امیرِ شریعت کا اعزاز

پیشتر ازیں تحریر کیا جا چکا ہے کہ ہندوستان کی سیاسی اور مذہبی ابتری نے ملک کا امن و سکون تہ و بالا کر دیا تھا اور یہ خانہ ویرانی اسلام کی ترقی کی راہ میں سنگِ گراں تھی۔ ہندو کے طرزِ عمل نے مسلمانوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے لیے شہادت کی موت تلاش کریں تاکہ ہندوستان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آبرو محفوظ رہ سکے۔ شدھی و سنگٹھن شاردا ایکٹ، تحریک شاتمِ رسول کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے کمزور اور قلیل تعداد مسلمانوں کو اس قدر ہراساں کر دیا تھا کہ علمائے کرام کی اپنی ذمہ داریاں بھی مخدوش نظر آنے لگی تھیں۔ خطیب شہر کی اذان بے اثر ہو رہی تھی۔ صحن حرم اور مسجد کے مینار اپنی رونق کی تلاش میں سرگرداں تھے کہ مارچ ۱۹۳۰ء کے آخری دنوں لاہور میں انجمن خدام الدین کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت علامہ انور شاہ صاحب کاشمیری نے فرمائی۔ وقت اور حالات کی موجودگی میں علمائے ہندوستان کا یہ تاریخی اجتماع تھا۔ دوسرے علماء کے ساتھ شاہ جی بھی اس جلسے میں شریک ہوئے۔ ہزاروں کا اجتماع تھا۔ صدارتی تقریر ہو رہی تھی کہ شاہ جی جلسہ گاہ میں پہنچے۔ حضرت انور شاہ صاحب فرما رہے تھے :۔

"دین کی قدریں بگڑ رہی ہیں۔ کفر چاروں طرف سے یلغار کر چکا ہے۔ اس وقت مسلمانوں کو اپنے لیے ایک امیر کا انتخاب کرنا چاہیے۔ اس کے لیے

میں سید عطا اللہ شاہ بخاری کو منتخب کرتا ہوں۔ وہ نیک بھی ہیں اور بہادر بھی۔ اس وقت تک انہوں نے فتنۂ شاتم رسول اور شاردا ایکٹ کے سلسلے میں جس جرأت اور دلیری سے دین کی خدمات انجام دی ہیں، آئندہ بھی ان سے ایسی ہی توقع ہے۔

یہ کہہ کر حضرت انور شاہ صاحب نے اپنے دونوں ہاتھ شاہ جی کی طرف بڑھائے اور شاہ جی نے اپنے دونوں ہاتھ حضرت انور شاہ صاحب کے ہاتھوں میں دے کر فرمایا:۔

"آپ یہ نہ سمجھیں کہ حضرت نے میرے ہاتھ پر بیعت کی بلکہ حضرت نے مجھے اپنی غلامی میں قبول فرمالیا ہے"

یہ جملے کہہ کر شاہ جی زار و قطار رونے لگے اور ان کا سارا جسم کانپنے لگا۔ اس کے بعد باقی علماء جن کی تعداد پانچ صد تھی اس وقت شاہ جی [1] کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ان میں مولانا ظفر علی خاں، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا احمد علی لاہوری سرفہرست تھے۔

حصولِ زندگی میں مذہب ایسے جذبات کا مجموعہ ہے جس سے عقلِ انسانی احاطہ نہیں کرسکتی اور نہ ہی فکر و تدبر میں ان کا وزن کیا جاسکتا ہے۔ جنونِ شوق ہی البتہ اس کسک کو محسوس کرتا ہے۔ پھر نمرود کی آگ ہو یا دریائے نیل کی موجیں وہ ان تمام خطرات کی دعوت پر لبیک کہتا ہے۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۰ء تک فرنگی عملداری میں کفر و ارتداد نے اصول اسلام، داعیٔ اسلام اور مسلمانوں پر وقت کے مختلف موڑوں سے جس طرح بے محابا خشت باری کی حضرت امیر شریعت سینہ سپر ہو کر ان سے ٹکرائے اور بامراد ہوئے۔ حضرت انور شاہ صاحب اور دیگر پانچ صد مقتدر علماء کا سید عطا اللہ بخاری کو امیر شریعت کا اعزاز بخشنا انہی خدمات کا صلہ تھا اور ہنوز مستقبل کی کئی امیدیں ان سے وابستہ تھیں۔

---

[1] آئندہ شاہ جی کی بجائے امیر شریعت کا لفظ آئے گا۔

امروہہ میں جمعیۃ علمائے ہند کا اجلاس

مہاتما گاندھی کی گرفتاری کے بعد ستیہ گرہ کی تحریک میں خاصا ہیجان پیدا ہو گیا اور سول نافرمانی کے ذریعے رضاکار، کارکن، رہنما جیل خانوں میں جا چکے تھے۔ مجلس احرار کے سوا باقی مسلم جماعتیں اور خاص کر جمعیۃ علمائے ہند جو نہرو رپورٹ میں اختلاف کے باعث کانگرس سے الگ ہو چکی تھی ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تھی۔ مولانا حسین احمد مدنی آزادیٔ وطن کی تحریکات میں کانگرس سے اشتراک کے حامی تھے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا اشرف علی تھانویؒ الگ اپنی رائے رکھتے تھے۔ نہرو رپورٹ سے علیحدگی کے باعث علی برادران نے بھی جمعیۃ العلماء علیحدہ بنالی تھی جسے دوسرے گروہ کی تائید حاصل تھی۔

ہندوستان میں اس کشمکش نے مسلمانوں کو من حیث القوم کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے مجبور کیا تھا۔ چنانچہ اول الذکر گروہ نے ۳۔مئی ۱۹۳۰ء کو امروہہ ضلع مرادآباد میں اپنا ایک اجلاس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ جمعیۃ علماء کا یہ تاریخی اجتماع تھا جس میں جمعیت کی آئندہ پالیسی پر غور ہونا تھا۔

امیرِ شریعت پنجاب میں سول نافرمانی کا آغاز کر چکے تھے۔ حکومت ان کے مدمقابل آ چکی تھی اور گرفتاری کی تیاریوں میں تھی کہ مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی نے، جو ان دنوں گرفتار ہو کر لدھیانہ جیل میں تھے، امیرِ شریعت کو کسی طرح جالندھر سے لدھیانہ بلا بھیجا۔ امیرِ شریعت لدھیانہ ڈسٹرکٹ جیل کے سپرنٹنڈنٹ پنڈت من موہن کی موٹر میں لدھیانہ پہنچے اور نصف رات گئے سپرنٹنڈنٹ جیل کے ذریعے ہی مولانا حبیب الرحمٰن سے ملے۔ وہاں فیصلہ ہوا کہ امیرِ شریعت راتوں رات پنجاب کی حدود سے نکل کر امروہہ پہنچنے کی کوشش کریں تاکہ جمعیت علمائے ہند کو مجبور کیا جا سکے کہ وہ بلا شرط آزادیٔ وطن کی تحریک میں کانگرس سے اشتراک کرے۔ چنانچہ ۲۔مئی کو امیرِ شریعت امروہہ پہنچ چکے تھے۔

علی برادران کی جمعیۃ العلماء کا اجلاس بھی انہی تاریخوں پر دہلی میں ہو رہا تھا۔ دونوں

جماعتیں اپنی اپنی جگہ بضد تھیں۔ جمعیۃ علمائے ہند کے خلاف امروہہ کے مخالفین نے مشہور کر دیا تھا کہ یہ ہندوؤں کی زر خرید ہیں، وہابی ہیں، نجدی ہیں، پیروں کے دشمن ہیں۔ انگریزوں سے لڑ کر مسلمانوں کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں وغیرہ! اس پروپیگنڈے سے گمراہ ہو کر مقامی رضاکاروں نے جمعیت کے جلوس کا ارادہ ملتوی کر دیا لیکن امیر شریعت نے امروہہ پہنچ کر حکم دیا:۔

"آج ہم مفتی ہیں۔ جلوس کے نکالے جانے پر ہمارا فتویٰ چلے گا۔ لہٰذا امروہہ کے بازاروں میں جلوس نکلے گا اور اس کی رہنمائی ہم خود کریں گے۔"

جلوس عربی لباس میں جمعیۃ علماء کے رضاکاروں نے اونٹوں پر نکالا اور ہراول دستے میں امیر شریعت کا اونٹ سب سے آگے تھا۔ یہ ۲۔ مئی کا واقعہ ہے۔ اسی رات امروہہ میں امیر شریعت کی تقریر کا بھی اعلان کیا گیا جس میں مخالفین نے اپنی پوری قوت کا مظاہرہ کیا۔ لیکن امیر شریعت کی تقریر جو بعد نمازِ عشا شروع ہو کر رات تین بجے تک جاری رہی، میں کسی کو لب کشائی کا موقع نہ ملا۔ دورانِ تقریر دو آدمی بے ہوش ہو گئے۔ یہ دونوں رائے میں اختلاف رکھتے تھے لیکن امیر شریعت کی تقریر سے ایسے متاثر ہوئے کہ ان کے اعضا شل ہو گئے۔

۳۔ مئی کو جمعیۃ علمائے ہند کا تاریخی اجلاس مولانا سید معین الدین اجمیری کی صدارت میں شروع ہوا جس میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی تجویز پر بحث شروع ہوئی کہ جمعیۃ علمائے ہند کو کانگرس کی تحریک سول نافرمانی میں شامل ہو جانا چاہیے۔ اس تجویز کی تائید مولانا حسین احمد مدنی نے کی۔ اس قرارداد کی مزید تائید میں حضرت امیر شریعت نے تین دن (۷ گھنٹے) تقریر کرتے ہوئے دلائل و براہین کے انبار لگا دیے۔ اس تاریخی تقریر کے مختصر جملے ہاتھ لگے ہیں جو حسب ذیل ہیں:۔

"علمائے کرام! خلافت کی تحریک کے بعد ایک اور وقت آیا ہے کہ ہم

عالمِ اسلام کے دشمن فرنگی سے جس کی حکومت میں سورج غروب نہیں ہوتا مگر اسلام کے غروب ہونے کا خطرہ بڑھ رہا ہے ایسی جنگ لڑیں کروہ ہندوستان کو چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔ اگر ہم بحیثیت مسلمان انگریز کو یہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو گئے تو یاد رکھیں اس سے نہ صرف عرب ریاستیں بلکہ تمام بلادِ اسلامیہ ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جائیں گے۔

میں ہندو کو بھی اپنا دوست قرار نہیں دیتا۔ لیکن ان کی دشمنی ساحلِ سمندر تک محدود ہے مگر انگریز تو سمندر پار تک اسلام کا تعاقب کر رہا ہے۔

اگر میں اپنے چھوٹے دشمن (ہندو) کے ساتھ مل کر انگریز ایسے اسلام کے بڑے دشمن کو شکست دے سکوں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ سودا کوئی مہنگا نہیں ہو گا۔

علمائے کرام! اگر میرا بس چلے تو میں انگریزوں کو مارنے کے لیے سوروں سے اتحاد کرنے میں بھی گریز نہ کروں۔ کیونکہ اس کی زندگی سے اسلامی تہذیب و تمدّن اور انسانیت کی موت ہو جائے گی اور اس کی موت سے اسلام اور مسلمان زندہ ہو جائیں گے۔ اسلامی ممالک میں اتحاد بڑھے گا۔ مسلمانوں میں رُوح جاگ اٹھے گی۔

جو مسلمان انگریزی فوج میں بھرتی ہو کر خانہ کعبہ پر گولی چلاتا ہے اور پیر کے روضہ پر حملہ آور ہوتا ہے وہ بھرا اپنے مقامات مقدّسہ کی حفاظت کرے گا۔ لہٰذا میری درخواست ہے کہ آپ دین اسلام کے لیے، مسلمانانِ عالم کی آزادی کے لیے کانگرس سے تعاون کریں۔

ہندو اتنا طاقتور نہیں ہے کہ ہم اس سے خائف ہو کر عالمِ اسلام کی امداد کو نظر انداز کر دیں۔ یار لوگ کہتے ہیں کہ ہندو مسلمان کو کھا جائے گا۔

حضرات! یہ کس قدر جھوٹ ہے۔ یہ مرغی کی ایک ٹانگ تو کھا نہیں سکتا وہ میرے ایسے مسلمان کو کیسے ہضم کر سکتا ہے۔

ہندو تہذیب یا اس کی دشمنی گنگا سے کاشی تک ہے لیکن اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے جس کی بنیاد سمندر کی اتھاہ گہرائیوں سے آسمانوں کے آخری جہانوں تک ہے۔ اگر اس بنیادی اور سچے مذہب کی حفاظت چاہتے ہو تو عیسائی حکمرانوں سے ہندوستان کو نجات دلاؤ۔

اپنی تقریر کے دوران امیر شریعت قرآن کریم سے سورۂ بقر کے اکثر حصے تلاوت کرتے رہے۔ آخر تین دن کی مسلسل بحث کے بعد ۶ مئی کو جمعیۃ علمائے ہند نے مولانا حفظ الرحمٰن کی قرارداد کو بغیر کسی اختلاف کے منظور کر لیا۔

وارنٹ گرفتاری

پنجاب پولیس امیر شریعتؒ کے وارنٹ لے کر امروہہ پہنچی دوسری طرف امروہہ میں امیر شریعت نے جو تقریر کی قانون نے اسے بھی پسند نہ کیا۔ چنانچہ ایک وارنٹ یہاں بھی تیار ہو گیا۔ اور امروہہ کی پولیس آج کسی وقت امیر شریعت کو گرفتار کر لے گی۔ یہ سن کر مقامی کارکنوں نے ۷ مئی کو رات کو امیر شریعت کی تقریر کا اعلان کر دیا۔

پولیس اس خیال میں رہی کہ دن کی گرفتاری سے عوام میں ہنگامہ ہو۔ رات جب جلسہ سے فارغ ہو کر قیام گاہ پر آئیں گے گرفتار کر لیں گے۔

جلسے کی ابتدائی تقریر مولانا احمد سعید دہلوی کی تھی لیکن لوگ امیر شریعت کی تقریر کے منتظر تھے۔ پولیس اپنی جگہ مطمئن تھی۔ رات دو بجے مولانا احمد سعید نے اپنی تقریر کے دوران گھڑی دیکھ کر کہا:

”ادھوا! کافی رات جا چکی ہے اور آپ لوگ سید عطاء اللہ شاہ کی تقریر کے انتظار میں ہوں گے۔ چلو پھر سن لینا۔ اب میں جلسہ برخاست کرتا ہوں۔“

اس اعلان کے بعد پولیس امیر شریعت کی تلاش میں نکلی تو معلوم ہوا کہ وہ جلسہ شروع ہوتے ہی امروہہ سے نکل گئے تھے۔ ہاتھ آیا ہوا شکار ضائع ہوتے پر شکاری کس قدر شرمندہ ہوتا ہے ـــــ امروہہ کی پولیس اپنے اقدام کی ناکامی پر سخت شرمندہ ہوئی۔

دوسرے دن اطلاع ملی کہ امیر شریعت الہ آباد سوراج بھون میں پنڈت موتی لال نہرو کے ہاں مہمان ہیں۔ پنڈت جی امیر شریعت کی تقریر اور تلاوت قرآن کریم سے متاثر تھے۔ رات الہ آباد میں امیر شریعت کی تقریر ہو رہی تھی کہ پولیس نے چاروں طرف سے جلسے کا محاصرہ کر لیا۔ پولیس کی اس حرکت سے امیر شریعت کی گرفتاری کا شبہ ہوا تو دیکھتی نظروں نے جلسہ گاہ میں جو ایک منٹ پہلے روشنی سے بقعہ نور تھا تاریک اندھیرا دیکھا اور اتنے میں معلوم ہوا کہ امیر شریعت اپنے میزبان کی کار پر الہ آباد سے جا چکے ہیں حالانکہ وہ سوراج بھون ہی میں مقیم تھے۔ دوسرے روز جب پولیس کو اطمینان ہو چکا کہ امیر شریعت ان کی حدود سے نکل گئے ہیں تب امیر شریعت پنڈت موتی لال نہرو کی ہمراہی میں آگرہ پہنچے۔ جلسے کا اہتمام پیشتر سے ہو چکا تھا۔ پروگرام کے عین مطابق وقت پر امیر شریعت کی کار قلعہ کے میدان میں پہنچی۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں فرش راہ تھے۔ خطبہ مسنونہ کے بعد حسب عادت مجمع پر ایک طائرانہ نظر ڈالی تو ایک کونے سے آواز آئی۔

"تم نے اگر حکومت کے خلاف یا کانگرس کے حق میں کوئی بات کہی تو قتل کر دیے جاؤ گے۔"

جیسے ہی امیر شریعت نے اس آواز کی طرف توجہ دی تو شہر کے قصاب ہاتھوں میں چھرے اور کلہاڑیاں اٹھائے ایک کونے میں کثیر تعداد میں کھڑے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے مجمع چیر کر امیر شریعت کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ بلوائیوں کی اس حرکت سے جلسے پر خوف و ہراس طاری ہو گیا۔ خود پنڈت موتی لال نہرو پریشان ہوئے پولیس

بطور تماشائی کے سامنے کھڑی یہ کھیل دیکھتی رہی۔ اتنے میں امیر شریعت نے قرآن کریم کی تلاوت شروع کی اور سورۂ بقر کے دو رکوع پڑھ کر ترجمہ کرنا چاہا لیکن مفسدوں نے اس کی بھی اجازت نہ دی۔ اسی کشمکش میں نصف رات بیت گئی۔ شاہی قلعہ اور تاج محل کی پرشکوہ عمارتیں مسلمان کے انحطاط کی ماندہ قابل غور دیواروں کو گرتے دیکھ کر اور خاموش ہو گئیں۔ جیسے جیسے رات بھیگتی جارہی تھی جلسے پر نیند کا غلبہ بڑھ رہا تھا۔ مگر امیر شریعت اور ان کے قاتل آمنے سامنے کھڑے تھے

ملک الموت کو ضد ہے کہ میں جاں لے کے ٹلوں

سر بہ زانو ہے مسیحا کہ مری بات رہے

اس کھینچا تانی میں مرغِ سحر نے اذان دی اور امیر شریعت نے سورۂ یوسف کی تلاوت شروع کر دی۔ رات کی موت پر طلوعِ سحر کا نغمہ الاپتے ہوئے زندگی نے انگڑائی لی۔ آگرہ کے عوام نے رات بھر تماشہ دیکھا کہ قاتل اور مقتول مقتل میں اپنی ذمہ داریوں کے تول تُل رہے ہیں مگر نہ قاتل کے ہاتھ اٹھے اور نہ مقتول کی گردن جھکی۔

کلام اللہ اور امیر شریعت کی زبان، نسیم صبحگاہی، ان سب نے قاتلوں کے عزائم پر نیند کا بوجھ ڈال دیا۔ امیر شریعت نے تقریر شروع کی جو دن کے نو بجے تک جاری رہی۔ گو سامعین کی تعداد میں بدستور کمی آتی گئی، مگر معرکۂ حق و باطل میں امتیاز کرنے والے عشاق بدستور جمے رہے۔ اس دوران مخالفین کو زبان درازی کی جرأت نہ ہوئی تاآنکہ صبح سب کے سب امیر شریعت کے قدموں میں آگرے اور رات بھر کی گستاخیوں کی ہزار بار معذرت چاہی۔

قاتلانہ حملہ

نمک کی ستیہ گرہ کے دنوں حکومت کی طرف سے ہر ضلع کی پولیس کو اختیار تھا کہ جس مقرر کو چاہے گرفتار کر سکتی ہے۔ ہندوستان بھر کے سیاسی کارکن کچھ تو گرفتار ہو چکے تھے اور کچھ روپوش ہو کر تحریک کی رہنمائی کر رہے تھے۔ کانگرس کی سرگرمیاں خلاف آئین قرار دی جا چکی تھیں لیکن امیر شریعت کی سرگرمیاں گورنمنٹ آف انڈیا کے لیے قابل اعتراض ہی نہیں، ناقابل برداشت حد تک پہنچ چکی تھیں۔ اس وقت تک پنجاب

اور صوبہ یوپی سے امیر شریعت کے خلاف بیس وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے تھے اور انگریزی قانون کے محافظ نشان پائے امیر شریعت کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ امروہہ اور آگرہ کی شکست کے بعد حکومت اور حکومت پرست نئے منصوبے باندھنے لگے جس سے وہ بڑھتے ہوئے طوفان کا راستہ روک سکیں۔

صوبہ یوپی سے فارغ ہو کر امیر شریعت بمبئی پہنچے۔ حالات فرنگی قانون سے بغاوت کا علم تھامے کھڑے تھے۔ واقعات کے ہاتھ سامراج کے خلاف جلتی آگ کو اپنے دامن سے ہوا دے رہے تھے۔ ساحل سمندر سے ٹکراتی ہوئی موجوں نے آگے بڑھ کر امیر شریعت کے قدم لیے۔ رات بندر روڈ پر جلسے کا اعلان کر دیا گیا۔ لاکھوں کی آبادی کا شہر بندر روڈ پر امڈ آیا۔ آگرہ کی شکست کا انتقام لینے خواجہ تاشانِ برطانیہ اپنے ارادوں سے مسلح جلسے کی صفِ اوّل میں جگہ سنبھال چکے تھے۔

قانون اور وقت جب ایک دوسرے سے متصادم ہوں تو دلوں سے بغاوت کا پھوٹ نکلنا اچنبھے کی بات نہیں۔ آزادی ہند کی تحریک میدانوں سے نکل کر پہاڑوں اور سمندروں تک جا پہنچی تھی۔ بغاوت کے الاؤ اس قدر روشن تھے کہ برطانوی راج کا وجود خطرے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ ایسے وقت میں برطانوی باغی کا بمبئی پہنچنا حکومت کے لیے ناپسندیدہ تھا۔ فیکٹریوں کا شہر جہاں چمنیوں کے دھوئیں، سمندر کی وسعتوں کو بادلوں کا فریب دیتے رہیں۔ یہاں کے انسان دولت کے انبار پر کھڑے ہو کر انسانیت کو بہت اونچائی سے دیکھتے ہیں۔ کاخ امرا کی بلند و بالا چوٹیاں آدمی کو دیکھنے میں جہاں ہمیشہ فریب خوردہ ہوں وہاں انگریز کے خلاف بات کرنا اپنے بخت کو بگڑے ہوئے سانچے میں ڈھالنا ہے لیکن امیر شریعت نے بمبئی کے عوام کو خطاب کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا تاکہ انگریزی سامراج کے خلاف جلتی ہوئی بھٹی میں مزید ایندھن کا اضافہ ہو سکے۔

امیر شریعت نے خطبہ مسنونہ کے بعد تقریر شروع کی۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"غلامی سب سے بڑا گناہ ہے۔ اگر اس گناہ سے نکلنا ہے تو اس سے بہتر کوئی موقع نہیں کہ ہم انگریزوں کے خلاف پر امن لڑائی میں شریک ہو جائیں"۔

یہ فقرہ ابھی نامکمل تھا کہ مجمع سے کسی نے تیز دھار کی چھری امیر شریعت کی طرف زور سے پھینکی، جسے ایک نوجوان نے جلدی سے آگے بڑھ کر اپنے سینے پر روک لیا۔ یہ ضرب اس قدر شدید تھی کہ تھوڑی دیر بعد زخمی نوجوان کا انتقال ہو گیا۔ مقتول نور خاں نامی کوہاٹ کا رہنے والا اکیس سالہ نوجوان تھا۔ نور خاں کی موت سے امیر شریعت کی جان بچی۔ لیکن نور خاں کے خون سے غیر ملکی سامراج کا وقار آخر کو مٹ کر رہا۔ گو قاتل گرفتار نہ ہو سکا مگر تحقیق پر معلوم ہوا کہ چھری زہر آلود تھی۔ اس افراتفری میں امیر شریعت پولیس کی گرفت سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

گرفتاری

آگرہ اور بمبئی کے قاتلانہ حملوں کے بعد امیر شریعت نے اس ضلع کو چھوڑ دینا مناسب سمجھا۔ اور یہاں سے ایک ماہ کے پیدل اور سنگلاخ راستوں پر خاموشی سے سفر کرنے کے بعد کلکتہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہندوستان بھر میں ہر ضلع سے گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو چکے تھے۔ حالات کے غیر مطمئن ہونے کے باعث امیر شریعت کے لیے ایک جگہ قیام غیر ممکن تھا۔ کلکتہ کے عوام جو ۱۹۰۵ء (تقسیم بنگال) سے انگریزوں کے خلاف دہشت پسندی اختیار کر چکے تھے، کانگرس کی تحریک سے بھی تعاون کر رہے تھے۔ امیر شریعت کے اس صوبہ میں دورہ سے سیاسی حالات کو اور جلا مل گئی۔ آپ نے دیہات، قصبات اور شہری عوام کو انگریزوں کے خلاف بغاوت پر ابھارا۔ آخر ۲۰ اگست ۱۹۲۳ء کو دیناج پور (بنگال) میں دفعہ ۱۰۸ کے تحت گرفتار کر لیے گئے۔ گو وارنٹ تو بہت تھے لیکن مقدمہ صرف ضلع علی پور کی ایک تقریر پر چلا۔ چونکہ کانگرس نے انگریزی عدالتوں سے عدم تعاون کا حکم دے رکھا تھا لہٰذا امیر شریعت عدالت کی تمام کاروائی سے الگ رہے۔ آخر ۲ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو چھ ماہ قید کی بامشقت سزا ہوئی۔

علی پور جیل سے آپ کو ڈم ڈم جیل میں تبدیل کر دیا۔ جہاں تمام ایام اسیری گزارے۔

باب سوم ——— ۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۰ء

ڈم ڈم جیل | جیل خانہ اس متحرک دنیا میں ہونے کے باوجود اپنے آئین کی منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے ہر گوشے میں ظلم و انصاف کے درمیان ٹکراؤ رہتا ہے۔ اجنبی حکمران جیلوں میں سیاسی قیدیوں سے بعض ایسے ضابطے منواتے رہے جسے نہ ضمیر پسند کرتا تھا اور نہ ہی دماغ اس پر رضامند ہوتا تھا۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو امیر شریعت جب ڈم ڈم جیل میں داخل ہوئے تو سپرنٹنڈنٹ جیل مسٹر سمسن (جو بعد میں بنگالی دہشت پسندوں کے ہاتھوں مارا گیا) نے امیر شریعت کو حکم دیا کہ وہ اپنے سر سے گاندھی کیپ اتار دیں۔ یوروپین سپرنٹنڈنٹ کے مطالبہ پر امیر شریعت نے کہا:-

"اوّل تو یہ گاندھی کیپ نہیں، اجمل کیپ ہے۔ اور یوپی کے اکثر شرفا اسے پہنتے ہیں۔ دوسرے میں اے کلاس کا قیدی ہوں۔ مجھے اپنا ہر طرح کا ذاتی لباس پہننے کا قانوناً حق ہے۔"

سپرنٹنڈنٹ نے جواب میں کہا:-

"علماء کی رائے ہے کہ یہ گاندھی کیپ ہے لہٰذا آپ اسے جیل کے اندر نہیں لے جا سکتے۔"

امیر شریعت:- "میں خود عالم ہوں اور میں جانتا ہوں کہ دیوبند کے علماء عام طور پر یہی کیپ پہنتے ہیں لہٰذا میں اسے نہیں اتاروں گا۔"

یہ بحث تمام دن رہی۔ آخر امیر شریعت کامیاب ہوئے۔ لیکن ابتداء کی

طوائی سزا کے اختتام تک وجہ نزاع بنی رہی۔ جیل مینول نے سپرنٹنڈنٹ جیل کو لامحدود اختیار سونپ رکھے ہیں۔ تڑپتے ہوئے جانور کی طرح قیدی کا تماشہ تو کیا جاسکتا ہے۔ لیکن بسمل کے زخموں پر مرہم کا رواج اس قفل میں نہیں۔ امیر شریعت گو بڑی حیثیت کے قیدی تھے لیکن تھے تو قیدی۔ زنجیر سونے کی اور خوراک میں یاقوت استعمال ہوں تب بھی قفس قفس ہے، قفس آشیاں نہیں ہوتا۔

رستم زماں سے ملاقات

دنیا کے شہ زور اور فن پہلوانی میں اپنے وقت کے رستم زماں غلام حسین عرف گاما پہلوان نون والے کے آباؤ اجداد آج سے تقریباً ڈیڑھ صدی پیشتر مہاراجہ گلاب سنگھ والئ کشمیر کے تشدد کے باعث کشمیر چھوڑ کر امرتسر آباد ہو چکے تھے۔ ان کے والد عزیز بخش پہلوان سیتاپور نامی ریاست کے سرکاری پہلوان تھے۔ اور یہیں ان کی شادی ریاست کے نامی گرامی نون پہلوان کی لڑکی سے ہوئی جس کے بطن سے غلام حسین نے جنم لیا۔ والد کی موت کے بعد غلام حسین کی پرورش ان کے نانا نون پہلوان کے سپرد ہوئی۔ چونکہ ابتدائی زندگی نون پہلوان کی گود میں پروان چڑھی تھی لہٰذا ساری زندگی گاماں پہلوان نون والے کہلواتے رہے۔

نسلی امتیاز کی آگ ایسے دلوں میں بھی روشن ہوتی ہے جن کے نزدیک یہ امتیاز گناہ کی آخری منزل قرار دی گئی ہے۔ امیر شریعت اور رستم زماں گاماں پہلوان کے نزدیک بظاہر کوئی ڈانڈا نہیں ملتا لیکن ڈوگرہ شاہی کے ستائے ہوئے کشمیری خاندان جب پنجاب آکر آباد ہوئے تو مہاجروں کا یہ ٹولہ ایک ایسی برادری اور خاندانی عصبیت اپنے ساتھ لایا کہ مقامی باشندوں کے رسم ورواج انہیں اپنے اندر جذب نہ کر سکے۔ امیر شریعت کشمیری، رستم زماں کشمیری، دونوں امرتسر میں مقیم۔ اس کے علاوہ امیر شریعت کی یہ ہابی (HOBBY) تھی کہ چڑیا گھر یا سرکس میں شیر کو اور اکھاڑوں میں پہلوانوں کو دیکھنا بہت پسند کرتے۔ ان وجوہ کی بنا پر امیر شریعت اور رستم زماں کے درمیان کئی رشتے مشترک تھے۔ چنانچہ جب کبھی فرصت ہوتی امیر شریعت

رستم زمان سے ملنے جاتے اور اکثر رستم زمان بھی لاہور یا امرتسر میں انہیں ملنے آتے۔

اِن دنوں رستم زمان بنگال کے دورے پر تھے کہ انہیں امیر شریعت کے ڈم ڈم جیل میں قید ہونے کی اطلاع ملی۔ ملاقات کا قصد لے کر پہلوان جیل پہنچے تو امیر شریعت اور سپرنٹنڈنٹ کے درمیان چپقلش آڑے آئی۔ امیر شریعت کی خواہش تھی کہ پہلوان اندر آ کر ملاقات کریں اس میں ان کا احترام تھا۔ لیکن سپرنٹنڈنٹ کا تقاضا تھا کہ امیر شریعت عام قیدیوں کی طرح جنگلے میں ملاقات کریں۔ اس میں امیر شریعت کی توہین تھی کہ وہ اے کلاس کے شاہی قیدی تھے۔ سارا دن اسی کھینچا تانی میں گزر گیا۔ آخر سپرنٹنڈنٹ کو ہار ماننی پڑی اور رستم زمان نے جیل کے اندر امیر شریعت سے ملاقات کی۔ اس موقع پر بنگالی قیدیوں نے خواہش کی کہ پہلوان کپڑے اتار کر اپنے بدن کی نمائش کریں۔ قیدیوں کے تقاضے پر دونوں مسکرائے اور رستم زمان نے لنگوٹا کر کے اپنے جسم کی نمائش کی تو بنگالی قیدیوں نے بے اختیار کہا ——— "ہے مانس"! (ارے یہ انسان)

امیر شریعت نے ایام اسیری ضائع نہیں کیے بلکہ سوشل کمار نامی بنگالی قیدی سے آپ نے انگریزی پڑھنی شروع کی اور سوشل کمار امیر شریعت سے قرآن کریم پڑھتا رہا۔ متبادل تعلیم کی دو نشستیں ہوتیں۔ صبح سوشل کمار قرآن کریم پڑھتا تھا اور شام کو امیر شریعت انگریزی پڑھتے۔ وقت اسی طرح گزرتا گیا۔

رہائی آخر جنوری ۱۹۳۱ء میں "گاندھی اردن پیکٹ" کے تحت نمکین ستیہ گرہ کی لڑائی بند کر دی گئی۔ تمام سیاسی قیدی رہا کر دیے گئے۔ امیر شریعت بھی اسی موقع پر رہا ہوئے۔

بہادر بہر حال بزدل نہیں ہوتا۔ امیر شریعت کے چچا سید معتیم شاہ پولیس آفیسر تھے اور ان دنوں کلکتہ میں تعینات تھے۔ جیل سے رہا ہو کر امیر شریعت چند دنوں کے لیے انہی کے ہاں ٹھہرے تو خطرات نے احاطہ کر لیا لیکن دیندار آفیسر نے انگریز کے باغی کو

پناہ دینے میں کسی قسم کی عار محسوس نہ کی۔ قانون اور فرائض کے درمیان دل و دماغ متصادم رہے لیکن خاندانی شرافت نے مہمان بھتیجے کے لیے پیشانی کو شکن آلود نہیں ہونے دیا۔

مجلسِ احرار کی تشکیلِ نو

۱۱۔ جولائی ۱۹۳۱ء کو اسلامیہ کالج لاہور کے حبیبیہ ہال میں احرار کانفرنس کا پہلا اجلاس مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں امیر شریعت چودھری افضل حق، خواجہ عبدالرحمٰن غازی، مولانا ظفر علی خاں شیخ حسام الدین، مولانا محمد داؤد غزنوی، مولانا مظہر علی اظہر اور دوسرے مسلمان رہنما شامل ہوئے اس اجلاس کی آخری قرارداد میں جداگانہ انتخاب کی پر زور حمایت کی گئی جس سے کانگریس اور ہندو پریس خصوصاً حواس باختہ ہو گئے۔ اجلاس کے اختتام پر پنجاب بھر میں احرار کے دفاتر قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ کام حضرت امیر شریعت کے سپرد ہوا اور آپ اپنے رفقا کو لے کر اس پروگرام کو سرانجام دینے کے لیے پنجاب کے دورہ پر روانہ ہو گئے۔

گاندھی جی سے ملاقات

اسی سفر کے دوران پنجاب کی حدود سے نکل کر جب امیر شریعت دہلی اور یوپی کے اضلاع میں پہنچے تو گاندھی جی کی لندن روانگی کا پتہ چلا۔

گاندھی جی دوسری گول میز کانفرنس میں شمولیت کے لیے لندن روانہ ہونے والے تھے۔ احرار رہنماؤں کی رائے تھی کہ انگریز کی میز پر بیٹھ کر ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ غلام ملک کا لیڈر نہیں بلکہ غیر ملکی حکومت کا اقتدار ہی کر سکتا ہے۔

۲۔ اگست ۱۹۳۱ء کو گاندھی جی جب بمبئی پہنچے تو امیر شریعت مولانا حبیب الرحمٰن کے ساتھ انہیں ملنے کے لیے بمبئی پہنچ گئے۔ آپ نے گاندھی جی کو گول میز کانفرنس میں شمولیت سے منع کیا۔ گاندھی جی نے احرار رہنماؤں کی رائے کو وزن تو دیا لیکن لندن جانے کا ارادہ ترک نہ کیا۔

میکلیگن کالج کا حادثہ

ستمبر ۱۹۳۱ء کے آخر کا واقعہ ہے کہ میکلیگن کالج لاہور کے انگریز پرنسپل مسٹر ڈٹیکیر نے مسلمان طلبا کی دل آزاری کرتے ہوئے

کلاس میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی پر ایسے رکیک حملے کیے جس سے مسلمان طلباء آپے سے باہر ہوگئے اور کالج میں سٹرائیک کر دی۔ محمڈن ہال بیرون موچی دروازہ میں طلباء نے مرکزی کیمپ بنا لیا اور پرنسپل کے خلاف باقاعدہ ایجی ٹیشن شروع کر دی۔ اس سلسلہ میں طلباء کا وفد شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی قیامگاہ پر پہنچا۔ واقعات سن کر ڈاکٹر صاحب نے انہیں احرار رہنماؤں سے ملنے کا مشورہ دیا۔

بمبئی سے واپسی پر دفتر مجلس احرار میں امیر شریعت گاندھی جی سے ملاقات کی رپورٹ اپنے ساتھیوں کے سامنے پیش کر رہے تھے کہ طلباء کا وفد انہیں ملنے کے لیے آن پہنچا۔ حالات اور واقعات سے تحریک کے زیادہ پھیلنے کا احتمال ہوا۔ اسی رات موچی دروازہ کے باغ میں امیر شریعت کی تقریر کا اعلان کر دیا گیا۔ لاکھوں کا مجمع تھا۔ حکومت پنجاب انگریز پرنسپل کی پشت پناہ تھی۔ رات دس بجے امیر شریعت نے تقریر شروع کی اور دو بجے رات تمام مجمع کو ساتھ لے کر راتوں رات میکلیگن کالج کے دروازے پر پہنچ کر ڈیرہ ڈال دیا۔ صبح ہونے تک سارا لاہور میکلیگن کالج کے دروازے پر تھا۔ پولیس کے انتظامات کے باوجود حالات ہر آن بگڑتے جا رہے تھے۔ لیکن امیر شریعت مع اپنے رفقاء مولانا محمد داؤد غزنوی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی عوام کو ہر قسم کی قانون شکنی سے روکتے رہے۔ گرفتاریاں شروع ہوئیں تو مولانا محمد داؤد غزنوی اور مولانا احمد علی گرفتار کر لیے گئے۔ دن بھر کی ہنگامہ آرائی نے شام ہونے تک جھگڑے کو اس قدر مختصر کر دیا کہ پرنسپل نے طلباء سے معافی مانگ لی اور کالج سے خارج شدہ طلباء دوبارہ داخل کر لیے گئے۔ گرفتار ہونے والے رات ہونے تک رہا کر دیے گئے۔ اس طرح حضرت امیر شریعت اور جماعت کی ایک دن کی ہمت نے انگریز پرنسپل کو پچھاڑ دیا۔

تحریکِ کشمیر تحریکِ کشمیر میں مجلس احرار کی شرکت کا سبب سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس تحریک کا مختصر پس منظر سمجھ لیا جائے۔

مہاراجہ ہری سنگھ والیٔ کشمیر نے ریاستی نظم و نسق سنبھالتے ہی غریب عوام اور کسانوں پر ٹیکسوں کی بھرمار کر دی۔ مظلوم طبقہ کی کمائی کی ساری پونجی مالیانہ اور آبیانہ کی نظر ہو جاتی۔ یہی وجہ تھی کہ کشمیر کے غریب عوام موسم سرما میں کشمیر سے نکل کر پنجاب کے میدانی علاقوں میں محنت مزدوری کے لیے پھیل جایا کرتے تھے۔ ان حالات میں عوام نے اپنے جائز حقوق منوانے کے لیے باقاعدہ تحریک کا آغاز کیا۔ انہی دنوں ریاست جموں میں ایک ایسا حادثہ پیش آیا جس سے ہندو حکمران اور مسلمان رعایا کے تعلقات خاص طور پر اُلجھ گئے اور آخر کار یہ تحریک ریاست سے باہر تک پھیل گئی۔

حادثہ یہ تھا کہ جموں میں ریاستی پولیس کا ایک مسلمان سپاہی اپنی بیرک میں قرآن کریم کی تلاوت کر رہا تھا کہ بغیر کسی نزاع کے ایک ہندو سنیاسی نے سپاہی کے ہاتھ سے قرآن کریم چھین کر زمین پر دے مارا۔ کتاب اللہ کی توہین نے تمام نظم و نسق کو پریشان کر دیا۔

عوام، کسان اور خصوصاً مسلمان حکومت کشمیر کے خلاف نبرد آزما ہو گئے۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ شیخ عبداللہ کشمیری عوام میں لیڈر کی حیثیت سے روشناس کرائے گئے۔ ان کی تقریروں نے کشمیری عوام کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا کر مہاراجہ کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اس تصادم میں حکومت کی طرف سے نہتے مسلمانوں پر گولیاں چلیں اور خون بے گناہ سے دریائے جہلم کی بھری ہوئی موجیں کناروں سے ٹکرانے لگیں۔

ایسے حالات نے پنجاب کے مسلمان کو بھی چونکا دیا اور پریس نے حالات کو بیدار کرنے میں خوب معاونت کی۔ انہی دنوں سر فضل حسین نے شملہ میں چند رجعت پسند مسلمانوں کے تعاون سے کشمیر کمیٹی کی بنیاد رکھی جس کے صدر قادیان کے مرزا بشیر الدین محمود اور سیکرٹری عبدالرحمان درد (مرزائی) کو نامزد کیا۔ میاں صاحب اس کمیٹی کے نگران مقرر ہوئے۔

کشمیر کمیٹی کی تشکیل کے ساتھ ہی مرزائی خلیفہ نے سرکار پرست مسلمان رہنماؤں کو اس کمیٹی کا رکن نامزد کر دیا۔ چنانچہ علامہ سر محمد اقبال کو بھی اس کمیٹی میں شامل کر لیا گیا

احرار رہنماؤں کو جب اس ڈرامے کا علم ہوا تو وہ علامہ اقبالؒ سے ملے۔ انہیں حالات سے آگاہ کیا کہ آپ کی وجہ سے نہ صرف کشمیر کا بتیس لاکھ مسلمان مرزائی ہو جائے گا۔ بلکہ بیرونی ممالک کے مسلمان بھی اس فریب سے متاثر ہوں گے۔ لہٰذا آپ کو کشمیر کمیٹی سے علیحدگی کا اعلان کر دینا چاہیے۔ چنانچہ دوسرے ہی روز برکت علی محمڈن ہال میں کشمیر کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ اس میں تحریک کشمیر کی ساری ذمہ داری مجلس احرار کے سپرد کر دی گئی۔

مجلس احرار کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے لاہور کے اجلاس منعقدہ ۱۸۔ اگست میں تحریک کشمیر کو باضابطہ چلانے کا فیصلہ کیا۔ انگریز، ریاستی حکام اور مرزائی حالات سے ہر گھڑی باخبر تھے۔ مجلس احرار کے فیصلے کی روشنی میں آنے والے نئے طوفان کا خوف دلا کر انگریز نے اپنے بااعتماد آدمی ہرکشن کول کو کشمیر کا وزیر اعظم بنا دیا۔

وفد کی روانگی

اوائل اکتوبر ۱۹۳۱ء کو چودھری افضل حق، مولانا مظہر علی اظہر اور خواجہ غلام محمد وفد کی صورت میں کشمیری حکام سے بات چیت کے لیے جموں روانہ ہوئے۔

انگریز اور مرزائی اپنی اپنی اوٹ سے جھانک رہے تھے کہ احرار رہنما سرینگر پہنچے۔ ڈوگرہ شاہی منتظر تھی کہ وفد کے ارکان کو کسی شیشے میں اتار سکیں بہ ایں راج محل کا تمام جاہ و جلال اپنی امیدوں میں ناکام رہا۔ احرار رہنماؤں کا ضمیر خریدنے والے شاہی سوداگر گداؤں کی طرح ملاقات کو آتے مگر دریائے جہلم کی موجوں پر تیرنے والا شاہی بوٹ ہر روز دیکھتا کہ شاہی فقیروں سے شکست کھا رہی ہے۔ آخر وفد ناکام لوٹ آیا۔

شاہ جی کی گرفتاری

وفد کے کشمیر جانے سے پیشتر حضرت امیر شریعت نے پنجاب کو اپنی تقریروں سے گرما کر میدان کارزار کے لیے تیار کر لیا تھا۔ احرار کے سرخ پوش جیوش کشمیر کی سرحدیں عبور کرنے کے لیے حکم کے منتظر تھے۔ وفد کی ناکام واپسی پر ڈوگرہ شاہی کی سنگینیں اور برطانوی جیل خانے مجاہدین کے انتظار میں تھے۔

مجلس احرار ہنوز سول نافرمانی کے نقشے سوچ رہی تھی کہ ۱۵۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو

امیر شریعت کو دہلی میں دفعہ ۱۲۴ ء کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ اس گرفتاری کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے تحریک کشمیر کے ڈکٹیٹر اول مولانا مظہر علی اظہر نے ۱۸۔ اکتوبر کو وائسرائے ہند کے نام حسب ذیل مکتوب تحریر کیا۔

"عام طور پر یہ خیال کیا جا رہا ہے کہ سید عطاء اللہ بخاری کے خلاف جو دفعہ ۱۲۴ لگائی گئی ہے۔ اس میں مرزا بشیر الدین محمود کا بھی ہاتھ ہے۔ میری اطلاع ہے کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے خلاف کارروائی کرنے کی منظوری دینے کی ذمہ دار صرف حکومت دہلی ہی نہیں ہے۔

بہرحال حکومت ہند اور حکومت پنجاب کی پوزیشن خواہ کچھ ہی ہو عام تاثر یہی ہے کہ حکومت پنجاب نے دوسری پارٹی (مرزائی) کی حوصلہ افزائی کے لیے ایک پارٹی کو ہدف بنایا ہے۔

ہماری جماعت (احرار) کے لوگ کسی سیاسی مقصد کے حصول کیلئے جیل جانے سے نہیں ڈرتے۔ لیکن ایک دوسری جماعت کی خاطر ہماری جماعت کو تختہ مشق بنانا کسی طرح کوئی سازگار فضا پیدا نہیں کر سکتا۔

سرکاری اعلان یا کسی دوسرے ذرائع سے اس امر کی تردید کافی نہ ہوگی اگر حکومت رائے عامہ کو مطمئن کرنا چاہتی ہے تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ مقدمہ واپس لے لے۔ اور اگر کسی صوبے کی حکومت سید عطاء اللہ شاہ کو محبوس زنداں کرنے کی مشتاق ہے تو وہ اس کے لیے دوسرے مواقع تلاش کر سکتی ہے۔

مولانا مظہر علی اظہر کے اس مکتوب کے جواب میں حکومت خاموش رہی اور اس مقدمہ میں امیر شریعت کو ۔۔۔ سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔

بورسٹل جیل

نومبر ۱۹۳۱ء میں مجلس احرار نے کشمیری عوام کی امداد کے لیے ریاست پر یلغار شروع کی۔ جہلم سے میرپور، راولپنڈی سے کوہالہ، سیالکوٹ سے سچیت گڑھ کے راستے احرار رضاکار ریاست کی حدود میں داخل ہوتے۔ انہیں یا تو گرفتار کر لیا جاتا یا وہ ریاستی حکام کے ظلم و جور کا نشانہ بن کر زخمی ہوتے۔ اس طرح تقریباً تین ماہ کی مسلسل لڑائی کے نتیجے میں چالیس ہزار مسلمان جیلوں میں گئے اور بائیس نوجوانوں نے جام شہادت نوش کیا۔ اجنبی حکمران اس دوران تماشائی بنا رہا۔ مگر ڈوگرہ شاہی کا پنجر ڈھیلا پڑ چکا تھا۔ لہٰذا اس نے ایک طرف انگریزی حکومت اور دوسری طرف جمعیت علمائے ہند کو درمیان میں لا کر احرار سے گفتگو کرنا چاہی اور اس سلسلہ میں احرار ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبران کو پنجاب کی مختلف جیلوں سے لاہور بورسٹل جیل میں منتقل کیا گیا، جن میں حضرت امیر شریعت بھی شامل تھے۔

دہلی سے مولانا مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید ناظم جمعیۃ علمائے ہند حکومت کی دعوت پر احرار رہنماؤں سے صلح کی گفتگو کے لیے لاہور پہنچے۔ دونوں حضرات صبح نو بجے جیل تشریف لاتے اور چار بجے شام واپس چلے جاتے۔ آخر ایک ہفتہ کی ناکام گفتگو کے بعد جمعیۃ علماء کے رہنما واپس چلے گئے۔ حالات نے نئی کروٹ لی مہاراجہ کی درخواست پر انگریزی حکومت نے احرار رضاکاروں کی گرفتاریاں شروع کر دیں اور ریاست کے تمام قیدی انگریزی جیلوں میں تبدیل کر دیے گئے۔

حضرت امیر شریعت ان دنوں بورسٹل جیل کی بارڈر لائن میں تھے۔ جیل کا یہ حصہ دس سال سے کم عمر بچوں کے لیے مخصوص ہے، جو معصوم احرار رضاکاروں سے بھرا ہوا تھا۔ امیر شریعت ان بچوں کے درمیان رات دن کھیل کود میں مصروف رہتے تاکہ انہیں گھر اور والدین کی یاد نہ ستائے۔ اس طرح ایشیا کے عظیم خطیب اور ہندوستان کے سیاسی اور مذہبی رہنما نے جس کی ایک للکار ایوان برطانیہ میں زلزلہ پیدا

کردیتی تھی، جماعت کے بلند مقاصد اور کشمیری عوام کی غلامی کے خلاف قید خانے کو کارِ طفلاں بنا دیا۔

انگریز اور مہاراجہ کے سمجھوتے نے تحریک احرار کا رخ براہ راست برطانیہ کی طرف موڑ دیا۔ اب ہندوستان میں کانگریس اور احرار کی تحریکیں ایک ساتھ چلنے لگیں۔ نیز امیر شریعت اور دوسرے احرار رہنماؤں کو نیو سنٹرل جیل ملتان تبدیل کر دیا گیا۔

کانگریس کی جدید سول نافرمانی کے باعث جمعیۃ علماء اور کانگریس کے رہنما جو پہلے سے ملتان جیل میں موجود تھے، اب ان میں احرار رہنماؤں کا بھی اضافہ ہو گیا۔ ان مذہبی اور سیاسی شخصیتوں کے باعث جیل کا احاطہ شب و روز علمی مجالس میں منتقل ہو گیا۔ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۲ء تک یہ رونقیں جاری رہیں۔ جیل کے سپرنٹنڈنٹ میجر فضل الدین جو انگریزی کے علاوہ جرمنی، ترکی اور ایرانی زبان پر قدرت رکھتے تھے بھی ان علمی محفلوں میں برابر کے شریک رہتے اور مستفید ہوتے۔

ایک ماں کا ایثار یوں تو ہزاروں ماؤں نے اپنے بچوں کو تحریک کشمیر کے لیے اپنے ہاتھوں کفن بردوش روانہ کیا لیکن بورسٹل جیل لاہور میں ملاقات کے دوران جب ایک ماں اپنے بچے کو تسلی دے کر اس کا حوصلہ بڑھا رہی تھی، امیر شریعت نے جو ملاقات کے وقت پاس کھڑے تھے نے بچے کی ماں سے کہا

"بچے سے پوچھو اسے کوئی تکلیف تو نہیں؟"

ماں نے مسکراتے ہوئے آبدیدہ نگاہوں سے کہا:۔

"بیتدا! میں تے اپنا گودی دا پتر دی تیرے حوالے کرن آئی آں" (شاہ جی! میں تو اپنی گود کا بچہ بھی تمہارے سپرد کرنے آئی ہوں)

جواب میں امیر شریعت نے ماں کے ان جذبات کو اسلام کے لیے زندہ رہنے کی دعا فرمائی۔

جیل سے رہائی اور سکھوں سے ٹکراؤ

دوسری گول میز کانفرنس کی ناکامی کے بعد گاندھی جی اور دوسرے رجعت پسند ہندو، اور مسلمان رہنماؤں نے برطانوی وزیر اعظم مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کو اپنا ثالث مقرر کر لیا۔ برطانوی وزیر اعظم نے ۱۶۔ اگست ۱۹۳۲ء کو اپنا ثالثی فیصلہ سناتے ہوئے تمام ہندوستان میں مخلوط انتخاب رائج کرنے کی تجویز دی۔ اس ثالثی فیصلہ کی تفصیلات میں پورے ملک میں مخلوط انتخاب، سندھ کی علیحدگی، اچھوتوں کے لیے باحیثیت ایک قوم جداگانہ انتخاب کا حق اور پنجاب و بنگال میں مسلم اکثریت کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔

اس ثالثی فیصلہ سے سکھ بے حد برہم ہوئے۔ چنانچہ اکتوبر میں ماسٹر تارا سنگھ نے تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ:

"اگر پنجاب میں مسلم راج قائم کرنے کی طرح ڈالی گئی تو ہم خون کی ندیاں بہا دیں گے"

سیاسی اور مذہبی جماعتوں کی طرف سے اس قسم کی ہنگامی محفلیں گرم تھیں کہ ۲۶۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو امیر شریعت ملتان نیو سنٹرل جیل سے اپنی میعاد اسیری گزرنے پر رہا کر دیے گئے۔ ان دنوں دیگر احرار رہنما بھی پیشتر ازیں رہا ہو چکے تھے۔ سکھوں کی مسلسل اشتعال انگیزی کے باعث پنجاب کا مسلمان حالات سے مقابلہ کے لیے تیار تھا کہ مجلس احرار نے سکھوں سے نبرد آزما ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ جماعت نے حضرت امیر شریعت کو منتخب کیا کہ ایک بہت بڑے اجتماع میں سکھوں کے چیلنج کا جواب دیں۔ چونکہ امرتسر سکھوں کا مرکزی شہر تھا اس لیے قصہ زمین برسر زمین کے مصداق اس شہر کا انتخاب کیا گیا۔ اس اجتماع کی تشہیر ایک ہفتہ پیشتر سے شروع کی گئی۔ پنجاب کے اکثر شہروں سے مسلمان امرتسر پہنچ چکے تھے۔ عیدگاہ (بیرون رام باغ) کے وسیع میدان میں لاکھوں مسلمانوں کا سمندر امڈ آیا کہ عید گاہ کو اپنی تنگ دامنی کا گلہ کرنا پڑا۔ ہواؤں نے اپنے دامن سنبھال لیے، دھوپ نے تمازت کم کر دی، آسمانوں کے ستارے سورج کی کرنوں سے جھانکنے لگے۔ رائج الوقت خاندان

کے محافظ آتشیں اسلحہ سے لیس ہو کر دوسرے حکم کا انتظار کرنے لگے۔
نماز عصر کے بعد امیر شریعت اپنے احباب کے جلو میں عید گاہ پہنچے۔ خطبۂ مسنونہ کے بعد مسلم نوجوان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

"غیرت حیران ہو کر آج نوجوان مسلمان کا منہ تکتی ہے کہ یہی اس قوم کے بے خبر فرزند ہیں جن کو انگلیوں پر گنی جانے والی قوم خون کی دھمکیاں دے رہی ہے۔ جس قوم نے دجلہ اور فرات کو اپنے پاؤں تلے روندا اور تلواروں کے درمیان کھڑے ہو کر موت کو زندگی کی دعوت دی۔

بے خبر نوجوان! ہوش سنبھال اور عقل کے ناخن لے۔ سکھوں سے کہہ دو کہ ہمیں اپنی پایاب ندیوں سے نہ ڈرائیں، ہم تو خون کے بحر بیکراں میں گھوڑے دوڑانے کے عادی ہیں۔

آخر میں سکھوں سے خطاب کرتے ہوئے صرف دو فقرے کہے۔

سکھ صاحبان کو میرا مشورہ ہے کہ وہ سوچ سمجھ کر بات کریں۔ ایسا نہ ہو کہ ہاتھوں سے دی ہوئی دانتوں سے کھولنی پڑے اور جس قوم کے سہارے وہ مسلمان کو خون کی ندیاں بہا دینے کی دھمکیاں دے رہے ہیں وہ ہندو قوم تو نو سو سال تک ہمارے گھٹنوں تلے رہی ہے"۔

امیر شریعت کی یہی تقریر امرتسر کے بعد سارے پنجاب میں گونجی۔ جس سے سکھوں کی للکار مدھم پڑ گئی۔ آخر گوردوارہ پربندھک کمیٹی لاہور کے ذمہ دار رکن سردار پرتاپ سنگھ ایڈوکیٹ نے امیر شریعت کی تقریروں کے بعد اپنے پریس بیان میں کہا:۔

"مسلمان دوستوں نے ہماری بات کا غلط مفہوم لیا ہے۔ ہمارا جھگڑا تو صرف حکومت اور کانگریس سے ہے۔ مسلمانوں سے ہماری کوئی لڑائی نہیں سکھ اپنے حقوق کے لیے صرف حکومت برطانیہ سے ٹکرائیں گے"۔

امیرِ شریعت رح کو زہر دیا گیا

مئی ۱۹۳۲ء میں امیر شریعت کو مدرسہ عربیہ کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لیے شجاع آباد جانا پڑا۔ خان محمد انور خاں کی حویلی میں قاضی احسان احمد کی زیر صدارت امیر شریعت نماز ظہر کے بعد تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو قاضی صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

"پان نہیں کھلاؤ گے؟"

قاضی صاحب نے حاجی نور محمد[1] کو پان لانے کے لیے کہا۔ حاجی صاحب تعمیلِ ارشاد کے لیے چلے ہی تھے کہ برابر کھڑے ایک آدمی نے کہا۔

"میں شاہ جی کے لیے پان لے آیا ہوں۔"

یہ کہہ کر پان حاجی نور محمد کے ہاتھ میں دے دیا اور انہوں نے قاضی صاحب کو دیا۔ امیر شریعت نے تقریر کے دوران جب یہ پان منہ میں رکھا تو ایک منٹ کے بعد کہا۔

"قاضی جی زہر دے دیا۔"

یہ کہتے ہوئے پان تھوک دیا اور قاضی جی نے اسے اپنے ہاتھ پر لے لیا۔ آن کی آن میں امیر شریعت کے چہرے کا رنگ سیاہ پڑ گیا اور قاضی صاحب کا ہاتھ بھی پھول کر ڈبل روٹی کی طرح ابھر آیا۔ تقریر سمیٹ لی اور جلسہ ختم کر دیا گیا۔ اس واقعہ نے شہر کے عوام کو پریشان کر دیا اور قاضی جی کا تمام گھر پاگل ہو گیا۔ ڈاکٹر لچھمن داس ریٹائرڈ سول سرجن نے امیر شریعت کو دیکھ کر تشخیص کی کہ انہیں واقعی زہر دے دیا گیا ہے۔

اس وقت پیاز کا پانی بڑی مقدار میں تیار کرایا گیا۔ ڈاکٹر نے اس پانی سے دوا دینا شروع کی تو جسم سے زہر کا رنگ پیشاب اور پاخانے کے راستے خارج ہونا شروع ہوا۔ پیاز کے مسلسل استعمال سے رات تین بجے تک جسم کا تمام زہر خارج ہو گیا۔ اس دوران ڈاکٹر لچھمن داس امیر شریعت کے سرہانے بیٹھے رہے۔ آخر ساڑھے تین بجے

---

[1] سالار جیوش احرار کہروڑ پکا ضلع ملتان۔

رات ڈاکٹر نے قاضی صاحب کو مبارک باد دی کہ اب شاہ جی خطرے سے باہر ہیں۔

زہر دینے والے کو پولیس صبح ہونے تک گرفتار کر چکی تھی۔ اس کا نام سید عنایت اللہ شاہ یا ولایت شاہ تھا۔ بہرحال جب اسے امیر شریعت کے سامنے لایا گیا تو امیر شریعت نے اپنے زہر دینے والے سے مخاطب ہو کر صرف اتنا کہا۔

"بھائی میں نے آپ کا کیا نقصان کیا تھا؟"

پھر پولیس افسر سے کہا

"میں اس سے کوئی انتقام لینا نہیں چاہتا۔ خدائے تعالیٰ اسے معاف فرمائیں آپ بھی معاف کر دیں۔"

اگر ملزم پر قانون گرفت کرتا تو ممکن ہے ارتکاب جرم کا انکشاف ہوتا مگر امیر شریعت کی بلند حوصلگی نے یہ راز نہ کھلنے دیا کہ زہر کیوں دیا گیا تھا اور اصل مجرم کون تھا۔

آگرہ اور بمبئی کے بعد امیر شریعت پر قتل کا یہ تیسرا حملہ تھا۔ گو حملوں کی نوعیتیں مختلف رہیں مگر مقصود میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ قاتل اور مقتول بھی ایک دوسرے سے اوجھل نہیں ہوئے۔ چونکہ موت و حیات کے مابین انسانی ارادے کو کوئی دخل نہیں اس لیے موت کا ہراول چھاپہ دار زندگی کی راہ میں مرگ ناگہاں ثابت نہ ہو سکا اور نہ ہی امیر شریعت کے مقاصد میں کوئی دیوار حائل ہو سکی۔

پنڈت کرپارام برہمچاری

انہی دنوں میرپور (کشمیر) کی انجمن اصلاح المسلمین کے سالانہ اجلاس میں امیر شریعت کو شمولیت کی دعوت ملی جسے انہوں نے منظور کر لیا۔ لیکن ریاستی حکام اور برطانوی سامراج کسی طرح بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ امیر شریعت کشمیر کے کسی حصے میں داخل ہوں۔ چنانچہ اگست ۱۹۳۳ء کے دوسرے ہفتے کی صبح کوچہ رنگریزاں امرتسر مسلح پولیس کے محاصرہ میں تھا۔ پولیس افسران امیر شریعت سے ایک نوٹس کی تعمیل کرانا چاہتے تھے۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ امیر شریعت کشمیر کی حدود میں داخل نہ ہو سکیں

پولیس اپنے ارادے میں مایوس ہوئی کیونکہ امیر شریعت گھر نہیں تھے۔ اس ناکامی کے بعد پنجاب بھر کے تمام پولیس اسٹیشنوں کو مطلع کر دیا گیا کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو کسی صورت اور کسی راستے سے بھی کشمیر کی حدود میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ نیز تمام ریلوے اسٹیشنوں، لاریوں کے اڈوں اور دوسرے پیدل پہاڑی راستوں پر خفیہ پولیس تعینات کر دی گئی اور اس طرح امیر شریعت کے کھوج میں پوری مشینری حرکت میں آگئی۔ امیر شریعت کو حکومت کے اس ارادے کی اطلاع ضلع جالندھر کے ایک گاؤں میں دی گئی۔

انسان اگر اپنے عزم میں مخلص ہو تو آسمانوں کی بلندیاں اُس کے قدم لیتی ہیں۔ ستارے فرشِ راہ ہوتے ہیں۔ سورج کی کرنیں اسے چاند کے ہالے تک لے جاتی ہیں لیکن حوصلے کی پستی خلوص کی معراج تک پہنچ کر بھی انسان کو اس کی شکست سے نہیں بچا سکتی۔ تمام آئینی پابندیوں کے باوجود امیر شریعت نے اپنے وعدے پر میرپور پہنچنے کا فیصلہ کر لیا۔ پولیس اس یقین پر کہ امیر شریعت اب گھر نہیں آئیں گے اس مورچہ سے غافل ہو گئی۔ اسی رات بارہ بجے امیر شریعت گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ میرپور سے کوئی صاحب آپ کو لینے آئے ہوئے ہیں اور اس وقت وہ محلہ کی مسجد میں سو رہے ہیں۔ امیر شریعت نے انہیں بیدار کیا اور صبح چھ بجے کی گاڑی روانگی کا فیصلہ کر کے وہیں سو گئے۔ رات چار بجے اسٹیشن کے ایک ویران کونے میں جا پہنچے۔ نیز ساتھی سے کہہ دیا کہ تم گاڑی میں میرے ساتھ نہ بیٹھنا۔ اگر مجھے آواز دینے کی ضرورت ہو تو شاہ جی کی بجائے "پنڈت کرپارام برہمچاری" کہہ کر آواز دینا۔ ہندی میں پنڈت کے معنی اونچی ذات کے ہیں اور مسلمانوں کے ہاں سیدا سردار کے معنی میں مستعمل ہے۔ کرپا ہندی میں عطا کرنے کو کہتے ہیں اور "رام" اللہ کے ہم معنی استعمال ہوتا ہے۔ ہندی میں برہمچاری مجرد کو کہتے ہیں سو امیر شریعت نے بخاری کا وزن برابر رکھنے کے لیے یہ لفظ استعمال کیا۔ اس طرح پنڈت کرپارام برہمچاری، سید عطا اللہ شاہ بخاری کے ہم معنی بن گیا۔ یوں امیر شریعت نے اپنے بلند مقاصد کی ادائیگی اور پولیس کی گرفت سے محفوظ رہنے کے لیے اپنے نام کا ہندی ترجمہ

کرلیا تاکہ پولیس یا کوئی دوسرا سرکاری آدمی چوکس نہ ہو۔

نیلے رنگ کا تہبند، نیم آستین کی واسکٹ، سر پر موٹے کھدر کی سفید پگڑی اور ہاتھوں سے خالی ——— لیکن پنجاب پولیس امیر شریعت کو مندرجہ ذیل لباس میں دیکھنے کی عادی تھی ——— سر پر کپڑے کی گول ٹوپی، نیم آستین کا لمبا کرتہ گھٹنوں سے اونچا پاجامہ اور ہاتھ میں ایک موٹا ڈنڈا۔

اجنبی لباس میں امیر شریعت نہ تو پولیس سے پہچانے گئے اور نہ ہی سفر میں کسی دوسرے مسافر سے۔ جہلم کے اسٹیشن پر اترتے وقت ضرورت پڑی تو ہمراہی نے امیر شریعت کو تلاش کے لیے پنڈت کرپا رام کہہ کر مسلسل پکارا۔ مگر امیر شریعت اسے ریلوے حدود سے دور جا کر ملے۔

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام — ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

میرپور، جہلم سے نو میل دور دریائے جہلم کے اس پار آبادی کا نام ہے۔ یہ کشمیر کے ان باشندوں پر مشتمل ہے جن کے اکثر افراد پہلی جنگ عظیم میں بھرتی ہو کر استعماری فوج کے دوش بدوش لڑ چکے تھے۔ تحریک کشمیر کے دنوں بھی اسی بستی کے عوام نے اپنی آزادی کے لیے مجلس احرار کے تحت بڑی قربانی کی تھی۔ پولیس کے انتظامات امرتسر سے جہلم تک مکمل ہو چکے تھے لیکن مجرم محافظوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنی منزل کے سامنے کھڑا تھا۔

میرپور کے سامنے سے گزرتے ہوئے دریائے جہلم کی چیخ و پکار سے پتھروں کے دل دھڑک رہے تھے۔ ناخدا کشتیوں کے پتوار پھیلائے موجوں سے برسرِ پیکار تھے کہ امیر شریعت نے پتن پر قدم رکھا۔ پولیس ہر مسافر کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے امیر شریعت نے پتن سے دریا کو عبور کرنا مناسب نہ سمجھ کر دو میل اوپر جا کر دریائے جہلم کو پار کیا اور پھر کئی میل پیدل سفر کے بعد میرپور میں داخل ہو گئے۔

ہمراہی کو متنبہ کیا کہ تم جاؤ لیکن میری آمد کی اطلاع نہ کرنا۔ میں آپ سے آپ جلسہ میں پہنچ جاؤں گا۔

انجمن کے سالانہ اجلاس کا آخری دن تھا۔ ریاستی حکام مطمئن تھے۔ برطانوی پولیس اپنے کارنامے پر خوش تھی کہ عطاء اللہ شاہ بخاری ریاست میں داخل نہیں ہو سکا۔ منتظمین نے اس خوف سے کہ انجمن کی بدنامی نہ ہو اور رات کے اجلاس میں لوگوں کی حاضری کم نہ ہو شہر میں منادی کرا دی کہ رات آخری اجلاس میں امیر شریعت عوام سے خطاب کریں گے۔ اجلاس شروع ہوا تو صدر جلسہ نے قوم سے معذرت کی۔

"ہمیں افسوس ہے کہ امیر شریعت ریاستی اور برطانوی قانون کی پابندیوں کے باعث تشریف نہ لا ——————"!

ابھی یہ فقرہ ادھورا تھا کہ امیر شریعت نے جلسے کے ایک کونے سے آواز دی۔ "آپ غلط کہتے ہیں"۔ یہ فقرہ کہتے ہوئے اور مجمع کو چیرتے ہوئے اسٹیج کی جانب بڑھتے گئے۔ لوگ حیران تھے کہ یہ کون دیہاتی ہے کہ صدر استقبالیہ کی بات کاٹ رہا ہے۔ اب امیر شریعت سٹیج پر تھے اور بھاری بھرکم کھدر کی پگڑی اتار کر عوام کے سامنے کھڑے تھے۔ اس وقت مجمع کا حال دیکھنے والا تھا۔ آخر امیر شریعت نے صبح چار بجے تک تقریر کی۔

امیر شریعت کے میرپور پہنچنے کے نتیجے میں [illegible]

[illegible]

[illegible] قادیان مرزا غلام احمد کی نبوت کا مرکزی مقام تھا اور مرزائی امت بہت بڑی اکثریت میں یہاں آباد تھی۔ مرزائی [illegible]ت نے یہاں حکومتی طرز پر اپنا نظام قائم کر رکھا تھا، جس کے تحت مختلف شعبے اور دفاتر قائم تھے۔ عملاً اس قصبہ میں خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود کی حکومت تھی۔

غیر مرزائی عوام مسلمان، ہندو اور سکھ اپنی مذہبی اور معاشی زندگی میں آزاد نہ تھے۔ یہاں تک کہ خلیفہ قادیان کی جانب سے ہر غیر مرزائی دکاندار کو یہ حکم تھا کہ اپنی دکانوں پر درج ذیل عبارت نمایاں طور پر آویزاں رکھیں۔

"میں آئندہ سے مرزا غلام احمد کو حضرت مرزا غلام احمد صاحب کہوں گا۔"
میں اپنے کسی مذہبی اجتماع میں شامل نہیں ہوں گا اور نہ ہی قادیان میں اپنے کسی عقیدے کے بزرگ کو آنے کی دعوت دوں گا۔
میں کسی ایسے دکاندار سے لین دین نہیں کروں گا جس کے پاس یہ اقرار نامہ نہیں ہوگا۔"

۱۹۲۸ء مولانا عبدالکریم[1] اور ان کے خاندان نے مرزائیت سے تائب ہونے کا اعلان کیا جس کے نتیجے میں انہیں سخت اذیتیں دی گئیں اور ان کی غیر منقولہ جائداد کو نذر آتش کر دیا گیا۔ ۱۹۳۰ء میں یہ خاندان ترک مرزائیت کے بعد قادیان سے بٹالہ منتقل ہو گیا۔

احرار رہنماؤں کی نظر میں مرزائی دین اسلام کے باغی اور برطانوی سامراج کے کھلے ایجنٹ تھے۔ مرزائیوں کے مظالم انتہا کو پہنچ چکے تھے لیکن کوئی باز پرس نہ تھی۔ اس پر احرار رہنماؤں نے ریاست کشمیر کی طرح قادیان کے عوام کی خدمت کرنا بھی دینی اور سیاسی ثواب سمجھا۔

چنانچہ ۱۹۳۴ء میں احرار نے قادیان میں اپنا دفتر قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور درپردہ دفتر کے لیے مکان کی تلاش شروع کر دی۔

قادیان کے مظلوم اور بیکس عوام کی زبردست خواہش تھی کہ کوئی ان کے زخموں کی مرہم بن کر یہاں آئے مگر ان کے دل خلیفہ قادیان کی قوت کے خوف سے دہشت زدہ تھے وہ ہر اجنبی کو قادیانیوں کا جاسوس سمجھ کر نگاہیں ملانے سے کتراتے تھے۔ آخر مولانا عبدالکریم

---

[1] - اس وقت کے مرزائی مبلغ۔

کے نیم سوختہ مکان میں دفتر مجلس احرار کی بنیاد رکھی گئی۔ علاؤ الدین اور غریب شاہ نامی دو رضاکاروں کو یہاں متعین کیا گیا۔ مرزائیوں کو جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے دونوں رضاکاروں کی خوب پٹائی کی اور مولانا عبدالکریم کے مکانوں کو مزید جلا کر خاک کر دیا۔

ان واقعات کی روشنی میں مجلس احرار نے اپنی تمام توجہ قادیان کی طرف مبذول کرنے کا فیصلہ کیا۔

۱۹۳۴ء اپنے مخصوص سیاسی حالات اور فرقہ وارانہ فضا کی بدولت ایک ہمہ گیر سال تھا۔ اس سال اور کسی دوسری تحریک کو ہوا دینا غیر ملکی حکمرانوں کی عمر بڑھانے کے مترادف تھا۔ لیکن ، ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی سامراج نے جن تحریکات کو از خود جنم دے کر پروان چڑھایا تھا، مرزائیت اسی پودے کا اہم بیج تھا۔ احرار رہنماؤں کے تدبر نے اس سے چشم پوشی کو ہندوستان سے غداری اور اسلام کے بنیادی عقیدۂ ختم نبوت سے انحراف سمجھ کر قادیان کے نظام حکومت میں دراڑ ڈالنا ضروری خیال کیا۔ چنانچہ ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو قادیان میں امیر شریعت کی صدارت میں تبلیغی کانفرنس کرنے کا اعلان کیا۔ اس فیصلے سے مرزائی اور حکومت اپنی اپنی جگہ سوچ میں پڑ گئے۔ پنجاب میں خصوصاً احرار رضاکاروں نے کانفرنس میں شمولیت کی تیاریاں شروع کر دیں۔

برطانوی سامراج ذہنی طور پر اس تحریک سے مقابلے کے لیے تیار نہیں تھا کیونکہ کانگریس اور دوسرے مسلمان رہنما حقوقِ قومیت اور سوراج کی سرد جنگ میں مصروف تھے۔ دوسری جانب انگریز بین الاقوامی سیاست میں جرمن اور روس کے اتحاد میں الجھا ہوا تھا۔ بایں ہمہ احرار کشمیر کی لڑائی میں جس قوت کا مظاہرہ کر چکے تھے، حکومت اس سے بھی غافل نہیں تھی۔ تاہم احرار سے الجھاؤ نامناسب سمجھ کر کانفرنس کی تیاریوں میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ڈالی گئی۔ حکومت کی اس سرد مہری کو دیکھتے ہوئے مرزائیوں نے واویلا کیا تو حکومت نے قادیان کی میونسپل حدود میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی۔ حکومت کے اس رویّہ

نے احرار کو ایک نیا ولولہ دیا لیکن وہ لڑائی کے موڈ میں نہیں تھے۔ لہٰذا قادیان کی میونسپل حدود سے باہر غیر مسلموں سے کانفرنس کے لیے جگہ حاصل کر لی گئی۔ ہندو سبھا ہائی اسکول کی عمارت مہمانوں کے لیے اور سردار ایشر سنگھ کی زمین کانفرنس کے پنڈال کے لیے لی گئی۔

پنجاب کے مختلف شہروں سے احرار رضاکاروں کے قادیان پہنچنے کے لیے ریلوے حکام نے سپیشل گاڑیاں چلانے کا انتظام کیا۔ دہلی تک کے رضاکار لدھیانہ ریلوے اسٹیشن پر اور پشاور تک کے رضاکار لاہور ریلوے اسٹیشن پر جمع ہو گئے۔ دونوں اسپیشل گاڑیاں جب مقررہ اوقات پر قادیان کو روانہ ہوئیں تو یہ نظارہ بھی دیدنی تھا۔ گاڑی کے انجن اور ہر ڈبے پر مختلف مقام کے رضاکاروں کے سرخ جھنڈے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ جب دونوں اسپیشل گاڑیاں امرتسر پہنچیں تو امیر شریعت ان کے استقبال کے لیے پہلے سے وہاں موجود تھے۔ دونوں کے درمیان امرتسر سے امیر شریعت کے لیے ایک تیسری گاڑی کا علیحدہ انتظام تھا۔ جس میں بٹالہ اور دوسرے اضلاع کے رضاکاروں کو سوار ہونا تھا۔ احرار کا یہ سرخ اژدہا امیر شریعت کی معیت میں جب قادیان پہنچا تو اس سرزمین نے ایک نئی کروٹ لی۔ کفر پر اسلام کی یلغار اس عہد کا عظیم واقعہ تھا۔

امیر شریعت قادیان ریلوے اسٹیشن سے ہزاروں رضاکاروں کے جلو میں پیدل پنڈال تک پہنچے، جہاں ایک نیا شہر آباد تھا۔ ہر طرف چھولداریاں اور خیمے نصب تھے۔ ان پر لہراتے ہوئے سرخ پرچم ہواؤں سے کھیل رہے تھے۔ سرخ وردیوں میں احرار رضاکار اس طرح لگتے جیسے بیر بہوٹیاں پہاڑوں کی شاہراہوں پر بکھری پڑی ہوں۔

احرار رہنماؤں کے علاوہ ہر مکتبِ فکر کے علماء نے اس اجتماع میں شرکت کی۔ ۲۱۔ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو لاکھوں انسانوں کی موجودگی میں نماز عشاء کے بعد احرار تبلیغ کانفرنس کا پہلا اجلاس حضرت امیر شریعت کی صدارت میں شروع ہوا۔ حسب عادت امیر شریعت رات دس بجے صدارتی تقریر کے لیے کھڑے ہوئے۔ آسمانوں نے ستاروں کو رات بھر

جاگنے کی تاکید کر دی۔ ہواؤں نے مہمانوں پر اپنے سائے پھیلا دیے۔ چاند نے رات کے اندھیرے پر اپنی سفید چادر ڈال کر کفر کا مکروہ چہرہ ڈھانپ دیا۔ امیر شریعت گویا ہوئے تو کفر گوش بر آواز تھا۔ تمام رات دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے اور سنتے رہے۔ صبح کی اذان کے ساتھ امیر شریعت نے اپنی تقریر ختم کی۔ کانفرنس کی باقی کارروائی تین دنوں میں مکمل ہوئی

گرفتاری

سانحہ شجاع آباد نے حرم امیر شریعت کو ایسا غم دیا کہ وہ دائم المریض ہو کر رہ گئیں زہر ملنے کی اطلاع جیسے ہی امرتسر پہنچی۔ گھر میں اہلیہ محترمہ کو خون کی قے آئی۔ بعد میں ڈاکٹروں کی تحقیق نے ٹی بی کی نشاندہی کر دی۔ امیر شریعت کی تہی دامنی اس شاہی مرض کے علاج کی متحمل نہیں تھی۔ وہ خاصے پریشان رہنے لگے۔ سیاسی اور مذہبی سرگرمیوں میں تعطل آ گیا۔ مسکراتا چہرہ گھریلو پریشانیوں کی نظر ہو گیا۔ مخالف موسم مرض کا ہمنوا ہوا ڈاکٹروں نے رائے دی کہ مریضہ کو کسی پہاڑی مقام پر رکھا جائے لیکن گرہ میں اس قدر حوصلہ کہاں تھا کہ پہاڑوں کا بوجھ سہہ سکے۔ تاہم بادلِ نخواستہ دوستوں اور حکماء کی رائے پر سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ بیوی بچوں کو مسوری لے گئے۔ وہاں علاج شروع کر دیا گیا۔

ایک دلچسپ واقعہ

اگر گھریلو معاملات میں اطمینان نہ ہو تو قلب و نظر کا سکون بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ امیر شریعت دیکھنے کو مسوری ایسی خوشنما اور دلفریب فضا میں رہ رہے تھے مگر رفیقہ حیات کی بیماری نے یہ جنت بھی جہنم بنا دی تھی۔ اسی عالم میں ایک دن امیر شریعت کی چھ سات سالہ بچی گھر سے کھیلنے بازار اتری کہ غائب ہو گئی۔ بچی کی گمشدگی نے سارے گھر کے ساتھ ساتھ حلقہ احباب کو بھی پریشان کر دیا۔ مسوری کے نشیب و فراز کھنگال ڈالے گئے مگر بچی کا کوئی پتہ نہ چلا۔ بستر پر مریضہ کی حرارت بڑھ گئی۔ برطانیہ جیسی سلطنت کو للکارنے والا پیشانی سے پسینہ پونچھنے لگا۔ دوستوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اسی طرح دن گزر گیا اور شام کے چراغوں نے مسوری کو جگمگا دیا۔ اتنے میں ایک انگریز خاتون بچی کو لے کر گھر پہنچی۔ دیکھتے ہی

امیر شریعت نے بچی کو سینے سے لگالیا اور انگریز عورت سے تلخی اور غصے میں کہا۔

"تم نے یہ کیا کیا؟ تم کون ہو! میرے گھر کا نظام تو نے درہم برہم کر دیا"

انگریز خاتون! امیر شریعت کی یہ گفتگو نہ سمجھ سکی۔ مگر اس نے انگریزی میں کہا۔

"عرصہ ہوا میری بچی جو شکل و صورت میں بالکل ایسی ہی تھی فوت ہو چکی ہے۔ مجھے یہ بچی بہت بھلی معلوم ہوئی۔ میں آپ کی اطلاع کے بغیر اسے لے گئی۔ مجھے معاف کریں لیکن آئندہ ہر صبح میں اسے یہاں سے لے جایا کروں گی اور شام کو چھوڑ جایا کروں گی"

اس پر امیر شریعت نے کہا۔

"تو ماں ہے! اگر ماں کے دکھی دل کو میرے دل کے ٹکڑے سے کوئی سکون مل سکتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن یہ دیکھنا کہ اس کی مریض والدہ بھی اسی کے سہارے زندہ ہے"

چنانچہ اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہا۔ کئی دنوں کے بعد انگریز خاتون اپنے خاوند کے ساتھ مسوری سے جانے لگی تو اس نے بلیوں کا نہایت خوبصورت جوڑا بچی کے کھیلنے کے لیے دیا۔ بلیاں اچھی نسل کی تھیں۔ گھر کے ہر فرد سے مانوس ہو گئیں۔ بچی کو کھیلنے کے لیے جیتے جاگتے کھلونے مل گئے۔

قادیان تبلیغ کانفرنس نے مرزائی خلافت اور ایوانِ برطانیہ میں ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ مرزائیت کی اڑتی ہوئی خاک میں خلیفہ قادیان کو موت کے نقشے ابھرتے دکھائی دینے لگے۔ باطل دعوؤں کی ایک ایک لکیر مٹنے لگی۔ آخر خود کاشتہ پودے کی حفاظت کے لیے امیر شریعت کو قادیان کانفرنس کی تقریر کی بنا پر دفعہ ۱۵۳ الف کے تحت مسوری سے ۷۔ دسمبر ۱۹۳۴ء کو گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن دوسرے ہی دن ڈیرہ دون سے انہیں ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ یہ ضمانت ڈاکٹر محمد امیر صاحب نے دی جو ان دنوں ڈیرہ دون ڈسٹرکٹ ہسپتال کے انچارج تھے۔

امیر شریعت کی گرفتاری پر اہل خانہ تو بہرحال پریشان تھے لیکن بلیوں کے جوڑے میں سے نر نے تمام دن اور رات بغیر کچھ کھائے مکان کی چھت پر کھلی فضا میں وقت گزارا حالانکہ گھر کے سب لوگ اسے دودھ پینے کے لیے پچکارتے رہے مگر وہ نیچے نہ اترا۔ جیسے ہی امیر شریعت ضمانت پر رہا ہو کر سوہدی پہنچے اور گھر والوں نے ان سے اس واقعہ کا ذکر کیا تو انہوں نے فوراً آواز دی۔ بلاّ جلدی سے نیچے اتر کر امیر شریعت کے پاؤں چاٹنے لگا اور دودھ بھی پی لیا۔

مجذوب کی دُعا

مقدمہ گورداسپور کی مصروفیت کے باوجود امیر شریعت اپنے مشن کے لیے رواں دواں رہے۔ ۱۹۳۴ء کا سال آخری دموں پر تھا کہ معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موقع پر امیر شریعت کو ملتان جانا پڑا۔ جلسے کی حاضری تاحدِ نظر تھی اور اس پر خاموشی کا یہ عالم جیسے انسانی سروں پر پرندے بیٹھے رہے ہوں۔ رات کے اس سکوت کو صرف امیر شریعت کی آواز توڑ رہی تھی۔ واقعہ معراج النبی کا ذکر کرتے ہوئے اسے تمثیلی انداز میں پیش کیا۔ اور حاضرین کی محویت کا یہ عالم تھا کہ وہ محسوس کرنے لگے جیسے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری ان کے سامنے سے گزر رہی ہے۔
عین ایسے وقت پر مجمع سے ایک مجذوب اٹھا اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر اس نے ملتانی زبان میں کہا۔

"سیّدا! شالا اتھائیں دفن تھیویں"! (اے سیّد! خدا کرے آپ یہیں (ملتان میں) دفن ہوں)

شاید یہ قبولیت کا وقت تھا کہ دل سے نکلی ہوئی بات حقیقت بن کر رہی۔

مقدمہ کی روئیداد

بظاہر ۱۵۳ ا کا مقدمہ اپنے اندر کوئی ایسی جاذبیت نہیں رکھتا کہ قانون اور ملزم کے درمیان انصاف کرنے والی عدالت کو الجھاؤ محسوس ہو۔ لیکن امیر شریعت کے اس مقدمہ نے نہ صرف عدالت کو بلکہ حکومت کی

پوری مشینری کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ مقدمہ کے دوران ہر پیشی پر ہزاروں انسانوں کا کچہری کے احاطہ میں ہجوم، عدالت کو بارگراں ثابت ہوتا۔ اس روز دیگر عدالتوں کا کام بھی معطل ہو جاتا۔ امرتسر سے گورداسپور کے درمیان ریل گاڑیوں میں تل دھرنے کی جگہ نہ ملتی۔

جمعۃ الوداع

انہی دنوں مجلس احرار نے اعلان کیا کہ رمضان المبارک کا آخری جمعہ گورداسپور میں امیر شریعت پڑھائیں گے۔ اس اعلان کے ہوتے ہی پنجاب بھر کے مسلمان گورداسپور پہنچنے کے لیے پر تولنے لگے۔ حکومت پنجاب نے بھی جو شروع سے مسلمان اور قادیانیوں کے درمیان تماشائی تھی، جمعہ کے اجتماع میں مداخلت مناسب نہ سمجھی۔

شہر سے باہر کھلے میدان میں نماز جمعہ کا انتظام کیا گیا۔ گورداسپور کی سرزمین اس روز اپنے مہمانوں کو سنبھالنے سے قاصر تھی۔ شہر کا دامن اپنی ساری وسعتوں کے ساتھ تنگی دامنی کا شکوہ کر رہا تھا۔

امیر شریعت سر پر عربی طرز کا رومال باندھے، ہاتھ میں کلہاڑی سنبھالے جب جمعہ کے خطبہ پر کھڑے ہوئے تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی عربی شہسوار ہے جو ابھی گھوڑے سے اتر کر فوج سے میدان جنگ میں خطاب کر رہا ہے۔ زبان کی شیرینی کلام کی صورت میں بانٹی جا رہی تھی۔ جس سے لاکھوں انسانوں کی دلوں کی جھولیاں بھر رہی تھیں۔ نظریں تھیں کہ امیر شریعت کو چاٹ رہی تھیں۔ دل تھے کہ بلیوں اچھل رہے تھے اور امیر شریعت تھے کہ لاکھوں انسانوں کے جذبات سے کھیل رہے تھے۔

نماز سے فارغ ہو کر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے امیر شریعت کے ہاتھ پر بیعت کی تجویز پیش کر دی جسے امیر شریعت نے قبول کر لیا۔ ایک ایک آدمی آ کر بیعت

کے لیے آتا تو ہفتوں گزر جاتے مگر امیر شریعت نے حکم دیا کہ میرے رومال کے ساتھ ایک پگڑی کو گرہ دے لو اور پھر اس سے تولیے، رومال، چادریں اور پگڑیاں باندھتے جاؤ جس کا ہاتھ ان کپڑوں سے لگ جائے وہ میری بیعت میں اپنے کو داخل سمجھے ۔ بس پھر کیا تھا۔ لاکھوں انسانوں کے سروں پر پگڑیوں، چادروں، تولیوں اور رومالوں کا ایک جال بن دیا گیا ۔ یہ سلسلہ ختم ہوا تو امیر شریعت نے بیعت ہونے والوں کو شرعی احکام سمجھائیے نیز فرمایا کہ کل ہر شخص اپنے اپنے گھر پہنچ کر ایک پوسٹ کارڈ پر اپنا نام اور پتہ درج کر کے مجھے بھیج دے۔

۲۳۔ مارچ ۱۹۳۵ء کو جب خلیفہ قادیاں مرزا بشیرالدین محمود، امیر شریعت کے مقدمہ میں بطور گواہ صفائی اپنی شہادت دینے آئے تو خطوط سے بھری ہوئی سات بوریاں امیر شریعت نے عدالت کے سامنے پیش کیں جو بیعت کرنے والوں نے اطلاعاً لکھے تھے تاکہ حکومت اور خلیفہ قادیاں کو معلوم ہو سکے کہ میرے روحانی مریدوں کی تعداد بھی کئی لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔

خلیفہ قادیاں کی شہادت چار دن تک جاری رہی اور اس دوران اس کی نگاہیں بار بار خطوط سے بھری ہوئی ان بوریوں سے ٹکراتی رہیں۔

فردِ جرم

عدالت نے امیر شریعت پر فردِ جرم عائد کرتے ہوئے لکھا:۔

"ملزم نے اپنی تقریر کے دوران ملکِ معظم کی رعایا کے دو طبقات احمدیوں اور غیر احمدیوں کے درمیان دشمنی یا حقارت پیدا کرنے کی کوشش کی۔"

لفظ "طبقات" مذہبی فرقوں پر اطلاق پاتا ہے۔

امیر شریعت نے فردِ جرم کے جواب میں کہا:۔

"میری تقریر کے جن حصوں کے متعلق شکایت کی گئی ہے وہ مسخ شدہ عبارتیں ہیں جس سے میری اصل تقریر کے معنی ہی بدل دیئے گئے ہیں۔

میں اقبال کرتا ہوں کہ میں نے اپنی تقریر میں یہ لفظ کہے تھے کہ نبی دھوکے باز نہیں ہوتا۔ تبلیغ کانفرنس میں جہاں میں نے سچے اسلام کی اشاعت کے لیے خطبہ صدارت پڑھا تھا مرزا بشیرالدین اور مسلمانوں میں حقارت پیدا کرنے کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔ مرزائی چالیس کروڑ مسلمانوں کو مرزا غلام احمد کو نبی نہ ماننے کی وجہ سے کافر سمجھتے ہیں اور چونکہ یہ مذہبی اختلافات ہیں۔ اس وجہ سے احمدیوں اور غیر احمدیوں میں شادی بیاہ کے اور دوسرے تعلقات ممکن ہی نہیں۔ مرزائی مسلمانوں کے بچوں کا جنازہ بھی نہیں پڑھتے اور وہ مسلمانوں کے متعلق خنزیر کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور ان کی عورتوں کو گالیاں دیتے ہیں اور کتیا سے بھی برے لفظ استعمال کرتے ہیں۔"

اگر ضرورت ہوئی تو میں ایک تحریری بیان شامل کروں گا۔

تحریری بیان دیوان سکھانند ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ گورداسپور نے امیر شریعت کے تحریری بیان کے حسب ذیل اقتباسات اپنے فیصلے میں نقل کیے ہیں۔

"شعبہ تبلیغ مجلس احرار کا فرض تھا کہ اسلامی دنیا کو متنبہ کر دے کہ وہ اپنے تئیں جماعت قادیانی کے فریب، دھوکوں، غلط الزامات اور عیاریوں سے بچائیں۔

"ضمیمہ انجام آتھم اور "نزول المسیح" جو مرزا غلام احمد قادیانی بانی جماعت کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں جو پیر مہر علی شاہ گولڑوی اور دیگر مقتدر ہستیوں کے خلاف سخت الفاظ اور گالیوں پر مشتمل ہیں۔"

"خداوند یسوع المسیح کو بھی اس مسیح موعود نے نہیں چھوڑا۔"

"تریاق القلوب" "نور الحق" اور بہت سی کتابیں مرزا غلام احمد کی لکھی ہوئی اور انگریزوں کے ساتھ چاپلوسی کی وفاداری اور چاپلوسی اور برٹش گورنمنٹ کی بے نظیر خدمات کا ثبوت ہیں۔"

"نورالحق" میں مرزا غلام احمد نے لکھا ہے کہ گورنمنٹ (برطانیہ) سے غداری خدا اور رسول سے غداری کے برابر ہے اور اگر اس بارے میں مرزائی بھی غدار ہو جائیں تو ان سے بڑا غدار کوئی نہ ہوگا۔"

"میں نے کہا تھا کہ او بڈھیا! تو نبی بنا تھا تو تجھے وہی وقار قائم رکھنا چاہیے تھا۔ جب نبوت کا دعویٰ کیا تھا تو تمہیں انگریزوں کے کتے نہ بننا چاہیے تھا۔ تم انگریزوں کے بغیر دم کے کتے ہو۔"

"موجودہ خلیفہ کے وقت میں قادیاں کے لوگوں پر ہر قسم کا دباؤ ڈالا جاتا ہے اور تشدّد کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس ڈر کے مارے کوئی عینی شاہد واقع شدہ مظالم کی گواہی دینے کو بھی تیار نہیں ہوتا۔ محمد امین کو دن دہاڑے مار ڈالا گیا۔ مباہلہ بلڈنگ گرا کر جلا دی گئی لیکن حکومت مجرموں کو پکڑ نہ سکی۔ نہ ان کا چالان کیا گیا اور نہ کوئی اور کارروائی ان کے خلاف کی گئی۔ یہ موجودہ خلیفہ کی حکومت کا نتیجہ ہے اس کا اثر مظلوموں اور ان کے ہم خیالوں کے دلوں پر ظاہر ہے۔ ان لوگوں کو یقین ہو گیا تھا کہ سوائے خلیفہ کے انگریزوں کی کوئی حکومت قادیاں میں نہیں اور خلیفہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ محمد امین کے قتل سے ان مسلمانوں میں تبلیغ کرنے کا راستہ کھل گیا جن کے دل پہلے ہی ڈر سے زخمی ہو گئے تھے۔"

"ملزم نے اس شخص کو چیلنج کیا جسے اپنی طاقت کا گھمنڈ تھا اور جس سے تمام ڈرتے تھے۔ مرزائیوں اور ان کی نبوت اور خلافت کے متعلق ملزم نے کہا کہ اب یہ نہیں رہے گا۔"

"ملزم نے بیان کے آخری حصے میں بطور صفائی کے کہا کہ جماعت احمدیہ نے اپنے کاموں سے اپنے خلاف دنیا میں اتنی نفرت پیدا کر لی ہے کہ میرے لیے ان کے خلاف

لہ ۔ پنجابی لفظ ہے۔

نفرت پیدا کرنا بے فائدہ تھا۔ بالخصوص اس حالت میں میرا مقصد یہ نہ تھا کہ میں نے انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے الفاظ استعمال نہیں کیے۔"

(امیر شریعت کی تقریر جسے عدالت نے اپنے فیصلے میں نقل کیا)

"اب ہم ملزم کی تقریر کی طرف آتے ہیں۔ سامعین جو کہ اکثر گنوار تھے انہیں مخاطب کرتے ہوئے ملزم نے دوران تقریر کہا۔ اس علاقہ میں جہاں بنت خدائی کا دعویٰ کرتے ہیں ہم غریبوں کا اکٹھا ہونا جن میں سے اکثر کا کوئی گھر بھی نہیں، کوئی معمولی بات نہیں۔ پھر ملزم نے کہا، فرعون کا تخت اٹھا جا رہا ہے اور خدا نے چاہا تو یہ نہیں رہے گا۔ پھر قادیان کے متعلق ملزم نے کہا۔ اس علاقہ میں حکومت کے اندر ایک اور حکومت پیدا ہو گئی ہے جہاں ظلم، نا انصافی، تکبر اور غرور اتنا بڑھ گیا ہے کہ جب بخاری مسعودی سے امرتسر کو آیا تو پولیس سائے کی طرح اس کے ساتھ لگی رہی اور امرتسر پہنچنے پر اسے دفعہ ۱۴۴ کے تحت دو سب انسپکٹروں نے نوٹس دیا۔ اس موقع پر ملزم نے پولیس کو جنوں کی فوج قرار دیا۔ پھر تقریر کرتے ہوئے کہا، اللہ اللہ! قادیاں میں غریب شاہ پٹ جاتا ہے ظالم سمجھتا ہے کہ وہ مر گیا اور حکومت کہتی ہے کہ گواہ نہیں ملتا۔ یہ چشم پوشی ہے۔ اور ہم اتنے ذلیل ہیں۔ اس لہجہ میں ملزم نے قادیاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہاں احمدیوں نے ریاست بہاولپور، پٹیالہ اور کشمیر جیسے اختیارات حکومت سے حاصل کر لیے ہیں اور ہمیں استنجا تک کرنے کی اجازت نہیں۔

پھر اس موقعے پر قیام امن کے لیے پولیس متعین کیے جانے کی طرف اشارہ کر کے اور احمدیوں کی اس کانفرنس کے ناکام کرنے کی کوشش کی طرف اشارہ کر کے ملزم نے کہا کہ اگر یہ احرار کی تبلیغی کانفرنس نہ ہوتی تو نہیں معلوم کیا ہو جاتا۔ آج پیروان حسین ہتھکڑیاں پہنے ہوتے۔

ملزم نے لوگوں کو تلقین کی کہ دلیری سے تکلیفیں برداشت کریں اور اپنے رسول اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں کی پیروی کریں ۔ ملزم نے خلیفہ قادیاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ وہ ایک نبی کا بیٹا ہے ۔ میں نبی کا نواسہ ہوں ۔ وہ آئے تم خاموش بیٹھے رہو سو میرے ساتھ اردو، پنجابی، عربی اور فارسی میں تمام مسائل پر بحث کرے تو اس جھگڑے کا آج ہی فیصلہ ہو سکتا ہے ۔ وہ پردے سے نکلے ، گھونگٹ اٹھائے اور حکومت کو ہمارے اختلاف کے بارے میں درمیان میں نہ لائے ۔ وہ کشتی کر لے اور مولا علیؓ کے جوہر دیکھے اور جس شان سے چاہے آئے ۔ وہ موٹر میں آئے ، میں پیدل آؤں ۔ وہ حریر پہن کر آئے میں کھدر کا کرتہ پہن کر آؤں ۔ وہ اپنے ابا کی سنت کے مطابق عنبر، بھنا ہوا گوشت ، یاقوتیاں اور پلومر کی ٹانک وائن پی کر آئے اور میں اپنے نانا کی سنت کے مطابق جو کی روٹی کھا کر آؤں ۔ اسے حکومت سے مدد نہیں مانگنی چاہیے اکیلا آئے اور بخاری کے جوہر دیکھے ۔

اگر ہم یہاں دو چار سال رہے تو خدا کے فضل سے یہ بالکل تباہ ہو جائیں گے ۔

اخبار "زمیندار" اور اس کے ایڈیٹر مولانا ظفر علی خاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور اپنے اس کانفرنس کے صدر ہونے کی طرف اشارہ کر کے ملزم نے یہ بھی کہا کہ ہندوستان کے کسی مولوی میں اس طرح قادیاں میں آنے کی طاقت نہیں ۔ یہ کسی اکیلے آدمی کا کام نہیں ۔ یہ ایک جماعت کی طاقت ہے ۔ جماعت کے سر پر خدا کا ہاتھ ہوتا ہے ۔ حکومت آج آزما کر دیکھے کہ باوجود پابندیوں کے جو حکومت نے لگا دی ہیں اور باوجود جماعت احمدیہ کی مخالفت کے غلامان محمد صلی اللہ علیہ وسلم اتنی تعداد میں نظر آتے ہیں ۔

پھر قادیاں اور خلیفہ کا ذکر کر کے ملزم نے کہا کہ ہم سب کو ایک عزم یہاں لایا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس ناپاک زمین کو پاک کیا جائے ۔ خدا اس زمین کو پاک کرے ۔ کیونکہ یہاں خاتم النبیینؐ کی توہین ہوتی ہے ۔ اس جگہ پیارے مدنی، مکی رسولؐ موجود نہیں ہیں ۔ یہاں شرک ہے اور یہاں چالیس کروڑ مسلمانوں کے تیرہ سو سالہ قبلہ کے احترام کی ہتک کی جاتی ہے ۔ میں ایک بات جانتا ہوں کہ خواہ کوئی شخص مکہ میں پیدا ہو

اور مکہ ہی میں مرے لیکن اگر اس نے رسولؐ سے محبت نہ رکھی تو اس کی نجات نہیں ہو سکتی۔ میں غریب ہوں اور اپنے دلی خیال کا اظہار کرتا ہوں۔ حکومت کو یاد رکھنا چاہیے کہ جو شخص نبوّت کی قمیص تک نہیں چھوڑتا ہم اس کے لیے طاعون اور ہیضے کی طرح ہیں اگر حکومت کوئی اور ہاتھ دیکھنا چاہتی ہے تو اس کی مرضی۔"

تم نے ہمیں سینکڑوں بار آزمایا ہے۔ قبل ازیں خلافت اور مقامات مقدسہ کے احترام کا سوال اٹھا۔ رسول اکرمؐ کی عزت پر حملہ کیا گیا تو یہ احمدی خوشی کے مارے اچھل پڑے جب ملک کا سوال اٹھا، انہوں نے کہا کہ یہ (مرزائی) ہندوستان کے ساتھ تعلق نہیں رکھتے ہیں اور صرف خدا کے رسول سے تعلق رکھتے ہیں۔ حکومت نے ہماری طاقت کو نہیں آزمایا۔ اب گیارہ بجے ہیں۔ سورج نکلنے میں ابھی سات گھنٹے باقی ہیں اور یہاں ہزاروں لوگ جمع ہیں۔ حکومت کو اپنی طاقت ہٹا لینی چاہیے۔

میں گورنمنٹ کے سامنے مسلمانوں کے مطالبات پیش کرنا چاہتا ہوں لیکن اس شخص کا کیا حشر ہوگا جو حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔

یہ ہمارے ساتھ کیا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ یہ انگلستان والوں کے دم کٹے کتے ہیں اور انگریزوں کی چاپلوسی بھی کرتے ہیں اور ان کی جوتیوں کے تلے صاف کرتے ہیں۔ میں فخر نہیں کرتا اور خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ اگر مجھے اکیلا چھوڑ دیا جائے تو تم میرے لئے بشیر کے معرکے دیکھو۔

میں کیا کہوں لفظ تبلیغ نے مجھے مشکل میں ڈال رکھا ہے۔ یہ پولیٹیکل کانفرنس نہیں ہے۔ اگر باہیں ڈھیلی چھوڑ دی جائیں تو مرزائیو! میں تمہیں کہتا ہوں کہ تم پیشاب کی جھاگ کی طرح بیٹھ جاؤ۔ ہم نے کبھی حکومت سے امداد حاصل نہیں کی۔ ان کی نبوت اور خلافت حکومت کے سہارے کھڑی ہے۔ تمہیں کیا پتہ پانچ سال کے عرصہ کے اندر اندر یہ پولیس ہمارے قبضہ میں ہوگی۔

پھر علماء سے جو اسٹیج پر بیٹھے تھے ملزم نے مخاطب ہو کر پوچھا کہ آیا جو شخص پانچویں جماعت میں فیل ہو جائے وہ نبی بن سکتا ہے؟ ہندوستان میں تو اس کی ایک مثال موجود ہے کہ ایک شخص نے فیل ہو کر نبی کا دعویٰ کیا۔

پھر ملزم نے کہا کہ حدیث اور تفسیر سے ثابت ہے کہ مرزا غلام احمد نبی نہیں تھا اور کہ نبی دھوکے باز نہیں ہوتا۔ پھر اب دفعہ ۴۴ نافذ کر دی گئی ہے۔ غریب شاہ کو مار گیا۔ محمد امین کو قتل کیا گیا۔

او مسیح کی بھیڑو! تم سے نپٹنے کے لیے کوئی نہیں آیا۔ ہاں اب تمہارا مجلس احرار سے مقابلہ ہے۔ اس نے تمہیں ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہے۔ یہ مرزائی ہر جگہ ایک ہی ہیں انگریز اگر مکہ پر بھی قبضہ کر لے تو یہ وہاں بھی ان کی امداد کریں گے۔ او مرزائیو! یہ تمہاری نبوت کی تصویر ہے اور یہ حکومت سے مخفی نہیں ہے۔ تم اس کی دیر تک خدمت کرتے رہے ہو اور تم اس کے ناصح اور خیر خواہ ہو۔

یہ ہندوستانی نبی ڈپٹی کمشنر کے پاس جا جا کر کہتا ہے کہ میں نے اور میرے باپ نے حکومت کی بڑی خدمتیں کی ہیں۔ او خبیث! اگر تم نبی ہو گئے تھے تو تمہیں اپنا وقار قائم رکھنا چاہیے تھا۔

ملزم نے ایک جھوٹے مدعی کی مثال بیان کی جس نے شہنشاہ عالمگیر کو گمراہ کیا تھا اور کہا اگر نبوت ہی کا دعویٰ تھا تو پھر تمہیں انگریزوں کا کتا نہیں بننا چاہیے تھا۔ تُف ہے اور لاکھ لعنت ہے اس نبوت پر۔ ایک کتاب "آئینہ کمالات" کا ذکر کر کے ملزم نے کہا۔ مرزا غلام احمد نے لکھا ہے کہ وہ جو مجھے نہیں مانتا حرامی ہے!

میں حکومت سے دریافت کرنا چاہتا ہوں اور حکومت کو جواب دینا ہوگا۔ اگر ایسا ہی کوئی لفظ "زمیندار، احسان، سیاست، احرار" میں چھپ جائے تو یہ تمام اخبارات ضبط ہو جائیں گے لیکن یہ مرزائی حرامی کا لفظ استعمال کریں تو کوئی ایکشن نہیں لیا جاتا۔

"نوراسلام" میں بھی جو مرزا غلام احمد کی لکھی ہوئی کتاب ہے کہتا ہے کہ مرزا غلام احمد کے مخالفین جو اس پر ایمان نہیں رکھتے سور (خنزیر) ہیں اور ان کی بیویاں کتیاں ہیں۔

تقریر ختم کرنے سے پہلے ملزم نے حکام کو مخاطب کر کے کہا کہ کانفرنس کے انعقاد سے ہماری غرض لڑائی نہیں بلکہ اس علاقے کے مظلوم مسلمانوں کا بچاؤ ہے۔ پھر سامعین کو یاد دلایا کہ مرزائی دفعہ ۱۴۴ تعزیرات ہند کے نافذ کرا لینے پر بھی شرمندہ نہیں ہیں۔

فیصلہ میں ملزم کو زیر دفعہ ۱۵۳ا تعزیرات ہند حضور ملک معظم کی رعیت کے دو فرقوں میں یعنی احمدیوں اور دوسرے مسلمانوں کے درمیان نفرت ڈلوانے کے الزام میں مجرم قرار دیتا ہوں۔ فیصلہ کے متعلق اس بات کا پورا احساس رکھتے ہوئے کہ یہ تقریر ایک تبلیغی کانفرنس میں ہوئی تھی میں سمجھتا ہوں کہ چھ ماہ قید بامشقت اس کے لیے کافی ہوگی پس میں ملزم کو چھ ماہ قید بامشقت سزا دیتا ہوں۔ اس کے ساتھ بی کلاس کے قیدیوں کا سا برتاؤ کیا جائے۔

دستخط سکھانند

مجسٹریٹ درجہ اول گورداسپور مورخہ ۲۰ ۴/۲۵

سیشن کورٹ میں اپیل

ماتحت عدالت کے فیصلہ کے خلاف سیشن کورٹ میں اپیل دائر کی گئی۔ ابتدائی سماعت میں امیر شریعت ضمانت پر رہا کر دیے گئے۔

مقدمہ کی پیروی کے لیے بخاری ڈیفنس کونسل قائم ہوئی جو چار وکلاء پر مشتمل تھی۔

۱۔ مولانا مظہر علی اظہر ایڈووکیٹ ۲۔ شیخ شریف حسین پلیڈر

۳۔ شیخ چراغ الدین (جو بعد میں پنجاب ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے)

۴۔ لالہ پشاوری مل ایڈووکیٹ۔

مرزائیوں کی جانب سے چوہدری سر ظفر اللہ خاں اور ان کے بھائی چوہدری اسد اللہ خاں پیروکار تھے۔

اپیل کا فیصلہ مسٹر جی ۔ڈی۔ کھوسلہ سیشن جج گورداسپور نے فریقین کے وکلاء کی بحث کے بعد حسب ذیل فیصلہ دیا۔

"اپیلانٹ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۵۳ ا کے تحت مجرم قرار دیتے ہوئے ۶ ماہ قید با مشقت کی سزا اس تقریر کی بنا پر دی گئی ہے جو اس نے احرار تبلیغ کانفرنس کے موقع پر ۲۱ ۔اکتوبر ۱۹۳۴ء کو کی تھی۔"

اپیلانٹ کے خلاف فرد جرم پر نظر ڈالنے سے پہلے چند واقعات کا بیان کرنا ضروری ہے، جو معاملہ زیر بحث سے تعلق رکھتے ہیں۔ تقریباً پچاس ۵۰ برس کا عرصہ ہوا قادیان کے ایک شخص مسمی غلام احمد نے دنیا کو اعلان کیا کہ وہ مسیح موعود ہے ۔اس اعلان کے ساتھ ہی اس نے اسلام کے اعلیٰ پادری کی حیثیت اختیار کر لی جس کے ارکان اگرچہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن ان کے بعض عقائد اور اصول اسلام کے عام مسلمہ اصولوں سے بالکل متضاد تھے ۔اس فرقے کا جو قادیانی، مرزائی یا احمدی کہلاتا ہے امتیازی نشان یہ ہے کہ اس کے ارکان اس فرقے کے بانی کی (جسے مرزا کہا جاتا ہے) نبوت پر کامل اعتقاد رکھتے ہیں۔ جو تحریک اس طرح شروع کی گئی اس نے جلدی ہی شکل پکڑی اور آہستہ آہستہ لیکن غیر مشتبہ طور پر بڑھنا شروع کیا اور اس کے پیرو چند ہزار کی تعداد میں ہو گئے ۔قدرتاً کچھ مخالفت ہوئی اور مسلمانوں کی اکثریت بانی فرقہ کی مذہبی فوقیت کے گھمنڈ سے سخت ناراض ہوئی۔ مذہب کے مخالفوں نے "کافر" کے الزام کا جو مرزا نے ان پر لگایا شدت سے جواب دیا۔ مگر قادیانیوں نے اس بیرونی تنقید کا بالکل خیال نہ کیا اور اپنے وطن قادیان میں مقامی طور پر محفوظ ہوتے ہوئے جہاں تک ہو سکا حالات کے مطابق خوشحال رہے۔

مقابلتاً محفوظ ہونے کی اس حالت نے غرور پیدا کر دیا جس نے قادیانیوں میں تمرّد کی شکل اختیار کر لی۔ اپنے دلائل کو منوانے اور فرقے کو ترقی دینے کے لیے انہوں نے

ان ہتھیاروں کا استعمال شروع کیا جن کو عام طور پر نہایت ناپسندیدہ کہا جائے گا۔ انہوں نے ان اشخاص کے دلوں میں جنہوں نے ان کی جماعت میں شامل ہونے سے انکار کیا۔ نہ صرف بائیکاٹ، اخراج اور بعض اوقات اس سے بھی بدتر مصائب کی دھمکیوں سے دہشت انگیزی پیدا کی۔ بلکہ اکثر انہوں نے ان دھمکیوں کو عملی جامہ پہنا کر اپنے تبلیغی سلسلے کو مضبوط کیا۔ قادیاں میں ایک والنیٹر کور مقرر کی گئی۔ جس کا منشا غالباً اپنے احکام کو منوانے کے لیے قوت پیدا کرنا تھا۔ انہوں نے عدالتی اختیارات کا استعمال بھی اپنے ذمے لے لیا۔ دیوانی مقدمات میں ڈگریاں صادر کی گئیں اور اجراء بھی کرایا گیا۔ فوجداری مقدمات میں سزا کے حکم سنائے گئے اور سزائیں بھی دی گئیں۔ لوگوں کو فی الحقیقت قادیان سے نکال دیا گیا۔ قصہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ قادیانیوں پر صریح الزام لگایا گیا کہ انہوں نے مکانوں کو تباہ کیا، جلایا اور قتل بھی کیے گئے۔

اس خیال سے کہ کہیں یہ نہ سمجھا جائے کہ مذکورہ بالا واقعات محض احرار کے تخیل کی ایجاد ہیں یہ لازمی ہے کہ میں چند واقعی مثالیں بیان کردوں جو اس مقدمے کی مسل پر لائی گئیں۔

کم از کم دو اشخاص کو اپنے وطن قادیان سے باہر نکالا گیا۔ کیونکہ ان کے خیالات مرزا کے خیالات سے متفق نہ تھے۔ وہ اشخاص حبیب الرحمٰن نمبر۲ اور اسمٰعیل ہیں مسل پر ایک چھٹی ڈی۔ زیڈ نمبر۲۳ موجود ہے جس کا کاتب خود موجودہ مرزا ہے اور جس میں یہ حکم دیا گیا کہ حبیب الرحمٰن گواہ صفائی نمبر۲ کو قادیاں میں آنے کی اجازت نہیں اس چھٹی کو مرزا بشیر الدین محمود گواہ نمبر۲۷ نے تسلیم کیا ہے۔ گواہ صفائی نمبر۱۲ (خانصاحب فرزند علی) نے تسلیم کیا ہے کہ اسمٰعیل کو جماعت سے خارج کیا گیا اور قادیان میں داخل نہ ہونے کا حکم دیا گیا۔ بہت سے دیگر گواہوں نے تشدد اور ظلم کی داستانیں بیان کی ہیں بھگت سنگھ گواہ نمبر۴۹ بیان کرتا ہے کہ مرزائیوں نے اس پر حملہ کیا۔ ایک شخص غریب شاہ کو قادیانیوں

سنے مارا اور جب اس نے دعویٰ کرنا چاہا تو کوئی شخص اس کی شہادت دینے کے لیے آگے نہ آیا۔ قادیانی ججوں کے فیصلہ شدہ مقدمات کی مسلیں پیش کی گئیں جو مسل میں موجود ہیں۔ مرزا نے تسلیم کیا ہے کہ عدالتی اختیارات قادیان میں استعمال کیے جاتے ہیں اور ان معاملات میں وہ خود آخری عدالتِ اپیل ہے۔ عدالت کی ڈگریوں کا اجرا کیا جاتا ہے اور ایک مثال بھی موجود ہے۔ جہاں ڈگری کے اجراء میں ایک مکان کو نیلام کیا گیا۔ قادیاں میں ایک والنٹیر کور کی موجودگی کی شہادت گواہ صفائی نمبر ۱۴ (مرزا شریف احمد) نے دی ہے[1]۔

علاوہ ازیں سب سے سنگین معاملہ عبدالکریم کا ہے۔ جس کی داستان حقیقتاً ایک داستانِ درد ہے۔ اس شخص نے مرزائی مذہب قبول کیا اور قادیان چلا گیا۔ مگر وہاں اس کے دل میں مذہبی شکوک و شبہات پیدا ہوئے اور اس نے مرزائیت سے توبہ کر لی۔ تب اس پر ستم آرائی کی ابتداء ہوئی۔ اس نے ایک اخبار "مباہلہ" نامی جاری کیا، جس کا مقصد مرزائی جماعت کے اعتقادات پر تنقید کرنا تھا۔ مرزا نے ایک تقریر میں جو دستاویز ڈی زیڈ نمبر ۳۹ (الفضل مورخہ ۳۰/۴ / ۱۱) میں شائع ہوئی ہے۔ اس تقریر میں ان لوگوں کی طرف اشارہ بھی کیا جو اپنے مذہب کی خاطر قتل کرنے کو بھی تیار ہوتے ہیں۔ اس تقریر کے فوراً بعد عبدالکریم پر قاتلانہ حملہ ہوا لیکن وہ بچ گیا۔ ایک شخص محمد حسین عبدالکریم کی امداد کرتا تھا اور ایک فوجداری مقدمہ میں جو عبدالکریم کے خلاف چل رہا تھا اس کا ضامن تھا۔ اس پر فی الحقیقت حملہ ہوا اور اسے قتل کر دیا گیا۔ قاتل پر مقدمہ چلا اور پھانسی کی سزا ہوئی۔

پھانسی کے حکم کی تعمیل ہوئی اور پھانسی کے بعد لاش قادیانی لائی گئی اور اس کو

---

[1] ۔ مرزا کو جو عرضیاں دی جاتی ہیں۔ ان پر قادیانی ساخت کا اسٹامپ اور کورٹ فیس تیار کر کے فروخت اور استعمال کیا جاتا ہے لیکن یہ سب پوشیدہ طور پر کیا جاتا ہے۔

دھوم دھام سے اسے اس جگہ دفن کیا گیا جس کا نام "بہشتی مقبرہ" ہے۔ الفضل اخبار میں جو مرزائی جماعت کا اخبار ہے قتل کی تعریف اور قاتل کی مدح سرائی کی گئی ہے لکھا گیا ہے کہ قاتل مجرم نہیں تھا اور امر واقعہ سے قبل ہی جان دے کر پھانسی کی بدنام کنندہ سزا سے بچ گیا۔ خدا نے اپنے عدل و انصاف میں یہ مناسب سمجھا کہ پھانسی کی ذلت سے پہلے ہی اس کی روح قبض کرلے۔

جب عدالت میں مرزا کا ایک معاملے کے متعلق بیان لیا گیا تو اس نے بالکل مختلف کہانی بیان کی اور کہا کہ محمد حسین کے قاتل کو باعزت طریق پر اس لیے دفن کیا گیا تھا کہ اس نے اپنے جرم پر اظہار ندامت کیا تھا اور اس طرح گناہ سے بری ہو گیا تھا لیکن دستاویز ڈی زیڈ نمبر ۴۰ اس کی تردید کرتی ہے اور مرزا کی نیت اور اس کی دلی کیفیت کا پتہ اس اظہار خیال سے بالکل عیاں ہے۔ (ڈی زیڈ نمبر ۴۰)

میں یہاں یہ بھی کہہ دوں کہ اس دستاویز کا مضمون لاہور ہائی کورٹ کی توہین بھی ہے۔

ایک اور واقعہ بھی ہے جو محمد امین کے قتل سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ محمد امین بھی مرزائی تھا اور یہ امر واقعہ ہے کہ وہ اس فرقے کا ایک مبلغ تھا اس کو بخارا بھیجا گیا تھا۔ لیکن کسی وجہ سے اس کو ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا۔ اس کی موت کلہاڑی کی ایک ضرب سے ہوئی جو چوہدری فتح محمد گواہ صفائی ۱۱۲ نے لگائی۔ عدالت ماتحت نے اس معاملے کو سرسری نظر سے دیکھا ہے لیکن اس پر نظر غائر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ محمد امین اگرچہ مرزائی تھا لیکن وہ مرزا کا مورد عتاب ہو چکا تھا۔ اس لیے ہستی بزرگ نہیں رہا تھا۔ اس کی موت کے واقعات کچھ ہی ہوں یہ امر ناقابل انکار ہے کہ محمد امین تشدد کی موت مرا۔ پولیس کو واقعے کی اطلاع دی گئی لیکن بالکل کارروائی نہ کی گئی۔ یہ بحث کرنا فضول ہے کہ قاتل حفاظت خود اختیاری کر رہا تھا کیونکہ یہ فیصلہ تو اس عدالت کا کام ہے جو مقدمے کی سماعت کرے۔ یہ امر کافی تعجب انگیز ہے کہ چوہدری فتح محمد

نے بہ اقرار صالح بیان دیا ہے کہ اس نے محمد امین کو قتل کیا تھا مگر پولیس کچھ نہ کر سکی اور اس کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ مرزائی طاقت اتنی بڑھ گئی تھی کہ کوئی گواہ سامنے آکر سچ بولنے کو تیار نہیں تھا۔ ہمارے سامنے عبدالکریم کے مکان کا معاملہ بھی ہے۔ عبدالکریم کو قادیان سے نکالنے کے بعد اس کا مکان جلا دیا گیا۔ اسے قادیان کی سمال ٹاؤن کمیٹی سے حکم حاصل کر کے نیم قانونی طریقے سے گرانے کی کوشش بھی کی گئی۔

یہ افسوسناک واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ قادیان میں طوائف الملوکی تھی جس میں آتش زنی اور قتل بھی ہوتے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکام ایک غیر معمولی درجے کے فالج کا شکار ہو چکے ہیں اور دنیوی اور دینی معاملات میں مرزا کے حکم کے خلاف کبھی آواز نہ اٹھائی گئی۔ مقامی افسروں کے پاس کئی مرتبہ شکایات کی گئیں لیکن انسداد نہ ہوا۔ مسل پر ایک دو ایسی شکایات ہیں لیکن ان کا حوالہ دینا غیر ضروری ہے اور اس مقدمے کے اغراض کے لیے یہ بیان کر دینا کافی ہے کہ قادیان میں ظلم و جور جاری ہونے کے متعلق غیر مشتبہ الزامات عائد کیے گئے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طرف مطلق توجہ نہ کی گئی۔

ان کارروائیوں کے سدِ باب کے لیے مسلمانوں کے اندر منتقدانہ روح حیات پیدا کرنے کے لیے احرار تبلیغ کانفرنس بلائی گئی۔ قادیانیوں نے قدرتاً اس اقدام کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور انہوں نے کانفرنس کے انعقاد کو کلیتہً روکنے کے لیے دلیرانہ کوشش کی۔ احرار کانفرنس کے انعقاد کے لیے ایک شخص ایشر سنگھ کی زمین حاصل کی گئی تھی۔ قادیانیوں نے اس زمین پر قبضہ کر لیا اور اس پر دیوار کھینچ دی۔ اس طرح ایک ہی قطعہ زمین سے بھی محروم کر دیے گئے جو ان کو قادیان میں حاصل ہو سکتا تھا اور اس لیے مجبور کر دیے گئے کہ قادیان سے ایک میل کے فاصلے پر ایک جگہ اپنا اجلاس کریں۔ دیوار کا بنایا جانا ظاہر کرتا ہے کہ اس وقت فریقین میں تعلقات کس قدر کشیدہ تھے۔

اور مرزائیوں کا تمرّد کس حد تک پہنچ گیا تھا کہ وہ اپنی دست درازی کے قانونی انجام سے اپنے آپ کو بالکل محفوظ و مامون سمجھتے تھے۔

لیکن اجلاس ہوا اور یہی اجلاس تھا جس کے لیے اپیلانٹ کو کہا گیا جو بے انداز مقناطیسی جذب اور اعلیٰ درجے کی فصیحانہ خطابت کا مالک ہے۔ اُس نے اس اجلاس میں وہ تقریر کی جسے ولولہ انگیز خطاب کہا جاسکتا ہے۔ تقریر کئی گھنٹے جاری رہی اور بیان کیا گیا ہے کہ حاضرین کی یہ کیفیت کہ گویا مسحور ہیں۔ اس تقریر میں اپیلانٹ نے اپنے خیالات کا اظہار کس قدر صاف گوئی سے کیا اور اس نے اس بات کو پوشیدہ نہ رکھا کہ اس کے دل میں مرزا اور اس کے پیرووں کے خلاف کس قدر ناپسندیدگی بلکہ نفرت ہے تقریر اخبارات میں شائع ہوئی اور اس پر اعتراض کیا گیا۔ معاملہ حکومت پنجاب کے سامنے پیش ہوا جس نے موجودہ مقدمہ کی اجازت دی۔

اپیلانٹ کے خلاف جو فرد جرم ہے اس میں اس کی تقریر کے سات حصے درج ہیں جن کو خاص طور پر قابلِ اعتراض اور قابلِ گرفت بتایا گیا ہے۔ وہ حصے یہ ہیں۔

"فرعونی تخت الٹا جارہا ہے انشاء اللہ یہ تخت نہیں رہے گا۔ وہ نبی کا بیٹا ہے، میں نبی کا نواسا ہوں۔ وہ آئے تم سب چپ چاپ بیٹھ جاؤ۔ وہ مجھ سے اردو، فارسی، پنجابی میں ہر معاملے پر بحث کرلے۔ یہ جھگڑا آج ہی ختم ہو جائے گا۔ وہ پردے سے باہر آئے۔ نقاب اٹھائے۔ کشتی لڑے۔ مولا علیؓ کے جوہر دیکھے۔ وہ ہر رنگ میں آئے۔ وہ موٹر میں بیٹھ کر آئے میں ننگے پاؤں آؤں۔ وہ ریشم پہن کر آئے میں کھدر کا کرتا۔ وہ زعفران، کباب، یاقوتیاں اور پلومر کی ٹانک اپنے ابا کی سنت کے مطابق کھا کر آئے میں اپنے نانا کی سنت کے مطابق جو کی روٹی کھا کر آؤں۔ یہ ہمارا مقابلہ کیسے کرسکتے ہیں۔ یہ برطانیہ کے دُم کٹے کتے ہیں۔

وہ خوشامد میں برطانیہ کے بوٹ کی ٹو صاف کرتا ہے۔ میں تکبر سے نہیں کہتا بلکہ خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ پھر بشیر کے اور میرے ہاتھ دیکھو۔ کیا کروں لفظ تبلیغ نے ہمیں مشکل میں ڈال دیا ہے۔ یہ سیاسی مجلس نہیں ہے۔ او مرزائیو! اگر باگیں ڈھیلی ہوتیں۔ میں کہتا ہوں کہ اب بھی ہوش میں آؤ۔ تمہاری طاقت اتنی بھی نہیں جتنی پیشاب کی جھاگ ہوتی ہے۔

جو پانچویں جماعت میں فیل ہوتے ہیں، نبی بن جاتے ہیں کیونکہ ہندوستان میں ایک مثال موجود ہے۔ جو فیل ہوا وہ نبی بن گیا۔ او مسیح کی بھیڑو! تم سے کسی کا ٹکراؤ نہیں ہوا۔ جس سے اب مقابلہ پڑا ہے یہ مجلس احرار ہے۔ اس نے تم کو ٹکڑے کر دینا ہے۔

او مرزائیو! اپنی نبوت کا نقشہ دیکھو۔ اگر تم نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا تو نبوت کی شان تو رکھتے۔

اگر تم نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ تو انگریزوں کے کتے نہ بنتے۔"

اپیلانٹ نے عدالت ماتحت میں بیان کیا کہ اس کی تقریر درست طور پر نہیں لکھی گئی۔ اس نے جملہ نمبر ۵ کے متعلق خاص طور پر کہا کہ وہ اس کا کہا ہوا نہیں ہے۔ اگرچہ اس نے تسلیم کیا کہ باقی جملوں کا مضمون میرا ہے لیکن اس نے عبارت کے غلط ہونے کا عذر اٹھایا۔ عدالت ماتحت کے فیصلے پر کہ جملہ نمبر ۵ کی رپورٹ غلط ہے اور اپیلانٹ کو اس کے متعلق مجرم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اپیلانٹ کی سزا یابی باقی چھ فقروں پر مدار رکھتی ہے۔ اپیلانٹ کے وکیل نے بحث کے وقت فوراً تسلیم کیا کہ فقرہ جات نمبر ۱ تا نمبر ۴ اور نمبر ۵ تا نمبر ۷ فی الحقیقت اپیلانٹ نے کہے۔ وہ اس م[illegible] پورٹر کی عبارت کی درستگی کو بھی زیر بحث نہیں لانا چاہتا۔ اس لیے میرے وا[illegible] امر قابل فیصلہ ہے

کہ آیا یہ چھ جملے زیر دفعہ ۱۵۳ الف قابلِ گرفت ہیں اور کیا یہ الفاظ کہہ کر مرافعہ گزار نے کسی جرم کا ارتکاب کیا ہے۔

"مرافعہ گزار نے عدالت میں بہت سی تحریری شہادتیں پیش کیں اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اس کی تقریر کا مقصد مرزا اور اس کے متبعین کے جبر و تشدد اور ستم رانیوں پر جائز اور معقول تنقید کرنا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ اس کی تقریر کا واحد مقصد سوئے ہوئے مسلمانوں کو دعوت بیداری دینا اور مرزائیوں کے مذموم افعال کا راز طشت از بام کرنا تھا۔"

اس نے اپنی تقریر میں جا بجا مرزا کے ظلم و تشدد کا ذکر کیا ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ ان مسلمانوں کی شکایات کا ازالہ کرایا جائے جو صرف مرزا کی نبوت اور اس کے خود ساختہ اقتدار کے منکر ہونے کی وجہ سے ہدفِ جور و ستم بنے ہوئے ہیں۔

میں نے مرافعہ گزار کی تقریر پر ان حالات کی روشنی میں غور کیا ہے جو قادیان میں رونما ہو رہے تھے۔ اوّل یہ کہ وہ مرزا اور اس کے متبعین کے افعال پر تنقید کرے دوم یہ کہ مسلمانوں کو اس بات کی ترغیب دینا چاہتا تھا کہ وہ مرزائیوں کے مقابلے میں بیدار ہو کر اپنی شکایات کے ازالہ کی کوئی صورت نکالیں۔

مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ تقریر مسلمانوں کی طرف سے صلح کا ایک اعلان تھی۔ لیکن اسے سرسری طور پر پڑھنے سے کوئی معقول آدمی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ اعلان صلح کی بجائے یہ تقریر پیکار آزمائی کی دعوت تھی۔ مرافعہ گزار نے قانون کے اندر رہنے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی ہو لیکن اپنی لسانیت اور جوشِ فصاحت میں وہ قانون کی امتناعی حدود کو پھاند گیا اور اس نے ایسی باتیں کہہ دیں جو اس کے سامعین کے دلوں میں مرزائیوں کے خلاف نفرت پیدا کرنے کے سوا اور کوئی اثر نہیں کر سکتی تھیں ایک پختہ کار مقرر کی طرح مرافعہ گزار نے روما کے مارک انٹونی کی سُنّت پر عمل کرتے

ہوئے یہ اعلان تو کر دیا کہ وہ احمدیوں سے برسر پیکار نہیں ہونا چاہتا لیکن صلح و اتحاد کا یہ اعلان ایسی سخت کلامی سے مملو تھا جس کا مقصد سامعین کے دل میں احمدیوں کے خلاف منافرت و حقارت پیدا کرنے کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ مرافعہ گزار کی تنقید میں ایسے حصے بھی ہیں جو مرزا کے افعال کی جائز اور معقول تنقید پر مبنی ہیں۔ تقریر کے دوران غریب شاہ کو زدوکوب کرنے کا واقعہ، محمد حسین اور محمد امین کے واقعات قتل اور مرزائے قادیان کے جبر و تشدد کے متعدد ایسے واقعات کا حوالہ دیا گیا ہے جن پر تنقید کرنے کا ہر سچے مسلمان کو حق ہے۔ نیز اس تقریر کے دوران اس توہین کا بھی ذکر کیا گیا جو احمدی اپیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان میں روا رکھتے ہیں اور جن سے لازمی طور پر مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔

مسلمانوں کے نزدیک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خاتم النبیین ہیں۔ لیکن مرزائیوں کا عقیدہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد بھی کئی نبی آ سکتے ہیں اور ان پر وحی نازل ہو سکتی ہے اور یہ کہ مرزائیہ فرقہ کا بانی نبی اور مسیح موعود تھا۔ اس حد تک مرافعہ گزار کی تقریر قانون کی زد سے باہر ہے لیکن جب وہ سخت کلامی سے کام لیتا ہے اور مرزائیوں کو ایسے ایسے فارمولا سے خطاب کرتا ہے جنہیں سننا کوئی معقول آدمی گوارا نہیں کر سکتا تو وہ جائز اور معقول تقریر کی حدوں کو پھاند جاتا ہے اور خواہ اس نے یہ باتیں دیدہ و دانستہ کہیں یا جذبات کے جوش میں قانون ان سے اغماض نہیں برت سکتا۔

مرافعہ گزار کو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ اس کے سامعین کی اکثریت ناخواندہ دیہاتیوں پر مشتمل ہے اور یہ کہ اس قسم کی تقریر ان کے دل میں احمدیوں کے خلاف بغض و عناد کے جذبات کی پرورش کرے گی۔ واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ تقریر نے سامعین پر مزعومہ اثر ڈالا اور مقرر کی لسانیت سے مسحور ہو کر لوگ [illegible] بڑے جوش کا مظاہرہ کیا۔ یہاں اس امر پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ سامعین نے اس وقت اپنے بعض

کے خلاف متشدّدانہ اقدام کیوں نہ کیا اس تقریر نے نفرت کو کچھ زیادہ ہی کر دیا۔

فردِ جرم میں جن سات حصوں کو قابل گرفت ٹھہرایا گیا میرے نزدیک ان میں سے تیسرا اور ساتواں سب سے زیادہ قابلِ اعتراض حصے ہیں۔ ان فقروں میں مرافعہ گزار نے احمدیوں کو برطانیہ کے دم بریدہ کتے کہا ہے۔ میرے نزدیک دوسرے حصے تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۵۳ اکے ماتحت قابل گرفت نہیں ہیں۔

پہلا حصہ یعنی فرعونی تخت الٹا جا رہا ہے میرے نزدیک بالکل بے ضرر ہے۔ دوسرا حصہ مرزا کی خوراک کے متعلق ہے۔ یہ امر قابل دلچسپی ہے کہ مرزائے اوّل نے اپنے عقیدت مندوں میں سے ایک کے نام خط لکھا تھا جس میں خوراک کی ایسی تمام تفصیلات موجود تھیں۔ یہ خطوط کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں اور ان کا ایک نسخہ اس مقدمے کے کاغذات میں شامل ہے۔

میری رائے میں تیسرے اور ساتویں حصے کے سوا اور کوئی حصہ قابل گرفت نہیں۔ اس کا یہ مقصد نہیں کہ مرافعہ گزار کی تقریر میں صرف دو حصے ہی قابل اعتراض ہیں تقریر کے کوائف سے پتہ چلتا ہے کہ مرافعہ گزار کا مقصد جہاں احمدیوں کے افعالِ شنیعہ کا تار پود بکھیرنا تھا وہاں مسلمانوں کے دل میں ان کے خلاف جذبات حقارت پیدا کرنا بھی تھا۔ یہ امر کہ سامعین نے اس کی تقریر سے متاثر ہو کر تشدّد اور امن شکنی کا مظاہرہ کیوں نہ کیا۔ اس کے جرم میں صرف تخفیف کرنے کا موجب ہو سکتا ہے۔

مجھے اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ مرافعہ گزار احمدیوں پر تنقید کرنے میں حق بجانب تھا۔ تاہم میرے خیال میں اس نے قانون کی حدیں توڑ دیں۔ اگرچہ مرافعہ گزار نے اصطلاحی جرم کا ارتکاب کیا ہے تو بھی قانون کی ہمہ گیری کا تحفظ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اس مقدمے کے تمام پہلو پر غور کرنے اور سامعین پر اس تقریر کے اثرات کا اندازہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مرافعہ گزار نے تعزیرات ہند کی دفعہ

۱۵۳ و کے ماتحت ارتکاب جرم کیا ہے اور اس کے جرم کو قائم رہنا چاہیے۔ سزا کی کمی اور بیشی کا اندازہ کرتے وقت یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان واقعات کو بھی پیش نظر رکھا جائے جو قادیان میں رونما ہو رہے تھے۔ چنانچہ میں اس کی سزا میں تخفیف کرتے ہوئے اسے تا اختتام عدالت قید محض کی سزا دیتا ہوں۔

دستخط

۶۔ جون ۱۹۳۵ء   جی۔ ڈی۔ کھوسلہ سیشن جج۔ گورداسپور

تقریر امرتسر

ماتحت عدالت گورداسپور میں ابھی مقدمہ زیر سماعت تھا کہ امیر شریعت نے امرتسر میں ۲۴۔ اپریل ۱۹۲۵ء کو رات نو بجے مسجد خیر الدین میں مولانا عبدالغفار غزنوی کی زیر صدارت تقریر کرتے ہوئے کہا

"بعض ناعاقبت اندیش لوگ کہتے ہیں کہ مرزائیت کے ساتھ ہمارے شیعہ، سنی اور وہابی کی طرح کے فروعی اختلافات ہیں اور اسی سلسلے میں گورنر بہادر انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں مسلمانوں کو اتحاد اور اتفاق کی تعلیم دے چکے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ ان کے لیے اپنے خود کاشتہ پودے کی مخالفت ناقابلِ برداشت ہے۔ ہم انشاء اللہ اس پودے کو جڑ سے اکھاڑ کر رہیں گے۔

مرزائیت کے وجود میں آنے کی وجہ یہ ہے کہ تیرہ سو سال سے عیسائیت کے جگر میں ایک کانٹا تھا جو کسی طرح نکلنے میں نہیں آتا تھا۔ وہ کانٹا یہ تھا کہ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو وحدت ملی یا مرکزیت عطا ہوئی تھی یہ دنیا کی کسی قوم کو حاصل نہ تھی۔ عیسائیت چاہتی تھی کہ اسلام کی اس وحدت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ اس کی بربادی کے لیے پنجاب میں مرزا غلام احمد قادیانی کو کھڑا کیا گیا۔ اور اس نے ایڑی چوٹی کا

زور وحدتِ ملّی کو تباہ کرنے میں لگا دیا۔ یہ اختلافات فروعی ہیں؟ کہ نبی کے مقابلے میں نبی کھڑا کر دیا گیا ہے اور مدینۃ النبیؐ کے مقابلہ میں مدینۃ المسیح اور جنت البقیع کے مقابلہ میں بہشتی مقبرہ بنایا گیا ہے۔

اس وقت ضرورت ہے کہ مرکزی شعبہ تبلیغ مجلس احرار کو مضبوط کیا جائے محلہ محلہ شعبہ ہائے تبلیغ قائم کر دیے جائیں اور قادیان میں زمین اور جائداد خرید لی جائے۔ جس دن ہمارا اپنا ہائی سکول، اپنا تبلیغی کالج، اپنی مسجد اور مہمان خانہ قادیان میں تیار ہو گیا، سمجھو کہ مرزائیت کا خاتمہ ہو گیا۔

مرزا بشیرالدین نے پیش گوئی کی تھی کہ ۶ ماہ کے بعد احرار کا کام ختم ہو جائے گا۔ اور یہ لوگ ٹھنڈے پڑ جائیں گے مگر میں بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارا کام اب شروع ہوا ہے۔

قادیان کانفرنس کے خطبے کی بناء پر حسب دفعہ ۱۵۳ الف کے تحت مجھے گرفتار کیا گیا ہے اس کی سزا زیادہ سے زیادہ صرف دو سال ہے۔ میرا جرم یہ ہے کہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خادم ہوں۔ اس جرم میں یہ سزا بالکل کم ہے۔ میں خاتم الانبیاءؐ کے ناموس پر ایسی ہزار جانیں قربان کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے شیروں اور چیتوں سے ٹکڑے ٹکڑے کرا دیا جائے اور پھر کہا جائے کہ تمہیں بجرم عشق محمدؐ تکلیف دی جا رہی ہے تو میں خندہ پیشانی سے اس سزا کو قبول کروں گا۔ میرا آٹھ سالہ بچہ عطاء المنعم اور اس جیسے، خدا کی قسم، ہزار بچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حرمت پر سے نچھاور کر دوں۔"

زلزلہ کوئٹہ | ۳۰۔ اور ۳۱ مئی ۱۹۳۵ء کی درمیانی رات جب کہ نظامِ کائنات محوِ خواب تھا اور صرف آسمان کے تارے جاگ رہے تھے کوئٹہ میں ایسا زلزلہ

آیا کہ بندگانِ خدا عذابِ الٰہی کے باعث زندگی کے راستے موت کی پگڈنڈی پر سفر کرنے لگ پڑے۔ دن بھر کے تھکے ماندے لوگ رات کو صبح کی آس لے کر سوئے تھے کہ زلزلے نے انہیں لاکھوں من ملبہ کے ڈھیر تلے دبا دیا۔ اس عظیم حادثہ میں ہزاروں انسان جان و مال سے محروم ہو گئے۔

یوں تو کوئٹہ زلزلہ کے حادثات کا عادی تھا لیکن انسانی تباہی کا یہ منظر اپنی نوعیت میں عظیم تر تھا۔ ان دنوں مجلسِ احرار کا آفتاب نصف النہار پر تھا، جس کی روشنی سے غیر ملکی سامراج کی آنکھیں بھی چندھیا رہی تھیں۔ مجلسِ احرار نے کوئٹہ سے دہلی تک اپنے ریلیف کیمپ کھول دیئے۔ ہزاروں باوردی رضاکار مصیبت زدگان کی امداد کے لیے رات دن مصروف ہو گئے۔

مجلسِ احرار کی اس بے لوث خدمت سے متاثر ہو کر وائسرائے ہند نے احرار رہنماؤں کو دہلی آنے کی دعوت دی تاکہ انہیں ان خدمات کے صلے میں سرکاری سرٹیفکیٹ دیا جائے۔ وائسرائے کی اس دعوت پر جماعت میں قدرے اختلاف تھا۔ ورکنگ کمیٹی نے اپنے ایک غیر رسمی اجلاس میں اس دعوت پر غور کیا۔ اجلاس میں امیرِ شریعت بھی امرتسر سے پہنچ گئے۔ جب انہیں وائسرائے کی اس دعوت کا علم ہوا تو اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

> "ملک ہمارا ہے۔ نقصان بھی ہمارا ہی ہوا ہے۔ بھائی بھی ہمارے مرے ہیں۔ ان کی خدمت کرنا بطور انسان کے ہمارا فرض تھا، سو ہم نے جو کچھ کیا اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے کیا۔ اس میں وائسرائے کون ہے جو ہماری خدمات سے خوش ہو کر ہمیں سرٹیفکیٹ دے۔ ہم تو اپنے خدا سے انعام چاہتے ہیں۔ انگریز کا سرٹیفکیٹ ہمارے لیے کوئی قیمت نہیں رکھتا۔ اگر مجلس احرار نے کوئٹہ ریلیف کیمپ وائسرائے کو خوش کرنے

کے لیے کھولا تھا تو پھر اس کی دعوت پر فوراً دہلی جانا چاہیے اور اگر مصیبت زدگان کی امداد خدا کے لیے کی ہے تو پھر میری رائے میں دوستوں کو اس قسم کے مشورے پر اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔"

امیرِ شریعت کی اس رائے کو ورکنگ کمیٹی نے پسند کیا اور وائسرائے کو اطلاع کر دی گئی کہ کوئٹہ ریلیف کیمپ کے سلسلے میں آپ کی دعوت کا شکریہ بعض مصروفیتوں کی بنا پر ہم ملاقات کے لیے نہیں آ سکتے۔

مسجد شاہ چراغ

بساطِ سیاست پر بیٹھنے والے کھلاڑی جب حالات و واقعات کی نبض پر انگلیاں رکھتے ہیں تو ان کے فکر کی دماغی نالیاں اُبھر کر حالات کے نقشے کو کچھ اس ترتیب سے لکیرتی ہیں کہ واقعات آپ سے آپ سلجھتے جاتے ہیں۔

جھوٹ اور فریب کا خوبصورت نام ہے "سیاست" اور سیاسیات میں اقتدار کے گھوڑے پر سفر کرنے والے لوگ عموماً اسی لباس سے آراستہ رہے ہیں۔

۱۹۳۵ء کے آئین نے ہندوستان کو جو رعایت دی، وقت کے دانشور کرگسوں کا لباس اُتار کر عوام میں شاہین بن کر پرواز کرنے لگے، حالانکہ وہ شاہین کی طرح شکار کرنے کے عادی نہیں تھے۔ لیکن کرگسوں میں پرورش پانے والے جب بال و پر سنوار کر سامنے آئے، تو نگاہیں فریب کھا گئیں۔

ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نفاذ کے بعد میاں سر فضل حسین جب وائسرائے کی کونسل سے فارغ ہو کر پنجاب میں آئے تو ان دنوں سر سکندر حیات آئندہ انتخاب کے لیے دوسری سیاسی پارٹیوں کے علاوہ مجلس احرار سے بھی رشتہ گانٹھ رہے تھے۔ ان کی رائے میں مجلس احرار اس وقت ایسی جماعت تھی جو پنجاب کی سیاست پر غالب تھی۔

سر فضل حسین زیرک آدمی تھے، اور ہوائی قلعے تعمیر کرنے کے عادی تھے اِس گٹھ جوڑ پر اپنے مستقبل کو روشن نہ پا کر حکومت سے سازش کر کے سر سکندر حیات خاں کو سٹیٹ بنک

آف انڈیا کا ڈپٹی گورنر بنا کر کلکتہ بھجوا دیا۔ راستے کی اب دوسری بڑی دیوار صرف مجلس احرار تھی، جس کے رضاکاروں کی سرخ وردیاں گرتے ہوئے فرنگی وقار کے اُفق پر پرچھائیاں ڈال رہی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس دیوار کے گرانے کو سیاسی استادوں نے مسجد شہید گنج کا منصوبہ تیار کیا۔

سات اور آٹھ جولائی ۱۹۳۵ء کی درمیانی رات کو چند سکھ مزدوروں نے لنڈا بازار کی تاریخی مسجد "شہید گنج" کو بلا کسی وجہ کے گرانا شروع کر دیا (ان دنوں پنجاب کا گورنر مسٹر ایمرسن تھا۔ یہی وہ انگریز آفیسر ہے جو ۱۹۲۴ء میں ملتان کا ڈپٹی کمشنر تھا، جس نے تعزیہ داری کے موقعہ پر ہندو مسلم فساد کرایا تھا) مسجد گرنے سے لاہور اور باقی پنجاب کی ساری فضا پھر سے مکدر ہو گئی (سیاسی اُستاد گھات میں تھے)، اور مسجد کا تمام ملبہ مجلس احرار پر گرا دیا گیا۔ اس سارے کھیل تماشے کے پس منظر میں مولانا ظفر علی خاں اور سر فضل حسین کی سیاست کام کر رہی تھی۔

مجلس احرار نے اعلان کیا کہ مسجد گری نہیں گرائی گئی ہے، اور یہ سب الیکشن کی سیاسی تدبیریں ہیں۔ مگر انگریز، مرزائی اور رجعت پسند مسلمان اس تیز روی سے پنجاب کی سیاسی زندگی کو اپنے قبضے میں کر چکے تھے کہ وقت کی سب سے بڑی فعال جماعت (احرار) کو سنبھالا لینا دشوار ہو گیا۔ اس ہنگامہ آرائی میں امیر شریعتؒ نے لاہور شاہی مسجد میں تقریر کے دوران کہا:-

> "مسجد شہید گنج آج ہی سکھوں کے قبضے میں نہیں آئی، بلکہ سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ ہی واقعات نے نئی کروٹ لی اور ۱۷۶۲ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ حکومت کے سنگھاسن پر براجمان ہوئے تو پنجاب کی قسمت نے پلٹا کھایا۔ ایک ہزار برس تک اٹھارہ لاکھ مربع میل پر حکومت کرنے والی مسلمان قوم بھی ان کی غلامی میں چلی گئی۔

موجودہ مسجد شہید گنج جو کبھی مسجد عبداللہ خاں کے نام سے مشہور تھی، سکھوں کی غلامی میں جا کر اس نے اپنا نام بھی تبدیل کر لیا۔ یہ عبداللہ خاں شہزادہ دارا شکوہ کا خانساماں تھا۔ یاد رہے کہ خانساماں سے مراد انگریزی عہد کا کھانا پکانے والا نہیں، بلکہ اس دور میں خانساماں کے معنی "خانِ ساماں" یا "امیر ساماں" تھا۔ یعنی ساماں کی حفاظت کرنے والا تھا۔

آج الیکشن کی ضرورت نے انگریز پرست لوگوں کو مجبور کیا کہ مسجد گرا کر اور اس کے کھنڈرات کو سیڑھیاں بنا کر پنجاب اسمبلی میں جائیں۔ ان مسجد کے شیدائیوں سے پوچھو کہ کیا لاہور میں کوئی دوسری مسجد[1] نہیں جس میں آج کل سرکاری دفاتر قائم ہیں۔ اس کی بازیابی کے لیے تو آواز بلند ہوتی، مگر ایک ایسی مسجد کو گرا کر کونسل کی سیڑھیاں بنایا جا رہا ہے جس کے گرنے سے پنجاب ہی میں نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں خون کی ندیاں بہہ جانے کا احتمال ہے۔"

یہ تقریر صرف آدھ گھنٹہ جاری رہی، اور امیر شریعتؒ کے اس فقرے نے کہ کیا لاہور میں کوئی اور دوسری مسجد نہیں جس میں آج کل سرکاری دفاتر قائم ہیں، حکومت اور عوام کو گہری فکر میں ڈال دیا۔

مسجد شاہ چراغ کے متعلق رائے بہادر کنہیا لال اپنی کتاب "تاریخ لاہور" میں لکھتے ہیں:۔

"محلہ سید چراغ شاہ، محلہ موج دریا بخاری کے مشرقی جانب واقع تھا۔ سادات گیلانی اس میں سکونت رکھتے تھے۔ یہ محلہ شاہ جہانگیر کے عہد میں آباد ہوا، اور مدت تک آباد رہا۔ آخر بے انتظامی کے باعث سکھ

---

[1] - امیر شریعتؒ کا یہ اشارہ مسجد شاہ چراغ کی طرف تھا جس میں ان دنوں سرکاری دفتر تھا

غارتگروں نے اس کو ویران کر دیا۔

سید چراغ شاہ کا مقبرہ مسجد پختہ اب تک موجود ہے، مسجد تو سرکاری قبضے میں ہے اور اس میں اکاؤنٹنٹ جنرل کا دفتر ہے۔"

حکومتِ پنجاب نے یہ سوچ کر کہ شہید گنج کی مٹی جو سکھ مزدوروں کے ہاتھوں اڑی اور مجلس احرار کے دامن سے لپٹ گئی، ایسا نہ ہو کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی اس تقریر کے بعد مسجد شاہ چراغ کی اینٹیں حکومت کو بھی زخمی کر دیں، چنانچہ تقریر کے دوسرے ہی دن اخبارات میں یہ خبر جلی عنوان سے شائع ہوئی، کہ

"حکومت نے مسجد شاہ چراغ مسلمانوں کو واگزار کر دی ہے اور اس کا انتظام انجمن اسلامیہ کے سپرد کر دیا ہے۔"

قتل کی سازش

پھول جب اپنی بہار چھوڑ دیتا ہے، تو نسیمِ سحر گاہی کا ایک ہی جھونکا اسے شاخ سے علیحدہ کر دینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

جو قومیں حصولِ زندگی کے سانچے اپنی تن آسانی کے ہاتھوں توڑ دیتی ہیں، پھر انہیں اپنے مستقبل کے راستے اندھیرے دکھائی دیتے ہیں۔

ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت انتخاب کی ضرورت نے مسلمان قوم سے وہ شعور چھین لیا، جس سے امتیاز کی دیوار قائم تھی، اور اپنے پرائے کے درمیان نشان دہی کی جا سکتی تھی۔ سیاسی شعبدہ بازوں نے اچھی بھلی قوم کو فکر کی تمام صلاحیتوں سے بیگانہ کر دیا، اور ایسے سبز باغ دکھائے کہ اپنے پرائے میں امتیاز مشکل ہو گیا۔ مسجد شہید گنج کی ہر اینٹ مجلس احرار کے دفتر کی طرف اٹھنے لگی۔ سیاست کے کھلاڑی مہروں کو اس انداز سے حرکت دیتے کہ بساط کی ساری بازی انہی کے حق میں معلوم ہوتی۔ انہی دنوں قادیان کے بتوں نے بھی خدائی کا دعویٰ کیا، وہ بھی اپنے راستے کے پہاڑ سے ٹکرانے کو نکل پڑے۔

امیر شریعتؒ اپنے رفیقوں کی معیت میں بھیرہ (ضلع سرگودھا) سے اس مشن پر یوپی

تک دورہ کرنے کا ارادہ لے کر روانہ ہوئے کہ مسلمانوں کو سمجھائیں کہ مسجد شہید گنج گری نہیں گرائی گئی ہے۔ اس کے پیچھے کن کن ہاتھوں نے کیا کیا حرکتیں کیں ہیں۔ چنانچہ مجلس احرار کا یہ وفد امیر شریعتؒ، مولانا حبیب الرحمٰن، شیخ حسام الدین اور (جانباز مرزا) راقم الحروف پر مشتمل مسلسل سفر کے بعد پنجاب کی سرحدوں کو عبور کر کے یو۔پی میں داخل ہوا۔ یہاں سے مولانا حبیب الرحمٰن اور شیخ حسام الدین جماعتی ضرورت کے لیے واپس کر دیے گئے۔ اب امیر شریعت اور راقم اس سفر کے لیے ..... باقی رہ گئے۔ یہی وہ تاریخی سفر ہے جس کے دوران لکھنؤ میں امیر شریعت پر انکشاف ہوا کہ یہاں (لکھنؤ میں) مدح صحابہؓ قانوناً جرم ہے اور اسی سفر میں امیر شریعت کے دل میں اس قانون کو ختم کرنے کے ارادے نے جنم لیا۔

یہ سفر کانپور تک جاری رہا، جب واپس ہوئے تو امیر شریعتؒ کی صحت تھکن کی وجہ سے بہت کمزور ہو رہی تھی۔ تاہم کچھ دن ستانے کے بعد ارادے، آرزوئیں اور عزم اسی طرح جوان تھے۔

لاہور پہنچے کچھ دن گذرے تھے کہ پولیس کا ایک ذمہ دار افسر میرے پاس آیا، اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے مجھ سے سوال کیا "آپ راجندر سنگھ آتش کو جانتے ہیں؟"

"جی ہاں"

میرے جواب پر اس نے سنبھل کر کہا "کیسے اور کب سے؟"

"۱۹۳۰ء میں راجندر سنگھ آتش میرے ساتھ لاہور بورسٹل جیل میں بطور سیاسی قیدی کے رہے ہیں۔ اس کے بعد میری ان کی ملاقات نہیں ہوئی۔"

میرے جواب پر پولیس افسر نے کہا "چلیے وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

"کہاں"؟ ۔۔۔ "تھانے کے حوالات میں" ۔۔۔ اب میری پریشانی قدرے بڑھی کیونکہ یہی نوجوان اخبار کی ایک خبر کے مطابق گذشتہ دنوں کلکتہ سے انقلابی پارٹی کا ممبر ہونے کے شبہ میں گرفتار کیا گیا تھا۔ پولیس افسر نے مجھے مجبور کیا، کہ میں راجندر سنگھ آتش سے ملوں

ان کے ساتھ جب میں متعلقہ تھانے پہنچا تو حوالات میں میں نے ایک ایسے نوجوان کو دیکھا جو میرے تصوّر سے بالکل جُدا تھا۔

۱۹۳۰ء میں جس راجندر سنگھ آتش کو میں نے دیکھا تھا، اس کے سر کے بال اور داڑھی اس کی عمر سے بھی زیادہ تھی۔ لیکن پانچ برس گزرنے پر راجندر سنگھ آتش یورپین لباس میں ایک ایسا فیشن ایبل نوجوان تھا، جس کا سر اور منہ سکھ مذہب کے اصولوں سے غداری کر چکا تھا۔

"آئیے جانباز صاحب! کیسے مزاج ہیں؟" "ٹھیک ہیں۔" لیکن آپ نے یہ کیا کیا؟ بس یہی کہانی سُنانے کے لیے آپ کو بلایا ہے، یاد ہے گذشتہ دنوں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے ساتھ آپ نے پنجاب اور یوپی کا دورہ کیا تھا۔" "جی ہاں" ۔"میں اس پورے دورے میں آپ کے ساتھ ساتھ تھا۔" اس کے بعد راجندر سنگھ آتش نے ہمارے سفر کے تمام واقعات من وعن سنائے جس کی تصدیق کرنا پڑی۔

"لیکن آپ نے ہمارے ساتھ یہ دورہ کیوں کیا؟"

میرے اس سوال پر اس نے پولیس افسر سے کہا کہ ہم کوئی بات کرنا چاہتے ہیں، آپ ذرا ہٹ جائیں۔ مگر پولیس افسر نے کہا "میں آپ دونوں کی گفتگو میں ڈیوٹی پر متعین کیا گیا ہوں۔" اس پر راجندر سنگھ آتش نے اپنی گفتگو کا لہجہ آہستہ کر دیا۔ اس نے بتایا۔

"خلیفہ قادیان بشیر الدین محمود نے مجھے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے قتل پر مقرر کیا تھا، اور اس کے عوض دس ہزار روپیہ دینے کا وعدہ کیا، جس کی ادائیگی پانچ ہزار روپیہ پیشگی اور پانچ ہزار واقعہ کے بعد طے پائی تھی، لیکن میں ارادتاً ایسا نہیں کر سکا۔ حالانکہ مجھے اکثر مواقع میسر آئے۔ لیکن میری ناکامی کی وجہ صرف یہ رہی کہ شاہ جی کے قتل کرنے کو میرا جی نہیں چاہا۔ ایک آدمی عوام کو اچھی باتیں سناتا ہے خواہ وہ کسی مذہب سے کیوں نہ ہو، میں

اپنی ذاتی غرض کے لیے اسے کیوں قتل کروں"۔

اس کے بعد جب میں واپس قادیاں پہنچا تو میری ناکامی پر بشیر الدین محمود نے کہا، تو پھر تم ڈاکٹر گور بخش[۱] سنگھ کو قتل کر دو۔ لیکن میں نے اس پر بھی انکار کیا۔ میرے اس انکار پر مرزائیوں نے مجھے ایک سازش کے تحت کلکتہ میں گرفتار کرا دیا ہے۔ اب میرا ارادہ ہے کہ میں یہ تمام واقعہ عدالت میں بیان کر دوں کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کی جماعت (مجلس احرار) اس مقدمے میں میری امداد کرے گی"؟

یہ سارا کچھ سننے کے بعد میں نے کہا "پارٹی سے مشورے کے بعد ہی کوئی رائے دے سکتا ہوں"۔ اس پر راجندر سنگھ سے میری ملاقات دوسرے دن پر ملتوی ہوگئی۔

دوسرے دن چودھری افضل حق سے ابھی پہلے دن کی گفتگو کا ذکر چل ہی رہا تھا کہ اخبارات آگئے۔ چودھری صاحب نے پہلی سُرخی دیکھتے ہی کہا، "لو! اس کو تو پولیس نے رہا کر دیا"۔ معلوم ہوا کہ پولیس افسر نے ہم دونوں کی گفتگو اپنے حکام کو پہنچائی، تو پنجاب کی حکومت نے بہتری اسی میں سمجھی کہ راجندر سنگھ کو رہا کر دیا جائے۔

قضا و قدر کی تحریریں نہ مٹائی جا سکتی ہیں، اور نہ ہی ان کا کوئی شوشہ تبدیل ہو سکتا ہے۔ لیکن انسان ہے کہ اپنے قلم کے فیصلے کی طرح ان میں بھی ترمیم چاہتا ہے۔ آگرہ، بمبئی اور شجاع آباد کے بعد امیر شریعت کے قتل کی یہ چوتھی کوشش تھی جو بہرحال ناکام رہی

قاتل سے ملاقات

حالات کی پیشانی شکن آلود تھی افضاؤں میں انتقامی ارادوں کے تیور ہنوز سُرخ تھے کہ امرتسر میں راجندر سنگھ آتش سے پھر ملاقات ہوگئی۔ اس نے امیر شریعت سے ملنے کا ارادہ ظاہر کیا، لیکن میں اسے طرح دے گیا۔ آخر جب اس کا اصرار بڑھا تو میں اسے امیر شریعت کے مکان پر لے گیا۔ قاتل اور مقتول کا آمنا سامنا

---

[۱] ڈاکٹر گور بخش سنگھ قادیاں میں مرزائیوں کا سخت مخالف تھا۔

ہونے سے پیشتر میں نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا، اور اپنی تسلّی کے لیے راجندر سنگھ کے جسم کو ہاتھ اور نگاہوں سے کھنگال ڈالا، جس پر وہ مسکرایا۔ اس کی یہ مسکراہٹ میرے شبہ پر طنز تھی۔

"لباس اور جسم کی تلاش میں اب کیا رکھا ہے جانباز! دل اور آنکھوں میں دیکھو، جن میں ندامت کے کس قدر آنسو ہیں، جو شاہ جی کی بھینٹ کرنے آیا ہوں۔ میں اپنے پرماتما کی سوگند کھا کر کہہ رہا ہوں کہ میرے پاپ مجھے پچھتاپ کے لیے اس عظیم انسان کے چرنوں میں سیس جھکا دینے کے لیے مجبور کر رہے ہیں کہ جس کی زبان نے میری چھری کو کُند کر دیا اور میرے ارادوں کو موت آگئی، ورنہ آج قاتل اور مقتول کا رشتہ ٹوٹ چکا ہوتا۔"

یہ کہتے ہوئے راجندر سنگھ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور میں نے امیر شریعت کے دروازے پر دستک دی۔

"کون ہے بھائی! اندر آجاؤ۔" یہ امیر شریعتؒ کی آواز تھی، ہم بیٹھک میں چلے گئے۔ امیر شریعتؒ پان بنانے میں مصروف تھے۔

"یہ آپ کا قاتل ہے شاہ جی!" میں نے عرض کیا۔ امیر شریعتؒ نے ایک نظر راجندر سنگھ کی طرف دیکھ کر فرمایا۔ "ہاں بھائی! ایسے ہی لوگ میرے قاتل ہوتے ہیں۔" میں نے اپنے فقرے کو دوبارہ ذرا وضاحت سے دُہرایا تو سنبھل کر بیٹھ گئے اور متعجب ہو کر سوال کیا۔ "کیا مطلب"؟

"یہ راجندر سنگھ آتش ہے، یہ آپ کے حالیہ طویل سفر میں مرزائیوں کی طرف سے آپ کے قتل پر مامور کیا گیا تھا۔"

"اچھا — کیوں بابو! یہ درست ہے؟" "ہاں شاہ صاحب!"۔

"تو پھر کون سی چیز مانع رہی؟" "یہ میں نہیں جانتا شاہ صاحب! مگر آپ کے طرزِ تکلّم

نے مجھے اس گناہ سے بچائے رکھا۔" اس پر امیر شریعتؒ نے زور سے قہقہہ لگایا۔ اور راجندر سنگھ کو مخاطب کر کے کہا:۔

"میرا طرزِ تکلّم مجھے کیا بچا سکتا ہے بابو! موت اور زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے۔ یاد رکھو، جو رات قبر کی ہے وہ باہر نہیں آسکتی، اور جس رات کو باہر آنا ہے اسے دنیا کی کوئی طاقت قبر کے سپرد نہیں کر سکتی۔ البتہ تمہیں میری نصیحت ہے کہ بحیثیت انسان ہمیشہ انسان کی بھلائی کے لیے سوچا کرو۔ دولت ہاتھ کی میل ہے بابو! اس کے لالچ میں اگر تم مجھے قتل بھی کر دیتے، اور میرے قتل کے الزام سے تمہارا دامن محفوظ بھی رہتا تو کسی دوسرے موقعہ پر بغیر جرم کے مارے جاتے ـــــ خیر!"

امیر شریعت پھر مسکرائے اور قرآن کریم کی چند آیات کا ترجمہ سناتے رہے کہ اتنے میں چائے آگئی۔ راجندر سنگھ امیر شریعت کی گفتگو اور قرآن عزیز کے لفظوں میں اپنے ماضی پر غور کرتا ہوا بے اختیار رونے لگ پڑا اور روتا ہوا امیر شریعتؒ کے قدموں پر گر پڑا۔

"اپنے رب کے سامنے گرو جو تمہیں معاف کرے میں تو تمہارا چاکر ہوں بابو! لو چائے پیو۔"

امیرِ شریعتؒ اور راجندر سنگھ آتش کے درمیان یہ ملاقات مغرب کی نماز تک رہی۔

تحریکِ مدحِ صحابہؓ

پنجاب اور یوپی کا دورہ کرتے ہوئے لکھنؤ (احاطہ شوکت علی) میں تقریر کے دوران کسی نے امیرِ شریعتؒ سے صحابہ کرامؓ کے نام کے ساتھ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہنے پر بلند آواز سے پکارا۔

"شاہ صاحب! یہاں صحابہ کے نام کے ساتھ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہنا جرم ہے۔"

یہ فقرہ سنتے ہی امیرِ شریعتؒ نے مجمع سے دوبارہ تصدیق کی ـــــ اور معاً بعد طبیعت میں یکایک تیزی آگئی، اور صحابہ کرامؓ کا بار بار نام لیا، اور ہر نام کے ساتھ رضی اللہ عنہ کہا۔

حالانکہ امیر شریعتؒ چار روز لکھنؤ ٹھہرے، لیکن قانون اور حکومت دونوں خاموش رہے۔ امرتسر واپس پہنچ کر جماعت سے صلاح و مشورے کے بعد ۲۶۔ اگست ۱۹۳۷ء کو دوبارہ لکھنؤ گئے اور چوک فرنگی محل میں تقریر کے دوران کہا:۔

”مجھے افسوس ہے کہ انگریز نے لکھنؤ میں ایک ایسا قانون جاری کر رکھا ہے، جس کی رو سے منقبتِ صحابہ کرنا اور کرانا جُرم ہے۔ حضرت ابوبکر و عمر، عثمان غنی و علی رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعریف کرنا قابلِ سزا جرم ہے، اور یہ سزا دو سال قید تک ہے۔

غضب خدا کا اسّی ہزار اہلِ سنت والجماعت کی آبادی اور وہ اس قانون کو حکومت سے نہیں بدلواتی۔ چند ماہ ہوئے ہمارے بھائی غازی منے خاں[1] نے یہاں مدحِ صحابہ پڑھی تھی جس کی پاداش میں ان پر مقدمہ چل رہا ہے۔ میں حکومت سے مطالبہ کرتا ہوں کہ وہ اس قانون کو فوراً منسوخ کر دے۔ یہ مداخلت فی الدین ہے۔ حکومت نے خود مذہب کی آزادی کا اعلان کر رکھا ہے۔

گالیاں بکنا تو جُرم ہو سکتا ہے، مگر کسی کی تعریف کرنا کیونکر جرم قرار دیا جا سکتا ہے۔ آج حکومت نے قمار بازی، شراب نوشی اور عصمت فروشی پر کوئی پابندی عائد نہیں کی۔ لیکن خلفائے راشدینؓ کی تعریف پر پابندی عائد ہے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ اپنی پوزیشن پر غور کرے۔

میں شیعہ حضرات سے خطاب نہیں کر رہا، بلکہ میرا روئے سخن حکومت کی طرف ہے، شاید کل کو کچھ اور سمجھ لیا جائے۔ اس لیے کان کھول کر سن لو، میں تمام یو۔پی کو ایک مرکز پر جمع کر دوں گا، اور اس قانون کو آئینی جدوجہد سے

---

[1] لکھنؤ مجلس احرار کے ناظم اعلیٰ تھے۔

ختم کرا کر دم لوں گا۔ اور اگر اس طرح بھی اس قانون کو ختم نہ کیا گیا تو پھر میں بے آئینی بھی کر سکتا ہوں۔"

ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات میں حکومت ان دنوں کسی طرح بھی دوسرے رنگ میں سوچنا مناسب نہیں سمجھتی تھی۔ کیونکہ ۱۹۳۵ء کے آئین کے نتیجہ میں جو واقعات سامنے آنے والے تھے، ان کے پیشِ نظر صوبائی جھگڑوں کی کوئی حقیقت نہیں تھی، لہٰذا امیر شریعت کی مندرجہ بالا تقریر کو حکومت نے ہوا کے دوش پر لٹکا دیا۔ اس کے بعد مجلسِ احرار نے اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لیا اور یہاں سے تحریک مدح صحابہؓ کی ابتداء ہوئی۔

قادیان میں نمازِ جمعہ

احرار ہمیشہ خیالات اور جذبات کے دو مختلف محاذوں پر برسرِ پیکار رہے ہیں، اوّل ہندوستان میں اسلام کا غلبہ اور دوسرے درجہ پر وطن کی آزادی۔

ان آمنے سامنے کے دو مختلف مورچوں پر احرار کبھی انگریز سے اور کبھی ہندو سے نبرد آزما رہے۔

۱۹۳۵ء میں انگریز نے جو آئین ہندوستان کو دیا۔ احرار اپنے دونوں مقاصد کے لیے اس آئین کے تحت الیکشن میں اترنے کی تیاری کر رہے تھے کہ پنجاب میں مسجد شہید گنج اور یو، پی میں مدح صحابہؓ کے ڈوا ایسے جال پھیلائے جن کا تعلق احرار کے جذبۂ ایمان سے تھا۔ اسی سنہ میں امیر شریعت کے مقدمے کا فیصلہ لکھتے وقت گورداسپور کے سیشن جج مسٹر جی، ڈی کھوسلہ نے مرزائیت کے تابوت میں جو میخ ٹھونکی، اس نے قادیانی مذہب کی بنیادوں میں دراڑ ڈال دی، چنانچہ اس خفّت کو مٹانے کے لیے خلیفۂ قادیان بشیر الدین محمود نے احرار کو مباہلہ کے لیے قادیان آنے کی دعوت دی، جسے احرار نے فوراً قبول کر لیا۔ جب وہ تیار ہو کر قادیان جانے لگے، تو قادیانیوں نے اپنی سرکار

سے واویلا کرنا شروع کیا کہ دیکھو احرار پھر قادیان آ رہے ہیں۔ چنانچہ حکومت نے قادیان میں دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ کر دیا۔ چونکہ احرار اس سفر کا عزم کر چکے تھے، لہذا جماعت نے قادیان میں نماز جمعہ پڑھنے کا اعلان کر دیا، اور امامت کے لیے امیر شریعتؒ کا نام تجویز کیا گیا۔

سال بھر کی دوڑ دھوپ اور مقدمہ سے رہائی کے بعد امیر شریعتؒ کچھ دنوں گھر میں سستانے کا ارادہ رکھتے تھے کہ جماعتی فیصلے کے تحت مولانا مظہر علی اظہر امرتسر پہنچے اور امیر شریعتؒ کو جماعتی فیصلے سے آگاہ کیا۔ امیر شریعتؒ نے مجلس احرار اسلام ہند کے ناظم اعلیٰ کا حکم سن کر تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا ـــ "بہت اچھا، جو مزاج یار میں آئے"

۶ دسمبر ۱۹۳۵ء کو امیر شریعتؒ بذریعہ گاڑی امرتسر سے قادیان روانہ ہوئے۔ اس وقت احرار دوستوں کا جم غفیر بھی ان کی معیت میں اسی گاڑی پر سوار ہوا۔ بٹالہ ریلوے اسٹیشن پر پولیس افسروں نے امیر شریعتؒ سے دفعہ ۱۴۴ کے نوٹس پر تعمیل کرانی چاہی، جس کی رُو سے امیر شریعتؒ قادیان کی حدود میں داخل نہیں ہو سکتے تھے، لیکن امیر شریعتؒ نے تعمیل نوٹس سے انکار کر دیا اور اپنا سفر جاری رکھا۔ جینتی پور کے ریلوے اسٹیشن پر سب انسپکٹر پولیس خان چراغ الدین نے امیر شریعتؒ کو دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی پر گرفتار کر لیا، اور اسی وقت سفری مجسٹریٹ مسٹر ڈزنی نے آپ کو تین ماہ قید اور ایک سو روپیہ جرمانہ اور عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں مزید ایک ماہ قید بامشقت کی سزا کا حکم سنا کر گورداسپور ڈسٹرکٹ جیل بھیج دیا، جہاں سے ایک ہفتہ بعد آپ کو لاہور سنٹرل جیل منتقل کر دیا گیا۔ قادیان میں نماز جمعہ کی تحریک نے مستقل شکل اختیار کر لی، اور ہر جمعہ کو کوئی نہ کوئی گرفتاری ہوتی آخر ایک ماہ بعد حکومت نے دفعہ ۱۴۴ واپس لے لی، مگر لیڈروں کو اپنی میعاد اسیری گزارنے کے بعد رہا کیا گیا۔ چنانچہ امیر شریعت ۱۵ اپریل ۱۹۳۶ء کو لاہور سنٹرل جیل سے رہا ہو کر آ گئے

سینما کی تعمیر

امیر شریعت رہا ہو کر آئے تو ملک کی سیاسی فضا یکسر بدلی ہوئی پائی۔ مجلس احرار سمیت تمام سیاسی جماعتیں اپنے اپنے مینی فسٹو کے تحت

انتخابی ہنگاموں میں مصروف تھیں۔ امیرِ شریعتؒ کا مزاج ان ہنگاموں سے متفق نہ تھا۔ آپ فرمایا کرتے کہ:۔

"برطانیہ نے ہندوستان کو ایسا آئین بنانے کی اجازت کیونکر دے دی، جس کے تحت صوبے خود مختار ہوں گے؟"

اور ساتھ ہی غالب کا یہ شعر پڑھتے ؎

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

لیکن جماعت (مجلسِ احرار) الیکشن لڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ لہٰذا امیرِ شریعتؒ نے بادلِ نخواستہ اپنی طبیعت کا رخ بھی اسی طرف موڑ لیا۔

مجلسِ احرار کی پوزیشن انہدامِ شہید گنج کے بعد عوام میں مخدوش ہو چکی تھی۔ لیکن اس کے باوجود پنجاب کی سیاسی زندگی احرار سے عبارت تھی اور دوسری کسی جماعت یا افراد کے لیے مشکل تھا کہ وہ احرار کے بغیر آگے بڑھ سکے۔ چنانچہ سر فضل حسین ایک طرف سر سکندر حیات سے تو دوسری طرف قائداعظم محمد علی جناح سے پنجاب کے آئندہ انتخابات کے سلسلہ میں مصروفِ گفتگو تھے۔ اسی طرح سر سکندر حیات کے ایماء پر نواب مظفر علی جو ان دنوں گورنر کی انتظامیہ کے ممبر تھے، مجلسِ احرار سے ناطہ جوڑ رہے تھے۔

اس موقعہ پر صدر گوردوارہ پربندھک کمیٹی راولپنڈی نے جامعہ مسجد راولپنڈی کے عقب میں سینما تعمیر کرنا شروع کر دیا۔ شہر کے مسلمانوں کے احتجاج کے باوجود سینما مکمل ہو رہا تھا کہ مسلمانانِ راولپنڈی نے امیرِ شریعت کو اپنی مشکلات سے آگاہ کیا اور انہیں راولپنڈی آنے کی دعوت دی۔

انتخابات کا زمانہ اپنے جلو میں جن واقعات کو جنم دیتا ہے، ان کے شب و روز میں ہزاروں بے بنیاد کہانیاں اپنے نقش و نگار تراشتی ہیں، اور مٹ جاتی ہیں۔ لیکن

ان کے معمار اپنے ذہن کی قدو کاوش میں فارغ نہیں بیٹھتے۔ امیر شریعت کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ جماعت کے انتخابی پروگرام کے درمیان کوئی دوسری مصروفیت اختیار کرتے، تاہم اس دینی کام کیلئے انہوں نے راولپنڈی کیلئے وقت نکال لیا۔

راولپنڈی میں سکھ مسلمان کشیدگی اس قدر بڑھ چکی تھی کہ دونوں طرف آگ برابر سلگ رہی تھی۔ ہندو اپنی دولت کے سہارے سکھوں کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ امیر شریعت نے دو، ایک دن میں شہر کے حالات دیکھے اور سنے۔ آخر معززین شہر کو جن میں سکھ، ہندو اور مقامی حکام بھی شامل تھے، باہم مل بیٹھنے کی دعوت دی یہ اجتماع شہر کی جامع مسجد میں ہوا۔ اس اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے امیر شریعت نے کہا:۔

"سکھ صاحبان اور دوسرے معزز دوستو! میں ایک مسافر ہوں۔ مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ آپ کے شہری معاملات میں مداخلت کروں۔ گذشتہ برسوں سے میری زندگی کا ایک مشن رہا ہے کہ میں انسانوں کو لڑتا دیکھنا پسند نہیں کرتا، پھر جبکہ ایک تیسری حکومت ہم کو لڑتا دیکھ کر خوش ہوتی ہے، ہمارے لیے آپس کی صلح اور بھی زیادہ مفید اور کارآمد ہے۔ جنوری سے جو قضیہ آپ کے شہر میں چل رہا ہے، جس نے آپ کی شہری زندگی میں ایسا زہر گھول دیا ہے کہ آپ ایک دوسرے کی جان کے دشمن بن گئے ہیں۔

یہ مسجد ہے، اور ایک مذہبی آدمی ہونے کی حیثیت سے اس کا احترام میرے لیے لازمی ہے۔ اسی قدر آپ کو بھی اس کا احترام کرنا چاہیے۔ اسی طرح میں گوردوارہ کی بھی عزت کرتا ہوں۔ کیونکہ وہ بھی رب کی عبادت گاہ ہے۔ گو میرا، آپ کا عقیدۂ عبادت جدا جدا ہے۔

اگر گوردوارہ کے سامنے یا برابر میں کوئی ہنگامہ ہو، تو آپ برداشت کریں گے؟ یقیناً نہیں۔ اسی طرح یہ حق مجھے بھی دو کہ میں مسجد کے احترام میں آپ سے گذارش کروں، کہ آپ یہاں سینما کی تعمیر بند کردیں یہ میری درخواست ہے۔

میں یہ درخواست آپ سے ایسے وقت کر رہا ہوں، جب کہ سارا ہندوستان انگریز سے آئینی لڑائی میں مصروف ہے، اس میں آپ کا فائدہ ہے کہ شہر میں امن ہو جائے گا۔ بہو بیٹی کی عزّت محفوظ رہے گی شہری زندگی کسی دوسری طرف دھیان کر سکے گی۔

مجھے آپ جانتے ہیں، میں ان دھندوں کا آدمی نہیں ہوں۔ لیکن آپ کی پریشان زندگی اور اللہ کے گھر کی بے حرمتی نے مجھے مجبور کیا کہ میں پارٹی کا کام چھوڑ کر یہاں حاضر ہوا ہوں۔

مجھے امید ہے کہ سکھ صاحبان میری گذارش کو قبول کریں گے؟

امیر شریعتؒ کی اس تقریر نے اجتماع کو متاثر کیا۔ مقامی حکام کی موجودگی میں گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے عہدیداران نے وعدہ کیا کہ آئندہ سے سینما کی تعمیر روک دی جائے گی۔ صبح ہوتے ہی سکھ عوام کو اس فیصلے کی اطلاع ملی، تو انھوں نے مذہبی ضد کی بناء پر رات کے فیصلے کو کالعدم قرار دے دیا، اور شہر کے حالات زیادہ خطرناک ہو گئے۔ دوسرے دن امیر شریعتؒ نے جامعہ مسجد میں تقریر کرتے ہوئے سرکاری حکام اور شہری عوام کو مخاطب کرتے ہوئے خطبۂ مسنونہ کے بعد کہا:۔

رات معزز افسران اور خود ڈپٹی کمشنر کی موجودگی میں سکھ صاحبان سے جو فیصلہ ہوا تھا۔ مجھے افسوس ہے، کہ سکھ رہنما اپنی قوم سے وہ فیصلہ منوا نہ سکے۔ اب میں اپنا فیصلہ اپنی قوم سے منوا کر دکھاؤں گا۔ بشرطیکہ

مقامی حکام درمیان میں حائل نہ ہوں۔ ہاں اگر وہ انتظامی معاملات میں کوئی چارہ کریں تو اس سے میں منع نہیں کروں گا۔

میری اس گفتگو سے یہ مراد نہ لی جائے کہ مسلمان سکھ بھائیوں سے دست وگریبان ہوں گے۔ نہیں، بلکہ میں عدم تشدد کا حامی ہوں اور اسی پر کاربند رہ کر اپنی بات اپنی قوم سے منواؤں گا۔ فیصلہ کل رات کو ہوگا۔

۲۴ گھنٹے باقی ہیں، سکھ صاحبان کو اپنے رویے پر غور کرنا چاہیے۔"

دوسرے دن شہر میں حالات اور بھی کشیدہ ہو گئے۔ دن بھر سکھ پریشان رہے نہ جانے شاہ جی رات کو کیا حکم دیں۔ حکومت اپنی جگہ سوچ میں رہی، شہر میں پولیس اور فوج کی تقرری میں اضافہ کر دیا گیا۔ رات پھر جلسے کا اعلان تھا۔ جامع مسجد میں انسانوں کا اس قدر ہجوم اس مسجد کی تاریخ میں کبھی نہیں دیکھا گیا۔ امیر شریعتؒ اس روز خلاف معمول نماز عشاء کے ساتھ ہی تقریر کے لیے کھڑے ہو گئے، اور آپ نے صرف مسلمان نوجوانوں سے چند منٹ خطاب کیا۔ زندگی میں اتنی مختصر تقریر امیر شریعتؒ نے کبھی نہیں کی تھی:

"عزیزو! ہماری لڑائی کسی سے نہیں اگر کوئی قوم اپنی ضد پر اتر آئے تو ہمیں خوف نہیں کھانا چاہیے، لہٰذا ایسا کام کرو کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے، میرے ساتھ وعدہ کرو کہ جو میں کہوں گا وہی کرو گے۔۔۔"

اس موقع پر تمام مجمع نے ہاتھ اٹھا کر وعدہ کیا، امیر شریعتؒ نے کہا:

"دیکھو! جو میں کہوں گا وہی کرنا ہوگا اگر کسی دوسری حرکت کی شکایت آئی تو میں ناراض ہو کر چلا جاؤں گا۔"

اس پر مجمع نے پھر وعدہ کیا۔

"عزیزانِ من! یا تو مسجد نہ رہے اور یا سینما نہ بنے۔ میں نے مقدور بھر کوشش کی شہر کے ذمہ دار حکام گواہ ہیں، کہ سکھ رہنماؤں نے وعدہ کے باوجود بات نہیں مانی۔ خیر! اب تم اپنا کام کرو، یا تو مسجد کے قریب سینما نہ ہو اور یا سینما کے قریب مسجد نہ ہو، بس! لیکن میری یہ درخواست یاد رہے کہ اینٹوں کے سوا انسانوں پر ہاتھ نہ اٹھیں"

امیر شریعتؒ کی تقریر سنتے ہی تمام مجمع سینما کی طرف دوڑا، اور صبح اٹھے تو ایک اینٹ وہاں باقی نہیں تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جنوں کی فوج نے راتوں رات سینما کا تمام ملبہ اٹھا کہ نہ جانے کہاں پھینک دیا کہ اب اس کا نشان تک نہیں ملتا۔

حالانکہ پولیس کا انتظام تھا، سکھ نوجوان بپھرے کھڑے تھے لیکن امیر شریعتؒ نے پہلے روز جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا، سرکاری حکام اس سے مطمئن تھے، سکھ رہنماؤں نے مسجد میں جو وعدے کیے تھے، وہ ان سے منحرف ہو چکے تھے، لہٰذا مسلمان نوجوانوں کے ہاتھ جب رات کے اندھیرے میں زیرِ تعمیر سینما کی طرف بڑھے ا تو سکھ قوم کے وقتی جذبات پولیس کی حفاظتی دیوار توڑنے کی جرأت نہ کر سکے۔

راولپنڈی کا یہ تاریخی میدان آج مجاہد پارک کے نام سے مشہور ہے۔

تبلیغِ اسلام

۱۹۲۵ء کے برطانوی آئین نے جہاں حالات میں مزید رد و بدل کیا، وہاں اچھوتوں کو ہندوستان کی ایک الگ قوم قرار دیتے ہوئے یہ حق بھی دیا کہ وہ بحیثیت ایک ہندوستانی قوم اپنی قومیت برقرار رکھتے ہوئے نئے قانون کے مطابق الگ انتخاب لڑ سکتے ہیں، جبکہ اس سے پیشتر کے آئین میں اچھوتوں کا ووٹ ہندو قوم کے ساتھ شامل ہوتا تھا۔

اس اعلان نے ہندوؤں میں ایک خاص قسم کا سیاسی ہیجان پیدا کر دیا۔ مہاتما گاندھی نے انہی دنوں برطانیہ کے اس قانون کو تبدیل کرانے کے لیے ۲۰ ستمبر ۱۹۲۵ء کو مرن برت

رکھنے کا فیصلہ کیا۔ نیز ہندو قوم کو اچھوتوں پر اپنے مندروں کے دروازے کھول دینے کا مشورہ بھی دیا۔

سیاسیات کی دوڑ میں قدم نہیں ناپے جاتے، ووٹ گنے جاتے ہیں، جو قوم صدیوں سے اچھوتوں کے سائے سے دامن بچاتی رہی، اپنی سیاسی ضرورت کیلئے اس نے نہ صرف اچھوتوں کو انسان تسلیم کیا بلکہ انہیں اپنی برادری کا جزو سمجھنے پر مجبور ہو گئی۔ انہی دنوں ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو لاہور میں اچھوت کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے امیر شریعتؒ نے مسلمان قوم کو پیغام دیا:۔

"اس وقت ہمارے سامنے تین مسئلے سب سے زیادہ اہم اور غور طلب ہیں۔ پہلا مسئلہ انتخاب کا ہے، جس کا ظاہر اتنا دلفریب ہے کہ بڑے سے بڑا تارک الدنیا گوشہ نشین بھی اس کے حُسن دلفریب کی تاب نہ لا سکا، اور بے چین ہو کر میدانِ انتخاب میں نکل آیا، نہ کوئی ہندو بچا نہ سکھ اور نہ عیسائی۔ مسلمان بھی اس سے بے نیاز نہیں۔ کوئی جماعت بھی ایسی نہیں جو مسئلہ انتخاب میں دلچسپی نہ رکھتی ہو۔

دوسرا مسئلہ ختم نبوّت کا ہے۔ چونکہ مسلمان سیاسی اُلجھنوں میں مصروف ہو گئے ہیں، اس لیے انہوں نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ ہندوستان کو ابدی غلامی میں جکڑے رکھنے کے لیے قادیانی نبوّت اپنا جال پھیلا رہی ہے۔ مسلمانوں کو اس دائمی لعنت سے بچنے کے لیے کوئی راہ سوچنا بڑا ضروری ہے۔

تیسرا اہم مسئلہ اچھوتوں کا ہے۔ اس وقت تمام ہندوستان کی توجہ ڈاکٹر امبیدکار[1] کے اعلانات کی طرف ہے، وہ پولیٹیکل اچھوت ہے

---

[1] اچھوتوں کا لیڈر

اور ہندوؤں سے بخوبی واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس وقت ہندوؤں کو دبانے سے کچھ نہ کچھ مل جائے گا۔ اب وہ ٹاٹ پر بیٹھنا نہیں چاہتا لیکن ہندوستان کے آٹھ کروڑ اچھوت جو ہزاروں سال سے حیوانوں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں اور کوئی ان کا پرسانِ حال نہیں ہے، اگر ان کو مساوات اور انسانیت کا درجہ کسی مذہب میں حاصل ہو سکتا ہے تو وہ صرف اسلام ہے، اسلام کے سوا دنیا کا کوئی مذہب اچھوتوں کو اپنے میں حقیقی طور پر جذب نہیں کر سکتا۔

کائنات میں سب سے بڑا اچھوت غلامی ہے۔ غلام کا جسم اور اس کی کمائی اپنی نہیں ہوتی، بلکہ مالک کی ہوتی ہے۔ لیکن اسلام نے دنیا میں غلام کا درجہ بلند کر دیا ہے، اور اچھوت پر سب سے بڑا احسان کرنے والے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جنہوں نے اپنی پھوپھی زاد ہمشیرہ زیدؓ سے منسوب کر دی، جو غلام تھا۔ اسلام نے مذہب کے معاملہ میں جبر و اکراہ سے کام نہیں لیا، بلکہ اپنے عمل سے اسلام کی تلقین کی، کہ ایسے لوگوں سے کیا سلوک کیا جائے جو مسلمان نہیں ہیں۔

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے

مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی!

لیکن بغیر نشے کے کسی کو پچھاڑنا کام رکھتا ہے، ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے عمل سے اور اپنے مذہب کی خوبیوں کے ذریعے اچھوتوں کے ساتھ ایسا سلوک کریں کہ وہ اسلام قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں اور سوائے مذہب اسلام قبول کرنے کے ان کے لیے کوئی چارہ نہ رہے۔

اس ضمن میں امیر شریعتؒ نے اپنے چشم دید واقعات بیان کیے، جن کی رو سے اچھوت ہمیشہ اپنے کو انسانی دائرے سے بھی خارج سمجھتے ہیں۔

مسلمانو! کروٹ لو اور اٹھاؤ ان گرے ہوئے اچھوتوں کو اور اپنے سینے سے لگاؤ۔ ہم روپیہ دے کر کبھی بھی ان کی اصلاح نہیں کر سکتے۔ نہ ہندو قوم کی طرح ہم انہیں سیاسی لالچ دے کر ان کے ووٹ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اسلام! اسلام ہے تشنگی بجھانے کیلئے دریا کسی کے گھر نہیں جاتا، ہمیشہ پیاسے ہی دریاؤں پر جاتے ہیں۔ کوئی تلوار کارگر نہیں ہوتی۔ لیکن اخلاق کی تلوار انسان کو ہمیشہ کے لیے رام کر لیتی ہے اس لیے اچھوتوں کو ساتھ ملانے اور دائرۂ اسلام میں داخل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ تم اس خلقِ عظیم کو اختیار کرو، جو اسلام نے تم کو بخشا ہے۔"

ڈسکہ میں انتخابی معرکہ

متحدہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ۱۹۳۶ء کا سال آئینی جدوجہد کا اہم سال قرار دیا جا سکتا ہے، اس سال کسی بھی سیاسی جماعت نے غیر آئینی حرکت نہیں کی، بلکہ ہر پارٹی انتخاب کے ذریعے اقتدار کی کشمکش میں مصروف رہی۔

مجلسِ احرار مسجد شہید گنج کے ملبے کے ڈھیر سے نکل کر ہنوز اپنے کپڑے جھاڑ رہی تھی کہ انتخاب کا ہنگامہ سر پر آن پہنچا۔ چنانچہ اس کی نگاہِ انتخاب نے پنجاب میں جن شہروں اور قصبات کو دین، وطن، اور جماعتی ضرورت کے لیے منتخب کیا ان میں ڈسکہ (ضلع سیالکوٹ) کی سیٹ پر اس کی خاص نظر رہی۔ گذشتہ سال مجلسِ احرار کا وفد جب دہلی میں وائسرائے ہند سے ملا کر وہ چودھری سر ظفر اللہ خاں کو اپنی

اننل ہیہ میں شامل نہ کریں تو وائسرائے نے جواب میں کہا کہ سر ظفر اللہ خاں مسلمانوں کے ووٹ سے منتخب ہو کر آتا ہے۔ مجلس احرار اس وقت تو لاجواب رہی۔ مگر اب وقت آگیا تھا کہ وائسرائے کے سوال کا جواب دیا جائے۔

اگرچہ امیر شریعت انتخابات کے دنوں پنجاب کے علاوہ صوبہ یو۔پی میں بھی مصروف تھے تاہم ان کی زیادہ تر توجہ کا مرکز ڈسکہ کی سیٹ تھی۔ چودھری سر ظفر اللہ خاں ہمیشہ اسی سیٹ سے مسلمانوں کے ووٹوں سے کامیاب چلا آ رہا تھا اور آج اس کا بھائی چودھری اسد اللہ خاں ایڈووکیٹ اسی سیٹ پر الیکشن کے میدان میں سامنے آیا تھا، سر ظفر اللہ خاں اپنی جاٹ برادری اور ضلع میں مقبولِ عام تھا۔ سرکاری اثر و رسوخ بھی اسے پناہ دیے ہوئے تھا۔ اس تحصیل کے مسلمانوں پر چودھری ظفر اللہ خاں کا اثر ریاستی نواب کی طرح تھا، ایسے حالات میں یہ ٹکراؤ بڑی جان جوکھوں کا کام تھا، خصوصاً جبکہ الیکشن بھائی چارے اور برادریوں کے نام پر لڑے جا رہے ہوں۔

بڑی دوڑ دھوپ کے بعد اسی برادری کے ایک معزز جاٹ چودھری غلام رسول ستراہ جو اپنے حلقہ میں خاصے رسوخ کے مالک تھے، مجلس احرار کے ٹکٹ پر انتخاب لڑنے کے لیے آمادہ ہوئے۔

چودھری غلام رسول کے پاس روپیہ، برادری کا اثر و رسوخ سب کچھ تھا۔ لیکن سرکاری دباؤ کا خوف سدِ راہ تھا، دوسری جانب مجلس احرار سمجھتی تھی کہ یہی شخصیت سر ظفر اللہ کے کفر کو توڑ سکے گی۔ چنانچہ ایک رات امیر شریعت نے چودھری غلام رسول سے کہا:۔

"دیکھو غلام رسول! اس وقت پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عزت کا سوال ہے، غیر ملکی حکومت کا نمائندہ (وائسرائے) کہتا ہے کہ تم ظفر اللہ کو مسلمان نہیں کہتے، لیکن اس حلقہ کا مسلمان تو اس کو ووٹ

دے کر منتخب کرتا ہے۔

چودھری صاحب! اگر آج اس سیٹ سے اس خاندان کا کوئی فرد جو حضور سرورِ کائنات کو آخری نبی نہیں مانتا، مسلمانوں کے ووٹ سے اسمبلی میں چلا گیا تو قیامت کے دن تم مجرم قرار پاؤ گے، کیونکہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے دنیوی خوبیوں سے نوازا ہے۔ برادری میں تمہارا اثر اس سے کم نہیں، دولت اور عزت تمہیں بھی خدا نے دی ہے۔ حکومت میں تمہارا بھی وقار ہے۔"

امیرِ شریعت کی یہ باتیں سن کر چودھری غلام رسول نے کہا۔

"شاہ جی! میں بہت ہی سیاہ کار ہوں، اس کے باوجود آپ حکم دیتے ہیں، تو حاضر ہوں، لیکن میرے پاس برادری کی وہ قوت نہیں جو چودھری سر ظفر اللہ کے پاس ہے۔ روپیہ تو میں خرچ کر سکتا ہوں، لیکن حلقہ اور برادری کے ذمہ دار لوگ شاید میرا ساتھ نہ دیں۔"

امیرِ شریعت نے چودھری غلام رسول کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا،

"تم اللہ کے رسولؐ کی عزت رکھو، اللہ تمہاری عزت کا وارث ہوگا۔ مجلس احرار کی سرخ فوج آج سے تمہارے حلقہ میں متعین کر دی گئی ہے، بے فکر رہو۔"

پولنگ شروع ہونے میں قریباً ایک ماہ باقی تھا کہ ڈسکہ سیٹ کی مہم شروع کی گئی۔ امیرِ شریعت دوسرے حلقوں کے علاوہ اس حلقہ میں زیادہ وقت اور توجہ صرف کرتے، مرکزی حکومت کے اشارے پر حکومتِ پنجاب نے بھی اس سیٹ پر خاصی توجہ دی۔ امیرِ شریعت نے گاؤں گاؤں پھر کر جاٹ برادری کو خصوصیت کے ساتھ حضور خاتم الانبیا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ناموس پر اپیل کی، کہ وہ اپنا ووٹ برادری کے نام پر نہیں بلکہ حضورؐ کے نام پر دیں، تاکہ دشمنانِ دین کے تمام منصوبے خاک میں مل جائیں۔ اس سلسلے میں امیرِ شریعت جب

گھوئینکے (ضلع سیالکوٹ) پہنچے تو وہاں نماز جمعہ پڑھانے کا پروگرام تھا۔ چودھری عبدالغنی گھمن بمعہ اپنی جاٹ برادری کے بندوقوں، پستولوں اور دوسرے اسلحہ سے مسلح ہو کر آن پہنچے کہ ہم عطاء اللہ شاہ بخاری کو تقریر نہیں کرنے دیں گے (یہ لوگ چودھری اسداللہ کے حامی تھے) امیر شریعتؒ نے کہا۔ اگر آپ اجازت دیں، تو میں صرف جمعہ کی نماز پڑھ لوں؟ اس پر انہوں نے ہاں کہہ دی۔ چنانچہ نماز سے پہلے امیر شریعتؒ نے قرآن کریم کا ایک رکوع پڑھا اور مخالفین سے پوچھا، اگر آپ حکم دیں تو اس آیت کی تشریح کر دوں۔ اس پر مخالفین کے دو حصے ہو گئے۔ ایک گروہ تشریح کے حق میں تھا اور دوسرا مخالف۔ آخر شاہ جی نے قرآن کریم کی تفسیر شروع کی، بس پھر کیا تھا کہ جمعہ کی نماز بھی مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ بعد پڑھی گئی۔ آخر میں مخالفین امیر شریعتؒ کے ہمنوا ہو گئے اور چودھری عبدالغنی گھمن کو اپنے ارادے میں بری طرح شکست ہو گئی۔

کیونکہ امیر شریعتؒ جاٹ برادری کے دل اپنے قبضے میں کر چکے تھے، ہزار جدوجہد کے باوجود سرکاری اثر ورسوخ بھی کوئی کام نہ دے سکا۔ یہ لڑائی (مسلمان اور مرزائی کے عنوان پر لڑی گئی۔ امیر شریعتؒ کی مسلسل اور پیہم تقریروں سے ڈسکہ تحصیل کا مسلمان، مرزائی اور مسلمان کے درمیان حدِّ فاصل کو سمجھ گیا، اور جب اس الیکشن کا نتیجہ سامنے آیا تو چودھری غلام رسول ستراہ نے چودھری اسداللہ خاں ایڈووکیٹ کو ہزاروں ووٹوں سے شکست دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ سیاسی طور پر اس گھرانے کا وقار ڈسکہ تحصیل سے ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا، اور تحریکِ مرزائیت کو خاصہ نقصان پہنچا۔

حضرت مدنیؒ سے اختلاف

انتخابی موسم بھی عجیب موسم ہوتا ہے، ہر پارٹی سیاسی اکھاڑوں میں ایسے ایسے داؤ پیچ کھیلتی ہے کہ آدمی منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔

۱۹۳۶ء میں متحدہ ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں نے ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت

انتخابات میں جو طریقے استعمال کیے، ان میں ایک یہ بھی تھا کہ مسلم لیگ کے رہنماؤں نے جمیعۃ علمائے ہند سے بعض ایسے وعدے کیے کہ مولانا مفتی کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد مدنی ایسے مذہبی اور سیاسی سوجھ بوجھ کے لوگ اس بساط پر مات کھا گئے، جمیعۃ علمائے ہند اور مسلم لیگ نے باہمی اشتراک سے یوپی کے تمام اضلاع میں الیکشن لڑا۔ انہی دنوں ۲۶۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو امیر شریعت، حافظ محمد ابراہیم کی حمایت میں ضلع بجنور کا دورہ کر رہے تھے کہ بجنور میں مولانا حسرت موہانی سے مڈبھیڑ ہو گئی۔

امیر شریعت ایک جلسہ میں تقریر کر رہے تھے، کہ مولانا حسرت موہانی مخالف سمت سے خاصی جماعت کے ساتھ امیر شریعت کی مخالفت کے لیے جلسہ گاہ میں آن پہنچے۔ عوام امیر شریعت کی تقریر سے متاثر ہو چکے تھے، انہوں نے مولانا حسرت موہانی کی اس حرکت کو ناپسند کیا، اور قریب تھا کہ مجمع مولانا حسرت موہانی پر ٹوٹ پڑتا، امیر شریعت نے مداخلت کر کے مولانا حسرت کو بالاحترام سٹیج پر بٹھالیا۔ تقریر جاری رہی۔ آخر جو لوگ مولانا حسرت کے ساتھ امیر شریعت کی مخالفت کرنے آئے تھے، اس قدر نادم ہوئے کہ ان کے لیے یہاں سے واپسی مشکل ہو گئی۔

بجنور سے الٰہ آباد جاتے ہوئے اسٹیشن پر حضرت شیخ الہند مولانا حسین احمد مدنی سے امیر شریعت کی ملاقات ہوئی۔ عقیدت، محبت اور احترام کے ملے جلے جذبات سے امیر شریعت نے آگے بڑھ کر حضرت سے مصافحہ اور معانقہ کرنا چاہا، لیکن حضرت مدنی نے جو ان دنوں مسلم لیگ کی حمایت کر رہے تھے، امیر شریعت سے مصافحہ کرنے سے انکار کر دیا اور کہا:

"چونکہ آپ کا مسلک غلط ہے لہٰذا میرا آپ سے کوئی تعلق نہیں۔"

اس پر امیر شریعت کو دلی رنج پہنچا، اور حضرت مدنی سے عرض کیا:

"حضرت! اگر آپ حکم کریں تو میں اپنا یہ دورہ ملتوی کر کے پنجاب چلا جاؤں
چونکہ آپ مسلم لیگ سے اشتراک کیے ہوئے ہیں، اور اپنے خادموں سے

ناراض ہیں، لیکن آنے والے کل کو آپ اپنے فیصلے پر خود نادم ہوں گے۔
مسلم لیگ سے آپ کا یہ اشتراکِ عمل سمجھ میں نہیں آیا، جبکہ کل تک آپ
خود ہمیں درس دیتے رہے ہیں کہ مسلم لیگ سرکار پرستوں کی ٹولی ہے۔
بہر! ..... آپ ناراض ہوں تب بھی میں نیاز مند ہوں"
اس گفتگو کے بعد امیر شریعت اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔

•

انتخاب ختم ہونے پر مارچ ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کا جو پہلا اجلاس ہوا، اس میں تمام رجعت پسند ممبران شامل ہوئے۔ اس پر جمعیۃ علمائے ہند نے اعتراض کیا کہ جمعیۃ علماء اور مسلم لیگ کا سمجھوتہ اس بنیاد پر تھا، کہ مسلم لیگ سے تمام رجعت پسند عناصر کو نکال دیا جائے گا، تو آج انتخاب کی کامیابی کے بعد ایسے عناصر کو پارلیمانی پارٹی کے اجلاس میں شامل کرنا اپنے وعدوں سے انحراف کرنا ہے۔

یکم اپریل ۱۹۳۷ء کا دن ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نفاذ کا دن تھا۔ کانگریس اور جمعیۃ علماء کے درمیان اس ایکٹ کے خلاف ہڑتال کرنے کا فیصلہ تھا، لیکن قائداعظم محمد علی جناح نے مسلم لیگ کی تمام شاخوں کو حکم دیا کہ وہ اس ہڑتال میں حصہ نہ لیں، اس پر جمعیۃ علماء نے قائداعظم سے دریافت کیا کہ جب تمام سیاسی جماعتوں نے اس ایکٹ کی مخالفت کا فیصلہ کیا ہے تو آپ نے اس سے علیحدگی کا کیوں اعلان کیا ہے؟ اس پر صدر مسلم لیگ نے اپنے ایک پریس بیان میں کہا کہ جمعیۃ علماء الیکشن میں مسلم لیگ سے اشتراک کر چکی ہے تو انہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ پارلیمانی پارٹی کے فیصلوں پر اعتراض کرے۔

اس بیان کا شائع ہونا تھا کہ جمعیۃ علماء نے مسلم لیگ کی عہد شکنی کی بنا پر علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ یہ اعلان پڑھ کر امیر شریعتؒ نے حضرت مدنیؒ کو امرتسر سے مبارک باد کا برقی پیغام بھیجا۔

امیر شریعتؒ ہمیشہ حضرت مدنیؒ کا احترام کرتے رہے۔ حضرت مدنیؒ کے دل میں بھی

امیر شریعت کی عزت رہی ، لیکن مسلم لیگ کے اتحاد کے بعد جو خفت جمعیۃ علمائے ہند کو اٹھانا پڑی ، جمعیۃ کے رہنما امیر شریعت کے سامنے اپنے اس طرز عمل کی بنا پر ہمیشہ شرمندہ رہے۔

تحریک مدح صحابہؓ کا دور ثانی

۳۱-مارچ ۱۹۳۷ء کا غروب آفتاب اپنی کرنوں کے ساتھ وہ تمام الاؤ سمیٹ کر لے گیا ، جن کی چنگاریوں نے ہندوستان کے ہر گھر میں آگ لگا رکھی تھی - بھائی سے بھائی ، باپ سے بیٹا اور ماں سے بیٹی اپنی رائے کی بناء پر دشمنی کرنے لگی تھی - انتخابات ختم ہوئے تو ہما پائی کا دامن سمٹ کر ان لوگوں کے آنگن میں لہرانے لگا ، جنہوں نے مستقبل میں صوبوں کے راج سنگھاسن سنبھالنے تھے ۔

یکم اپریل ۱۹۳۷ء کا سورج اپنے جلو میں ایک ایسا قانون لے کر طلوع ہوا ، جس سے فرنگی سامراج کی جگہ اپنے دیس کے لوگوں نے صوبائی خود مختاری کے تحت حکومتیں سنبھالیں - عوام کے نئے منتخب نمائندوں نے آگے بڑھ کر غیر ملکی آئین کو اپنی رائے کے سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیا - تو متحدہ ہندوستان کے بعض صوبوں میں انگریزی راج کی پیدا کردہ مشکلات نے انہیں آن گھیرا - ۱۹۰۴ء کا ذکر ہے کہ لکھنؤ کے شیعہ ، سنی اور ہندو مل کر تعزیے کا جلوس نکالتے تھے ، اور یہ جلوس تال کٹورا کی کربلا میں ختم ہوتا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں شیعہ حضرات نے اس ماتمی جلوس میں شامل ہونے والوں پر یہ قدغن لگا دی کہ تعزیہ کے جلوس میں برہنہ سر و پا شامل ہونا چاہیے - یہ شرط سنی عقیدہ کے مسلمانوں کے لیے تھی - کیونکہ شیعہ تو پہلے ہی ننگے سر اور ننگے پاؤں شامل ہوتے تھے ۔ اس سے پیشتر سنی عقیدہ کے مسلمان سر پر ٹوپی اور پاؤں میں جوتا پہنے جلوس کے ہمراہ چلتے تھے ۔ نئے احکامات پر سنی مسلمانوں نے اعتراض کیا ، تو حکومت نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اپنا علیحدہ کربلا بنا لیں - چنانچہ شہر سے آٹھ میل دور پھول کٹورا کے نام سے نئی کربلا تعمیر کی گئی - ۱۹۰۶ء کا محرم سنیوں نے اسی کربلا میں منایا - یہ بنیاد تھی لکھنؤ میں شیعہ سنی کے

مابین جھگڑے کی۔

۱۹۰۷ء میں رام پور کا شیعہ مولوی مقبول احمد نے جو دہلوی کہلواتا تھا۔ ایک اعلان کیا۔

"چونکہ حکومت کا اعلان ہے کہ وہ کسی کے مذہب میں مداخلت نہیں کرے گی، لہٰذا تبرّہ کہنا ہمارا مذہبی حق ہے، اور ہم تبرّہ کہیں گے۔ اس پر ہمیں کوئی نہیں روک سکتا۔"

اس اعلان سے سنی عقیدہ کے مسلمان برہم ہوئے، اور اس سال لکھنؤ میں شیعہ سنی فساد ہوا۔ اس فساد کی بنا پر ۱۹۰۹ میں حکومت یو۔پی نے ایک کمیشن مقرر کیا، جس نے اپنی رپورٹ کے آخر میں حکومت کو مشورہ دیا کہ:۔

"عشرہ محرم کے دن، چہلم کے موقعہ پر اور ۲۱۔ رمضان کے دن مدح صحابہؓ کی بندش کی جائے۔"

کمیشن کے اس مشورے پر حکومت نے اعلان کیا:۔

"کوئی شخص ایسے اشعار یا نظمیں یا دوسرے الفاظ جن میں ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ کی تعریف کی گئی ہو، یا ان کی مدح میں ہوں، تعزیوں میں یا کسی دوسرے اسلامی جلوس کے راستے پر نہ پڑھے، اور نہ ایسے مقام پر پڑھے، جہاں سے جلوس تک آواز پہنچ سکے، اور نہ کسی مجمع اور نہ کسی پبلک مقام پر ایسے مدحیہ اشعار اور نظمیں پڑھے۔

اگر کوئی شخص احکام مذکورہ کی خلاف ورزی کرے گا تو وہ فوراً گرفتار کر لیا جائے گا، اور اس پر دفعہ ۲۹۸ یا کسی مناسب دفعہ تعزیرات ہند کے تحت مقدمہ چلایا جائے گا۔"

اس قسم کے ہنگامی اور مذہبی واقعات نے نئی حکومتوں کے راستہ میں کانٹے بکھیرے اور مشکلات پیدا کیں۔

جون ۱۹۳۷ء کو یو۔پی میں نواب چھتاری نے بحیثیت مسلم لیگ کے جب اپنی عارضی گورنمنٹ ترتیب دی تو راجہ صاحب سلیم پور کو جو عقیدتاً شیعہ تھے، اپنی وزارت میں شامل کر لیا۔ ان کے عہدِ وزارت میں مدحِ صحابہ کا قضیہ جب ان کے سامنے لایا گیا، تو مصلحتاً انہوں نے یہ کاغذات آنے والی وزارت کے سپرد کرنا ہی بہتر سمجھا۔

یو۔پی میں باوجود کہ کانگرس اکثریت سے کامیاب ہوئی تھی، لیکن ہنوز ان کے درمیان وزارتیں قبول کرنے میں اختلاف تھا۔ آخر چار ماہ کی مسلسل بحث کے بعد جب کانگرس نے عہدے قبول کرنے کا فیصلہ کیا تو نواب چھتاری کی وزارت مستعفی ہو گئی۔ مدحِ صحابہؓ کی تحریک نے انہیں ایسا پریشان کیا کہ کانگرس گورنمنٹ اس عقدہ کے حل کرنے میں ایسی الجھی کہ سلجھاؤ کا کوئی راستہ دکھائی نہ دیا۔ اس دوران شیعہ سنی اختلافات بڑھتے گئے۔

اس سال ۹۔محرم کو امیرِ شریعت لکھنؤ گئے تو انہوں نے شیخ شوکت علی وکیل کے احاطہ میں تقریر کے دوران عقیدہ اہلِ سنت رکھنے والے مسلمانوں سے صرف ایک سوال کیا:۔

"اس صوبہ میں آپ کا کوئی وارث ہے یا نہیں"؟

اس سوال کو ہی امیرِ شریعت نے اپنی تقریر کا عنوان بنا کر تین گھنٹے سنی عقیدہ کے مسلمانوں سے خطاب کیا۔

اس تقریر کے بعد مجلس احرار کے دوسرے رہنما چودھری افضل حق، مولانا حبیب الرحمٰن کئی بار لکھنؤ گئے۔ مولانا حسین احمد مدنی کی وساطت سے یو۔پی کانگرس حکومت سے رابطہ قائم کیا۔ لیکن حکومت خواہ کسی کی ہو اس کا آستانہ اس قدر بلند ہوتا ہے کہ اس پر بغیر زینے کے چڑھنا دشوار ہے، اور یہ زینہ انسانی لاشوں سے تیار ہوتا ہے۔

شیخ الہند مولانا حسین احمد مدنی اور دوسرے رہنماؤں نے کانگرسی حکومت سے وزیرِ اعلیٰ پنڈت گووند ولبھ پنت اور گورنر سر ہنری ہیگ سے متعدد بار گذارش کی کہ:۔

"لکھنؤ میں سُنّی مسلمانوں کا حق ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کی تعریف کریں،
جبکہ یہاں ان کی تعداد اٹھاسی ہزار کے قریب ہے اور شیعہ حضرات صرف
بارہ ہزار۔"

مگر حکومت، حکومت تھی۔ کسی کل نہ مانی۔ آخر ۱۰۔ جولائی ۱۹۳۷ء بروز جمعہ مجلس احرار نے کانگرسی حکومت کے خلاف سول نافرمانی کا اعلان کر دیا۔ اس تحریک میں قریباً پچیس ہزار مسلمان گرفتار ہوئے۔

آخر ۱۴۔ نومبر کو گورنر کے اعلان پر تمام قیدی رہا کر دیے گئے اور ۲۶۔ مارچ ۱۹۳۸ء کو سُنّی مسلمانوں کا یہ حق تسلیم کرتے ہوئے حکومت نے واضح طور پر اعلان کیا۔

"سنّیوں کا یہ حق ہرگز مابہ النزاع نہیں کہ آیا انہیں جلسۂ عام یا خاص
مجلسوں میں خلفائے ثلاثہ کی مدح و ثناء کرنے کا حق ہے یا نہیں۔ بلاشبہ
ان کو یہ حق حاصل ہے۔ جھگڑا صرف اس بات کا ہے کہ کس طریقے اور
کن حالات پر ان کو لکھنؤ میں مدح صحابہؓ پڑھنی چاہیے۔
جب مختلف اقوام کے عقائد اور نقطۂ نظر میں فرق ہو تو گورنمنٹ
کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ امنِ عامہ کو قائم رکھنے کے لیے مداخلت کرے
اور عام لوگوں کی سہولت کا خیال کرے۔"

اس طرح یو، پی حکومت نے سنّی عقائد کے مسلمانوں کا مدح صحابہؓ کا حق تسلیم کرتے ہوئے ۱۹۰۹ء کے انگریزی اعلان کو ختم کر دیا۔

قتل کی سازش کا الزام

۱۹۳۸ء میں گو ہندوستان کے سیاسی حالات پر سکون نہیں تھے تاہم قانون شکنی کا دور ختم ہو چکا تھا۔ ہر سیاسی تنظیم اپنے حمائتوں کی تعداد کے لیے کوشاں تھی۔

مسلم لیگ اور کانگرس کے اختلافات جوان ہو کر دلوں کی جذباتی بھٹیاں روشن کر

کر رہے تھے۔ اگرچہ یہ لڑائی مذہب سے لاتعلق تھی، تاہم سیاسی ضرورت کے تحت اس عمارت کی بنیاد مذہب پر اٹھائی گئی تھی۔ اس وقت ہندوستان کی سیاست دو دھڑوں میں منقسم ہو چکی تھی۔ مسلم لیگ میں کافی تعداد مسلمانوں کی شامل تھی اور کانگریس سے ہندو اکثریت وابستہ تھی۔ انھی دنوں کی بات ہے کہ دہلی کے اخبار ہفت روزہ "الامان" کے مدیر اعلیٰ مولانا مظہر الدین نے اپنے اخبار میں لکھا کہ:۔

"رات میں نے ایک خواب دیکھا ہے، ایک ہندو دیوی جو کھدر کے لباس میں ہے، اس نے مولوی حسین احمد کی پیشانی پر قشقہ لگایا ہے اور مولوی عطاء اللہ شاہ کے گلے میں جلینو پہنایا ہے۔"

اس خواب کو مولانا مظہر الدین نے کارٹون کی شکل میں اپنے اخبار "الامان" میں شائع کیا۔ دن بھر یہ کارٹون اپنوں اور غیروں کے درمیان بحث کا موضوع بنا رہا، اور کچھ دنوں کے بعد ۱۴۔ مارچ ۱۹۳۹ء کو ان کے دفتر میں انہیں قتل کر دیا گیا۔ اس قتل کے الزام میں دو نوجوان محمد شفیق اور محمد احمد کو گرفتار کر لیے گئے۔

اس قتل کا پس منظر کیا تھا؟ لیکن پیش منظر میں یہ مقدمہ سیاسی نوعیت اختیار کر گیا چنانچہ دہلی کی مرکزی حکومت اور لکھنؤ، فرنگی محل کے مولانا قطب الدین اس قتل کی سازش میں ملزمان سے یہ اقرار کرانے پر مصر رہے کہ اس قتل پر نوجوانوں کو آمادہ کرنے والے سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا مفتی کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد مدنی تھے، مگر ملزمان نے پیہم اصرار کے باوجود اس اقرار پر انکار کر دیا، البتہ ملزمان نے اپنے صفائی کے گواہان میں امیر شریعت اور مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کا نام دیا۔ جب یہ دونوں حضرات عدالت میں تشریف لائے، تو ملزمان نے عدالت سے کہا:۔

"ہم ان بزرگوں کی صرف زیارت کرنا چاہتے تھے، گواہی کی ضرورت نہیں۔"

آخر اس مقدمہ کے فیصلے میں ایک نوجوان کو سزائے موت اور دوسرے کو عبور دریائے

شور کی سزا دی گئی۔

ضلع میانوالی کا دورہ

۱۹۱۴ء کی طرح ۱۹۳۹ء کا سال بھی یورپین قوموں کے مقدر عروج و زوال کا سال تھا۔ یورپ کے افق پر دوسری جنگ عظیم کے بادل منڈلا رہے تھے۔ اس جنگ کے نتائج خواہ کچھ ہوتے، لیکن چوگان سیاست میں کھیلنے والے جانتے تھے کہ اگر اب کے برطانیہ جنگ میں الجھا تو وہ سورج جو اس کی سلطنت میں غروب نہیں ہوتا، وہ اس کو لے ڈوبے گا۔ اور یہ وقت تھا کہ برطانیہ پر ضرب کاری لگائی جائے اور پنجاب کے ایسے علاقوں میں جا کر لوگوں کو انگریزی فوج میں بھرتی ہونے سے منع کیا جائے، جو خالص فوجی علاقے کہلاتے ہیں، چنانچہ اگست ۱۹۳۹ء کے دوسرے ہفتے امیر شریعت اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ضلع میانوالی کے دورہ پر روانہ ہو گئے۔

یہ زمانہ پنجاب میں سر سکندر کی وزارت کا تھا۔ اس کی یونینسٹ پارٹی "سروں" اور "رائے بہادروں" پر مشتمل تھی۔ انگریز کی کوکھ سے جنم لینے والے یہ لوگ انگریزی سائے کو رحمت خداوندی سے تعبیر کرتے تھے۔ انہیں جب پتہ چلا کہ امیر شریعتؒ اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ضلع میانوالی کا دورہ کر رہے ہیں، تو حکومت کی ساری مشینری حرکت میں آ گئی۔

موت سے کھیلنے والے لوگوں کی سرزمین گوریت کے پہاڑوں تلے آباد ہے مگر پتھروں کے سے دل رکھنے والے جوانوں کی آبادی میں جب امیر شریعت نے توحید باری تعالیٰ اور برطانوی سامراج کے خلاف بغاوت کے پھول کانٹے بکھیرے تو ریتلی زمین کا دامن بھی ثمر آور ہوا، اور خشک پہاڑوں سے امید بہار کی بو آنے لگی۔ رات جس گاؤں میں امیر شریعت تقریر کرتے گرد و نواح کی فضا کو رائفلوں کی آواز سے دہشت زدہ کر دیا جاتا۔ دن کو جن راستوں پر سفر کرتے انہیں ڈاکوؤں کی آماجگاہ بنا دیا جاتا۔ امیر شریعت کے ہمراہیوں کو ضلع کی پولیس نے اکثر پریشان کیا۔ مگر پر خطر ماحول میں پرورش پانے والے انسان ہر خطرے کو خود دعوت دے کر اپنے گرد جمع کر لیتے، اور یہی [illegible] گی ہے جو انہیں آخر کو منزل سے ہمکنار کرتی ہے۔

گرفتاری

اس سنگلاخ وادی میں پندرہ دن گذار کر جب امیر شریعت واپس آئے، تو دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہو چکا تھا۔ ہٹلر کی فوجیں پولینڈ، ناروے اور ڈنمارک سے گذر کر فرانس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ پنجاب میں یونینسٹ حکومت کو یہ بات پسند نہ آئی، کہ خالص عسکری علاقوں میں حکومت کے خلاف بغاوت کو پھیلنے دیا جائے، جبکہ انگریز براہ راست جنگ میں شریک ہو چکا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کی برستی ہوئی گھٹاؤں نے یورپ کی دلدل میں ایشیا کو بھی اپنے ساتھ گھسیٹنا چاہا۔ چنانچہ ہندوستان میں انگریزی پرچم کی آزاد اڑانوں کی نگاہیں ایسے لوگوں کی جستجو میں مصروف نظر آنے لگیں، جن کے ارادے اس جنگ کے منتظر تھے اور وہ انگریزی اقتدار سے نجات کے بہانے تلاش کر رہے تھے۔ آخر ڈیفنس آف انڈیا رولز کی نگاہِ اول نے امیر شریعت کو تاک کر سب سے پہلا وار کیا، اور انہیں ۸ ستمبر ۱۹۳۹ء کو ضلع مظفر گڑھ سے دفعہ ۱۲۱، ۲۰۲، ۱۲۴ا اور ۱۵۳ا کے تحت سیشن جج راولپنڈی کے حکم سے گرفتار کر لیا گیا۔

مجلس احرار کی قرارداد

امیر شریعت کی گرفتاری کے ساتھ سارے ہندوستان میں سیاسی کارکنوں کی عام گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ کانگرس اور مجلس احرار ایسی سیاسی جماعتیں تھیں، جنہوں نے ماضی قریب میں ہندوستان بھر میں اپنی سیاسی تاریخ کو اس نہج پر ترتیب دیا تھا کہ انگریزی راج ان سے متزلزل تھا۔ دوسری جنگ عظیم سے متعلق فیصلہ کرنے کا انہی جماعتوں کو اختیار تھا، چنانچہ ۱۱۔ ستمبر ۱۹۳۹ء کو احرار ورکنگ کمیٹی نے امرتسر میں فیصلہ کیا۔

> "مسلمانانِ ہند اس وقت تک اس جنگ میں حکومت برطانیہ کے ساتھ تعاون نہیں کریں گے، جب تک کہ برطانیہ اسلامی ممالک سے اپنی فوجیں واپس نہ بلائے، نیز ہندوستان کو مکمل طور پر آزاد نہ کر دے۔
>
> مجلس عاملہ کی رائے میں پھر یہ سوچنا باقی ہے کہ آیا ہمارے ابنائے

فوج میں جانے سے انسانیت کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔"

مجلس احرار کی اس قرارداد سے ایک طرف انگریزی سامراج برہم ہوا، تو دوسری طرف کانگرس کے حواس بھی درست نہ رہے۔ کیونکہ کانگرس ذہنی طور پر یہ سمجھتی تھی کہ اس کے بغیر اس جنگ کے متعلق کوئی دوسری پارٹی رائے دینے کی مجاز نہیں۔

مندرجہ بالا قرارداد نے امیر شریعت کے مقدمات پر بھی اثر ڈالا، اور عدالت نے انہیں ضمانت پر رہا کرنے سے انکار کر دیا۔ چوبیس[۲۴] روز کی مسلسل کارروائی کے بعد ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو یہ مقدمات سیشن جج راولپنڈی کے سپرد کر دیے گئے۔ لیکن قانون امیر شریعت پر عائد کردہ تمام دفعات کی سچائی میں ناکام رہا، اور اس گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دینے کے لیے ۱۸۔ دسمبر ۱۹۳۹ء کو لالہ موسیٰ ضلع گجرات میں ایک دوسرا مقدمہ ۱۱۷ اور ۳۰۲ کے تحت تیار کر لیا گیا۔ سرکاری استغاثہ نے امیر شریعت پر الزام لگایا کہ انہوں نے ۲۸۔ جون ۱۹۳۹ء کو لالہ موسیٰ میں تقریر کرتے ہوئے کہا ہے کہ:۔

"اب اسلام کی حکومت کہیں نہیں رہی اور مسلمانوں کو از سر نو حکومت سنبھالنی چاہیے، موجودہ حکومت میں مسلمان عورتوں کے نکاح کے فیصلے شیطان فرنگی کرتا ہے، اور اسلامی قانون کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا۔ اور غیر دیانت دار یورپین مؤرخوں نے حکومت کے زیر اثر تاریخی واقعات کو غلط پیرائے میں بیان کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ عالمگیر اورنگ زیب پر الزام ہے کہ وہ ہر روز صبح ہندوؤں کے بارہ من جنیو اتارنے کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اور حاضرین کی حوصلہ افزائی پر شاہ صاحب نے کہا کہ میں انگریزی حکومت کا تختہ الٹ دوں گا اور ان کو اتنے زور سے سمندر میں دھکیل دوں گا کہ وہ پھر واپس نہ آ سکیں گے، سمندر کے پانی کو انگریزوں کے خون سے سرخ کر دوں گا، اور زمین کو بھی انگریزوں کے خون سے اس طرح سرخ کر دونگا

جس طرح یزید نے امام حسینؓ کی فوجوں کو قتل کر دیا تھا۔
مرزا غلام احمد کافر ہے، اس نے برٹش گورنمنٹ کی پانچ سو گھوڑوں
سے امداد کی تھی۔"

گجرات ڈسٹرکٹ جیل میں اس مقدمے کی سماعت لالہ لکشمی داس مجسٹریٹ نے کی، دیوان چمن لال امیر شریعتؒ کی طرف سے سینئر وکیل تھے، ان کے علاوہ دوسرے قانون دانوں نے بھی امیر شریعتؒ کی حمایت میں اپنی کتب کے اوراق کھنگال ڈالے۔

۱۱۔ جنوری ۱۹۴۰ء کو امیر شریعتؒ مقدمے کی پیشی کے لیے عدالت کے کمرہ میں داخل ہونے لگے، تو کسی نے اشارے سے کہا "شاہ جی" یہ ہے لالہ لدھارام پولیس رپورٹر جس نے آپ کی تقریر کی ڈائری لکھی تھی، اور آج آپ کے خلاف عدالت میں پیش ہوگا اس پر امیر شریعتؒ نے نظر اٹھا کر لدھارام کی طرف دیکھا، نیز اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

"بابو لدھارام اس عدالت کے علاوہ ایک دوسری عدالت بھی ہے،
جہاں تم نے پیش ہونا ہے، شہادت دیتے وقت اس عدالت کا خیال
بھی رکھنا۔"

یہ فقرے کہہ کر امیر شریعتؒ عدالت میں داخل ہو گئے۔

ڈاکٹر عبدالقادر (گجرات) کا بیان ہے، جو اس مقدمہ میں امیر شریعتؒ کے معاون تھے، کہ سرکاری گواہ امیر شریعتؒ کے مندرجہ بالا فقروں پر آبدیدہ ہو گیا، اور دیر تک تنہائی میں خاموش کھڑا رہا۔



باب چہارم ——— ۱۹۴۰ء تا ۱۹۵۰ء

ابتدائی کارروائی

انسانی ضمیر کے بیدار ہونے میں گاہ عمر گذر جاتی ہے اور گاہ آنسوؤں کی نمی اسے بیدار کر دیتی ہے۔ جب احساس جاگ اٹھتا ہے تو کھوئی ہوئی انسانیت تلاش کرنے میں انسان کو دقت نہیں ہوتی۔

امیر شریعتؒ کے الفاظ سرکاری گواہ لدھارام کی کایا کلپ کر گئے۔ انگریزی سلطنت کا ہیڈ کانسٹیبل درویش کے ایک فقرے پر زندگی کی ساری آسائشیں برباد کر بیٹھا۔

استغاثہ کی ابتدائی شہادت ہیڈ کانسٹیبل لدھارام کی تھی، جس نے ۲۸۔جون ۱۹۳۹ء کو لالہ موسیٰ میں امیر شریعتؒ کی تقریر کے شارٹ ہینڈ نوٹ لیے تھے۔ جب وہ بطور چیف رپورٹر ۱۱۔جنوری ۱۹۴۰ء کو ڈسٹرکٹ جیل گجرات میں لکشمی داس کی عدالت میں پیش ہوا، تو امیر شریعت کی طرف سے دیوان چمن لال ایڈووکیٹ (ایم۔ایل اے)، میاں عبدالعزیز ایڈووکیٹ (ایم۔ایل۔اے) اور مولانا مظہر علی اظہر ایڈووکیٹ بطور وکیل پیش ہوئے۔ لدھارام نے حسب ذیل ابتدائی بیان دیا۔

"میں نے ۲۸۔جون ۱۹۳۹ء کو اس جلسہ میں شرکت کی تھی، جو گرانڈ ٹرنک روڈ کے قریب لالہ موسیٰ میں ہوا تھا۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے اس جلسہ میں تقریر کی تھی لیکن مجھے یہ بات یاد نہیں کہ شاہ صاحب کے علاوہ کسی اور شخص نے بھی تقریر کی تھی یا نہیں۔ میں نے شاہ صاحب کی تقریر کا خلاصہ لکھا تھا جس کتاب پر حروف "پی۔ڈی" تحریر ہے اس میں تقریر کا اردو خلاصہ درج

ہے، اور میرے ہی ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، لیکن یہ خلاصہ دراصل اس تقریر کا نہیں ہے جو شاہ صاحب نے کی تھی، بلکہ یہ تقریر کا مسخ شدہ خلاصہ ہے، جو میں نے تقریر کے وقت نہیں، بلکہ تقریر کے بعد کیا تھا، اصل تقریر کا خلاصہ جلا دیا گیا تھا۔

تقریر پیش نظر کا خلاصہ پروسیکیوٹنگ انسپکٹر کی ہدایت پر میں نے گجرات میں ان کے مکان پر مرتب کیا تھا اور دوسرے روز میں نے اسے مفصل عبارت میں منتقل کیا۔"

اس مرحلے پر استغاثہ نے عدالت سے درخواست کی کہ اسے قانونِ شہادت کی دفعہ ۱۵۴ کے تحت گواہ پر جرح کرنے کی اجازت دی جائے۔ مختصر بحث کے بعد عدالت نے یہ درخواست قبول کر لی۔ پروسیکیوٹنگ انسپکٹر کی جرح کے جواب میں گواہ نے کہا۔

"میں نے یہ خلاصہ تقریر کے تین روز بعد مرتب کیا تھا۔ مجھے وزیر اعظم پنجاب (سر سکندر حیات) کا ایک خط دکھایا گیا تھا، جس میں مجھے پروسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مکان پر حاضر ہونے کی ہدایت کی گئی تھی، میں نے اس کی تعمیل کی، اس خط میں تحریر تھا کہ جلسہ ختم ہونے کے بعد جس قدر جلد ممکن ہو تم پروسیکیوٹنگ کے مکان پر پہنچو، لیکن اس خط میں وہاں پہنچنے کی تاریخ معین نہیں کی گئی تھی۔ یہ خط ٹائپ کیا ہوا تھا اور مجھے اصل خط دکھلایا گیا تھا۔ میں نے اپنی واقفیت کے لیے اس خط کا ترجمہ کر لیا تھا۔ استغاثہ کے دو گواہ جنہوں نے تقریر کے اس خلاصے پر دستخط کیے تھے، میرے ساتھ پروسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مکان پر نہیں گئے تھے۔ خط میں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ تقریر کا خلاصہ پروسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مشورے پر مرتب کرنا چاہیے۔

یہ خط ۲۸۔ جون ۱۹۳۹ء کا لکھا ہوا تھا۔ اس پر نمبر سی، آر، پی، بی ۸، ۷ ایل

(C.R. P.B. 78. L) تھا۔ یہ خط ۲۸۔ جون کو ہی گجرات پہنچا تھا۔ خط میں یہ ہدایت بھی درج تھی کہ اس خط کو خفیہ تصور کرنا چاہیے۔ اس بناء پر میں نے کسی دوسرے پولیس افسر کو اس بات کی اطلاع نہیں دی کہ میں نے تقریر کا خلاصہ پروسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مشورے سے مرتب کیا ہے۔ کیونکہ مجھ سے وعدہ کیا گیا تھا کہ مجھے ترقی دی جائے گی، اور مجھے کام کی عمدگی کی سالانہ سند دی گئی تھی، اس لیے میں نے تقریر کے خلاصہ کو مسخ کرنے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس سلسلے میں مجھے نقد انعام بھی دیا گیا تھا، لیکن مجھے یہ بات یاد نہیں کہ انعام کی صحیح رقم کیا تھی؟

شہادت کے دوران دیوان چمن لال نے چند کاغذات لدھا رام کو دیے جنہیں گواہ نے عدالت میں پیش کیا۔ ان کاغذات میں گواہ نے اپنے اس نظریہ کی وضاحت کی تھی، جس کی بنا پر اب وہ پولیس کی ملازمت سے مستعفی ہو چکا تھا۔ اس استعفے کو عدالت نے پروسیکیوٹنگ انسپکٹر کے کہنے پر ایگزیبٹ ڈی۔ ڈبلیو ۲/۱ کر لیا۔ جو حسب ذیل ہے۔

جناب عالی!

میں اڑہائی سال سے محکمہ پولیس میں کام کر رہا ہوں۔ میری ڈیوٹی پولیس رپورٹر کی ہے۔ میں کئی دفعہ اپنے ضمیر کے خلاف کام کرتا رہا ہوں، وہ محض اس لیے کہ افسرانِ بالا کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ان کو خوش رکھوں۔ مگر آخر کار مجھے اپنے ضمیر نے بیدار کیا اور میں اپنے ضمیر کا خون نہ کر سکا، جس کا ثبوت یہ ہے کہ میں آج عدالت میں بالکل درست، اصل اور قدرتی چیز پیش کر رہا ہوں۔ چنانچہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے مقدمے کے اصل حالات حسبِ ذیل ہیں۔"

" آنریبل سر سکندر حیات وزیر اعظم پنجاب کی طرف سے چند ایک مراسلات

اُن کے "پی۔اے" کی معرفت سپرنٹنڈنٹ پولیس گجرات کو پہنچے، جن میں سے
بعض حکموں پر میری تعمیل کرائی گئی۔
سب سے پہلی چٹھی مورخہ ۲۹/۱/۲ نمبر سی۔آر۔پی جس میں سید عطاء اللہ
بخاری کی نگرانی کے لیے تحریر تھا، جس میں مسٹر بی، ایس، برا سپرنٹنڈنٹ
پولیس گجرات کو لکھا گیا تھا کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ سکنہ ناگڑیاں ضلع گجرات
جب تمہاری حدود میں پہنچے، تو اس کی تمام حرکات و سکنات کی نگرانی کی جائے
اور ایک اچھے ہوشیار رپورٹر کی ڈیوٹی اس کے ساتھ لگادی جائے، وہ محتاط
ہوکر اس کی نگرانی کرے، اور نگرانی کنندہ کا نام وغیرہ اس چٹھی میں درج کیا
جائے۔" اس چٹھی کی تعمیل میں مجھے سید عطا اللہ بخاریؒ کی نگرانی کے لیے
مقرر کیا گیا اور بذریعہ چٹھی نمبر اے ۱۰۶ مورخہ ۲۹/۱۱/۲ سپرنٹنڈنٹ صاحب
کی طرف سے مندرجہ ذیل جواب وزیر اعظم کے "پی۔اے" کی معرفت بھیجا گیا
جناب عالی! تعمیل حکم حضور والا شائع ہوگئی ہے۔ اور ایک اچھا
ہوشیار رپورٹر ان کی نگرانی کے لیے منتخب کیا گیا ہے، جس کا نام لدھا رام
ہے۔ اور پڑھا لکھا کانسٹیبل ہے۔ انگریزی خواندہ ہے۔"
اس کے بعد مندرجہ ذیل چٹھی "پی۔اے" سر سکندر حیات کی طرف سے
۱۱۔جون ۱۹۳۹ء کو سپرنٹنڈنٹ پولیس گجرات کے نام آئی۔ اس چٹھی کا نمبر
C.R.P/86376 تھا۔" آپ کو تحریر کیا جاتا ہے کہ ہمیں خفیہ طور پر اطلاع ملی ہے
کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری تمہارے ضلع گجرات میں یونینسٹ وزارت کے
خلاف پروپیگنڈے کے لیے جا رہا ہے۔ آپ ایک ہوشیار باختیار
رپورٹر کو حکم دیں کہ وہ اس کی تقریروں کے نوٹ لکھ کر آپ کے سامنے
پیش کرے، اور ممکن ہو تو بہت کشادہ لفظ لکھے جاویں۔ اس حکم کو نہایت

خفیہ حکم تصور کیا جائے، اور بعد کرانے تعمیل رپورٹ ہمارے پاس بھیج دیا جائے ضروری ہے۔"

اس چٹھی کے جواب میں مورخہ ۲۲/۶/۳۹ کو چٹھی B-106 کے ذریعے سپرنٹنڈنٹ گجرات نے سرسکندر حیات خان کو ان کے "پی۔ اے" کی معرفت اس مضمون کی چٹھی لکھی۔

"بجواب حکم B.511.L عرض کی گئی ہے کہ لدھارام رپورٹر کی ڈیوٹی لگائی گئی ہے اور اس کو خاص ہدایت کی گئی ہے کہ وہ عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریروں کے نوٹ لیتے وقت کشادہ طور پر لکھے، اور ہمارے روبرو پیش کرے اور پیر غازی میں ایک جلسہ ہونے والا ہے، جس میں کہ اسے خاص ہدایت کی گئی ہے کہ وہ کھلے طور پر نوٹ کرے جو کہ ڈائری علیحدہ ارسال ہوگی۔"

اس چٹھی کے بعد موضع پیر غازی وغیرہ میں جلسے ہوئے جن میں شاہ صاحب نے بالکل مذہبی تقریریں کیں۔ میں نے ان کو کشادہ لکھنا موزوں نہ سمجھا کیونکہ ان میں کمی بیشی کر کے مقدمہ چلانے کی گنجائش نہ تھی۔ اس پر سپرنٹنڈنٹ صاحب نے میری طلبی کی۔ میں نے جواب میں کہا کہ تقریریں بالکل مذہبی تھیں ان کو کشادہ لکھنا بے سود تھا۔

اس کے بعد سرسکندر حیات کے پرسنل اسسٹنٹ نے ۲۸۔ جون ۱۹۳۹ء کو چٹھی نمبر C.R.P / B.7806 کے ذریعے سپرنٹنڈنٹ ضلع گجرات کو لکھا۔

"ڈائری خفیہ از موضع پیر غازی اور مدینہ پہنچ چکی ہے، چونکہ ان میں مذہبی لیکچر تحریر ہے، جس میں اتنی گنجائش معلوم نہیں ہوتی، لہٰذا آئندہ ڈائری کوئی بھی ہو، جس میں پولیٹیکل اظہار ہو اس میں تقریر کو اس طرح پر بعد لینے کے لیے بحکم پروسیکیوٹنگ انسپکٹر بنایا جائے کہ وہ تقریر زیر دفعہ ۱۲۱ تعزیرات ہندیا

کسی قتل کی تبلیغ کے جرم میں مثلاً ۲۰۲/۱۱۷ کا مرتکب ہو سکے، اور یہ بھی خیال رکھا جائے کہ ساتھ ۱۲۴/۱۵۴ بھی قائم رہے اور گواہان خاص طور پر معتبر اور اچھے پولیس کے اثر والے ہوں، اس حکم کو نہایت خفیہ تصور کیا جائے۔"

اس حکم کی وصولی کے بعد مورخہ ۲۸/۲/۴۹ کو شاہ صاحب نے لالہ موسیٰ ضلع گجرات میں تقریر کرنے کے لیے آنا تھا۔ چنانچہ حسب سابق مجھے رپورٹ لینے کے لیے متعین کیا گیا۔ شاہ صاحب نے تاریخ مقررہ پر لالہ موسیٰ میں تقریر کی، اور میں نے اس تقریر کے شارٹ ہینڈ نوٹ لیے اور ان میں کچھ کشادہ جگہ موجب ہدایت افسرانِ بالا رکھی اور تقریر کے لونگ ہینڈ نوٹ کے بغیر ہی گجرات واپس آیا اور پروسیکیوٹنگ انسپکٹر نے کشادہ جگہ کو ناکافی خیال کیا اور مجھے کہا کہ میں اس تقریر کو لونگ ہینڈ میں لکھ دوں۔ میں نے تعمیل حکم "پی، آئی" صاحب کی۔ اور "پی، آئی" صاحب نے لونگ ہینڈ کی عبارت میں اپنے حسب منشا تبدیلیاں اور اضافے کیے۔ اس کے بعد چونکہ ۲۸، تاریخ والی کاپی کی تحریر تبدیلیوں اور اضافوں کے باعث مشکوک ہو گئی تھی اور اسے عدالت میں پیش نہیں کیا جا سکتا تھا، اس لیے "پی، آئی" صاحب نے حکم دیا کہ نئی کاپی پر تبدیل شدہ عبارت، شارٹ ہینڈ اور لونگ ہینڈ میں تحریر کی جائے۔

نئی کاپی مورخہ ۳۰/۲/۴۹ کو صاحب سپرنٹنڈنٹ بہادر پولیس کے سٹینو سے حاصل کی گئی، اور اس پر تمام عبارت شارٹ ہینڈ اور لونگ ہینڈ نوٹ کرنے کے بعد ۲۸/۲/۴۹ والی اصل کاپی کو بحکم "پی، آئی" صاحب نذرِ آتش کر دیا۔ اور اس نئی کاپی کی بنا پر مقدمے کی منظوری حاصل کی گئی، اور یہ مقدمہ چلایا جا رہا ہے۔ اصلی ڈائری اور موجودہ ڈائری (جعلی)، کے چند ایک

اختلافات میں یہاں نوٹ کرتا ہوں، جن سے معلوم ہو سکے گا کہ کس طرح حکّام بالا کے احکام کی ناجائز تعمیل کی گئی ہے۔

موجودہ ڈائری میں جو کچھ تحریر کیا گیا۔

۱۔ ساڈیاں بیٹیاں دے نکاح تے ساڈے نکاح دے فیصلے شیطان فرنگی کردا اے، تے ساڈی شریعت دا کوئی خیال تے لحاظ نہیں کردا۔

۲۔ یہ ان بے ایمان فرنگیوں اور سکندر کی متعصبانہ چال ہے۔

۳۔ میں حیران ہوں کہ یہ فرنگی، خدا ان کو غارت کرے کیوں نہیں جاتے؟

۴۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ زیادہ نہیں، صرف جتنے آدمی یہاں موجود ہیں، میرے ساتھ ہو جائیں۔ میں اس حکومت کا تختہ پلٹ دوں، ان کے پرخچے اڑا کر رکھ دوں اور ان ڈشٹوں کو بحر میں جا کر ایسا دھکا دوں کہ نظر نہ آئیں۔ مجھے اس وقت بھی اگر تمہارا حوصلہ ہو اور تیر و کمان و تیغ بکف ہو کر ان فرنگیوں کے خون کی نہریں بہا دوں، ان کے خون سے سمندر لال کر دوں۔ ان کے خون سے زمین سیراب کر دوں، جس طرح یزید نے حسینؓ کی فوج کو تہ تیغ کیا تھا، اسی طرح ان شیطانوں کو کاٹ دو، حوصلے سے کام لو اور ان بے ایمان کافروں کو نکال دو۔"

تلف شدہ ڈائری میں جو کچھ تحریر تھا۔

۱۔ ساڈے نکاح تے ساڈی بیٹیاں دے نکاح دے فیصلے غیر مسلم کرن، اساڈی شریعت دا کوئی خیال تے لحاظ نہ ہووے۔

۲۔ نہیں، بلکہ یہ سکندر اور یونینسٹ پارٹی کی مہربانی اور چال ہے۔

۳۔ میں حیران ہوں کہ باوجود سردار دھنا سنگھ کی مسجد بنوانے پر بھی سکھ صاحبان کے دل سے کدورت اور برا خیال کیوں نہیں جاتا، اور یہ اتفاق

کیوں نہیں کرتے۔

۴۔ یہ الفاظ صرف پی آئی صاحب نے بحکم سر سکندر حیات خاں مندرجہ اپنی طرف سے لکھوائے، جو بالکل جھوٹ ہیں اور ایک بے گناہ ہستی کو گناہ عظیم کا موجب بناتے ہیں۔ یہ الفاظ قطعاً مقرر نے اپنی تقریر میں استعمال نہیں کیے۔

اس طرح مقدمہ تیار کرنے کے بعد اور ۱۵۳-الف تعزیرات ہند کا مواد مہیا کرنے اور ساتھ ہی ۱۲۴-الف/۱۵۳ کا خیال رکھنے کے بعد سپرنٹنڈنٹ پولیس گجرات نے سر سکندر حیات کو ان کے "پی / اے" کی معرفت اپنی چٹھی نمبر ۷-۱۰۶ مورخہ ۲/۳۹ میں اپنی کارکردگی اور تعمیل ارشاد کی حسب ذیل اطلاع دی۔

"جناب عالی!

مورخہ ۲۸/۷/۳۹ کو عطا اللہ نے لالہ موسیٰ میں تقریر کی، جس کے متعلق رپورٹر کو خاص طور پر ہدایت کی گئی تھی۔ مطابق ہدایت "پی۔ آئی" صاحب کے پاس ڈائری کو بھیجا گیا، اور اس میں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے ڈائری اور مرتب کی گئی۔ جس میں قانونی اغراض کو مدنظر رکھتے ہوئے کمی بیشی کی گئی اور ایسے الفاظ ایجاد کیے گئے جن پر فوراً ۱۵۳-الف تعزیرات ہند عائد ہوتی ہے اور بعد شہادت استغاثہ ۱۲۱ تعزیرات ہند بھی قائم ہو سکتا ہے ۱۵۳-الف تعزیرات ہند کے لیے صرف الفاظ تبلیغ قتل اقوام انگریز اور پبلک میں کافی اشتعال لکھا گیا ہے۔ لہٰذا بموجب حکم تعمیل ہو کر رپورٹ عرض ہے۔"

وزیر اعظم سے لے کر نچلے افسروں تک کی تمام کارروائی کا حال مذکورہ بالا خط و کتابت اور جعلی ڈائری نویس سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس پر مزید کسی تنقید

کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی کوئی منصف مزاج انسان اس بارے میں کسی تنقید کا محتاج ہوگا۔

اب میرے سامنے کئی روز سے یہ سوال درپیش ہے کہ آیا میں اس طرز عمل کو قبول کرتا جاؤں جو کہ اب تک جاری ہے اور جس کے ذریعے دنیاوی طور پر فائدہ اور ترقی کی امید ہے، اور اس جعلی ڈائری کی ترتیب میں جو خدمت مجھ سے لی گئی ہے، اس کے صلے میں ۳۹/۹/۸ کو پچیس۲۵/ روپے نقد انعام اور ایک عدد سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے بعد مزید ترقی و انعام اکرام کے لالچ میں جیسا کہ مجھ سے وعدہ کیا گیا ہے، میں ضمیر فروشی کرتا جاؤں یا دوسروں کے خون سے ہاتھ رنگین کرنے سے باز نہ آؤں خواہ اس میں دنیاوی زر و مال کی کمی ہی کیوں نہ ہو۔ میرے دل نے بیحد کشمکش اور شب و روز کے غور و فکر کے بعد یہی فیصلہ کیا ہے کہ میں بڑے بڑے افسران کا آلۂ کار بن کر اپنے ضمیر کا خون نہ کروں اور جس محکمہ میں اس قسم کی بے ایمانی اور ضمیر فروشی کے بغیر ترقی کا راستہ نہیں مل سکتا، اس کو خیرباد کہتا ہوا اپنے گناہوں سے توبہ کروں اور اپنے آپ کو خدا کے بھروسے پر چھوڑ دوں۔ لہٰذا بریں حالات میں ملازمت سے مستعفی ہوتا ہوں۔"

لدھا رام بقلم خود

مندرجہ بالا بیان کے بعد گواہ پر مفصل جرح کی گئی اور یہ کہ اس نے نوٹ بک کس طرح حاصل کی تھی۔ اس سلسلے میں لدھا رام نے بیان میں کہا:۔

"میں نے ۴۔ نومبر ۱۹۳۹ء کو مقدمہ کی پہلی سماعت کے موقعہ پر جب شاہ صاحب کو دیکھا تو میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ میں ایک بیگناہ شخص کو مصیبت میں پھنسا رہا ہوں، مجھے خدا کے سامنے اس فعل

کا جواب دینا ہوگا۔ چنانچہ میں نے یہ تہیہ کر لیا کہ اگر کسی وجہ سے آج میری شہادت نہ ہو سکی تو میں اس راز کو جو ابھی تک میرے سینے میں محفوظ ہے طشت از بام کر دوں گا، لیکن اگر آج میں شہادت سے نہ بچ سکا، تو گواہی دینے کے بعد خودکشی کر لوں گا۔ میں ۲۔ دسمبر ۱۹۳۹ء کو رخصت پر چلا گیا تھا۔ اور آج اس مقدمے کی سماعت کے موقعہ پر حاضر ہوں۔ میں آج ہی لاہور سے کرائے کی ایک موٹر کار میں یہاں پہنچا ہوں۔ میں تنہا آیا ہوں۔ میں نے دو آنے تین پائی فی میل کے حساب سے کرایہ ادا کیا ہے۔ میں ڈرائیور کا نام نہیں جانتا۔ لیکن وہ جیل کے دروازے کے باہر موجود ہے میں گذشتہ اڑھائی سال سے محکمہ پولیس میں ملازم ہوں۔

مجھے چند خفیہ خطوط بھی دکھائے گئے۔ اگر عدالت مجھے اس بات کا یقین دلائے کہ ان خطوط کے مضامین کو منظرِ عام پر لانے کی پاداش میں مجھ پر مقدمہ نہیں چلایا جائے گا، تو میں ان کو منظرِ عام پر لانے کے لیے تیار ہوں۔"

گواہ نے بیان جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

"میں اس سے پہلے اپنے ضمیر کو ذبح کرتا رہا ہوں، لیکن آئندہ اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

اس کے بعد گواہ نے اس بات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا کہ میں کس طرح اس مقدمہ میں شہادت دینے سے گریز کرتا رہا۔ نیز پروسیکیوٹنگ انسپکٹر کا منشا بھی یہ تھا کہ میں شہادت نہ دوں۔ کیونکہ انہیں کسی طرح میرے ارادے کا پتہ چل گیا تھا۔ گواہ نے کہا:۔

"میں ۲۸۔ دسمبر ۱۹۳۹ء کو پروسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مکان پر گیا جہاں

مجھ سے کہا گیا کہ تمہیں تار کے ذریعے چھٹی لینی چاہیے۔"

شاہ صاحبؒ کے وکیل کی جرح کے جواب میں گواہ نے کہا:۔

"میں ایک یا ڈیڑھ سال سے پولیس رپورٹر کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔ مختصر نویسی کی کتابیں پولیس کے دفتر میں رہتی ہیں، جب ایک کتاب ختم ہو جاتی ہے تو اسے پولیس کے دفتر بھیج کر دوسری منگوالی جاتی ہے۔ مجھے حکم دیا گیا تھا کہ شاہ صاحب کی تقریر کے خلاصہ کو پروسیکیوٹنگ انسپکٹر کے پاس لے جاؤں۔ مجھے وزیراعظم کے حکم میں یہ ہدایت کی گئی تھی کہ شاہ صاحب کی تقریر کا خلاصہ لکھتے ہوئے الفاظ کے درمیان خالی جگہ چھوڑتا چلا جاؤں۔ یہ خط جس میں مذکورہ بالا ہدایت درج تھی۔ وزیراعظم کے پرسنل اسسٹنٹ کی جانب سے تھا۔ ایسے تمام خطوط جو پولیس سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں موصول ہوتے ہیں، ایک رجسٹر میں درج کر لیے جاتے ہیں۔ یہ رجسٹر صیغہ راز میں ہوتا ہے اور کسی ایسے شخص کو جس سے اس امر کا کوئی تعلق نہ ہو نہیں دکھایا جاتا۔ میں ان خطوط کا خلاصہ اس لیے اپنے پاس لکھتا رہا کہ اس میں میرے لیے ہدایات درج تھیں۔"

اس موقعہ پر گواہ نے خطوط سے متعلق اپنی یادداشتیں پیش کیں، اور اپنے بیان کو مزید جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

" وہ نوٹ بک جس میں شاہ صاحب کی تقریر کا صحیح خلاصہ درج تھا ۲۸۔ دسمبر کو پراسیکیوٹنگ انسپکٹر نے اپنے مکان پر جلا دی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، شاہ صاحب نے اپنی تقریر میں کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی، جس کی بناء پر ان کے خلاف $\frac{108}{117}$ اور ۱۲۱ قانون ضابطہ فوجداری کے تحت مقدمہ چلایا جا سکے۔"

بیان کے آخری حصے میں گواہ نے کہا:۔

"لاہور سے گجرات آتے ہوئے آج راستہ میں مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ میری گرفتاری کے لیے جہلم یا گجرات سے وارنٹ جاری ہو گئے ہیں۔ جب میں ڈسٹرکٹ جیل کے احاطہ میں دیوان چمن لال سے ملا، تو ان سے امداد کی درخواست کی" اور عدالت کے کمرہ میں داخل ہوتے ہوئے چند کاغذات اور ایک خط انہیں دے دیا۔

یہ میرا استعفیٰ تھا، جب میں ڈسٹرکٹ جیل کی عدالت کے کمرہ میں داخل ہو رہا تھا، تو دیوان چمن لال نے عدالت کے سامنے استعفیٰ اور دوسرے خطوط مجھے واپس کر دیے۔

میں مجسٹریٹ کے ساتھ ساتھ سب جیل تک آیا ہوں۔ کیونکہ میں حفاظت کا متمنی ہوں۔ عدالت کے کمرہ میں داخل ہونے سے پہلے میں نے دیوان چمن لال صاحب سے کہا تھا کہ وہ عدالت سے درخواست کریں کہ وہ مجھے بطور گواہ پیش ہونے کے لیے اپنی حفاظت میں لے لیں۔

۲۸۔ دسمبر ۱۹۳۹ء کو پراسیکیوٹنگ انسپکٹر نے مجھ سے دوسری ڈائری تیار کرنے کے لیے کہا تھا کہ اس مسودہ کے جس پر حروف پی آئی لکھے ہوئے ہیں، صفحہ ۴ پر جن لوگوں کے دستخط موجود ہیں، وہ ان کی موجودگی میں دوبارہ دستخط کرا سکیں۔

۸۔ جنوری ۱۹۴۰ء کو اپنی ملازمت پر واپس آ رہا تھا کہ پراسیکیوٹنگ انسپکٹر مجھے وزیر آباد ریلوے سٹیشن پر ملے۔ مجھے یاد نہیں کہ اس وقت میرے ساتھ کوئی تھا یا نہیں۔ بدر نارائن میرا عزیز ہے اور لاہور کے قیام کے دوران میں اسی کے پاس ٹھہرا تھا۔"

اس شہادت کے بعد مقدمہ ۲۳-جنوری پر ملتوی ہوگیا۔

شہادت کے بعد جب لدھارام عدالت سے باہر آیا تو بخشی آنندرام اسسٹنٹ سب انسپکٹر پولیس نے ان سے ایک نوٹس کی تعمیل کرائی، جس میں تحریر تھا کہ چھٹی منسوخ ہو جانے کے بعد کیونکہ تم بروقت اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے حاضر نہیں ہوئے، اس لیے تمہیں معطل کیا جاتا ہے۔

لدھارام: "میں مستعفی ہو چکا ہوں"

اس طرح مقدمہ کے حالات و واقعات نے ایک نئی شکل اختیار کرلی۔ دوسری صبح کے اخبارات نے جلی سرخیوں کے ساتھ اس مقدمہ کو شائع کیا، تو لا اینڈ آرڈر کے تحفظ کے لیے سرکاری قانون اپنی حفاظت میں لیس ہوکر سامنے آگیا۔ ۱۲-فروری ۱۹۴۰ء کو ایڈووکیٹ جنرل مسٹر سلیم نے ہائیکورٹ میں درخواست دی کہ

"اس مقدمہ کو ہائی کورٹ میں منتقل کر دیا جائے۔ کیونکہ لدھارام گواہ استغاثہ نے وزیراعظم پنجاب کو جو لا اینڈ آرڈر کے مالک ہیں۔ اس مقدمہ میں پھنسانے کی کوشش کی ہے۔ لہٰذا کسی ماتحت عدالت پر اس معاملہ کا فیصلہ نہیں چھوڑا جاسکتا۔"

چنانچہ جسٹس اسکیمپ نے درخواست کی سماعت کے بعد یہ مقدمہ ہائیکورٹ میں منتقل کر دیا۔

ماتحت عدالت سے فارغ ہوکر لدھارام گواہ کو یقین تھا کہ پولیس انہیں گرفتار کرلے گی لیکن امیر شہر لعنت کے وکیل دیوان چمن لال ایڈووکیٹ نے لدھارام کو اپنی تحویل میں لے لیا اور اس سے گفتگو کرتے ہوئے اپنی کار کے قریب لے آئے کہ اتنے میں ڈپٹی آئی جی پولیس نے کہا "میرے پاس لدھارام کے دفعہ ۹۴ کے وارنٹ ہیں۔ انہیں گرفتار کرنا چاہتا ہوں۔"

دیوان چمن لال نے کہا "آپ انہیں گرفتار نہیں کر سکتے، کیونکہ وہ اب ملازمت سے مستعفی ہو چکے ہیں۔

پولیس آفیسر کو گمان ہوا کہ ممکن ہے کوئی قانونی شق ایسی ہو کہ میں انہیں گرفتار نہیں کر سکتا، ابھی وہ اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ دیوان چمن لال جلدی سے لدھا رام کو اپنی کار میں بٹھا کر لے اُڑے پولیس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے، لیکن اب ہو بھی کیا سکتا تھا؟

لدھا رام کی تلاش

پنجاب پولیس نے اپنے مجرم کی تلاش میں مجالس احرار کے دفاتر، سیاسی کارکنوں کے مکان اور دیگر پولیٹیکل پارٹیوں کے ٹھکانوں پر مسلسل چھاپے مارے، مگر نامرادیوں کے سوا انہیں کچھ ہاتھ نہ آیا۔ آخر لدھا رام کہاں غائب ہو گیا؟ اپنے تمام وسائل کے باوجود پنجاب پولیس اس سے بے خبر رہی۔

ہائی کورٹ میں

ان دنوں لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر سر ڈگلس ینگ اور پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر حیات کے درمیان تعلقات خوشگوار نہیں تھے۔ احرار رہنماؤں نے اس سے استفادہ کرنے کے لیے دہلی کے مشہور چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ مسٹر آئر کی معرفت چیف جسٹس سے ملاقات کی راہ نکالی، نیز سر ڈگلس ینگ نے بھی کسی محفل میں اس ارادے کا اظہار کیا کہ:۔

"اگر آپ مجھے مطمئن کر دیں کہ سر سکندر حیات نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے خلاف ذاتی رنجش کی بناء پر در پردہ سازش کر کے مقدمہ چلایا ہے تو میں سیّد صاحب کے ساتھ پورا پورا انصاف کروں گا۔"

چنانچہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، ڈاکٹر عبدالقوی لقمان کی معیت میں صبح پانچ بجے ٹیکسی کار کے ذریعے جسے ایک سکھ ڈرائیو کر رہا تھا، سر ڈگلس ینگ کی کوٹھی کے عقبی دروازے پر پہنچے۔ سر ڈگلس ینگ پہلے سے منتظر تھے۔ وہ مولانا کو اپنے خاص کمرہ میں احترام سے لے گئے۔ ڈاکٹر عبدالقوی لقمان کے توسط سے مولانا اور مسٹر ینگ کے درمیان گفتگو ہوئی۔

مولانا نے، سر سکندر حیات کے پرسنل اسسٹنٹ کے خطوط کی تصاویر دکھائیں۔

گو یہ ملاقات بڑی محتاط اور مخفی طریق سے تھی، لیکن سی آئی ڈی کو پتہ چل ہی گیا کہ احرار رہنماؤں اور ینگ کے درمیان ملاقات ہوئی ہے۔ آخر ۱۱ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر ڈگلس ینگ اور رائے بہادر جسٹس رام لال پر مشتمل ڈویژنل بنچ کے روبرو زیر دفعہ ۱۲۴ الف بغاوت، دفعہ ۱۵۳ ملک معظم کی رعایا کے درمیان منافرت پھیلانے، دفعہ ۳۰۲-۱۱۷ تعزیرات ہند قتل کی انگیخت وغیرہ الزامات کے تحت مقدمہ پیش ہوا۔ اس موقع پر امیر شریعت کو لاہور سنٹرل جیل سے پولیس کی خاصی تعداد کے حراست میں بغیر ہتھکڑی کے ہائی کورٹ میں پیش کیا گیا۔

اس موقعہ پر سینکڑوں کی تعداد میں لوگ عدالت کے صحن میں جمع تھے۔ عدالت کے باہر اور ہائی کورٹ کے صحن میں پولیس کا کڑا پہرہ تھا۔

سرکار کی طرف سے مسٹر محمد سلیم ایڈووکیٹ جنرل اور مسٹر منیر احمد سینئر ایڈووکیٹ جنرل عدالت میں موجود تھے۔ جبکہ امیر شریعت کی طرف سے میاں عبدالعزیز، دیوان چمن لال، مسٹر کے ایل گابا بیرسٹر، مسٹر بدر السلام ایڈووکیٹ، مولانا مظہر علی اظہر ایڈووکیٹ اور مسٹر عبدالقیوم وکیل لائل پور پیروکار تھے۔

اس مقدمہ میں استغاثہ کی طرف سے ۱۱، ۱۲ مارچ کی کارروائی کے دوران چھ سرکاری گواہان نے عدالت میں بیان دیے۔ آخری اور اہم گواہ لدھا رام تھا، جس کے لیے مقدمہ یکم اپریل پر ملتوی کر دیا گیا۔

لدھا رام پانچ فٹ چھ انچ قد، سفید رنگ کے ساتھ دوہرا اور گٹھیلا جسم، خوبصورت نقش و نگار یہ تھا چوبیس سالہ نوجوان مسٹر لدھا رام، والد کا نام امیر چند نارنگ، اور یہ ضلع سرگودہا کے چک ۶۶ میں پیدا ہوئے، اور سناتن دھرم ہائی سکول گجرات سے میٹرک کرنے کے بعد لاہور ڈی۔ اے۔ وی کالج سے ایف۔ اے تک تعلیم حاصل کی۔ گجرات پولیس میں

بطور ہیڈ کانسٹیبل بھرتی ہوئے۔ اوپر کے افسروں میں اس قدر اعتماد حاصل کیا کہ ضلع کی ہر سیاسی ضرورت کے لیے انہیں استعمال کیا جاتا رہا۔

۱۱۔ جنوری ۱۹۴۰ء کو جب وہ پہلی بار امیر شریعتؒ کے مقدمہ میں چیف رپورٹر کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہوئے اور عدالت نے انہیں منحرف گواہ قرار دے دیا، تو دیوان چمن لال اور میاں عبدالعزیز انہیں لاہور لے آئے۔ وہ قریباً ایک ہفتہ مولانا مظہر علی اظہر کے مکان واقع ریلوے روڈ میں روپوش رہنے کے بعد کیلاش پور (سہارن پور سے ۹ میل دور) پھر کیتھل ہردوار کے قریب جنگل میں چھپے رہے۔

عدالت میں

ہائیکورٹ میں اٹھارہ دن التوا کے بعد یکم اپریل کو مقدمہ کی کارروائی از سر نو شروع ہوئی۔ اس روز لدھا رام کی شہادت تھی۔ عدالت کے وسیع صحن میں ہزاروں انسانوں کا اجتماع تھا۔ عدالت میں داخلے کے لیے پاس جاری کیے گئے تھے۔ مگر ہجوم کی زیادتی کے باعث پاس بند کرنے پڑے۔ کمرۂ عدالت سے باہر اور اندر پولیس کا اہم انتظام تھا۔ ٹھیک نو بج کر پینتالیس منٹ پر امیر شریعتؒ کو پولیس کی معیّت میں کار پر عدالت میں لایا گیا تو ہجوم اس قدر بے قابو ہوا کہ پولیس کو اس پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ مقدمہ کی کارروائی ٹھیک دس بجے شروع ہوئی۔

ایڈووکیٹ جنرل مسٹر سلیم نے عدالت سے کہا:

"سابقہ پیشی کے بعد لدھا رام کے نام سمن جاری کیے گئے تھے، لیکن سمنوں کی تعمیل نہیں ہو سکی۔ بہتر کوشش کے بعد بھی پتہ نہیں چل سکا کہ لدھا رام کہاں ہے۔"

اس پر میاں عبدالعزیز ایڈووکیٹ نے عدالت سے کہا:

"میں عدالت سے درخواست کرنا چاہتا ہوں اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ لدھا رام لاہور ہی میں ہے۔ اور میرے ایک دوست نے کہا ہے کہ لدھا رام کو احاطہ عدالت میں دیکھا گیا ہے۔"

میاں عبدالعزیز کی درخواست پر لدھارام کی تلاش کے لیے عدالت کی کارروائی نصف گھنٹہ ملتوی کر دی گئی۔

دس بج کر پینتیس منٹ پر بھورے رنگ کی ایک کار عدالت کے عین سامنے آکر رکی، جس پر لدھارام سوار تھا۔ پولیس کی خواہش تھی کہ لدھارام کو عدالت میں داخل ہونے سے پیشتر گرفتار کر لیا جائے لیکن احرار رضاکار چاہتے تھے کہ لدھارام ایک دفعہ عدالت میں چلا جائے اس کشمکش میں کچھ وقت صرف ہوا، آخر کامیابی احرار کارکنوں کو ہوئی۔ اور لدھارام عدالت میں داخل ہو گیا۔

عدالت کی دوبارہ کارروائی دس بج کر پنتالیس منٹ پر شروع ہوئی اور لدھارام کا بیان ہوا۔

چیف جسٹس مسٹر ینگ کے سوال و جواب کے بعد ایڈوکیٹ جنرل مسٹر سلیم نے عدالت سے گواہ پر جرح کرنے کی اجازت چاہی، جس کے جواب میں لدھارام نے حسب ذیل بیان دیا۔

لدھارام کا بیان

لدھارام قریباً ۲۴ سال کا مضبوط نوجوان ہے۔ اس نے نسواری رنگ کا کوٹ ، چوڑی دار پاجامہ اور گلابی رنگ کی قمیص پہنی ہوئی تھی۔ پاؤں میں سفید کینوس کے بوٹ تھے اور چھوٹی چھوٹی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک ہاتھ کی کلائی پر گھڑی بندھی ہوئی تھی۔ جب وہ کمرۂ عدالت میں داخل ہوا، تو بہت سے نعرے بلند ہوئے۔ اس لیے چیف جسٹس کو کہنا پڑا کہ اگر ذرا بھی شور ہوا، تو کمرۂ عدالت وزیٹروں سے خالی کرا دیا جائے گا۔ لدھارام ولد امیر چند تارنگ نے شہادت دیتے ہوئے کہا کہ میری عمر قریباً چوبیس پچیس سال ہے۔ میں پہلے ملازم تھا اور اب مستعفی ہو چکا ہوں میں انگریزی جانتا ہوں، لیکن بول نہیں سکتا۔

مسٹر سلیم:۔ جب ۲۸ جون کو سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے لالہ موسیٰ میں تقریر کی تھی، کیا آپ وہاں موجود تھے؟

لدھارام :۔ پولیس رپورٹر کی حیثیت سے ۔

س : شاہ صاحب نے جو تقریر کی، کیا آپ نے اس کے نوٹ لیے ؟

ج : جی ہاں! میں نے نوٹ لیے ۔

س : لانگ ہینڈ میں نوٹ لیے یا شارٹ ہینڈ میں ؟

ج :۔ ورنیکلر شارٹ ہینڈ میں ۔

س : کیا تم نے تمام تقریر کے نوٹ لیے تھے ؟

ج : جو کچھ میں لکھ سکتا تھا لکھا ۔

س : کیا تم تمام تقریر لکھ سکتے تھے یا اس کا زیادہ حصہ ؟

ج : میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا ۔ میں نے جو کچھ سمجھا وہ لکھا ۔

س :۔ جو کچھ آپ نے لکھا کیا یہ وہی تھا جو شاہ صاحب نے کہا تھا ؟

ج : (کچھ دیر خاموش رہ کر) جب تک آپ اس سوال کو صاف نہ کریں ، میں کچھ نہیں کہہ سکتا ۔

س : میرا مطلب یہ ہے کہ شاہ صاحب نے جو کچھ کہا تھا کیا وہی آپ نے لکھا تھا ؟

ج :۔ جو کچھ میں نے سمجھا کہ شاہ صاحب نے کہا ہے وہی میں نے لکھا ۔

س : جب آپ نے یہ نوٹ لکھ لیے ، تو کیا آپ نے کسی سے دستخط کرا لیے تھے ؟

ج : جی ہاں ، میں نے غلام حسین ، رولدو سنگھ (تیسرا نام ذرا سوچ کر) مقبول حسین شاہ اور فیروز خاں کانسٹیبل کے دستخط کرا لیے تھے ۔

س : کیا اس کے بعد ان شارٹ ہینڈ نوٹوں کے آپ نے اسی وقت لانگ ہینڈ نوٹ بنائے ۔

ج :۔ اسی وقت نہیں ۔

س : تو کب آپ نے لانگ ہینڈ نوٹ تیار کیے ؟

ج :۔ گجرات میں پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے گھر آ کر لانگ ہینڈ نوٹ لکھے ، اور اسے

دے دیئے۔

س: کس تاریخ کو لکھے؟

ج: جس دن تقریر کے شارٹ ہینڈ نوٹ لیے تھے اس رات اور دن کے بعد۔ میں نے ۲۸۔ جون کو لالہ موسیٰ میں نوٹ لیے تھے، رات بھر وہیں رہا، ۲۹ کو بھی وہیں رہا۔ ۳۰ جون کو پراسیکیوٹنگ کے پیش کیے۔

س: چیف جسٹس:۔ کس جگہ پیش کیے؟

ج: پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مکان پر تقریباً دوپہر کے بعد۔

س: یہ لانگ ہینڈ نوٹ علیحدہ کسی کاغذ پر لیے یا اسی نوٹ بک میں جس میں شارٹ ہینڈ نوٹ لیے تھے؟

ج: علیحدہ کاغذ پر لکھ کر اسے پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کو دیا۔

س: کیا وہ ترجمہ جو آپ نے شارٹ ہینڈ نوٹ سے لانگ ہینڈ نوٹ میں کیا درست تھا؟

ج: شارٹ ہینڈ نوٹوں کے مطابق لانگ ہینڈ نوٹ بالکل درست تھے۔

س: جس نوٹ بک میں آپ نے شارٹ ہینڈ نوٹ لیے اس میں کوئی خالی صفحہ بھی لکھا؟

ج: میں دونوں طرف نوٹ لکھتا گیا۔

س: کیا آپ عام طریقے پر اسی طرح شارٹ ہینڈ نوٹ لیتے تھے؟

ج: عام طور پر دونوں طرف نہیں لکھا جاتا۔ کسی جگہ درمیان میں خالی صفحے چھوڑ دیے جاتے ہیں کسی جگہ نہیں۔

س: آپ کتنے عرصے سے رپورٹنگ کر رہے ہیں؟

مسٹر جسٹس رام لال: آپ یہ سوال کس لیے دریافت کر رہے ہیں؟

مسٹر سلیم:۔ اس لیے کہ اپنے پہلے سوال کا ٹھیک جواب حاصل کروں۔ (یہ کہہ کر آپ نے پھر سوال دہرایا)۔

لدھارام: میں قریباً ایک سال سے رپورٹنگ کر رہا ہوں۔

مسٹر سلیم: کیا تم نے اس سے پہلے بھی کسی جلسے میں نوٹ لیے؟

ج: جی ہاں! میں نے کئی جلسوں میں نوٹ لیے۔

س: جب آپ دوسروں کے نوٹ لیتے تھے تو صفحے کے ایک طرف لکھتے تھے یا دونوں طرف؟

ج: اگر اچھا اور ایسا مقرر ہوتا، جو عام طور پر مشہور ہوتا اور یہ خیال ہوتا کہ وہ ایسی تقریر کرے گا جو قابلِ اعتراض ہوگی، تو جگہ چھوڑ دیتے۔

چیف جسٹس: مسٹر سلیم، آپ سادہ اور مختصر سوال کیوں نہیں کرتے، جس سے سارا جواب مل جائے۔

مسٹر سلیم: میرا مطلب یہ ہے کہ جب آپ دوسری تقریروں کے معاملے میں کہیں جگہ چھوڑ لیتے تھے تو اس کا کوئی خاص سبب ہوتا تھا؟

ج: جی ہاں! شارٹ ہینڈ نوٹوں کے ساتھ کئی دفعہ لانگ ہینڈ نوٹوں کے لیے علیحدہ کاغذ چھوڑ دیا جاتا، تاکہ جب مقدمہ پیش ہو تو یادداشت ہو سکے۔

چیف جسٹس: تم جو شارٹ ہینڈ نوٹ ایک صفحے پر لیتے تھے کیا اس کے لانگ ہینڈ نوٹ اس جگہ پر جو خالی چھوڑ دی جاتی تھی آجاتے تھے؟

ج: سارے نہیں آجاتے تھے، بلکہ ہم ضروری حصے لکھ لیتے تھے تاکہ انہیں یاد رکھ سکیں۔

مسٹر سلیم: آپ نے کہا ہے کہ کئی حالتوں میں آپ خالی صفحے چھوڑ دیتے تھے اس کا کیا سبب تھا؟

ج: جب ہمیں پتہ لگ جاتا تھا کہ گورنمنٹ نے مقدمہ چلانے کی اجازت دے دی ہے اب جگہ چھوڑ دیتے تھے۔

مسٹر سلیم : میرا سوال یہ ہے کہ جن تقریروں کے نوٹ لیتے وقت آپ نے خالی صفحہ نہیں چھوڑا، اس کا سبب کیا ہے ؟

ج : جن حالتوں میں تقریریں قابلِ اعتراض ہوتی ہیں، ان میں ہی خالی جگہ چھوڑی جاتی ہے۔

س : جگہ چھوڑنے کا فیصلہ آپ تقریر کے نوٹ لیتے وقت کرتے تھے یا بعد میں ؟

ج : تقریر کے دوران ہی میں جب اس نتیجے پر پہنچیں۔

چیف جسٹس : اب سوال یہ ہے کہ جب آپ لالہ ہوسٹل میں پہنچے تو کیا آپ کا خیال تھا کہ شاہ صاحب قابل اعتراض تقریر کریں گے ؟

لدھارام : مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ شاہ صاحب قابل اعتراض تقریر کریں گے یا نہیں۔

مسٹر سلیم : (ایک نوٹ بک جو کمرۂ عدالت میں موجود تھی گواہ کو دکھا کر) اس کتاب کے ۱۶ سے ۴۳ صفحات تک جو شارٹ ہینڈ نوٹ درج ہیں وہ کیا تمہارے لکھے ہوئے ہیں ؟

لدھارام : یہ بھی میرے لکھے ہوئے ہیں۔

س : جو کچھ آپ نے لانگ ہینڈ میں لکھا کیا وہ اس شارٹ ہینڈ کا ترجمہ ہے ؟

ج : جی ہاں! اس کتاب میں جو شارٹ ہینڈ نوٹ ہیں، ان کے مطابق لانگ ہینڈ نوٹ درست ہیں۔

س : کیا آپ نے سارے کے سارے شارٹ ہینڈ نوٹوں کا ترجمہ لانگ ہینڈ نوٹوں میں کیا تھا۔

چیف جسٹس : یہ سوال پوچھنے کی کیا ضرورت ہے ؟

مسٹر سلیم : یہ دیکھنے کے لیے کہ یہ ترجمہ صحیح ہے یا غلط (اس مرحلے پر پھر مسٹر سلیم نے یہی سوال دریافت کیا)

لدھارام : جی ہاں! جو کچھ میں نے شارٹ ہینڈ میں لکھا ہے اس کا ترجمہ سارے کا سارا لانگ ہینڈ نوٹوں میں کیا۔

مسٹر سلیم : کیا یہ وہی شارٹ ہینڈ نوٹ ہیں، جو آپ نے ۲۸۔جون کو ملزم کی تقریر کے لیے تھے ؟

لدھارام : یہ وہ نوٹ ہیں جو میں نے جلسے میں لیے تھے۔

جرح کی اجازت

اس مرحلے پر مسٹر سلیم نے درخواست کی کہ مجھے گواہ پر جرح کرنے کی اجازت دی جائے، کیونکہ گواہ منحرف ہو گیا ہے۔ میاں عبدالعزیز نے اعتراض کیا کہ اس مرحلے پر کوئی وجہ نہیں کہ گواہ کو منحرف قرار دیا جائے۔ کیونکہ یہ ثابت نہیں ہوا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ سچ بول رہا ہے۔ فاضل جج نے فیصلہ کیا کہ ایڈووکیٹ جنرل کو جرح کرنے کا حق ہے۔ میاں عبدالعزیز سے انہوں نے کہا کہ کسی گواہ کے منحرف ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے، ایک سچے گواہ کو بھی منحرف قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ اس نے استغاثہ کی مرضی کے مطابق بیان نہیں دیا، خواہ استغاثہ جھوٹا ہے یا سچا"۔ مسٹر سلیم نے گواہ پر جرح شروع کی۔

س : یہ شارٹ ہینڈ نوٹ آپ نے کہاں سے لیے ؟ جو آپ کہتے ہیں کہ اصلی نوٹ نہیں ہیں ؟

ج : میں نے لالہ موسیٰ سے واپسی پر گجرات میں پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مکان پر یہ شارٹ ہینڈ نوٹ لکھے جو مجھے دکھائے گئے ہیں۔ ۳۰۔جون کو جب میں نے یہ نوٹ لکھے تو پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مکان پر ایک اور آدمی راجہ خاں نائب محرر لالہ موسیٰ پولیس اسٹیشن بھی موجود تھا۔

س : آپ نے ان نوٹوں کو کہیں سے نقل کیا یا کسی نے لکھوائے تھے ؟

ج : پراسیکیوٹنگ انسپکٹر صاحب جو مجھے لکھاتے رہے ہیں، اسی کو شارٹ ہینڈ میں لکھتا گیا۔ میں پہلے لانگ ہینڈ ترجمہ پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے پاس پہنچا چکا تھا۔ اسی کو دیکھ

کر اس میں تبدیلیاں کر کے وہ مجھے لکھاتے رہے۔

س: کیا ان تبدیلیوں کے متعلق پراسیکیوٹنگ انسپکٹر نے اپنے پاس نوٹ لکھ کر رکھے ہوئے تھے یا وہ زبانی تبدیلیاں کراتے جاتے تھے؟

ج: اس وقت میرے لانگ ہینڈ نوٹس کے علاوہ اور بھی ایک کاغذ تھا لیکن مجھے یہ نہیں دکھایا گیا کہ اس کاغذ پر کیا لکھا ہوا تھا۔ لیکن اتنا نظر آ رہا تھا کہ اس پر کچھ لکھا ہوا ہے۔ دوسری طرف سے انگریزی کے ٹائپ شدہ حروف نظر آ رہے تھے۔ لکھاتے وقت وہ دوسرے کاغذ کی طرف بھی دیکھتے جاتے تھے۔ شارٹ ہینڈ کے بعد پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مکان پر لانگ ہینڈ بک کا ترجمہ بھی لکھا گیا۔ لانگ ہینڈ ترجمہ علیحدہ کاغذ پر بھی لکھا۔ اسی دن پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مکان پر نوٹ بک پر لانگ ہینڈ لکھنے کے بعد علیحدہ کاغذ پر لانگ ہینڈ ترجمہ کی نقل کی۔ دوسری دفعہ جب لانگ ہینڈ کی نقل کی گئی تو کاربن پیپر کے ذریعے دو کاپیاں بنائی گئیں۔ ایک اصل اور دو کاربن والی کاپیاں، دوسری نوٹ بک پر جو بعد میں تیار کی گئی۔ میرے سامنے گواہوں نے دستخط نہیں کیے اصل نوٹ بک جس میں جلسے کی تقریر کے نوٹ تھے، پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے سامنے میز پر رکھی ہوئی تھی وہ شارٹ ہینڈ نوٹ اور لانگ ہینڈ ترجمہ پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے سامنے چھوڑ گیا تھا۔

نوٹ بک جلادی گئی

اصلی شارٹ ہینڈ نوٹ بک میرے سامنے پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مکان پر جلادی گئی، اور اصلی نوٹوں کے لانگ ہینڈ نوٹوں کے ترجمے کو بھی میرے سامنے جلادیا گیا، یہ پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کا رہائشی مکان تھا۔ میٹنگ سے پہلے ہی مجھے ہدایت دی گئی تھی کہ پیر غازی میں جس تقریر کے شارٹ ہینڈ نوٹ لینے مقصود ہیں ان نوٹوں کے درمیان وقفے چھوڑ دینا۔ ہدایات کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا کہ پنجاب کے وزیر اعظم کی ایک چٹھی سپرنٹنڈنٹ پولیس گجرات کو موصول ہوئی ہے جس میں انہوں نے

لکھا ہے کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری آپ کے علاقے میں آ رہا ہے، وہ یونینسٹ پارٹی کے خلاف منافرت پھیلانے آ رہا ہے۔ اس کی تقریر اس طریقے پر لی جائے کہ دفعات ۱۲۴-۱۱۷ اور ۱۵۳ کی زد میں آ جائے۔ تقریر کے شارٹ ہینڈ نوٹ لینے پر ایسے شخص کو لگایا جائے جو تعلیم یافتہ ہو، اور گواہ بھی ایسے ہونے چاہییں جو پولیس کے زیر اثر ہوں۔"

ایک اور سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ:

ایک چٹھی ایسی تھی جس پر سپرنٹنڈنٹ پولیس اور پراسیکیوٹنگ انسپکٹر نے میرے دستخط کرائے، وہ چٹھی ہدایات سے متعلق تھی اور دستخط اس لیے کرائے تھے کہ میں بعد میں یہ نہ کہہ سکوں کہ ہدایات نہیں ملی تھیں۔ جس خط پر وزیر اعظم کی ہدایات تھیں وہ مجھے نہیں دکھایا گیا تھا، پہلی دفعہ مجھے ۲۰ جون سے دو تین ہفتے پہلے ہدایات دی گئی تھیں۔ ۲۸ جون کو جب میں تقریر کی رپورٹ کے لیے لالہ موسیٰ روانہ ہونے والا تھا تو مجھے بلا کر کہا گیا کہ تقریر کی رپورٹ جلد از جلد لے کر شارٹ ہینڈ نوٹ پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے پاس پہنچا دوں۔ جب دو یا تین ہفتے پہلے ہدایات دی گئیں اس وقت مجھے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے بلایا تھا۔ پراسیکیوٹنگ انسپکٹر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس انگریزی میں بات کرتے تھے۔ تھوڑی بہت انگریزی میری سمجھ میں آتی تھی باقی نہیں آتی تھی۔ پھر پراسیکیوٹنگ انسپکٹر نے ایس۔ پی کی موجودگی میں ہدایات دیں کہ پیر غازی (لالہ موسیٰ) میں میٹنگ ہونے والی ہے۔ وہاں سید عطاء اللہ شاہ بخاری تقریر کرنے والے ہیں۔ اس کی تقریر کے شارٹ ہینڈ نوٹ لیتے وقت خالی جگہیں چھوڑتے جانا۔

س : کیا اس وقت آپ کو بتلایا گیا تھا کہ شارٹ ہینڈ نوٹوں میں جگہیں کیوں چھوڑنی ہیں۔

ج : اس وقت تک مجھے نہیں بتایا گیا تھا کہ یہ جگہیں کیوں چھوڑنی ہیں۔ لیکن یہ بات تو ہر آدمی سمجھ سکتا ہے کہ جب سپرنٹنڈنٹ پولیس سمجھ چکے تھے تو مجھے ہدایات دی گئیں۔ پیر غازی جو جلسہ ہونے والا ہے اس کے نوٹوں میں خالی جگہ رکھی جائے۔

ایک سوال پر گواہ نے کہا کہ جگہ شارٹ ہینڈ نوٹوں میں چھوڑنی تھی۔

س : کیا یہ ہدایات دی گئی تھیں کہ جہاں آپ کا خیال ہو جگہ چھوڑ دو یا کوئی خاص جگہ چھوڑنے کے لیے کہا گیا تھا۔

ج کہیں ایک لائن کہیں دو لائنیں۔

س : میرا سوال یہ ہے، کیا یہ قطعی سہولت دی گئی تھی کہ کس طرح جگہ خالی چھوڑی جائے ؟

ج : نہیں! خاص طریقے کی ہدایت نہیں دی گئی تھی۔

س : یہ ہدایات کس کی تقریروں کے متعلق تھیں ؟

ج : سید عطاء اللہ شاہ کی تقریر کے متعلق۔

س : تقریر کہاں کرنی تھی ؟

ج : پیر غازی میں۔

س : کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ کو جگہ چھوڑنے کے متعلق کیوں ہدایت کی گئی تھی ؟

ج : مجھے پتہ نہیں۔

س : آپ کو پتہ نہیں تھا اور آپ نے کسی سے خیال بھی ظاہر نہیں کیا ؟

ج : نہیں۔

س : آپ قیاس بھی نہیں کر سکتے تھے ؟

ج : قیاس تو ہر شخص کر سکتا ہے ایک معمولی سا ملازم بھی۔

عدالت سے تحفّظ کی درخواست

س : کیا پہلا موقع تھا جب آپ نے اس طرح خالی جگہ چھوڑی ؟

ج : اگر عدالت مجھے تحفّظ دے تو میں اس سوال کا جواب دے سکتا ہوں۔

چیف جسٹس : آپ کو تحفّظ دیا جاتا ہے، لیکن اگر ہمیں خیال ہوا کہ آپ کا جواب غلط ہے تو مقدمہ چل سکتا ہے، اگر درست ہوا تو نہیں۔

لدھارام: میری عرض یہ ہے کہ میں جن واقعات کے متعلق جواب دوں گا، اس میں مقدمہ چل کر سزا ہو سکتی ہے۔

مسٹر سلیم، مائی لارڈ، میری درخواست ہے کہ یہ کارروائی میں لکھا جائے کہ گواہ کو مجبور کیا گیا کہ وہ اس سوال کا جواب دے۔ اس میں سب کچھ آجاتا ہے۔

میاں عبدالعزیز: لیکن اس صورت میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گواہ جواب دینے سے انکار کر دے۔

چیف جسٹس، محض یہ سوال دریافت کیا جائے کہ کیا گواہ کو پہلے بھی یہ ہدایت ملی تھی۔

مسٹر سلیم نے یہی سوال کیا جس کے جواب میں گواہ نے کہا کہ مجھے اس سے پہلے بھی اسی طرح کی ہدایات ملی تھیں۔

مسٹر سلیم: آپ کو ہدایات کب ملی تھیں؟

اس مرحلے پر وکیل صفائی میاں عبدالعزیز نے درخواست کی کہ اس سوال کے جواب میں گواہ کو تحفظ دیا جائے۔

چیف جسٹس، یہاں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ گواہ پہلے کہہ چکا ہے کہ اسے پہلے بھی ہدایات ملتی رہی ہیں۔

میاں عبدالعزیز: لیکن اس معاملہ میں گواہ کو ضرور تحفظ ملنا چاہیے۔

چیف جسٹس، صرف اس خاص سوال کے جواب میں تحفظ دیا جائے گا۔

مسٹر سلیم، (گواہ سے) سید بخاری کے جلسے کے متعلق آپ کو جو ہدایات دی گئی تھیں کیا اس وقت بھی کوئی چیٹھی آئی تھی؟

ج: چیٹھیاں تو کئی آتی رہتی ہیں۔

مسٹر جسٹس رام لال، کیا اس خاص جلسے کے متعلق کوئی چیٹھی دکھائی تھی؟

لدھارام: جی ہاں۔

مسٹر سلیم : اصلی چھٹی دکھائی گئی تھی یا اس کی نقل ؟

ج : اس کا ترجمہ ، کیونکہ اس پر لکھا ہوا تھا یہ بہت خفیہ ہے ۔

ایک اور سوال کے جواب میں گواہ نے کہا ۔ میں نے اصلی خط نہیں پڑھا بلکہ نقل جو سپرنٹنڈنٹ پولیس کا ریڈر اپنے رجسٹر میں درج کرتا ہے اوہی پڑھی ۔

مسٹر سلیم : رجسٹر میں جو درج تھا اس میں کیا لکھا تھا ؟

ج : مجھے یاد نہیں رہا جو کچھ مجھے یاد ہے وہ کہہ چکا ہوں اور وہ یہ کہ جگہ خالی رکھی جائے اور تقریر کے نوٹوں کی ایک کاپی پراسیکوٹنگ انسپکٹر کو دی جائے ۔

مسٹر جسٹس رام لال : کیا سارا رجسٹر پڑھا تھا یا محض وہ نقل ؟

ج : ترجمہ جو کچھ تھا وہ پڑھا ، اور اس خط کے نمبر بھی علیحدہ نوٹ کر لیے ۔

ایک اور سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ میں نے جو کچھ لکھا تھا وہ مستقبل میں اپنی رہنمائی کے لیے لکھا تھا ۔ ایک اور سوال کے جواب میں کہا کہ میں نے یہ نقل ریڈر کے ذریعے سپرنٹنڈنٹ پولیس کی اجازت سے لی تھی ۔ اور میں اسی طرح اکثر نقل لیا کرتا تھا ۔

چیف جسٹس : آپ نے جس تحریر کی نقل لی تھی وہ بہت تھوڑی تھی یا زیادہ ؟

گواہ : کچھ خط تھے جن پر تھوڑی تھوڑی عبارت تھی ۔

چیف جسٹس : دس دس سطریں یا بیس بیس سطریں ۔ تم نے کتنی دیر میں نقل کیں ؟

لدھارام : تین چار منٹ میں ، میں نے پیر غازی کے جلسے کے متعلق ہدایات نقل کیں ۔

چیف جسٹس : کیا سپرنٹنڈنٹ پولیس اس وقت موجود تھے ؟

گواہ : وہ دوسرے کمرے میں بیٹھے تھے ۔

مسٹر سلیم : مطلب یہ ہوا کہ بعض اوقات نقل کرتے وقت سپرنٹنڈنٹ پولیس موجود ہوتے تھے اور بعض اوقات نہیں ۔

گواہ : کئی اوقات ریڈر کو ہدایت کی جاتی تھی کہ دوسرے کمرے میں لے جائے ۔

خفیہ رجسٹر

چیف جسٹس: یہ رجسٹر بہت خفیہ ہے؟
گواہ: جی ہاں۔

چیف جسٹس، اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کو نہیں بتایا جاتا تھا؟

گواہ: جس کے متعلق ہدایت ہوتی تھی اسے بتا دیا جاتا تھا۔

چیف جسٹس: سوال یہ ہے کہ ایک سترہ روپیہ ماہوار تنخواہ پانے والے کانسٹیبل کو سپرنٹنڈنٹ پولیس وہی خفیہ تحریریں کیونکر دکھا سکتے ہیں؟

گواہ: میں چند اور باتیں بھی اس سلسلے میں بیان کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ وہ کام میں نے کرنا تھا۔

مسٹر سلیم، آپ نے کہا تھا کہ آپ نقل کرتے وقت نمبر بھی نقل کر لیتے تھے۔ یہ کیوں؟

گواہ، اس کے متعلق نقل کرتے وقت کوئی خیال نہیں ہوتا۔

س: جو نقل آپ کے پاس تھی اس کے متعلق آپ کو ہدایت تھی کہ اسے محفوظ رکھا جائے یا نہیں؟

ج: اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جاتا تھا۔

چیف جسٹس، سوال یہ ہے کہ جب تم نقل کر لیتے تھے تو کیا یہ بتلایا جاتا تھا کہ اسے جس طرح چاہو استعمال کرو، اسے اپنے پاس رکھو یا نہیں؟

میاں عبدالعزیز: (اٹھ کر) اس وقت گواہ ان کے اعتماد میں تھا۔

گواہ: جو کچھ میرے متعلق لکھا ہوتا تھا، اس کے متعلق ہدایت ہوتی تھی کہ اپنی یادداشت کے لیے نقل کر لو۔

س: جب آپ کو چٹھی دکھائی جاتی تھی یا ہدایت دی جاتی تھی، تو ہمیشہ اس کی نقل دی جاتی تھی؟

ج: میں ہمیشہ نقل کر لیتا تھا۔ ایک اور سوال پر گواہ نے کہا کہ میں نقل اپنے ساتھ لے جاتا تھا اور محفوظ رکھتا تھا۔

لکڑی کا بکس

مسٹر سلیم: تو ہم فرض کرتے ہیں کہ کئی مقدمات کے متعلق بھی ہدایات کی نقلیں آپ کے پاس ہوں گی؟

ج: جی ہاں! میرے پاس پولیس اسٹیشن گجرات میں ہیں، جنہیں میں اپنے رہائشی کوارٹر میں اپنے ایک صندوق میں چھوڑ آیا ہوں۔

چیف جسٹس: اسے تالا لگا یا تھا؟

گواہ: تالا لگایا تھا، مگر وہ پہلے سے ہی خراب تھا۔ قریباً تین چار ماہ پہلے سے۔

چیف جسٹس: کیا ان کاغذات کو خفیہ رکھنے کے لیے بکس ملا تھا؟

گواہ: جی ہاں۔

گواہ نے ایک اور سوال کے جواب میں کہا کہ اس صندوق میں لکڑی کا ایک چھوٹا سا بکس تھا، جس میں وہ کاغذات رکھے ہوئے تھے۔ اس میں تالا لگا ہوا تھا۔ اس کی چابی ابھی تک میرے پاس ہے۔

چیف جسٹس: لاؤ دیکھیں۔

لدھارام، نے اپنی جیبیں ٹٹولنے کے بعد کہا کہ "میں نے اپنی تمام چابیاں اپنے ایک دوست خواجہ کو دی ہوئی ہیں، وہ یہیں موجود تھے"۔ اس کے بعد خواجہ کو (جس کا پہلا نام گواہ نہیں جانتا تھا) بلایا گیا۔ اس نے چابیاں گواہ کو دیں۔ گواہ نے چابیاں چیف جسٹس کو دے دیں اور اس بکس کی چابی بتائی۔ گواہ نے یہ بھی بتایا کہ خواجہ سے میری گذشتہ پندرہ بیس دن کی واقفیت ہے۔ مزید کہا کہ جلال الدین ہیڈ کانسٹیبل کے پاس بھی اس بکس کی اسی طرح کی چابی ہے۔ اس کے بعد گواہ کو کچھ دستاویزات دکھائی گئیں۔ انہیں دیکھ کر گواہ نے ایک پیرا دیکھ کر کہا کہ یہ پیرا میں نے رجسٹر سے نقل کیا تھا۔

مسٹر سلیم: اس سے پہلے جو سی۔ آر۔ پی لکھا ہے، اس سے کیا مراد ہے؟

گواہ: مجھے معلوم نہیں۔

چیف جسٹس ، شاید اس کا مطلب کانفیڈینشل رپورٹ آف پولیس ہے۔

خُفیہ جھوٹ

مسٹر سلیم : کسی پر سی ایل پی لکھا ہوتا ہے۔

چیف جسٹس ، (ازراہ مذاق) کانفیڈینشل لائز (جھوٹ) ہو سکتا ہے (قہقہہ)

اس مرحلے پر چیف جسٹس نے میاں عبدالعزیز سے کہا کہ "کہ آپ اپنی جرح میں اس بات کو ضرور معاف کیجئے کہ اس قدر خطرناک اور کانفیڈینشل ہدایات کو ایک سترہ روپے کے کانسٹیبل کو نقل کر کے ساتھ لے جانے کی اجازت کس طرح دی گئی۔ ہمیں اس کا یقین نہیں ہوتا"

میاں عبدالعزیز : نے کہا "مائی لارڈ! میں اس بات کا خیال رکھوں گا"

گواہ نے مسٹر سلیم کی مزید جرح کے جواب میں کہا کہ :

"۲۸ - جون کو میں ہدایت حاصل کر کے پیر خاںزی والی تقریر کے نوٹ لینے گیا تھا۔ ہدایات مجھے پراسیکیوٹنگ انسپکٹر نے گجرات میں دی تھیں ۔ ایس ۔ پی اپنے کمرہ میں ہو گا ۔ لیکن اس وقت ہم دونوں کے سوائے کوئی وہاں موجود نہ تھا۔ اس وقت مجھے یہی ہدایات دی گئی تھیں کہ تقریر کے نوٹ لیتے ہی پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے پاس واپس آنا۔ اس کے علاوہ اس دن مزید ہدایات نہیں دی گئی تھیں ۔ لیکن مجھے یہ معلوم تھا کہ تقریر FABRICATE ہو گی ۔ کیونکہ ایسی باتیں تو قیافہ سے ہی معلوم ہوتی ہیں ۔ اس سے پہلے مجھے کہا جا چکا تھا کہ جگہ خالی چھوڑوں یا نہ چھوڑوں ۔ مجھے محض یہ ہدایت تھی کہ جس وقت نوٹ لے آؤں فوراً پراسیکیوٹنگ افسر کے مکان پر پہنچ جاؤں ۔

مسٹر سلیم : اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ کو یہ ہدایت نہیں کی گئی تھی جس سے یہ معلوم ہو کہ اس میں بناوٹ کی جائے گی ؟

ج : مجھے پہلے ہی پتہ تھا کہ اس میں بناوٹ کی جائے گی ۔

س : کیا آپ کو شبہ تھا یا بتایا گیا تھا؟

ج : ایسی باتیں ہمیشہ ہوتی رہتی ہیں، مجھے بتایا نہیں گیا تھا۔

س : کیا اس تقریر کے متعلق خاص ہدایت کی گئی تھی؟

ج : مجھے فون پر بلا کر ہدایت کی گئی تھی کہ لانگ ہینڈ نوٹ نہ کرنا۔

س : کیا یہ بتایا گیا تھا کہ کوئی خالی جگہ نہ چھوڑنا؟

ج : مجھے نہیں بتایا گیا تھا۔

س : جس نوٹ بک میں آپ نے نوٹ لیے وہ گجرات سے لی تھی؟ — جب آپ لالہ موسیٰ گئے تھے کیا آپ کو خیال تھا کہ نوٹ بک چلائی جائے گی؟

س : کیا آپ کو یہ ہدایات دی گئیں کہ فوراً آجائیں؟

ج : مجھے یہ ہدایت تھی کہ جتنی جلدی فارغ ہو جاؤ واپس آجانا۔

س : کب فارغ ہو گئے تھے؟

ج : اور بھی کئی تقریریں تھیں۔ شہزادہ آزاد نے بھی تقریر کی تھی اس لیے دوسرے دن شام کو فارغ ہوا۔

س : ۲۸۔ جون کی شام کو آپ نے کس وقت تقریر کے نوٹ لیے؟

ج : مجھے یاد نہیں — ایک اور سوال کے جواب میں کہا کہ غالباً دونوں شہروں میں دس گیارہ میل کا فاصلہ ہے۔

س : کیا جس رات نوٹ لیے تھے اس رات سوئے بھی تھے؟

ج : جی ہاں! میں تھانہ لالہ موسیٰ میں سویا تھا۔ وہاں اور سپاہی بھی تھے، جنہوں نے مجھے کہا تھا کہ شاید کل جلسہ ہو۔ اس لیے مجھے لالہ موسیٰ ہی میں ٹھہرنا چاہیے (اس مرحلے پر کارروائی لنچ کے لیے ملتوی ہو گئی)

لنچ کے بعد کارروائی شروع ہوئی تو مسٹر سلیم نے جرح جاری رکھتے ہوئے ادھارام سے پوچھا؛

س : ۲۸-جون کے جلسے میں جس میں عطاء اللہ شاہ بخاری نے تقریر کی، کیا آپ نے کسی دوسری تقریر کے نوٹ لیے؟

گواہ : جی ہاں! میں نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر کے علاوہ ایک دو اور اصحاب کی تقریروں کے نوٹ لیے جن کے نام مجھے یاد نہیں۔

س : جب آپ نے نوٹ لیے اس وقت دن کچھ باقی تھا؟

ج : نہیں، جلسہ رات نو بجے کے بعد شروع ہوا۔

س : کیا ان تقریروں کے نوٹ اسی نوٹ بک میں لیے تھے؟

ج : جی ہاں۔

س : کیا آپ نے دوسرے دن یعنی ۲۹-جون کو کسی اور تقریر کے نوٹ لیے تھے؟

ج : نہیں۔

مسٹر جسٹس رام لال: کیا اس دن لالہ موسیٰ میں کوئی جلسہ تھا؟

ج : ایک جلسہ تھا مگر اسے ملتوی کر دیا گیا تھا۔

مسٹر سلیم: آپ لالہ موسیٰ سے گجرات کب گئے؟

ج : ۲۹-جون کی شام یا ۳۰-جون کی صبح، لیکن مجھے ٹھیک یاد نہیں۔ کیونکہ اس واقعے کو آٹھ، نو ماہ کا عرصہ ہو چکا ہے۔

س : آپ نے پہلے کہا تھا کہ آپ کو ہدایت ہوئی تھی کہ تقریریں نوٹ کرنے کے بعد فوراً پہنچو، تو کیا آپ کو یاد نہیں کہ ۲۹-جون کی شام کو گئے یا ۳۰-جون کی صبح کو؟

گواہ : مجھے یاد نہیں۔ لیکن یہ یاد ہے کہ ۳۰-جون کو پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے پاس گیا تھا۔

مسٹر سلیم: اگر آپ ۲۹-جون رات کو گجرات جاتے تو کہاں رہتے؟

ج : گجرات جاتا تو تھانہ میں رپورٹ دے کر وہیں رہتا۔

س : پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے پاس کس وقت گئے؟

ج : دوپہر کے بارہ بجے کے بعد، مجھے ٹھیک یاد نہیں۔ غالباً تین اور چار بجے کے درمیان گیا ہوں گا۔

س : جب آپ پراسیکیوٹنگ انسپکٹر سے ملے تو کیا نوٹ بک جس میں آپ نے ان تقریروں کے نوٹ لیے تھے، وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے اور اسے پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے حوالے کر دیا تھا ؟

ج : جی ہاں !

س : جب آپ نے نوٹ بک حوالے کی تو کیا شارٹ ہینڈ نوٹ پڑھ کر سنائے تھے یا لانگ ہینڈ میں لکھ کر ؟

ج : میں نے لانگ ہینڈ نوٹ بنائے اور اس کے بعد انہیں انسپکٹر کو پیش کر دیا۔

س : کیا ان کی موجودگی میں لانگ ہینڈ نوٹ تیار کیے ؟

ج : جی ہاں، پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کی موجودگی میں تیار کیے۔

س : جب آپ نے لانگ ہینڈ نوٹ بنائے تو کیا آپ کی موجودگی میں انہوں نے پڑھا ؟

ج : جی ہاں۔

س : کیا انہوں نے پڑھنے کے بعد کہا کہ یہ تسلی بخش نہیں ہے یا ہے ؟

ج : انہوں نے کہا کہ جو کچھ میں بولوں، اس کے نئے سرے سے شارٹ ہینڈ نوٹ لکھو۔
ایک اور سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ پراسیکیوٹنگ انسپکٹر نے میرے لانگ ہینڈ نوٹ دو تین مرتبہ پڑھے اور اس کے بعد لکھانا شروع کیا۔

س : آپ نے جو نوٹ لکھے ان میں کتنا عرصہ لگا ؟

ج : قریباً چھ سات گھنٹے ـــ ایک اور سوال کے جواب میں کہا کہ شارٹ ہینڈ نوٹ لکھوانے اور لانگ ہینڈ نوٹ بنوانے کے لیے پہلے شارٹ ہینڈ نوٹ بک جلائی گئی تو دوسری تقریروں کے متعلق کیا ہوا ؟ گواہ نے کہا کہ اگر کورٹ مجھے تحفظ دے تو میں جواب

دے سکتا ہوں۔ کیونکہ ان کے سلسلے میں عدالت فیصلہ دے چکی ہے۔

میاں عبدالعزیز: دوسرے مقدمے میں جو شہزادہ آزاد کے خلاف ہوا گواہ پر جرح ہوئی ہے، اس لیے گواہ کی درخواست ہے کہ اگر وہ اس کے متعلق یہاں جو بھی بیان دے گا وہ اس کے خلاف استعمال نہیں کیا جائے گا۔ اس پر گواہ نے کہا کہ جو شہادت میں نے جہلم میں شہزادہ آزاد کے خلاف دی تھی وہ پراسیکیوٹنگ افسر کے کہنے پر دی تھی۔

مسٹر سلیم: سوال یہ نہیں۔ سوال یہ ہے کہ دوسری تقریروں کے نوٹوں کے متعلق کیا کیا گیا؟

گواہ: ان پر دستخط بھی تھے۔

چیف جسٹس: سوال یہ ہے کہ اس نوٹ بک میں دوسری تقریروں کے نوٹ بھی تھے۔ جب اس نوٹ بک کو جلا دیا گیا تو ان تقریروں کے نوٹوں کا کیا بنا؟

گواہ: انہیں بھی دوبارہ لیا گیا، اسی لیے تو سات گھنٹے صرف ہوئے تھے۔

مسٹر سلیم: جب آپ سید صاحب کی تقریر کے نوٹوں کا ذکر کر رہے تھے، تو دوسری تقریروں کا ذکر کیوں نہیں کیا؟

گواہ: اسی لیے کہ میں پروٹیکشن لینے کے بعد ہی کروں گا۔

س: جو جو تقریریں ہوئیں کیا ان سب کو دوبارہ نوٹ بک میں لیا گیا تھا؟

گواہ: جی ہاں۔

س: جب آپ نے ان تقریروں کو دوبارہ کر لیا تو کیا انہیں اصل کے مطابق لیا یا ان میں بھی تبدیلی کرائی گئی؟

گواہ: اگر مجھے یقین دلایا جائے کہ اس بیان پر میرے خلاف مقدمہ نہیں چلے گا تو میں بتا سکتا ہوں۔

میاں عبدالعزیز: یہ حفاظت تو پہلے دی جا چکی ہے۔

گواہ : کچھ لفظ سید عطاء اللہ شاہ کی تقریر کے نکال کر شہزادہ آزاد کی تقریروں میں ڈال دیئے گئے تھے۔

چیف جسٹس : تاکہ شہزادہ آزاد کو سزا ہو جاتی ــــ تو کیوں یہ لفظ ان کی تقریر میں ڈالے گئے؟

گواہ : اس لیے کہ اگر ساری تقریر کو بنایا جاتا تو یہ خیال ہوتا کہ بناوٹی ہے۔ شہزادہ آزاد کی تقریر میں یہ الفاظ کہ "ٹوانوں نے ہزاروں روپوں کے کتے خریدے" نکال کر سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر کے نوٹوں میں ڈال دیئے گئے ــــ ایک اور سوال کے جواب میں کہا، کہ اس ڈائری میں جو جعلی بنائی گئی، اگر سارے قابلِ اعتراض الفاظ ڈالے جاتے تو معلوم ہوتا کہ ساری جعلی ہے، اس لیے وزارت کے متعلق بھی کچھ حصہ ملا دیا گیا۔ کیونکہ خط میں لکھا ہوا تھا کہ سید عطاء اللہ شاہ، یونینسٹ پارٹی کے خلاف پروپیگنڈا کر رہا ہے۔

مسٹر سلیم : آپ کا یہ خیال ہے کہ ایک تقریر کے چند حصے دوسری تقریر میں ڈالے گئے تاکہ یہ معلوم نہ ہو کہ ساری تقریر جعلی ہے۔

گواہ : جعلی نظر نہ آتے اور دوسرے یہ کارکردگی دکھانے کے لیے کہ میں یونینسٹ وزارت کا اتنا ہمدرد ہوں۔

چیف جسٹس : وہ الفاظ جو شہزادہ آزاد کی تقریر سے نکال کر سید عطاء اللہ شاہ کی تقریر میں ڈالے گئے وہ قابلِ اعتراض تھے یا نہیں؟

گواہ : ہو سکتا ہے۔

چیف جسٹس : جو الفاظ سید صاحب کی تقریر سے نکال کر آزاد کی تقریر میں ڈالے گئے وہ قابلِ اعتراض تھے یا نہیں؟

گواہ : ہوں گے، مجھے پتہ نہیں۔

چیف جسٹس : کیا آپ کے خیال میں دونوں نے قابلِ اعتراض تقریریں کی تھیں؟

گواہ : نہیں

چیف جسٹس : ہوسکتا ہے تمام تقریریں قابلِ اعتراض نہ ہوں، چند الفاظ ہی قابلِ اعتراض ہوں؟

گواہ : جہاں تک میرا خیال ہے نہیں۔

چیف جسٹس : اگر نہیں تو ایک تقریر کے الفاظ دوسرے کی تقریر کے الفاظ میں کیوں ڈالے گئے؟

گواہ : ایک آدھ لفظ ایک تقریر سے لیا جاتا تھا اور کچھ اپنے پاس سے ملا لیا جاتا تھا۔

مسٹر جسٹس رام لال : یعنی پورے جملے نہیں، بلکہ چند الفاظ ہی ملائے جاتے تھے؟

گواہ : جی ہاں۔

مسٹر سلیم : آپ نے کہا تھا یہ دستخط جو اس کے نیچے ہیں آپ کی موجودگی میں نہیں کیے گئے تو پھر کس نے کیے تھے؟

گواہ : یہ ان لوگوں کے دستخط تھے جو میں نے بتائے ہیں یا پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے کہنے پر مقبول حسین شاہ کو بلوایا گیا تھا، اس نے اپنے دستخط کیے اور دوسرے فیروز خاں کے نام پر اس نے خود دستخط کیے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کون سے دستخط کیے تھے، لیکن یہ یاد ہے کہ دونوں میں سے ایک میں نے کیے۔

مسٹر سلیم : فیروز خاں کو کیوں نہیں بلایا گیا؟

گواہ : وہ مل نہیں سکا تھا۔

س : مقبول حسین کب آیا؟

ج : جس دن یہ نوٹ تیار کیے گئے اس کے تین چار دن بعد گجرات سے آیا تھا۔

س : اس دوران میں یہ مبیّنہ جعلی ڈائری کس کے پاس رہی؟

ج : پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے پاس۔

مسٹر جسٹس رام لال : آپ کو کب واپس ملی؟

گواہ : دس پندرہ دن کے بعد۔

چیف جسٹس : جب آپ کو پہلی دفعہ جعلی دستاویز کے لیے کہا گیا تو کیا آپ نے پروٹسٹ کیا؟
گواہ : جی ہاں! میں نے پروٹسٹ کیا تھا، لیکن میرے ساتھ ایک کانسٹیبل تھا، جس نے ایک دفعہ غلطی کی تھی تو اسے معطل کر دیا گیا تھا۔

خودکشی کا ارادہ

چیف جسٹس : کیا تم نے درخواست میں کہا تھا کہ میں جھوٹی شہادت دینا نہیں چاہتا؟

گواہ : اگر میں لکھتا تو نہ معلوم مجھے کیا دھکے کھانے پڑتے، اور نہ معلوم پولیس مجھ سے کیا سلوک کرتی — اس مرحلے پر مسٹر سلیم نے ایک سوال دریافت کرنا چاہا، جس پر لدھا رام نے کہا کہ میری ایک اور درخواست بھی ہے، میں تہیہ کیے ہوئے تھا کہ شہادت دینے کے بعد خودکشی کروں گا۔ اس کے لیے میں نے سنکھیا خریدا۔ آپ بے شک اس دکان سے دریافت کر سکتے ہیں۔ میرے والد، میری والدہ اور گھر کے تمام آدمیوں کو اس کا علم ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ میرے دل میں کیا تھا۔

مسٹر سلیم : یہ تو معمولی بات تھی کہ جھوٹی شہادت نہ دو اور خودکشی نہ کرو۔

گواہ : جی ہاں، بات معمولی تھی۔ لیکن مجھے پتہ تھا کہ اگر وہاں آواز پہنچاتا تو اس عدالت میں بھی جہاں میری آواز پہنچ رہی ہے پہنچ نہ سکتی۔

مسٹر جسٹس رام لال : یہ پولیٹیکل پلیٹ فارم نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر تمہارا ضمیر بیدار تھا تو تم نے یہ فیصلہ کیوں نہیں کیا کہ سچ بولوں گا؟

گواہ : اس لیے تو میں اب سچ بولنے پر مجبور رہا ہوں۔

میاں عبدالعزیز : پوزیشن یہ ہے کہ اس وقت پروٹسٹ نہیں کیا، کیوں کہ پیٹ کا فکر تھا۔ ماتحت عدالت میں مشکل تھا، اس لیے اب عدالتِ بالا میں اسے ہمت ہو گئی کہ سچ بولے۔

مسٹر سلیم، نے گواہ پر جرح جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔ اس نوٹ بک میں جو آپ کے

خیال میں جعلی ہے کیا بعد میں اور تقریروں کے نوٹ بھی لیے تھے؟

گواہ : جی ہاں۔

مسٹر سلیم : پہلے بھی اس میں نوٹ تھے؟

گواہ : مجھے خیال نہیں۔

س : جب آپ کو یہ نوٹ بک دی گئی تو کیا آپ کو یہ خیال نہیں کہ ساتھ کچھ صفحے لکھے ہوئے تھے؟

ج : صفحے تھے جو پھاڑ دیے گئے اور یہ دیکھے جا سکتے ہیں۔

س : مطلب یہ کہ جب آپ کو یہ نوٹ بک دی گئی اس وقت اس میں شارٹ ہینڈ کے نوٹ تھے؟

ج : جی ہاں کچھ لکھا تھا۔

س : یہ نوٹ آپ نے لکھے تھے یا کسی اور نے؟

ج : میرے ہی تھے۔

س : کب پھاڑے گئے، آپ کی موجودگی میں۔

ج : جی ہاں۔

س : پھاڑنے کے بعد جو صفحے بچے کیا وہ خالی تھے؟

ج : جی ہاں۔

س : جو صفحے خالی بچے، انہیں کیوں نہیں پھاڑا گیا؟

ج : ان میں تاریخوں کی ردوبدل تھی، ان کی تاریخیں بہت پہلے کی تھیں، اس کے بعد بھی کئی تقریروں کے نوٹ لیے جا چکے تھے، کئی نوٹ بکیں جل چکی تھیں۔

س : آپ نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے نوٹ اسی پر کیوں نہیں لیے، نئی کاپی کیوں لی؟

ج : نئی کاپی اس لیے لائی گئی تھی کہ جعلی رپورٹ بنائی جاتی تھی۔

س : گویا یہ شبہ آپ کو تھا؟

ج : میرا بھی خیال تھا اور عام طور پر ایسا ہو ہی جاتا ہے۔

س : گویا شک ہونے پر آپ نے کہا تھا کہ ایسا نہ کرو نئی کتاب لاؤ۔

ج : میں نے نہیں کہا تھا۔

س : گویا یہ خیال آپ نے دل میں رکھا؟

ج : نہیں۔

س : اس کا مطلب کیا ہوا؟

ج : خیال تھا کہ اس راز سے کیا ظاہر ہوتا ہے، اس لیے جو بھی کاپی آئے اسے لگا لیا جائے۔

س : گویا وہاں بہت سی کاپیاں پڑی ہوئی تھیں؟

ج : کورٹ انسپکٹر کے پاس نہیں۔ انگلش سٹینو گرافر کے پاس ہوتی ہیں۔

س : مگر آپ کورٹ انسپکٹر کے گھر گئے تھے وہاں کاپیاں پڑی ہوئی تھیں۔

ج : نہیں، وہاں ویر سنگھ اسٹینو گرافر کو بلایا گیا کہ ایک نوٹ بک لاؤ۔

س : کیا اسے بتایا گیا تھا کہ کیوں نوٹ بک لاؤ؟

ج : نہیں۔

س : گویا وہ ایک نوٹ بک لے آیا؟

ج : تین چار نوٹ بکیں لے آیا۔

س : کیا وہ خالی تھیں؟

ج : کئی خالی تھیں اکئی لکھی ہوئی۔

س : کیا کوئی ایسی تھی جو بالکل خالی تھی، اور جس میں نوٹ لکھے ہوئے نہیں تھے؟

ج : میں نے تین کاپیاں دیکھی تھیں۔ ایک کے متعلق پراسیکیوٹنگ انسپکٹر نے کہا کہ یہ

موزوں ہے۔ میں نے دوسری کو دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

س : (نوٹ بک دکھا کر) کہاں سے کاغذ پھاڑ لیے گئے تھے ؟

ج (دیکھ کر) شروع سے پھاڑ لیے گئے تھے۔

س : یہ صفحے کس نے پھاڑے تھے ؟

ج : میں نے خود اس دن پھاڑے تھے۔

س : آپ کہتے ہیں کہ اس کتاب میں اور تقریروں کے نوٹ بھی ہیں وہ جعلی ہیں یا اصلی ؟

ج : ان میں جعل سازی نہیں کی گئی۔

س : آپ نے کہا تھا کہ مبینہ جعلی نوٹ بک جب آپ کے پاس پندرہ سولہ دن کے بعد آئی تو لانگ ہینڈ نوٹ لکھے تھے ؟

ج : جی ہاں۔

س : جو علیحدہ کاغذ پر لانگ ہینڈ نوٹ لکھے تھے، وہ بھی آپ کے حوالے کر دیے گئے ؟

ج : پہلے اسے پولیس اسٹیشن کو بھیجا گیا اور مجھے کہا گیا تھا کہ لالہ موسیٰ تھانہ سے لے آؤ، مجھے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے جانے کا حکم دیا تھا۔

س : آپ کو وہ لانگ ہینڈ نوٹ کب ملے ؟

ج : مجھے تاریخ یاد نہیں۔

س : آپ کے پاس کتنے عرصے تک رہے ؟

ج یہی دو تین دن۔

س : اس کے بعد آپ نے کس کو دیے ؟

ج عبدالحمید سٹینو گرافر تھانہ گجرات کو۔

س : تاریخ یاد ہے ؟

ج : نہیں

س : کیا اس دن عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی پیشی تھی؟

ج : نہیں

س : آپ نے یہ نوٹ عبدالحمید کو دے دیئے تو کیا پھر واپس لیے؟

ج : ہاں، میں نے واپس لیے، اور نقل تیار کر کے اسی دن انہیں واپس دے دیا۔

س : تاریخ کیا تھی؟

ج : غالباً ۱۸۔ نومبر

س : آپ نے کس کے پاس انہیں دیکھا؟

ج : پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے پاس، انہوں نے مجھے چند حصوں کو خط کشیدہ کر کے دیا اور کہا کہ گواہوں کو یاد کراؤ۔

س : کیا وہ حصے تم نے گواہوں کو پڑھ کر سنائے؟

ج : جس گواہ کے متعلق جو جو حصہ مقرر تھا وہ اس کو لکھ دیا۔

س : کیا اس دن مقدمہ ملتوی ہو گیا تھا؟

ج : جی ہاں۔

س : کیا گواہوں نے کہا ہے کہ ہمیں ۱۱۔ نومبر کو بیان بتایا گیا تھا اور آپ ۱۸۔ نومبر کو کہہ رہے ہیں؟

ج : مجھے پختہ یاد نہیں۔ یہ تاریخ وہ تھی جب سید عطاء اللہ شاہ بخاری جیل میں آچکے تھے۔

س : تاریخ ملتوی ہونے کے بعد لانگ ہینڈ نوٹ کہاں گئے؟

ج : میں نے سٹینوگرافر عبدالحمید کو واپس کر دیئے۔

س : کیا پھر کبھی اس سے واپس لیے؟

ج : نہیں، میں نے دوبارہ واپس نہیں لیے۔

س : کسی سے بھی نہیں؟

ج : نہیں۔

س : گویا اس کے بعد آج تک آپ نے کبھی ان لانگ ہینڈ نوٹوں کو نہیں دیکھا؟

ج : جی ہاں دیکھا ہے۔

س : کب؟

ج : جب پراسیکیوشن انسپکٹر نے کہا انہیں دوبارہ بنانا ہے تاکہ جو جعلی دستخط بنائے ہوئے ہیں انہیں ٹھیک کیا جائے، کیونکہ عطاء اللہ شاہ بخاری جو کافی بااثر مولوی ہے، گواہ غلام حسین اور رولدو سنگھ پر دباؤ نہ ڈال لے، اس لیے ان دونوں کے دستخط کر لیے جائیں۔

س : تاریخ کیا تھی؟

ج : ۲۸۔ دسمبر تھی۔

س : کس طرح آپ کہتے ہیں کہ بضرور ۲۸۔ دسمبر ہی تھی؟

ج : میرا خیال ہے کہ ۲۸۔ دسمبر ہی تھی۔

گرفتاری اور رہائی

کورٹ کا اجلاس ساڑھے تین بجے ختم ہوتا تھا، اس وقت تین بج کر ۳۵ منٹ ہو گئے تھے۔ آنریبل چیف جسٹس نے میاں عبدالعزیز وکیل صفائی کو بتایا کہ لدھارام کی گرفتاری کے دو بلاضمانت وارنٹ آئے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ موجودہ مقدمے میں شہادت کے لیے ہمیں لدھارام کی ضرورت ہے، استغاثے کو بھی اور آپ کو بھی۔ یہ وارنٹ جن مقدمات کے سلسلے میں جاری کیے گئے ہیں ان کا اس مقدمہ سے کوئی تعلق نہیں۔

میاں عبدالعزیز: میری یہ درخواست ہے کہ جب تک لدھارام کا بیان ختم نہ ہو جائے اسے پولیس کے حوالے نہ کیا جائے۔ اس دوران میں اسے ضمانت پر رہا کیا جائے۔

چیف جسٹس: کیا یہ مناسب ہوگا کہ اسے جوڈیشل حوالات میں بھیج دیا جائے۔

میاں عبدالعزیز: نہیں جناب میری درخواست ہے کہ جب تک اس کی شہادت ختم نہیں ہوتی اسے ضمانت پر رہا کیا جائے۔

چیف جسٹس: یہ مقدمہ نہایت سخت ہے اور اس میں اس کی حاضری کی ضرورت ہے۔

میاں عبدالعزیز: اس کے لیے زیادہ ضمانت لی جا سکتی ہے، اگر اس کا کوئی یہاں ضمانتی ہوا تو ضمانت دے گا۔ پانچ، دس ہزار جتنی چاہیں ضمانت مانگ لیں۔

چیف جسٹس: پانچ ہزار کی ضمانت طلب کی جاتی ہے۔

اس حکم پر لدھا رام کو ڈاکٹر عبدالقوی لقمان ایم۔ بی۔ ایس کی پانچ ہزار کی ضمانت پر رہا کر دیا گیا اور مقدمہ کی کارروائی دوسرے دن پر ملتوی کر دی۔

۴۔ اپریل کو ہائی کورٹ کے ڈویژن بنچ نے استغاثہ کے چیف گواہ لدھا رام کو ناقابل اعتبار گواہ قرار دیتے ہوئے ۵۔ اپریل (۱۹۳۰) کو امیر شریعت کو باعزت بری کر دیا اور لدھا رام کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ گجرات مسٹر سعد اللہ خاں اور چودھری بنسی لال مجسٹریٹ درجہ اول کی عدالت میں سے جاری شدہ وارنٹوں کی بنا پر گرفتار کر لیا گیا۔

اس کارروائی کے بعد چیف جسٹس نے امیر شریعت سے براہ راست سوال کیے۔

سوال: کیا آپ نے ۲۰۔ جون کو لالہ موسیٰ میں کوئی تقریر کی؟

امیر شریعت: جی ہاں۔

سوال: کیا اس تقریر میں کہا تھا کہ مسلمانوں کی سلطنت اب نہیں رہی۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لیں؟

جواب: میں نے کہا تھا کہ ہندوستان کی حکومت مسلمانوں کے ہی ہاتھ سے گئی ہے۔ لہٰذا اب مسلمانوں کو آزادئ وطن میں حصہ لینا چاہیے۔

سوال: کیا آپ نے کہا تھا کہ ہماری بیٹیوں کے نکاحوں کے متعلق فیصلے یہ شیطان فرنگی کرتے اور شریعت کی کوئی پرواہ نہیں کرتے؟

جواب: ایسے غیر شریفانہ الفاظ میں نے کبھی اپنی زبان سے استعمال نہیں کیے۔ میں نے کہا تھا کہ وطن آزاد ہونے پر ہمارے مذہبی معاملات یعنی نکاح اور طلاق وغیرہ کے فیصلے بھی غیر مسلموں کی بجائے ہمارے مذہبی نقطۂ نگاہ سے شریعت کے مطابق ہوں گے۔

سوال: کیا آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ مؤرخوں نے انگریزوں کی متعصبانہ چال میں آکر لکھ دیا ہے کہ اورنگ زیب بارہ من جنیؤ روزانہ اتارتا تھا۔

جواب: چونکہ یہ جلسہ کانگریس کا تھا اور میں کانگرس کے پلیٹ فارم سے بول رہا تھا لہٰذا ہندو مسلم اتحاد کے ضمن میں میں نے کہا تھا کہ بعض متعصبین نے یہ غلط رنگ میں مشہور کر دیا ہے کہ اورنگ زیب روزانہ بارہ من جنیؤ جلایا کرتا تھا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو دہلی کے قرب و جوار میں ایک بھی ہندو نظر نہ آتا۔ حالانکہ اس وقت بھی وہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی اور اب بھی ہے۔

سوال: کیا آپ نے کہا تھا کہ اگر آپ میرے ساتھ ہو جائیں تو میں حکومت کا تختہ الٹ دوں۔ اور ان انگریزوں کو ایسا دھکا دوں کہ سمندر سے باہر واپس نہ آسکیں۔

جواب: میں نے اپنی زندگی میں یہ الفاظ کبھی استعمال نہیں کیے اور نہ ہی میں نے یہ کہا کہ انگریزوں کو اس طرح قتل کر دو، جس طرح یزید نے حسینؓ کی فوج کو قتل کیا۔ میں پچھلے تیس سال سے عدم تشدد کا پرچار کر رہا ہوں، ہنگو سے ڈھاکہ اور شملہ سے بمبئی تک میں نے کروڑوں انسانوں میں عدم تشدد کا پرچار کیا۔ میں عدم تشدد کو اپنا مذہبی فریضہ سمجھتا ہوں۔ اس قسم کے لغو الفاظ میں نے کبھی استعمال نہیں کیے، اور نہ آئندہ زندگی میں کر سکتا ہوں۔ جہاں تک حسینؓ اور یزید کا تعلق ہے، آپ کے سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ میں نے اپنے کو یزید کہا اور انگریزوں کو حسینؓ ظاہر کیا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کوئی مسلمان اپنے کو یزید نہیں کہہ سکتا۔

اس موقعہ پر چیف جسٹس نے میاں عبدالعزیز ایڈووکیٹ سے امیر شریعتؒ کے مندرجہ بالا آخری فقرے کی وضاحت چاہی۔

میاں عبدالعزیز: شاہ صاحب کا مطلب یہ ہے کہ میں غیر اسلامی الفاظ کبھی استعمال نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ الفاظ استعمال کر کے میں اپنے کو یزید اور انگریزوں کو حسین کہوں گا، نہ ہی میں برداشت کر سکتا ہوں کہ کوئی مسلمان اپنے کو یزید کہے۔

جسٹس رام لال (امیر شریعت سے) کیا اس کے سوا کچھ اور کہنا چاہتے ہو؟

امیر شریعت: میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

مسٹر سلیم ایڈووکیٹ جنرل نے چیف جسٹس کی اجازت سے امیر شریعت سے مندرجہ ذیل سوالات کیے

"کیا آپ نے کہا تھا کہ وہ کون تھا کافر (غلام احمد)"؟

میاں عبدالعزیز: (مسٹر سلیم سے) مگر اس کا اس مقدمہ سے کیا تعلق؟

جسٹس رام لال: مسٹر عبدالعزیز! آپ جانتے ہیں کہ لدھارام کی شہادت کی کیا وقعت ہے (قہقہہ)

مسٹر سلیم نے اپنا سوال پھر دہرایا، جس پر چیف جسٹس نے امیر شریعت سے براہ راست سوال کیا۔

"کیا آپ نے کہا تھا کہ وہ کافر ہے، جس نے انگریزوں کو پانچ صد گھوڑ سواروں سے مدد کی تھی، وہ کون ہے، (غلام احمد) سوال یہ ہے کہ یہ کوئی تاریخی واقعہ ہے"۔

میاں عبدالعزیز: نہیں مائی لارڈ، یہ کوئی تاریخی واقعہ نہیں۔

امیر شریعت: (چیف جسٹس سے) میں نے ہزاروں مرتبہ مرزا غلام احمد کو کافر کہا، کہتا ہوں اور کہتا رہوں گا۔ یہ میرا مذہب ہے۔ باقی مرزا غلام احمد کی اپنی کتابوں میں درج ہے، جس میں اس نے گورنمنٹ کو اپنی وفاداری کا یقین ان الفاظ میں دلایا تھا کہ "ان کے دادا نے ۱۸۵۷ء میں پانچ سو سواروں سے گورنمنٹ کی مدد کی تھی"۔ ان کے

سوا میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

دوسرا مقدمہ ہائی کورٹ کا فیصلہ سنتے ہی ہجوم نے امیر شریعت زندہ باد۔ لدھارام زندہ باد کے نعروں سے اس فیصلے کا استقبال کیا۔

لدھارام کو پولیس نے گرفتار کر لیا، اور امیر شریعت کو راولپنڈی میں زیر سماعت دوسرے مقدمہ ۱۲۴ و اور ۱۵۳ کے لیے روک لیا گیا۔

۳۔جون ۱۹۳۹ء کو امیر شریعت نے نواں محلہ (راولپنڈی) میں ایک تقریر کی، جسے فرنگی نے پسند نہ کیا اور انہیں ۸۔ستمبر ۱۹۳۹ء کو ضلع مظفر گڑھ کی ایک گمنام بستی سے زیر دفعہ ۱۲۱ "ترغیب قتل" ۱۲۴۔الف "حکومت کے خلاف بغاوت" ۱۵۳ "ملک معظم کی حکومت کے دو فرقوں کے درمیان نفرت پھیلانا" گرفتار کر لیا۔ یہ مقدمات ہنوز زیر سماعت تھے کہ لاہور ہی میں مندرجہ بالا مقدمات کی بنیاد ڈالی گئی۔ چنانچہ ۵۔اپریل ۱۹۴۰ء کو جیسے ہی امیر شریعت... ہائی کورٹ سے رہا ہوئے۔ دوسرے مقدمے میں پکڑ لیے گئے۔ حکومت کی یہ کوشش بھی ریتلی دیوار ثابت ہوئی، اور اس قدر جلدی گر گئی کہ قانون اپنی ساری قوت کے باوجود درویش سے مات کھا گیا۔

۴۔جون ۱۹۴۰ء کو لاہور سیشن جج کے جواب میں امیر شریعت نے کہا:۔

"اس مقدمے کی حقیقت بھی وہی ہے جو مقدمہ گجرات کی تھی، جس میں ہائیکورٹ نے مجھے بری کیا۔ یعنی جس طرح ایک جعلی تقریر پیش کر کے گجرات میں مجھ پر مقدمہ بنایا گیا، اسی طرح جو تقریر محترم عدالت میں پیش کی گئی ہے، وہ بھی اسی طرح گھٹا اور بڑھا کر میرے بعض جملوں کو خلاف ترتیب سے پیش کیا گیا (جس سے میری تقریر کا مقصد اور مفہوم ضائع ہو گیا، جو نیکی برباد گناہ لازم کے مصداق ہے۔

پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کے قیام کے بعد یونینسٹوں اور احرار

کے تعلقات کشیدہ رہے ہیں ۔ ہماری یہ کوشش رہی کہ ہم بہتر حکومت قائم کریں ۔ یہ کشمکش انتخاب کی صورت میں تمام پنجاب میں پھیل گئی ۔ ہم نے یونینسٹ امیدواروں کے مقابلے میں اپنے امیدوار کھڑے کیے اور انہوں نے ہمارے امیدواروں کو شکست دینے کی کوشش کی، اس سلسلے میں مَیں نے اور میرے رفیقوں نے تمام اضلاع کا دورہ کیا۔ یکم اور تین جون کو پنڈی گھیپ ضلع کیمبلپور میں کانفرنس ہوئی جس میں مَیں شریک ہوا۔ اور میرے رفیقوں میں مولانا مظہر علی اظہر ایم ایل اے بھی شریک ہوئے ۔ حُسنِ اتفاق پیر لال بادشاہ آف مکھڈ کانفرنس میں شریک ہوئے اور ایک اجلاس کی انہوں نے صدارت بھی فرمائی ۔ دوسرے اجلاس میں انہوں نے یونینسٹ وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کی جو بالاتفاق پاس ہو گئی ۔

کانفرنس میں تمام علاقے کے بڑے بڑے زمیندار، علماء، صوفیا اور نوجوان شامل ہوئے ۔ ۳۔ جون کو اڑھائی بجے کانفرنس ختم ہوئی ۔ مولانا مظہر علی اظہر اور میں لاہور جاتے ہوئے راولپنڈی پہنچے ، چونکہ شہید گنج ایجی ٹیشن کے بعد میں نے راولپنڈی آنا جانا چھوڑ دیا تھا ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تمام پنجاب میں سب سے زیادہ مجلس احرار کی مخالفت اسی شہر میں ہوئی ۔ میری رائے تھی کہ راولپنڈی میں کوئی سیاسی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی ۔ اس ماحول میں بھی چند دوست ایسے تھے جو ہماری رائے سے اتفاق کرتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ میں یہاں (راولپنڈی) تقریر کروں ۔ میں نے حتی الامکان کوشش کی کہ تقریر نہ کروں ، لیکن جب دوستوں کا اصرار بڑھا تو میں نے گھڑی سامنے رکھ کر ایک گھنٹہ ۴۵ منٹ تقریر کی ۔

میری تقریر کا مقصد صرف مجلس احرار پر سے ان الزامات کا ہٹانا

تھا، جو مسجدوں اور بازاروں میں عام جلسوں کے اندر مجلس احرار پر لگائے جاتے تھے۔ مثلاً یہ کہ یہ لوگ کانگرس کے زرخرید غلام ہیں اور ہندوؤں سے مل کر ہندوستان میں ہندو راج قائم کرنا چاہتے ہیں۔

ہماری جماعت میں علماء بھی ہیں، اور میں خود ۱۹۴۰ء سے لے کر تا آن جمعیتہ علمائے ہند کی ورکنگ کمیٹی کا ممبر ہوں۔ جب بازاروں میں علماء کے خلاف نعرے لگائے جاتے تھے اور "مولوی کا غلط مذہب" نامی رسالہ علامہ عنایت اللہ مشرقی کا لکھا ہوا ٹکے میں بکتا تھا۔

میں نے اپنی تقریر میں علماء کی صحیح روش، ان کا صحیح مذہب اور صحیح پالیسی کا بیان کرنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ۱۸۵۷ء سے لے کر اس وقت تک کی عدم تشدد اور تشدد کی تاریخ میں نے بیان کی اور ثابت کیا کہ صحیح مذہب اور پالیسی وہی ہے جس پر مجلس احرار اور جمعیتہ علماء کار بند ہیں چنانچہ، ہم پر جو الزام تھا، کہ ہم نے اپنے ضمیر کو بیچ کر اور کانگرس سے مل کر بجائے اسلامی حکومت کے ہندو راج قائم کرنا چاہتے ہیں، میں نے یہ بیان کیا کہ ہمارے بزرگوں کا دماغ اس خیال سے خالی نہیں کہ ہندوستان میں ایک دفعہ پھر اسلامی حکومت قائم ہو جائے۔ چنانچہ، ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں علماء شریک ہوئے اور ناکامی کے بعد کچھ لوگ شہید ہوئے، اور ہزاروں انسانوں نے وطن عزیز کے لیے جانیں دیں۔ مغل شہزادوں کا خون بہایا گیا۔ ان مصیبتوں کے بعد بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، اور اسلامی حکومت قائم کرنے کا خیال شکست کھا گیا۔

اس کے بعد ۱۹۱۴ء میں علماء کی ایک جماعت نے بھی ارادہ کیا کہ مسلم راج قائم کرنے کے لیے تحریک شروع کی جائے اور اس میں بھی

شکست کھائی۔

چنانچہ ۱۹۲۰ء میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ دیوبندی مالٹا سے رہا ہو کر تشریف لائے۔ دہلی میں ملک کے مختلف حصوں سے پانچ سو سے زائد علماء کا اجتماع ہوا اور یہ طے پایا کہ تشدد کا راستہ غلط ہے اور موجودہ دور میں اسلامی حکومت کا قیام تقریباً ناممکن ہے، لہٰذا کانگرس کے ساتھ شامل ہو کر اور تمام قوموں سے مل کر ملک کو آزاد کرائیں، اور جمہوری حکومت قائم کریں، چنانچہ اس وقت سے ہم (احرار) اس عقیدے پر قائم ہیں اور اسی راستے کو صحیح راستہ سمجھتے ہیں۔

عدالت عالیہ! یہ میری تقریر کا مفہوم تھا، جو میں نے ۳۔جون کو راولپنڈی میں کی تھی۔"

عدالت کے ایک سوال پر امیر شریعتؒ نے کہا:

میں نے کہا تھا، خواہ ہمیں قتل ہونا پڑے، تباہ ہونا پڑے یا پھانسی پر چڑھنا پڑے، ہم یہاں بھی اسی طرح کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں، جس طرح دوسرے صوبوں میں حکومتیں قائم کر کے برطانوی اقتدار کو کم کیا گیا ہے میرا بیس برس سے یہ سیاسی کردار رہا ہے کہ جب بھی مجھ پر حکومت نے مقدمہ بنایا، جو لفظ میں نے کہا اس کا اقرار کیا۔ میں نے ایسی بات کبھی نہیں کی جس کا بعد میں مجھے افسوس ہوا، اور اس کے لیے عدالت میں جھوٹ بول کر جان بچانی پڑے، میں جھوٹ بول کر زندہ رہنا نہیں چاہتا۔"

اس مفصل اور تحریری بیان کے بعد سیشن جج لاہور مسٹر ڈی فالشانے اپنے چار اسیسروں کی رائے کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے امیر شریعتؒ کو ۷۔جون ۱۹۴۰ء کو باعزت طور پر بری کر دیا۔ نیز اسی روز شام کو لاہور ریڈیو پر

امیر شریعت کی بریت کا بھی اعلان کیا گیا۔ اور دوسرے دن برلن ریڈیو کے اناؤنسر نے کہا،

"ہندوستان میں برطانوی سلطنت کے سب سے بڑے باغی مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو صوبے کی سب سے بڑی عدالت نے بری کر دیا ہے۔"

نیز جرمن شعبہ نشر و اشاعت نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تصاویر ہوائی جہاز کے ذریعے اپنے ملک میں تقسیم کیں۔

رہائی کے بعد

یورپ میں دوسری بڑی لڑائی کے بادل اس تیزی سے برس رہے تھے کہ توپوں کے دہانوں سے نکلتی ہوئی آگ تہذیب یورپ پر مسکرا رہی تھی۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو قراردادِ پاکستان کے بعد ہندو مسلمانوں کے درمیان سلگتی ہوئی آگ شعلے دینے لگی تھی، اور گذشتہ ربع صدی کی فرقہ وارانہ کشمکش فیصلے کے آخری موڑ پر پہنچ گئی تھی۔ انہی دنوں ملک کے دانشور تدبّر کے ناخن لیے عقل و خرد کے گوشوں میں بیٹھے تھے کہ امیر شریعتؒ قریباً نو ماہ جیل میں گزار کر رہا ہوئے۔

غیر ملکی قانون کے محافظ سر سکندر حیات خاں کی دام تزویر کی تمام کڑیاں از خود ٹوٹ کر قانون کو شرمندہ کرنے لگیں۔ اقتدار نے اپنے منہ پر کئی طمانچے مارے، جس سے اس کا اپنا چہرہ لہولہان ہو گیا۔ اور اپنے اس خون کی سرخیوں میں ڈوبتے ہوئے سورج کی طرح وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غرقاب ہو گیا۔

امیر شریعتؒ مقدمات سے بری ہوتے ہی سب سے پہلے اپنے والد محترم سے ملنے ناگڑیاں چلے گئے۔

ان دنوں امیر شریعتؒ انچاس سال کے پیٹے میں تھے، مصائب و آلام میں گزرے ہوئے برسوں نے داڑھی اور سر کے بالوں میں سپیدی کو اس قدر تیزی سے جنم دیا کہ وہ قبل از وقت بوڑھے دکھائی دینے لگے۔ دوسرے قوائے جسمانی بھی مشین کے پرزوں کی طرح ڈھیلے ہو چکے تھے۔ اندرونِ خانہ ۱۹۲۵ء میں جس بیماری کا آغاز ہوا تھا، اس کی

جڑیں بدستور پھیلتی جا رہی تھیں۔ اس طرح گھر کا سکون بھی میسر نہ تھا، اور اکثر جماعتی احباب کے جیل خانوں میں جانے کے باعث جماعتی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی انہی کے کندھوں پر آن پڑا تھا۔

دل اور دماغ جب باہم متصادم ہوں تو آدمی فکر کے ایسے دوراہے پر کھڑا ہوتا ہے، جہاں سے خرد کے تمام دروازے مسدود ہو جاتے ہیں اور جنون اپنا دامن شوق وا کیے ہر موڑ پر آدمی کا استقبال کرتا ہے، ایسے موقعے پر آوارہ ذہن آدمی کا مقصدِ حیات سے بھٹک جانا بڑی بات نہیں لیکن امیر شریعت نے ۱۹۲۱ء میں جس سفر کا قصد کیا اور صعوبتوں کو دعوت دی تھی، ان سے وابستگی کی تمام کڑیوں کو اپنے ہاتھوں سے گرہ دیتے رہے۔

کئی دن والد صاحب کے ہاں ٹھہرے۔ ان کی دعائیں لیں اور پھر تازہ دم ہو کر سفر پر چل دیے۔ حالانکہ خانگی حالات اور اہلیہ کی بیماری راستہ روکتے رہے، لیکن وقت کا مسافر اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہا۔

حضرت رائے پوری سے وابستگی

دوسری جنگِ عظیم کے باعث ہندوستان کے ہنگامی قوانین نے سیاسی کارکنوں کے محاسبے کو اس قدر تنگ کیا ہوا تھا کہ اپنے قدموں کی آواز پر بھی دشمنوں کا گمان ہوتا تھا، اور ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا تھا، ایسے حالات میں امیر شریعتؒ نے لاہور پہنچ کر جماعتی کاموں کا جائزہ لیا اور ضروری احکامات دے کر اپنے مرشد مولانا عبدالقادر کی خدمت میں حاضری کے لیے رائے پور (ضلع سہارنپور) چلے گئے۔

امیر شریعتؒ نے ۱۹۳۷ء کے دم توڑتے ہوئے دنوں میں حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری کے ہاتھ پر لاہور میں مولانا عبداللہ فاروقی کے مکان پر بیعت کی تھی، اس سے پیشتر امیر شریعتؒ، سید مہر علی شاہ صاحب گولڑوی کے دامن سے وابستہ تھے، ان کی وفات کے بعد ایک عرصہ اپنے روحانی پیشوا کی تلاش میں رہے اور اس غرض کے لیے

میاں شیر محمدؒ کی خدمت میں شرق پور (شیخوپورہ) بھی گئے اور ان سے عرض کیا۔

تو کہ کیمیا فروشی نظرے بقلب ما کن۔

حضرت میاں شیر محمد صاحبؒ نے دو گھنٹہ مراقبہ کے بعد فرمایا:

"شاہ جی! آپ کوئی دوسرا گھر تلاش کریں، میرے دامن میں اتنی وسعت کہاں کہ آپ کو پناہ دے سکے۔"

واپسی پر میاں صاحب امیر شریعتؒ کو اپنے جلو میں گاؤں کی آخری سرحد تک چھوڑنے آئے۔

حضرت مولانا عبدالقادرؒ موضع ڈھڈی سدہ ضلع سرگودھا کے ایک ممتاز دینی گھرانے میں پیدا ہوئے اور تکمیل علم کے بعد برصغیر کے مشہور روحانی پیشوا حضرت شاہ عبدالرحیم (رحمتہ اللہ علیہ) کے آستانے سے وابستہ ہو گئے۔ حضرت شاہ عبدالرحیم، حضرت گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ کے ممتاز خلفاء میں سے تھے ان کا ظاہری اور باطنی علوم میں بہت بڑا مقام تھا، انہوں نے حضرت مولانا عبدالقادر کی سعید روح کا جائزہ لے کر ان پر ایسی توجہ فرمائی کہ انہیں جذب و شوق کی تمام منزلیں طے کرنے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ حضرت نے انہیں اپنا خلیفہ منتخب کیا، اور پھر شیخ طریقت حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے وصال کے بعد حضرت مولانا عبدالقادر ان کے جانشین مقرر ہوئے، پھر ایسے فنافی الشیخ ہوئے کہ اپنا وطن ترک کر کے دم واپسیں سے کچھ دن پیشتر تک رائے پور میں قیام کیا۔ آخر ۱۶۔ اگست ۱۹۶۲ء کو لاہور میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

امیر شریعتؒ اور ان کے مرشد کے درمیان احترام کی ایک اونچی دیوار حائل تھی لیکن اس کے باوجود حضرت رائے پوریؒ نے امیر شریعتؒ سے محبت کا رشتہ اس قدر مضبوط استوار کر لیا کہ پیر طریقت کے دل میں اپنے مرید کے لیے بے پناہ لگاؤ تھا۔

کسی سیاسی یا مذہبی تحریک میں شامل ہونے یا شروع کرنے سے پیشتر اول اپنے

ضمیر سے پھر پیرِ طریقت سے مشورہ کرتے۔ جب دونوں رائیں ہم آہنگ ہوتیں تو پھر نتائج سے بے نیاز ہو کر میدان میں نکل آتے۔

قانون کی شکست

سیاسیات کی بادِ سموم کے باعث ہندوستان کی فضا نے اس قدر گرمی پیدا کر دی تھی کہ جس دل و دماغ میں احساس کی آگ جل رہی تھی، اس کے لیے گوشۂ تنہائی میں بیٹھنا دشوار ہو گیا تھا۔ چنانچہ ان دنوں اتحادی اور محوری فوجیں ایک دوسرے کے مقابل صف آراء تھیں۔ اقوامِ یورپ کی اس جنگ نے ایشیا کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۴۰ء کو کانگرس نے اس لڑائی کے خلاف انفرادی ستیہ گرہ شروع کیا تو ہندوستان میں ڈیفنس رولز آف انڈیا ایسے ہنگامی قوانین کا نفاذ ہو چکا تھا۔ محبِ وطن لوگ جیل خانوں میں مقفل کر دیے گئے۔

امیرِ شریعتؒ نے انہی دنوں انگریز کے خلاف جلتے ہوئے دلوں کی بھٹیوں میں جذبات و نفرت کا ایندھن بھرا، وہ ہندوستان کے ہر کوچہ و بازار میں گئے اور لاکھوں انسانوں کے اجتماع سے خطاب کیا۔

پنجاب میں سر سکندر حیات خاں کی فوجی حکومت برطانوی سامراج کے دشمن سے شکست کھا چکی تھی۔ قانون اپنی پوری گرفت کے باوجود امیرِ شریعتؒ تک نہ پہنچ سکا۔ لیکن امیرِ شریعتؒ مجلسِ احرار کی جنگ کے خلاف تحریک کی بڑی بے باکی اور چابکدستی سے سارے ہندوستان میں رہنمائی کرتے رہے۔ حکومت کی پوری مشینری ان کے تعاقب میں رہی۔ امیرِ شریعتؒ اپنے رضا کاروں کو فوجی بھرتی کے خلاف سول نافرمانی پر اکساتے رہے۔ گاؤں، قصبات اور شہروں کے ہزاروں عوام اس تحریک کے تحت جیل خانوں میں گئے۔ ملتان اور مظفر گڑھ کا ضلع خصوصیت کے ساتھ اس تحریک سے براہِ راست متاثر ہوا۔

جاپان جنگ میں شریک ہو چکا تھا اور دوسری طرف جرمن فوجیں جنرل رومیل کی کمان میں سکندریہ کے ساحل تک بڑھ آئی تھیں۔ اتنے میں ۱۹۴۲ء کی عمر کا جام لبریز

ہو گیا اور ۱۹۴۲ء کی شعاعوں نے آگے بڑھ کر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔

اپنے ماضی کی طرح ہندوستان ان دنوں بھی سیاسی طور پر دو دھڑوں میں منقسم تھا۔ رجعت پسند انگریزی حکومت کے معاون تھے، اور انتہا پسند گروہ اس موقعہ کو غنیمت جان کر غیر ملکی حکومت کے خلاف بغاوت کو اپنا دین سمجھتا تھا۔ چنانچہ اوّل الذکر گروہ فوجی بھرتی کے لیے گاؤں گاؤں گھوم پھر کر سادہ لوح عوام کو انگریزی اقتدار کی بقاء اور دوسری جنگ عظیم کی آگ میں جھونکنے کے لیے خوبصورت وردی، بندوق اور مفت راشن کا لالچ دے کر بھرتی کر رہا تھا۔

والدین کو جب معلوم ہوتا کہ ہمارا لڑکا فوج میں بھرتی ہو گیا ہے تو وہ پریشان ہو کر امیر شریعتؒ کے پاس آتے۔ امیر شریعتؒ پہلے تو انہیں سخت سست کہتے، پھر ان سے مجلس احرار کے لیے پانچ روپے چندہ وصول کرتے اور اس کی رسید اس لڑکے کے نام کاٹتے جو فوج میں بھرتی ہو کر ٹریننگ کے لیے جا چکا تھا۔ ساتھ ہی جماعت کے طبع شدہ فارم پر اس لڑکے کے نام حسب ذیل خط لکھتے۔

"عزیزم ......!

سلام مسنون۔ تمہارا چندہ برائے مجلس احرار بڑی پابندی سے پہنچ رہا ہے، شکریہ! اپنی جماعتی ذمہ داریوں کو خوب اچھی طرح نبھانا، فوج کے اندر رہ کر جماعت نے جو ڈیوٹی تمہارے سپرد کی ہے اسے خیال سے انجام دینا۔

فقیر، عطاء اللہ شاہ بخاریؒ"

یہ خط جب فوجی افسروں کے پاس پہنچتا تو وہ متعلقہ لڑکے کو بلا کر دریافت کرتے، تمہارا عطاء اللہ سے کیا تعلق ہے"؟

سولجر: "میں تو انہیں جانتا بھی نہیں صاحب!

آفیسر: "تم تو اس کی جماعت کو چندہ بھی دیتے ہو"؟

سولجر: "نہیں صاحب"!

آفیسر: لیکن تمہارے نام اس کا خط اور چندے کی رسید کیسے آگئی؟ چلو تمہیں فوج کی ملازمت سے علیحدہ کیا جاتا ہے"!

گویا خط پہنچنے کے چوتھے روز بعد لڑکا اپنے گھر واپس پہنچ جاتا، اور گھر والے امیر شریعت کو دعائیں دیتے۔ انگریز جوان دنوں محاذِ جنگ پر مصروف تھا امیر شریعت کی ان حرکات سے چیں بہ جبیں ہوا، لیکن اندرونِ ملک وہ حالات سے مجبور تھا کہ اپنے کسی سیاسی حریف کو قانونی گرفت میں لیتا۔ اس طرح سے سینکڑوں نوجوانوں کو انگریزی فوج سے نکالنے کا سہرا امیرِ شریعت کے سر ہے، اور یہ سلسلہ اختتامِ جنگ تک جاری رہا۔

حکومتِ الٰہیہ

۱۹۴۰ء کی لاہور قرارداد کے بعد اقوامِ ہند کے خیالات نئے زاویوں سے دیکھے جانے لگے۔ ہندو کے جذبۂ نفرت نے مسلمان کو اس سے متنفر کر دیا تھا۔ دلوں کی باتیں زبانوں پر آ کر فضاؤں میں پھیل چکی تھیں، جس کے باعث ہر روز کے حالات نئے واقعات کو جنم دے رہے تھے۔ دوسری طرف جنگِ عظیم کے متوقع نتائج کے پیشِ نظر غیر ملکی اقتدار کا زوال صاف دکھائی دے رہا تھا، ایسے میں احرار رہنماؤں کو یقین تھا کہ مستقبل قریب میں ہندوستان کے نقشے پر کوئی نیا سورج طلوع ہو گا اور ہو سکتا ہے کہ یہ سورج اسلام کا سورج ہو، برائی نیکی کی ضامن بن جائے۔ لہٰذا آنے والے کل کے لیے آج سے راستہ ہموار کرنا چاہیے۔ چنانچہ مئی ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا احرار ورکنگ کمیٹی نے سہارن پور میں سول نافرمانی کی قرارداد جو کہ ۱۹۴۲ء میں واپس لے لی گئی تھی کی جگہ حکومتِ الٰہیہ کی قرارداد منظور کی۔ نیز فیصلہ کیا کہ مجلسِ احرارِ ہندوستان کے موجودہ فرقہ وارانہ فیصلوں سے الگ رہے گی اور ہندوستان کے آئین میں اگر کوئی تبدیلی آئی تو مسلمان اپنے لیے حکومتِ الٰہیہ کا نظام پسند کریں گے، کیونکہ اس سے

پیشتر انگریز کا نعرہ تھا ——

"خلقت خدا کی، حکم بادشاہ (ملک معظم) کا"

لیکن سہارن پور کی قرارداد کے بعد مجلس احرار کا نعرہ تھا ——

"خلقت خدا کی اور حکم بھی خدا کا"

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ

ان دونوں نعروں کے درمیان خاصا ٹکراؤ رہا، مگر قانون شکنی کی نوبت نہ آئی۔
جماعت کی اس نئی قرارداد نے امیر شریعتؒ کی ذمہ داریوں میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔
مسلم لیگ کا مطالبۂ پاکستان ان دنوں زوروں پر تھا، ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت اس کے حق میں تھی، لیکن امیر شریعتؒ کی رائے مسلم لیگ کے نعرہ سے متصادم تھی، وہ تقسیم ملک کے بعد کے نتائج کو اپنی بصیرت کی روشنی میں ناپسند کرتے تھے، چنانچہ اس کے خلاف وہ حکومتِ الٰہیہ کے حق میں عوام سے کہتے:۔

"کسی زمین کو حاصل کرنے سے پیشتر اللہ کا نظام اپنے دلوں پر قائم کریں فرنگی کی ڈیڑھ سو سالہ غلامی سے جو دل زنگ آلود ہو چکے ہیں، انہیں ایمان کی کسوٹی پہ پرکھیں، تاکہ کفر کے نظامِ حکومت کے جو نشان اس پر جم چکے ہیں وہ صاف ہو جائیں۔ اس کے علاوہ اگر آپ نے کوئی زمین حاصل کر بھی لی، تو جو نظام آپ قائم کریں گے، وہ انسانوں کا بنا ہوا ہوگا جس کی ہر شق کفر کے آئین سے ماخوذ ہوگی"

امیر شریعتؒ نے انہیں خیالات کا اظہار سارے ہندوستان میں کروڑوں انسانوں کے اجتماعات میں کیا۔

حکومتِ الٰہیہ کی قرارداد سے ہندو اور انگریز کے بعد مسلم لیگ سے متعلق مسلمان بھی امیر شریعت سے اختلاف کرنے لگے۔ اگرچہ مجلس احرار کا عسکری نظام ہندوستان کے

اکثر صوبوں میں قائم تھا تاہم مسلمانوں کی غالب اکثریت جو مطالبۂ پاکستان کی حامی تھی امیر شریعت کے عوامی جلسوں میں ہر جگہ اپنی ناراضگی کا اظہار کرتی لیکن یہ مخالفین کی رائے کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتے۔

مولانا گل شیر کی شہادت

فرد ہو یا قومیں، غصے اور انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے دونوں انجام سے بے خبر ہوتے ہیں۔

موضع ملھووالی ضلع کیمبلپور کے مشہور عالم دین مولانا گل شیر اپنے ضلع کی حدود سے نکل کر میانوالی اور جہلم کے ورلے کنارے تک اپنی منفرد طرز خطابت، خلوص، جرأت اور طبیعت کی سادگی کے باعث مسلمانوں کے دلوں پر راج کرتے تھے، وہ سیاسیات سے الگ تھلگ فقہ اسلامی کی وکالت کے لیے شب و روز غیر اسلامی رسم و رواج سے منع کرتے، غیر مسلموں سے لین دین میں مسلمان عورتوں کو روکتے، گاؤں گاؤں پھر کر اپنے اس موقف کی وضاحت میں قرآن کریم سناتے۔ آزادیٔ وطن کے ضمن میں کانگرس سے اتحاد پر مجلس احرار اور دوسری سیاسی جماعتوں سے سخت متنفر تھے۔ کہیں اگر احرار رہنماؤں سے مڈبھیڑ ہو جاتی تو مولانا گل شیر انہیں ایسا کوستے کہ انہیں اپنا پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا۔

۱۹۳۸ء میں مولانا گل شیر حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ واپسی پر ان کے طریقِ زندگی میں اس قدر انقلاب آیا کہ فوج محمدیؐ کی سٹیج پر مجلس احرار اور امیر شریعتؒ کی بار بار تعریف ہونے لگی۔ اس تبدیلی سے عوام کے لیے یہ بات ایک سوال بن گئی کہ ایکا ایکی یہ کیسے ہو گیا؟ مگر مولانا گل شیر نے یہ راز چھپائے رکھا۔ آخر ۱۹۳۹ء میں جب وہ مجلسِ احرار میں شامل ہوئے ایک اجلاس میں تقریر کے دوران مولانا نے کہا:

> "میں ہمیشہ سے امیر شریعتؒ مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری اور ان کی جماعت کو ہندوؤں کی زر خرید سمجھتا تھا۔ اپنے اس عقیدے کے تحت میں نے

ے۔ مولانا گل شیر کی اپنی رضاکارانہ غیر سیاسی تنظیم تھی۔

اپنے علاقے میں ان حضرات کی سخت مخالفت کی، جہاں کہیں میرا بس
چلا میں نے اس جماعت کے پاؤں نہیں جمنے دیے۔ لیکن گذشتہ سال حج
کے موقعہ پر میں طواف کعبہ سے فارغ ہو کر نماز عصر سے ذرا پہلے نیند میں
تھا کہ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے رویا میں مجھ سے کوئی کہہ رہا ہے:
"تم مجلس احرار میں شامل ہو جاؤ"۔ "تم مجلس احرار میں شامل ہو جاؤ"۔ "تم
مجلس احرار میں شامل ہو جاؤ"۔
اس فقرے کی مسلسل تکرار سے میری آنکھ کھل گئی اور میں نے وہیں فیصلہ
کر لیا کہ میں اس حکم پر ضرور عمل کروں گا۔ الحمد للہ کہ اب میں اس مجاہد جماعت
کے ایک رضاکار کی حیثیت سے ہمیشہ حق کے لیے کفر سے نبرد آزما رہونگا"

اسی سال مولانا گل شیر، مولانا امیر شریعت، مولانا حبیب الرحمٰن، قاضی احسان احمد اور
خواجہ عبدالرحیم عاجزؔ کو میانوالی کے ضلع میں اپنے ساتھ لے گئے۔ واپسی پر امیر شریعتؒ نے
مولانا گل شیر کا ہاتھ پکڑ کر لاہور کے ایک عظیم اجتماع میں کہا: "اج میں اپنے نال اک ہور جنا
لے کے آیا واں"۔ (لفظ "جنا" میانوالی کے علاقے میں بہادر اور جرأت مند پر بولا جاتا ہے)
یعنی آج میں اپنے ہمراہ ایک اور بہادر کو لے کر آیا ہوں۔

ان دنوں ملک میں مجلس احرار فوجی بھرتی کے خلاف تحریک چلا رہی تھی۔ مولانا گل شیر
بھی گرفتار ہو کر جیل چلے گئے۔ رہا ہو کر آئے تو نواب آف کالاباغ کی اپنی رعایا سے ٹکر ہو
چکی تھی، مولانا نے وہاں کے غریب عوام کا ساتھ دیا، اور اس تحریک کو سارے پنجاب میں
ہوا دی۔

مولانا گل شیر کی مقبولیت اب پنجاب کے قصبات تک پہنچ چکی تھی۔ شہرت کے
ساتھ ساتھ ان کے سیاسی جرائم میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ کیمبلپور اور میانوالی اضلاع کے
اُمرا کو یہ بات کب پسند تھی کہ رسم و رواج پر وعظ کرنے والا مولوی اس حد تک آگے بڑھے

کہ اس کے ہاتھ ان کے گریبانوں تک پہنچ جائیں۔ ان کے نزدیک مولانا گل شیر کے مندرجہ ذیل جرائم ناقابلِ معافی تھے۔

۱۔ مجلسِ احرار میں شمولیت۔

۲۔ امیرِ شریعت کا ضلع میانوالی میں ورود ——— (یہ ضلع انگریز کا اہم ترین عسکری مرکز تھا۔)

۳۔ نواب کالاباغ کی مخالفت۔

۴۔ خلافِ شرع رسم و رواج کے خلاف جہاد۔

اپنے علاقے کے امراء سے اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۳ اور ۲۴ مئی ۱۹۴۰ء کی درمیانی رات کو جب کہ مولانا گل شیر اپنے مکان کے صحن میں سو رہے تھے، کسی نامعلوم شخص نے انہیں گولی مار کر شہید کر دیا۔

مولانا کی شہادت سے پنجاب بھر میں کہرام مچ گیا۔ ہر آنکھ اور ہر زبان رائج الوقت قانون سے سوال کرتی تھی۔ ایک پارسا، نیک، تہجد گزار، حق گو عالمِ دین کو کس نے قتل کیا؟ وہ ہاتھ کس کے اشارے پر اٹھا، جس نے ناکردہ گناہ کی سزا میں ایک نیک انسان کے خون سے اپنے کو مجرم ٹھہرایا؟ قاتل کو بندوق کس نے دی، جس سے نکلی ہوئی گولی سے مولانا گل شیر شہید ہو گئے۔

ان سوالات کے جواب اس وقت کے قانون کے پاس بھی نہیں تھے، اور آج کی انصاف پسند دنیا بھی خاموش ہے۔

قاتل کے نشانِ پا کن محلات کے سامنے جا کر گم ہو جاتے ہیں؟ قانون اپنے کھوج میں کیوں ناکام رہا۔ میانوالی کی زمین کے ذرات اس رازہائے درونِ پردہ کو کب چاک کریں گے؟ ؎

قریب آیا ہے روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

اس حادثۂ جانکاہ کے بعد امیر شریعت اپنا مجوزہ پروگرام ملتوی کر کے کیمبل پور اور میانوالی کے سفر پر روانہ ہو گئے، جہاں انہوں نے وہی باتیں کہیں، جو مولانا گل شیر کے قتل کا باعث بنی تھیں۔

تحریکِ پاکستان

ہٹلر کی فوجیں جیسے جیسے برطانوی سلطنت کا سورج غروب کرتی ہوئی آگے بڑھتی گئیں۔ ایشیا کی سیاست اسی قدر متاثر ہوتی گئی۔ مجلس احرار ان دنوں کانگرس اور مسلم لیگ کے تصادم سے بالاتر رہ کر اپنی پالیسی پر گامزن تھی۔ ہندوستان کے مسلمان دو دھڑوں میں بٹے ہوئے تھے۔ مطالبہ پاکستان زور پکڑتا جا رہا تھا۔ سرکاری دفاتروں میں ہندو کی تنگ نظری نے کلرک قسم کے مسلمان کو بھی مسلم لیگ کا ممبر بنا دیا تھا۔ کانگرس پر قابض فرقہ پرست ہندو نے نیشلسٹ مسلمان کو بھی کانگریس سے علیحدگی پر مجبور کر دیا تھا۔ دوسری طرف مسلم لیگ میں رجعت پسند اور تن آسان لوگوں کے ہجوم نے "پاکستان" کا نعرہ کچھ اس انداز سے بلند کیا کہ متعینہ راہ پر چلتے ہوئے مسافروں کو بھی راستے کی لکیریں گڈمڈ نظر آنے لگیں۔

سال ۱۹۴۴ء کے آخری ایام برطانوی سلطنت اور غلام ہندوستان کے مابین کشمکش کے آخری اور انتہائی نازک دن تھے۔ متحدہ ہندوستان نے لیگ اور کانگرس کے ٹکراؤ سے ۹ ستمبر ۱۹۴۴ء کو ایک نئی کروٹ لی، جبکہ بمبئی میں گاندھی جناح ملاقات سے پاکستان کے نعرے میں نئی بہار آ گئی۔ مسلمان من حیث القوم مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے لیکن امیر شریعت یہ سب کچھ دیکھتے اور سنتے ہوئے بھی حکومتِ الٰہیہ کی وضاحت میں ایسے مصروف ہو گئے کہ انہوں نے مجلس احرار کی سہارن پور والی قرارداد کے دوسرے حصے پر عمل کرتے ہوئے مسلم لیگ اور کانگرس کے جھگڑوں میں الجھنا غیر مناسب سمجھا، اور اس طرح یہ سال بھی گذر گیا۔

نئے سال کے طلوع ہوتے ہی دوسری جنگِ عظیم کے برستے ہوئے بادلوں کے

دامن خشک ہو رہے تھے کہ ۱۵۔اگست ۱۹۴۵ء کو امریکہ نے جاپان کے خوبصورت شہر ہیروشیما پر ایٹم بم دے مارا۔اس سے پیشتر جرمن اتحادیوں کے سامنے سپر انداز ہو چکا تھا۔ اس طرح جنگ کے خاتمہ پر جہاں اور بہت سی تبدیلیاں آئیں، وہاں لندن کی کنزرویٹو پارٹی نے الیکشن ہار کر حکومت کا چارج لیبر پارٹی کے سپرد کر دیا۔برطانیہ کی نئی حکمران پارٹی نے چونکہ اپنے ووٹروں سے ہندوستان میں نئی تبدیلیوں کے عنوان پر ووٹ لیے تھے لہٰذا ہندوستان کو جلد سے جلد آزاد کرنے کے منصوبے شروع کیے۔

بعد از جنگ کے حالات نے باوجودیکہ اتحادیوں کو فتح ہوئی تھی، برطانیہ کو دنیا کی تیسرے درجہ کی طاقت بنا دیا تھا۔ہندوستان کے سیاسی حالات بھی برطانیہ کے حق میں نہیں تھے۔ان واقعات کو دیکھتے ہوئے مصلحت کا تقاضہ تھا کہ برطانیہ ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہندوستانیوں کی رائے پر چھوڑ دے، چنانچہ ان دنوں برطانوی دانشوروں کے اکثر وفود ہندوستان آئے، جن میں ''کرپس مشن'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، جس نے مسلم لیگ اور کانگرسی راہنماؤں سے گفتگو کی۔

قائداعظم سے ملاقات کی خواہش

عالمی سیاسیات میں برطانیہ کی پوزیشن ڈوبتے سورج کے سہارے تلاش کر رہی تھی۔بدیں حالات یقین ہو چکا تھا کہ اب انگریز ہندوستان کو تقسیم کئے بغیر دم نہیں لے گا۔ چنانچہ امیر شریعت نے دہلی میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر محمد علی جناح (قائداعظم) سے مخاطب ہو کر کہا:

> ''پاکستان کی تصویر میرے بار بار سوچنے پر بھی سمجھ میں نہیں آئی۔میں جس قدر اس پر سوچتا ہوں اسی قدر کھو جاتا ہوں۔ لیکن اگر آپ کہتے ہیں کہ مسلمان قوم اور خود ہندوستان کی نجات بھی اسی میں ہے، تو اس سلسلے میں میرے چند خدشات ہیں۔ اگر آپ مجھے ملاقات کا موقع دیں اور میرے خدشات دور کر دیں تو پھر آپ آرام سے بمبئی بیٹھ جائیں، میں آپ کے

ایک ادنیٰ سپاہی کی حیثیت سے حصولِ پاکستان کے لیے ہندو اور انگریز دونوں سے نپٹ لوں گا۔

دیکھئے مسٹر جناح! یہ دس کروڑ مسلمان قوم کے مذہب اور اس کے مستقبل کا سوال ہے۔ یہ دس کروڑ عرب سے نہیں آئے، بلکہ اسی کفر گڑھ سے خواجہ معین الدینؒ چشتی (اجمیری) حضرت خواجہ مجدد الف ثانی سرہندیؒ، حضرت علی ہجویریؒ (داتا گنج بخش) حضرت نظام الدین اولیا (دہلی) حضرت پیران کلیرؒ جیسے ولی، قطب، ابدال اور شب زندہ دار لوگوں نے اپنی ریاضت و عبادت سے راجپوتانہ ایسے کفر گڑھ میں بیٹھ کر انہیں مسلمان کیا تھا۔ اگر ہندو اور انگریز کی ملّی بھگت سے ان دس کروڑ مسلمانوں کو کسی طرح کا نقصان پہنچا تو اس کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔"

اسی مجمع میں آپ نے عوام سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"میں نے اپنی عمر کا ایک تہائی حصہ فرنگی سے لڑ کر اس کے جیل خانوں میں گذارا ہے، مگر جو بات ایک دفعہ سمجھ میں آگئی ہے پھر اس سے منہ نہیں موڑا، اور انگریز جیسی جابر سلطنت کے سامنے کھڑے ہو کر وہی کچھ کہا جس سے میرا ضمیر مطمئن تھا۔ میں مسٹر جناح کا بے حد احترام کرتا ہوں۔ میری ان سے سیاسی لڑائی ہے ذاتی نہیں۔ آج میں آپ لوگوں کو گواہ کر کے یہ بات کہتا ہوں کہ اپنی بات سمجھنے کے لیے اگر مجھے مسٹر جناح کے قدموں پر اپنی یہ سفید داڑھی بھی رکھنی پڑی، تو خدا کی قسم میں اس سے گریز نہیں کروں گا۔ لیکن بات سمجھے بغیر ان کی ہاں میں ہاں ملانے پر تیار نہیں ہو سکتا اچاہے میری قوم میرے خلاف ہو جائے۔"

اس سے ملتے جلتے خیالات کا اظہار امیر شریعت نے قریباً سارے ہندوستان میں

کیا۔ مگر قائداعظم کی طرف سے کوئی جواب وصول نہ ہوا، تاآنکہ ملک میں ۱۹۴۶ء کے نئے انتخابات کا ہنگامہ شروع ہوگیا۔ یہ ۱۹۴۵ء کے وسط کا واقعہ ہے۔ دسمبر ۱۹۴۵ء کے آخر تک انتخابات کے نتیجے سامنے آئے تو مسلم لیگ ہندوستان میں اسی فیصد کامیاب رہی لیکن امیر شریعتؒ کے خدشات بدستور رہے، جن کا اظہار وہ کبھی کبھار نجی محفلوں میں بھی کرتے، لیکن اس آس پر کہ شاید الیکشن سے فارغ ہوکر قائداعظم انہیں بلائیں گے۔ بالآخر امیر شریعتؒ کی اس خواہش کو ٹھکرا دیا گیا۔

قرارداد مجلس احرار

ہندوستان کے سیاسی حالات و واقعات دیکھتے ہوئے برطانیہ کی نئی حکومت نے جس کے سربراہ مسٹر اٹیلی تھے، ۱۹۔ فروری ۱۹۴۶ء کو برطانوی پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ کابینہ کے تین وزراء کا ایک وفد ہندوستان جاکر وہاں کی مختلف سیاسی پارٹیوں سے گفتگو کرے گا! اس اعلان کے پیش نظر ۲۴۔ مارچ (۱۹۴۶) کو برطانوی وفد ہندوستان پہنچ گیا، جس کی قیادت وزیر ہند مسٹر لارڈ پیتھک لارنس کر رہے تھے۔ امیر شریعت نے جب یہ خبر اخبارات میں پڑھی تو ۲۵۔ مارچ کو لاہور پہنچ کر صدر مجلس احرار شیخ حسام الدین کے مشورے سے ۲۷۔ مارچ کو لاہور مجلس احرار کی ورکنگ کمیٹی کا ہنگامی اجلاس طلب کر لیا۔ ممبران احرار ورکنگ کمیٹی سے پاکستان سے متعلق اپنے خدشات کا اظہار کرنے کے بعد امیر شریعتؒ نے حسب ذیل قرارداد پیش کی۔

ا۔ آل انڈیا مجلس احرار اسلام کی ورکنگ کمیٹی کا یہ اجلاس موجودہ اہم سیاسی مسائل کے متعلق ایک بار پھر اپنی پوزیشن واضح اور غیر مبہم طور پر ظاہر کرنا ضروری سمجھتا ہے۔

ب۔ جہاں تک مسلم لیگ کے نظریۂ پاکستان کا تعلق ہے مجلس عاملہ کسی صورت میں بھی اس سے اتفاق نہیں کرسکتی۔ ہم تقسیم ہند کے نظریہ کا تجزیہ محض اقتصادی اور معاشرتی اصولوں پر نہیں کرتے، پاکستان کے قبول کرنے

کا مطلب ملّت اسلامیہ ہندیہ کو تین مختلف حصوں میں منتشر کرنا ہوگا۔ پنجاب کا (نامکمل صوبہ) سرحد، سندھ اور بلوچستان ہندوستان کے ایک سرے پر اور بالکل دوسرے سرے پر مشرقی بنگال اور آسام کے کچھ اضلاع کو پاکستان بنایا جارہا ہے۔

ملّت اسلامیہ ان دو حصوں میں بٹ کر نہیں رہے گی، بلکہ اس سے ایک قابل قدر حصے پر ہندوستان میں دوامی غلامی مسلط رہے گی۔ ان دو پاکستانی ریاستوں میں مؤثر غیر مسلم اقلیت موجود رہے گی۔ نیز پاکستان کی یہ دونوں ریاستیں جغرافیائی اعتبار سے ایک دوسرے کی کسی بیرونی حملے کے وقت امداد نہیں کرسکیں گی اور ان دو ریاستوں کے درمیان ہندوؤں کو دنیا کی سب سے بڑی سلطنت سونپ دی جائے گی۔ جس میں مسلم اقلیت کی پوزیشن حد درجہ غیر مؤثر رہے گی۔

مزید برآں اب مسٹر جناح نے نواب زادہ لیاقت علی خاں کے نظریہ کو اپنا لیا ہے اور سکھوں کی علیحدہ سلطنت بنانے کے حق کو تسلیم کرکے پنجاب میں جمنا سے لے کر راوی بلکہ چناب تک کا علاقہ مغربی پاکستان سے علیحدہ ہونا درست قرار دے دیا ہے۔ اس روش کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ بنگال اور آسام کے صوبوں کی بھی اسی طرح قطع و برید ہوگی، جس سے مغربی پاکستان کی طرح مشرقی پاکستان بھی پہلے سے زیادہ بے وقعت اور اقتصادی لحاظ سے بے حال ہو جائے گا۔

ان ٹھوس حقیقتوں کے بعد کوئی ذی شعور جماعت جو مسلمانوں کے تحفظ حقوق کا دعویٰ کرتی ہے اس مہلک نظریہ سے متفق نہیں ہوسکتی۔

مجلس عاملہ اس حقیقت کا اعلان کرنا ضروری سمجھتی ہے کہ یہ تمام خلافِ

آئین و اخلاق سرگرمیاں اور محدود حق رائے دہندگی مسلم لیگ کی وقتی کامیابی کی ضامن ہوئیں۔ مسلم لیگ کی قیادت مسلمانوں کو ایک غیر منظم قوم اور بے ہنگام گروہ کی حیثیت دینا چاہتی ہے۔ لہٰذا یہ اجلاس ایک بار پھر اعلان کرتا ہے کہ مسلم لیگ کی قیادت قطعی غیر اسلامی ہے۔ اس کا عمل آج تک ملت اسلامیہ کے مفاد کے منافی رہا ہے۔ مرکزی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں میں اسلامی قوانین کی مخالفت اس کا مستقل شعار ہے۔ اس لیے مسلمان سیاسی، مذہبی، تمدنی راہنمائی کی توقع مسلم لیگ کی غیر اسلامی قیادت سے نہیں کر سکتے، اور مسلم لیگ کے کسی فیصلے کو اسلامی ہند کا فیصلہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔

اپنی اس قرارداد کی تائید میں تقریر کرتے ہوئے امیر شریعتؒ نے کہا:

رفقائے محترم! گذشتہ سال کے وسط میں میں نے دہلی میں پاکستان سے متعلق اپنے خدشات اور دلی اطمینان کے لیے جناح صاحب سے درخواست کی تھی کہ وہ مجھے پاکستان کی تھیوری سمجھائیں۔ اگر ان کا نظریہ درست نکلا اور مجھے ذہنی اطمینان ہوا تو میں انشاء اللہ حصولِ پاکستان کے لیے انگریز اور ہندو دونوں سے ٹکرا جاؤں گا۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ جناح صاحب نے میری حقیر گذارش کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ آج میں نے ورکنگ کمیٹی کے سامنے اپنے خدشات کا اظہار کر دیا ہے۔

میں صرف آئینی سمجھوتے میں ہندوستان کی نجات نہیں سمجھتا، اور نہ ہی میرے نزدیک الیکشن کی ہار جیت ملک یا قوم کے لیے نفع بخش ہو سکتی ہے۔ میں تو بس ہندوستان میں انگریز سے ایک ایسی لڑائی دیکھنے اور لڑنے کا متمنی ہوں کہ جس میں گھر بار تباہ و برباد کر کے پھانسیاں لگنے کا پروگرام ہو، بس یہی پروگرام آزادیٔ ہند کے مسئلے کو حل کر سکتا ہے۔ جماعت کو الیکشن نہیں لڑنا چاہیے تھا

بلکہ کوئی اور ٹھوس پروگرام سامنے رکھ کر کام کرنا چاہیے۔

پاکستان کے بارے میں گزشتہ سال سے میں نے جس جگہ بھی تقریر کی، پاکستان کو مسلمانانِ ہندوستان کے لیے مہلک بلکہ ہلاکت آفرین اور ہلاکت خیز بتایا ہے اور دلائل سے یہ باتیں ثابت کی ہیں۔ میری سمجھ میں پاکستان کے حق میں کوئی دلیل بھی تو نہیں آئی۔ اس وقت قوم کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ میں نہیں کہتا کہ میری رائے مان لی جائے، سب کو ہی اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے۔ اگر کسی کے پاس میرے دلائل کے خلاف کوئی واضح اور ٹھوس دلائل ہوں تو مجھے اپنی تجویز پر اب بھی ضد نہیں ہے۔"

امیر شریعتؒ کی اس تقریر کے بعد ورکنگ کمیٹی نے جمعیۃ العلماء ہند کی حسب ذیل سہارنپور والی قرارداد کو تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ منظور کر لیا۔

"جمعیت العلماء ہند کے نزدیک تمام ہندوستان کے لیے عموماً اور مسلمانوں کے لیے خصوصاً یہ صورت مفید ہے کہ وہ حسب ذیل نکات پر اتفاق کر لیں اور اس بنیاد پر حکومتِ برطانیہ کے سامنے متفقہ مطالبہ پیش کریں۔

ا۔ ہمارا نصب العین آزادیٔ کامل ہے۔

ب۔ وطن کی آزادی میں مسلمان آزاد ہوں گے، ان کا مذہب آزاد ہوگا۔ مسلم کلچرل، تہذیب و ثقافت آزاد ہوگی۔ وہ کسی ایسے آئین کو قبول نہ کریں گے، جس کی بنیاد ایسی آزادی پر نہ رکھی گئی ہو۔

ج۔ ہم ہندوستان میں کامل آزادی اور خود مختاری کے حامی ہیں، غیر محدود داخلی اختیارات صوبوں کے ہاتھ میں ہوں گے اور مرکز کو صرف وہی اختیارات ملیں گے جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالے کریں اور ان کا تعلق تمام صوبوں سے یکساں ہو۔

د: ہمارے نزدیک ہندوستان کے آزاد صوبوں کا وفاق ضروری اور مفید ہے، مگر ایسا وفاق اور ایسی مرکزیت جس میں اپنی مخصوص تہذیب و ثقافت کے مالک نو کروڑ نفوس پر مشتمل مسلمان قوم کسی غالب اکثریت کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو، ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا نہ ہوگی۔ یعنی مرکز کی تشکیل ایسے اصولوں پر ہونی ضروری ہے کہ مسلمان اپنی مذہبی، سیاسی و تہذیبی آزادی کی طرف سے مطمئن ہوں۔

۱: مرکزی ممبروں کی تعداد کا یہ تناسب ہو۔ ہندو ۴۵ - مسلمان ۴۵ " اور دیگر اقلیتیں - ۱۰ فی صد۔

۲: مرکزی حکومت میں اگر کسی بل یا تجویز کو مسلم ارکان کی ۲/۳ اکثریت اپنے مذہب یا اپنی سیاسی آزادی یا اپنی تہذیب و ثقافت پر مخلصانہ اثرانداز قرار دے تو وہ بل یا تجویز ایوان میں پیش ہو تو پاس نہ ہو سکے گی۔

۳۔ ایک ایسا سپریم کورٹ قائم کیا جائے جس میں مسلم و غیر مسلم ججوں کی تعداد مساوی ہو، اور جس کے ججوں کا تقرر مسلم و غیر مسلم صوبوں کی مساوی تعداد کے ارکان کی کمیٹی کرے۔

یہ سپریم کورٹ مرکز اور صوبوں کے درمیان تنازعات یا صوبوں کے باہمی تنازعات یا ملک کی قوموں کے اختلافات کا آخری فیصلہ کرے گی۔ نیز تجویز نمبر ۲ کے تحت اگر کسی بل کے مسلمانوں کے خلاف ہونے، نہ ہونے میں مرکزی اکثریت مسلم ارکان کی ۲/۳ اکثریت کے فیصلے سے اختلاف کرے تو اس کا فیصلہ سپریم کورٹ سے کرایا جائے گا۔

۴: محکمہ قضا کا قیام۔

۵: ہندوستانی فوج میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مساوی نمائندگی ہوگی، تاکہ

کسی قوم کو زیادہ نیابت دوسری قوم کے لیے خوف و ہراس کا باعث نہ رہے۔

۶۔ مرکز کی طرف سے پسماندہ صوبوں میں تعلیم و صنعت کے مستقل عطیہ جات۔

۷۔ اقلیتوں کے لیے صوبوں میں ویٹیج کا طریقہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔

۸۔ ہندوستان میں مختلف ملتوں کے کلچرل، زبان، مذہبی تعلیم، مذہبی تبلیغ، مذہبی عقائد، مذہبی اعمال، عبادت گاہیں، اوقاف آزاد ہوں گے، حکومت ان میں مداخلت نہ کرے گی۔

۹۔ دستور اساسی میں اسلامی پرسنل لا، کی حفاظت کے لیے خاص دفعہ رکھی جائے گی، جس میں تشریح ہو گی، کہ مجالس قانون ساز اور حکومت کی جانب سے ان میں مداخلت نہ کی جائے گی اور پرسنل لا، کی چیزیں مثلاً احکام نکاح، طلاق، رجعت، عدّت، خیار، بلوغ، تفریق زوجین، خلع مفقود، نفقہ زوجیت، حضانت، ولایت، نکاح و مال وصیت، وقف وراثت، تکفین و تدفین و قربانی وغیرہ،

۱۰۔ مسلمانوں کے لیے ایسے مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے جن میں مسلمان حاکم کا فیصلہ ضروری ہے، مسلم قاضیوں کا تقرر کیا جائے گا۔ اور ان کو اختیارات تفویض کیے جائیں گے۔"

مجلس احرار کی یہ تاریخی قرار داد دور رس نتائج کی حامل تھی۔ وقتی اور فوری اثرات سے بے نیاز ہو کر احرار رہنماؤں نے اپنی دانست میں مسلمانانِ ہندوستان کے مستقبل کو ایسی قرار داد کے ذریعے محفوظ سمجھا۔

دہلی کا آخری اجلاس

ورکنگ کمیٹی کے اجلاس سے فارغ ہو کر حضرت امیر شریعت اپنے رفقاء مولانا حبیب الرحمٰن، شیخ حسام الدین اور ماسٹر تاج الدین انصاری کی معیت میں ۲۲۔ مارچ (۱۹۴۶ء) کو دہلی روانہ ہو گئے، جہاں

انہوں نے مختلف الخیال رہنماؤں سے بات چیت کی۔

ان دنوں دہلی میں برطانوی مشن مسلم لیگ اور کانگرسی راہنماؤں سے سیاسی مذاکرات میں مصروف تھا۔ ۳۰۔ مارچ کو جمعیت العلمائے ہند کے راہنماؤں سے ان کی دعوت پر امیر شریعت کی گفتگو ہوئی، جس میں مجلس احرار کی قرارداد کا بھی ذکر آیا۔ اور آخر میں جمعیت کے ناظم اعلیٰ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے مجلس احرار کی قرارداد کو مسلمانانِ ہند کے لیے پسندیدہ قرار دیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو سے بھی انہی دنوں ملاقات ہوئی۔

۲۶۔ اپریل (۱۹۴۶ء) کو رات گیارہ بجے اردو پارک (دہلی) میں امیر شریعتؒ نے ایک کثیر اجتماع سے خطاب کیا۔ یہ آخری اجتماع ہے، اس کے بعد امیر شریعتؒ پھر کبھی دہلی نہیں جا سکے۔ اس اجتماع میں قریباً پانچ لاکھ انسانوں نے شرکت کی چشم دہلی نے پیشتر ازیں اتنا بڑا اجتماع کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس اجلاس کی صدارت مولانا حسین احمد مدنی نے کی، اور اسٹیج سیکرٹری کے فرائض شیخ حسام الدین نے انجام دیے، جبکہ عوام کو سنبھالنے کا انتظام احرار رضا کاروں کے ذمے تھا۔ اجتماع کے چاروں طرف احرار رضا کاروں کے دستے متعین تھے۔ اجتماع کے چاروں طرف احرار پرچم لالہ و گل کی سی بہاریں دکھا رہے تھے۔ اسٹیج پر مولانا حبیب الرحمٰن، ماسٹر تاج الدین انصاری اور جمعیت العلمائے ہند کے راہنما موجود تھے۔

اچانک ہنسانی سمندر میں ایک لہر اٹھی، ایک ارتعاش پیدا ہوا، دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ شوقِ دید تجسس کے لیے سرگرداں ہوا کہ امیر شریعتؒ زندہ باد کے نعروں نے جلسے کے امن و سکون کی ساری طنابیں توڑ دیں۔ عوام اپنے محبوب راہنما کی زیارت کے لیے سراپا نیاز اٹھ کھڑے ہوئے، شاہجہان کی مسجد کے مینار اور لال قلعہ کی دیواریں محوِ دید تھیں۔ آسمان ستاروں کی روشنی میں دنیا کی اندھیر گردی میں روشن چراغوں کو آخری بار ٹمٹماتے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

امیر شریعتؒ اسٹیج پر تشریف لائے کہ ایک دوسرا قافلہ آن پہنچا۔ اس میں برطانوی مشن کے سربراہ وزیر ہند لارڈ پیتھک لارنس، مولانا آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو نمایاں تھے، اسٹیج اس وقت بین الاقوامی شخصیتوں سے بارونق تھا۔ ٹھیک بارہ بجے حضرت امیر شریعتؒ نے قرآن کریم کی تلاوت شروع کی۔ الفاظ جیسے جیسے آگے بڑھتے جاتے تھے قرآن حکیم اپنے معانی و مطالب آپ سے آپ واضح کرتا جاتا۔ حضرت امیر شریعتؒ کے گلے کی حلاوت اور طرزِ بیان سے ایسا محسوس ہوتا جیسے آیاتِ خداوندی کا نزول ہو رہا ہو۔ لاکھوں انسانوں کے اجتماع میں ہو کا عالم۔ اس خاموشی کو کبھی کبھار آسمان پرستاروں کی انگڑائیاں توڑ رہی تھیں۔

"میں تو صرف بخاری صاحب کا قرآن سننے کے لیے حاضر ہوا تھا، اب میں اجازت چاہتا ہوں۔ برطانوی مشن کی آمد کے باعث میں زیادہ مصروف ہوں۔"

یہ تھے پنڈت جواہر لال نہرو کے الفاظ، جو انہوں نے امیر شریعت کے اختتامِ قرآن پر مجمع سے خطاب کرتے ہوئے کہے اور واپس چلے گئے۔ امیر شریعتؒ نے انسانی سمندر کے بحرِ بیکراں پر ایک نظر ڈالی اور خلافِ معمول خطبۂ مسنونہ سے پہلے فرمایا۔

"آپ حضرات درود شریف پڑھیں۔"

پھر فرمایا "درود شریف پڑھیں"۔ تیسری بار بھی عوام سے یہی مطالبہ کیا، لوگ حیران تھے کہ اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا۔ آج یہ نئی رسم کیوں؟ اس سوال کے جواب میں خود ہی امیر شریعتؒ نے فرمایا:

"میں نے ایسا اس لیے کیا ہے کہ اتنے بڑے عظیم اجتماع کی موجودگی کے باوجود صبح یار لوگ اخباروں میں کہیں گے کہ رات مجمع تو چار پانچ

لاکھ کا تھا، مگر اس میں مسلمان کوئی نہیں تھا۔ اس لیے میں نے درود شریف پڑھوا لیا ہے، تاکہ دوستوں کو اندازہ ہو جائے کہ اس مجمع میں مسلمان ہیں یا یہ مجمع مسلمانوں کا ہے۔"

اس پر تمام مجمع کشتِ زعفران بن گیا۔

خطبہ مسنونہ کے بعد تقریر کرتے ہوئے حضرت امیر شریعتؒ نے کہا:

"حضرات! مجھے آج کوئی تقریر نہیں کرنی، بلکہ چند حقائق ہیں، جنہیں بلا تمہید عرض کروں گا۔ اس وقت آئینی اور غیر آئینی دنیا میں خواہ اس کا تعلق ایشیا سے ہو یا یورپ سے، جو بحث چل رہی ہے، وہ یہ ہے کہ آیا ہندو اکثریت کو مسلم اقلیت سے جدا کر کے برصغیر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ قطع نظر اس بحث کے کہ مجھے پاکستان بن جانے کا اسی قدر یقین ہے جتنا کہ اس بات پر کہ صبح سورج مشرق سے طلوع ہونے والا ہے، لیکن یہ پاکستان وہ پاکستان نہیں ہوگا جو اس وقت کے دس کروڑ مسلمانانِ ہند کے ذہنوں میں موجود ہے، اور جس کے لیے آپ بڑے خلوص سے کوشاں ہیں، ان مخلص نوجوانوں کو کیا معلوم کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

بات جھگڑے کی نہیں، سمجھنے اور سمجھانے کی ہے۔ تحریک پاکستان کی قیادت کرنے والوں کے قول و فعل میں بنیادی تضاد ہے۔ اگر آج مجھے کوئی اس بات کا یقین دلا دے کہ کل کو ہندوستان کے کسی قصبے کی کسی گلی میں شریعتِ اسلامیہ کا نفاذ ہونے والا ہے تو میں آج ہی اپنا سب کچھ چھوڑ کر آپ کے ساتھ رہنے کے لیے تیار ہوں لیکن یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ جو لوگ اپنی اڑھائی من کی لاش

اور چھ فٹ قد پر اسلامی قوانین نافذ نہیں کر سکتے، جن کا اٹھنا، بیٹھنا، جن کا سونا، جاگنا، جن کی وضع قطع، رہن سہن، بول چال، زبان لباس، غرض کوئی چیز اسلام کے مطابق نہ ہو، وہ ایک قطعہ زمین پر اسلامی قوانین کس طرح نافذ کریں گے"؟

کلہاڑی کو دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر امیر شریعتؒ نے مشرق اور مغربی پاکستان کے نقشے سمجھاتے ہوئے کہا:

"ادھر مغربی پاکستان ہوگا، ادھر مشرقی پاکستان، درمیان میں چالیس کروڑ ہندو کی حکومت ہوگی، لالوں کی حکومت، لالے دولت والے، لالے ہاتھیوں والے، ہندو اپنی عیاری اور مکاری سے پاکستان کو ہمیشہ تنگ کرے گا۔ اسے کمزور بنانے کی ہر کوشش ہوگی۔ آپ کے دریاؤں کے پانی روک دیئے جائیں گے، آپ کی معیشت تباہ کرنے کی کوشش کی جائے گی، اور آپ کی حالت یہ ہوگی کہ بوقتِ ضرورت مشرقی پاکستان، مغربی پاکستان کی اور مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان کی مدد کرنے سے قاصر ہوں گے۔ پاکستان پر چند خاندانوں کی حکومت ہوگی اور یہ خاندان زمینداروں، صنعت کاروں کے خاندان ہوں گے۔ جو اپنی من مانی کارروائیوں سے عوام الناس کو پریشان کر کے رکھ دیں گے۔ غریب کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ امیر دن بدن امیر تر ہو جائیں گے اور غریب، غریب تر"

رات کافی بھیگ چکی تھی۔ حضرت امیر شریعتؒ اپنی سیاسی بصیرت اور سوجھ بوجھ کے موتی بکھیر رہے تھے۔ مستقبل سے ناآشنا مسلمان منہ کھولے انجانے واقعات حیرت سے سن رہا تھا۔ اسی طرح ہندو سے خطاب کرتے ہوئے امیر شریعتؒ نے کہا:

"پاکستان کی بنیاد ہندو کی مسلمان دشمنی پر استوار ہوتی ہے اور لت

سے پیار کرنے والے ہندو نے، گائے کی پوجا کی، پیپل مہاراج پر پھول چڑھائے، چیونٹیوں کے بلوں پر چاول ڈالے، سانپ کو اپنا دیوتا مانا۔ لیکن مسلمان سے ہمیشہ نفرت کی۔ اس کے سائے تک سے اپنا دامن بچائے رکھا، پھر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ بڑے سے بڑے ہندو نے اچھوتوں پر اپنے مندروں کے دروازے کھول دیئے۔ لیکن مسلمان سے اس قدر نفرت کی کہ اس کے لیے دل کے دروازے کبھی وا نہ کیے ——

آج اسی نفرت کا نتیجہ ہے کہ مسلمان اپنا الگ وطن مانگنے پر مجبور ہوا ہے کانگرس یہ سب کچھ دیکھ کر بھی مصلحتاً خاموش رہی۔ اگر کانگرسی راہنما، ہندو مہاسبھا، آریہ دل اور اسی قسم کی تحریکوں کو اپنے اثر سے ختم کر دیتے تو مسلم لیگ کے پنپنے کی یہاں کوئی گنجائش نہ ہوتی، مگر میں کیا کروں یہ کوڑھ کانگرس کے اندر سے پھوٹا ہے۔ جو بیماری جسم کے اندر سے پیدا ہو، اس کا علاج باہر کے اثرات کیسے کر سکتے ہیں۔ کانگرس نے ہمارے ساتھ بھی نباہ نہ کیا۔ اگر مسلم لیگ سے بگاڑ ہی تھی، تو نیشلسٹ مسلمان کی بات ہی مان لی ہوتی۔ آج اس قدر قربانیوں کے باوجود فرنگی کو اپنا ثالث مان رہے ہو۔ اے کاش! ہم سے نہیں تو مسلم لیگ ہی سے نباہی ہوتی، تاکہ آپس میں بیٹھ کر کوئی معاملہ طے کر لیا جاتا۔ لیکن اس قدر قربانیوں کے باوجود آج فرنگی کو اپنا ثالث مان رہے ہو!"

آخر میں امیر شریعتؒ نے زوردار آواز میں کہا:۔

"مسلم لیگ اور کانگرس دونوں میری بات سنو! ؎

احباب جمع ہیں میسر دردِ دل کہہ لے
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

یاد رکھو! اگر تم باہم مل بیٹھ کر کوئی معاملہ طے کر لیتے تو الگ الگ رہ کر بھی شیر و شکر رہتے، مگر تم نے فرنگی سے اپنا انصاف مانگا ہے، وہ تم دونوں کے درمیان کوئی نہ کوئی ایسا فساد ضرور پیدا کر جائے گا کہ تم دونوں قیامت تک چین سے نہیں بیٹھ سکو گے۔ آج تلواروں اور لاٹھیوں سے لڑنے ہو تو آنے والے کل کو توپ اور بندوق سے لڑو گے۔ تمہاری اس نادانی سے انسانیت کو جو نقصان ہوگا، عورت کی جو توہین ہوگی اور شرافت جس بری طرح برصغیر میں زخمی ہوگی، اس کے لیے تم دونوں مجرم ٹھہرو گے وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ ؎

اب تو جاتے ہیں میکدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا!

امیر شریعتؒ کی یہ تقریر تقریباً ساڑھے پانچ گھنٹے جاری رہی، تا آنکہ شاہی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی اور صبح کی نماز اسی جگہ ادا کی گئی۔

امیر شریعتؒ کشمیر میں

امیر شریعت ہندوستان کے تمام سیاسی راہنماؤں سے برصغیر کے حالات پر گفتگو میں ہی کے آخر تک مصروف رہے حالات ان دنوں عاجلانہ طور پر آگے بڑھ رہے تھے، ہر صبح کا سورج نئے واقعات ڈھال رہا تھا مجلس احرار کے رہنماؤں کی نگاہیں کانگرس، مسلم لیگ اور برطانوی مشن کی ایک ایک حرکت کو احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ آخر یہی بہتر سمجھا کہ مسلم حقوق کے معاملات میں کانگرس کے مقابل مسلم لیگ کو ذمہ داری سونپ دی جائے، اس فیصلہ کے بعد احرار رہنما وقتی طور پر گوشۂ تنہائی میں خاموش جا بیٹھے۔

انہی دنوں امیر شریعتؒ اپنے حرم محترم سمیت کشمیر چلے گئے اور سری نگر سے چند میل دور سوپور نامی گاؤں میں خواجہ غلام محمد بٹ کے ذاتی مہمان ہوئے۔ امیر شریعتؒ

کی قیام گاہ لبِ سڑک ایک اوسط درجے کے دو منزلہ مکان پر تھی۔

ہندوستان کے ساتھ ساتھ کشمیر کے حالات بھی انقلاب کی ہنگامہ آرائیوں سے نبرد آزما تھے۔ سری نگر کے درمیان بہتا ہوا دریائے جہلم کا پانی کشمیری حریت پسندوں کے خون سے نہ جانے کتنی بار اپنی رنگت تبدیل کر چکا تھا۔ ڈوگرہ شاہی سے نجات کے لیے کشمیری غلام اپنی آخری پونجی داؤ پر لگا چکا تھا۔ مسلم لیگ اور کانگرس کی سیاسی ضرورتیں یہاں بھی اپنا جادو چلا رہی تھیں۔ لیکن امیر شریعت سوپور میں رہ کر بھی واقعات و حالات سے اس قدر انجان رہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ امیر شریعت کشمیر میں ہیں۔ اس گمنامی کے باعث صبح سے شام اور رات سے سویرا ہونے تک ذکرِ الٰہی میں مصروف رہتے، البتہ دن کے کسی حصے میں میزبان کی دکان پر آ بیٹھتے اور اخبارات پر ایک نظر ڈال لیتے، حالات سنتے اور پھر اپنی رہائش گاہ پر چلے جاتے۔ ان دنوں مولانا ابوالکلام آزاد بھی گلمرگ (کشمیر) میں قیام پذیر تھے۔ انہیں جب پتہ چلا کہ امیر شریعتؒ سری نگر میں موجود ہیں تو اس تمنا کے ساتھ راقم کے توسط سے ملاقات کی خواہش کی۔

"شاہ جی سے کہنا، زندگی اور موت کے مابین اب کوئی فاصلہ نہیں رہا۔

حالات نے دونوں کو جس ڈگر پر ڈال دیا ہے، جانے اس سفر میں کس

کی جیت ہو؟ اس لیے بہتر ہے کہ وقت نکال کر مل جائیں۔"

گلمرگ سے واپسی پر راقم نے امیر شریعت کو جب یہ پیغام دیا۔ تو بے اختیار رونے لگ پڑے اور اس قدر روئے کہ داڑھی آنسوؤں سے بھیگ گئی۔

خیالات کی ہم آہنگی بھی کیا چیز ہے ، برسوں کی رفاقت کے بعد ایک منزل کے دو راہی وقت کے عاجلانہ فیصلے کے ہاتھوں جب بے بس ہوئے اور اپنے ارادوں میں شکست نظر آنے لگی تو اپنی تمناؤں کی ساری عمارت اپنے آنسوؤں کی نذر کر دی۔

عبوری حکومت میں احرار کو شمولیت کی دعوت

ہندوستان کے سیاسی حالات بڑی تیزی کے ساتھ تبدیل ہو رہے تھے۔ برطانوی حکومت فیصلہ کر چکی تھی کہ ہندوستانیوں کو ان کے حقوق جلد سے جلد منتقل کر دیے جائیں۔

کانگرس اور مسلم لیگ کے مابین عبوری حکومت میں مساوی نمائندگی کی بحث چل رہی تھی، کانگرس اپنے نمائندوں میں ایک مسلمان کو شامل کرنا چاہتی تھی لیکن مسلم لیگ غیر مسلم لیگی مسلمان کو نمائندہ ماننے پر آمادہ نہیں تھی۔ اس بحث نے جب طول کھینچا تو بالآخر وائسرائے ہند لارڈ ویول نے ۱۶۔ جون ۱۹۴۶ء کو بہر حال عبوری حکومت بنانے کا اعلان کر دیا۔

فریقین میں بحث جاری تھی کہ اس دوران کانگرس نے مجلس احرار کو بھی دعوت دی کہ وہ عبوری حکومت میں شامل ہو جائے۔

غالباً کانگرس کا منشا تھا کہ اگر مسلم لیگ کسی طرح بھی عبوری حکومت میں شامل ہونے کے لیے راضی نہ ہو تو مجلس احرار کو شامل کر لیا جائے۔ احرار رہنماؤں نے امیر شریعت کے مشورے سے جو ان دنوں کشمیر میں تھے کانگرس کی اس پیش کش کا جواب حسب ذیل الفاظ میں دیا:۔

"ملک کی موجودہ حالت کے پیشِ نظر مجلس احرار یہ ضروری سمجھتی ہے کہ کانگرس، مسلم لیگ سے باوجود وسیع اختلافات کے کوئی ایسا عارضی سمجھوتہ کر لے جس پر مسلم لیگ کے نمائندے عارضی حکومت میں شامل ہو کر کام کر سکیں تاکہ متحدہ ہندوستان کی جدوجہد کسی نہ کسی مرحلہ پر کامیاب ہو جائے۔

۲: اگر مسلم لیگ عارضی حکومت میں شامل ہونے کے لیے کسی طرح بھی رضامند نہ ہو تو مجلسِ احرار اس شرط پر عارضی حکومت میں اپنا نمائندہ بطور وزیر

بھیجنے کو تیار ہے کہ مجلس احرار کا نمائندہ مجلس احرار کی ہدایت کے مطابق کام کرے گا۔

۳۔ مجلس احرار کا نمائندہ اس کا پابند نہ ہوگا کہ وہ سیاسی سمجھوتے یا عدم سمجھوتے کی بنا پر صرف کانگرس ہی کا ساتھ دے۔"

مولانا ابوالکلام آزاد نے مجلس احرار کی اس شرط کو جو کانگرس ہائی کمانڈ کی دعوت کے جواب میں تھی، کانگرس ورکنگ کمیٹی میں پیش کیا۔ سردار پٹیل نے اس مشروط پیشکش کی سخت مخالفت کی، بنا بریں مجلس احرار نے بلا شرط عارضی حکومت میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔

مسلم لیگی حلقوں میں خاص کر نواب زادہ لیاقت علی خاں تک جب یہ بات پہنچی تو انہوں نے احمد شاہ بخاری کے ذریعے شیخ حسام الدین کو جو ان دنوں مجلس احرار کے صدر تھے، مبارک باد کا تار بھیجا کہ "مجلس احرار نے ملک کے سیاسی سمجھوتے کے بارے میں ایک صحیح قدم اٹھایا ہے۔"

کشمیر سے واپسی

قریباً تین ماہ کے بعد جب امیر شریعت کشمیر سے واپس آئے تو برطانوی وفد حالات سے مات کھا کر واپس جا چکا تھا، لیکن ملک کے سیاستدان اپنی اپنی بساط پر نئے مہرے چل رہے تھے۔ کانگرس اور مسلم لیگ اقتدار کی کشمکش میں مصروف تھیں۔

غیر ملکی حکومت کا بجھتا ہوا چراغ دودِ محفل بنا ہوا تھا کہ ۲۔ نومبر ۱۹۴۶ء کو میرٹھ میں کانگرس کے سالانہ اجلاس کے موقعہ پر سردار ولبھ بھائی پٹیل نے اپنی تقریر کے دوران کہا:

"آج ۱۹۴۲ء کے حالات نہیں ہیں، کانگرس پہلے سے بہت زیادہ مضبوط ہے [illegible] زیادہ توانائی اور آسانی سے اپنے دشمنوں کا مقابلہ کر سکتی ہے موجودہ فرقہ وارانہ لڑائی اگر ختم نہ ہوئی، تو ان لوگوں کو جن پر حملے کا خدشہ ہے میں

کہوں گا کہ تلوار سے اپنی حفاظت کریں۔ ہندوستانیوں کو چاہیے کہ وہ غنڈوں سے اپنی حفاظت کریں۔ پولیس اور فوج پر انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ تلوار کا جواب تلوار ہے۔ میں لوگوں پر زیادہ زور دیتا ہوں کہ وہ حفاظت خود اختیاری کے لیے طاقت کا استعمال کریں۔

میں عوام کو یہ مشورہ اس لیے دے رہا ہوں کہ مرکز میں اس وقت کوئی گورنمنٹ نہیں، انتقالِ اختیارات کے اس مرحلے میں حکومت مفلوج ہو چکی ہے۔"

سردار پٹیل کی یہ تقریر کانگرس کی آئندہ پالیسی کی آئینہ دار تھی۔ اخبارات کے ذریعے جب یہ تقریر امیر شریعتؒ تک پہنچی تو ان کے ذہن میں ہندو ارادوں کا سارا نقشہ کھنچ گیا، وہ پارٹی سے مشورہ کے بعد متحدہ پنجاب کے اضلاع میں دورے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔

پنجاب میں ان دنوں مندروں میں جن سنگھ اور اکالی پارٹی ایک ساتھ سامانِ حرب کے طریقۂ استعمال کی مشق کر رہی تھیں۔ ہندو، سکھ ڈنڈ پیلتے اور اکھاڑوں میں ورزش کرتے ہندو محلوں کے سامنے آہنی دروازے لگا دیئے گئے۔ اس طرح اندرونِ خانہ مسلمانوں سے مقابلے کی پوری تیاری ہو رہی تھی۔ ریوالوروں اور دستی بموں سے قریباً تمام ہندو محلوں کو مسلح کر دیا گیا تھا، لیکن جذباتی مسلمان جسے مسلم لیگ نے صرف نعروں سے لیس کیا تھا، آنے والے خطرناک ہندو منصوبوں سے ناآشنا تھا۔ مسلمان نے ہمیشہ جذبات کی رَو میں سانس لی اور محض تدبیر کے سہارے تقدیر بنانے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ قوموں کی تقدیر۔ تدبیر سے نہیں شمشیر سے بنتی ہے۔ امیر شریعتؒ نے اس پرآشوب دور کو اپنی بالغ نظری سے بھانپ کر انبالہ سے راولپنڈی تک کے مسلمان نوجوانوں سے کہا:

"عزیزِ من! وقت آگیا ہے کہ اپنے تمام مذہبی اور سیاسی اختلاف کو

بھلا کر صرف اپنی آبرو بچانے کی تدبیریں سوچیں۔ ہمسایہ قومیں تمہارے مٹانے کی فکر کر رہی ہیں۔ سکھوں کے گوردوارے، ہندوؤں کے مندر جنگی قلعے بن گئے ہیں۔ سامانِ حرب سے لیس ہمسایہ قومیں تمہارے خون کی پیاسی ہیں۔

میں نے گذشتہ تیس سال سے تمہیں ایک طرف انگریز کے خلاف اُکسایا، تو دوسری طرف اپنے بازو پر بھروسہ کرنے کا سبق بھی دیا۔ عزیز من! تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ اپنے اندر زندہ رہنے کی صلاحیتیں پیدا کرو! قومیں جب قصاص لینے پر آتی ہیں تو لحاظ نہیں کرتیں، مگر تم نے میری ایک نہیں سنی۔ آخر وہی ہوا جس کا خطرہ تھا ؎

سبو اپنا اپنا ہے جام اپنا اپنا
کئے جاؤ مے خوار و کام اپنا اپنا

یاد رکھنا اگر اب بھی تم نے فیصلہ کرنے میں ڈھیل کی تو دریائے بیاس اور ستلج پانی کی بجائے تمہارے خون سے بہیں گے۔ جو کچھ میری نگاہیں دیکھ رہی ہیں، دشمن جو منصوبے باندھ چکا ہے۔ خدا نہ کرے، اگر ایسا ہوا تو پھر مسلمانو! تمہاری عزت و آبرو کا خدا حافظ۔ وقت تمہیں مہلت نہیں دے گا۔ اٹھو! حالات سے مقابلے کے لیے کفن بردوش ہو جاؤ۔ اپنے گھروں میں جس قدر سامانِ حرب جیسا کیسا ہو جمع کرو، اور اپنی حفاظت کے لیے کمر بستہ ہو جاؤ۔ یہ میری آخری گذارش ہے، پھر خدا جانے میں زندہ رہوں یا تم میں سے کوئی حالات کی نذر ہو جائے۔ یہ وقت زیادہ لمبی چوڑی تقریروں کا نہیں کہ میں تمہیں صبح تک بٹھائے رکھوں، لیکن نہیں۔ جاؤ! اپنے اپنے گھروں میں جو کچھ میں نے کہا ہے اس کی تیاری کرو۔"

اس قسم کی تقریریں امیر شریعتؒ نے پنجابی اور اردو زبان میں پنجاب کے شہروں قصبوں اور دیہاتی آبادیوں کے عام اجتماعوں میں کیں۔اس کے ساتھ وہ محلّوں میں خفیہ اجلاس بلا کر مسلمان نوجوانوں کو حالات و واقعات سے آگاہ کرتے۔نیز مخیّر حضرات کو اکساتے کہ وہ صوبہ سرحد سے اسلحہ منگوا کر نوجوانوں میں تقسیم کریں اور استعمال کی تربیّت بھی سیکھیں، فوجی پنشنروں کی خدمات حاصل کریں تاکہ اسلحہ کے استعمال کی تربیّت دے سکیں۔ جالندھر اور امرتسر جیسے مرکزی شہروں میں اسلحہ کی درآمد دسمبر ۴۶ ۱۹ء کے آخر تک جاری رہی۔ مجلسِ احرار کے ذمہ دار کارکن اور باعتبار مسلم لیگی اس اہم کام میں امیر شریعتؒ کے معاون تھے۔

سنہ ۱۹۴۷ء

۱۷۶۷ء میں سلطان حیدر علی والیٔ میسور نے آزادیٔ وطن کے لیے غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف جو جہاد شروع کیا تھا، ۱۹۴۷ء کا سال اس مہم کا آخری سال تھا۔ایک سواسی برس کی طویل جدوجہد کے دوران محبّانِ وطن کو غیر ملکی سامراج سے نبرد آزما ہونے میں جن سنگلاخ وادیوں سے گذرنا پڑا، تاریخ کا ایک ایک ورق اس خونچکاں داستاں کو مستقبل کی امانت سمجھ کر سمیٹ چکا ہے۔ برطانوی کیبنٹ کمیشن آج جن حیلے بہانوں سے پاک و ہند کے راہنماؤں کو اپنی بساط پر لیے بیٹھا ہے، یہ اس بجھتے ہوئے چراغ کی آخری لَو ہے، جس نے ایک سو اسی سال برصغیر پاک و ہند میں روشن رہ کر دلوں میں ایسی اندھیر گردی مچادی کہ نہ اس ملک کا تمدّن ہی اپنا رہا اور نہ اخلاق!

پاک و ہند کی نئی دیواریں تعمیر ہونے کا یقین پختہ ہو چکا تھا۔ہندوستان کی تمام قومیں اپنے اپنے حقوق کی نگہداشت میں چوکس نظر آرہی تھیں۔سکھوں کے لیڈر گیانی کرتار سنگھ نے اس افراتفری میں ۱۲۔جنوری ۱۹۴۷ء کو ایک پریس بیان میں اعلان کیا:۔

"وزارتی مشن کی سکیم کے مطابق جلد ہی گروپ اسمبلیاں قائم ہو رہی ہیں ان اسمبلیوں میں مسلم لیگ کی اکثریت ہوگی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ایسے گروپ بنا کر پاکستان کا اصول تسلیم کر لیا گیا ہے، ان حالات میں ہندو اور سکھوں کا مفاد اسی بات میں ہے کہ وہ اپنے لیے ایک الگ صوبے کا مطالبہ کریں"

پاک و ہند کے دوسرے سیاسی حلقوں کے علاوہ احرار حلقوں میں یہ بیان بڑی معنی خیز نظروں سے پڑھا گیا۔ سکھوں کے اس بیان سے تقسیم در تقسیم کا شبہ ہونے لگا۔ چنانچہ احرار نے ورکنگ کمیٹی کا فوری اجلاس طلب کیا۔ جس نے ۲۴۔مارچ ۱۹۴۷ء کو لاہور میں جنرل کونسل کا اجلاس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہندوستان کے حالات روز و شب بد سے بدتر ہو رہے تھے۔ یہ خبریں لندن پہنچیں تو ایوانِ برطانیہ سے ۲۰۔فروری ۱۹۴۷ء کو ایک اعلان شائع ہوا۔

"عبوری کابینہ میں کوئی سا فریق رہے اور کوئی سا نہ رہے۔ اس سے متعلق ہمارا جواب یہ ہے کہ ہم خود (برطانیہ) جون ۴۸ء تک یعنی زیادہ سے زیادہ اٹھارہ ماہ کے اندر ہندوستان سے اپنا ہاتھ کھینچ لیں گے، ہم چاہتے ہیں کہ یہاں سے رخصت ہوتے وقت حکومت کسی ایسی ادارے کے سپرد کر سکیں، جو کابینہ مشن پلان کے مطابق باہمی سمجھوتے سے قائم ہو"

برطانیہ کے اس اعلان نے حالات کو مزید پریشان کرنے میں کافی مدد دی۔ ان دنوں ہندوستان بے یار و مددگار تھا۔ نہ تو اس کا کوئی وارث اور نہ ہی اس پر کسی کا راج تھا۔ ۲۔مارچ کو پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ سر خضر حیات ٹوانہ نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ ۴۔مارچ کو ماسٹر تارا سنگھ نے پنجاب اسمبلی ہال سے باہر کرپان کو بے نیام

فضا میں لہراتے ہوئے اعلان کیا۔

"جو مانگے گا پاکستان! اس کو دیں گے قبرستان"

تارا سنگھ کے ان الفاظ کی تائید ہندو راہنماؤں نے کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسی شام امرتسر میں سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان خونریز فساد کی ابتدا ہوئی۔ حضرت امیر شریعتؒ اس وقت امرتسر میں موجود تھے۔ حالات کا رُخ دیکھ کر محلے کے تمام نوجوانوں کو اپنے گھر میں جمع کیا اور انہیں اپنے گھروں کی حفاظت کے لیے تیار رہنے کی تلقین کی اور خود ان کے ساتھ تمام رات تلوار سے مسلح پہرہ دیتے رہے۔ دوسرے دن بھی ایسا ہی ہوا اور رات بھر محلے داروں کی معیت میں گلوالی گیٹ سے باہر، جس کے قریب ہی سکھوں کا مرکز تھا، پہرہ دار رہے۔ آخر ۶۔ مارچ کو امرتسر میں کرفیو لگا دیا گیا۔

تقسیمِ پنجاب کی مخالفت

سکھوں کے ۱۲۔ جنوری والے اعلان کے بعد مجلس احرار اپنے اجلاس میں تقسیمِ پنجاب کی شدت سے مخالفت کر چکی تھی کہ ۱۹۔ مارچ کو لاہور بریڈلے ہال میں پنجاب سوشلسٹ پارٹی اور مجلسِ احرار کا مشترک اجلاس ہوا، جس میں حضرت امیر شریعتؒ نے تقسیمِ پنجاب کی مخالفت میں دو گھنٹے تک اپنے دلائل دیے اور اپنے خدشات کا از سرِ نو اظہار کیا، اور مسلم لیگ پر زور دیا کہ وہ پنجاب کی تقسیم کو کسی صورت میں بھی منظور نہ کرے ورنہ مشرقی پنجاب کا مسلمان تباہ ہو جائے گا۔

آخر وہی ہوا، جس کا خدشہ تھا۔ پنجاب کے فسادات کی آڑ لے کر کانگرس نے اعلان کیا۔

"پنجاب اور بنگال کی تقسیم ناگزیر ہے"

ہندو مہا سبھا اس کے لیے پہلے سے تیار تھی، گو گاندھی جی نے اس اعلان کی مخالفت کی، لیکن واقعات اس قدر تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے کہ نہ حکومت رہی تھی اور نہ لیڈر، دونوں بیکار ہو چکے تھے۔ ایسی افراتفری کے دور میں ۲۲ مارچ (۱۹۴۷ء) کو لاہور میں مجلسِ احرار کی جنرل کونسل نے ایک ہزار سے زائد نمائندوں کی موجودگی میں

سہ روزہ بحث کے بعد حسب ذیل تاریخی قرارداد منظور کی:۔

"پنجاب کے حالیہ فسادات میں وحشت و بربریت، لوٹ مار، آتش زدگی، قتل و خونریزی وغیرہ جرائم کا سیلاب جس بے پناہ تیزی کے ساتھ بروئے کار آیا اور جس باقاعدگی سے اس خانہ جنگی کو ہوا دینے کے لیے صوبہ کے مقتدر اور ذمہ دار غیر مسلم افراد اور جماعتوں نے اس میں حصہ لیا، اس کی روشنی میں مجلس احرار اسلام ہند کی یہ پختہ رائے ہے، کہ یہ انسانیت سوز تصادم برطانوی استعمار کے حالیہ اعلان کا بدیہی نتیجہ ہے، جس میں قطعی طور پر ہندوستان کی زمام اقتدار کو منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے اور جس کے باعث صوبے کی غیر مسلم اقلیتوں نے انتقال اختیارات سے پیشتر ہی جبر و تزویر سے ایسی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی جس سے سہم کر صوبے کی اکثریت اپنے جائز اور آئینی حق کے استعمال سے قاصر اور مجبور ہو کر رہ جاتے، اور صوبے کا اقتدار آسانی کے ساتھ غیر مسلم فسطائی قوتوں کے قبضہ و تصرف میں منتقل ہو سکے، چنانچہ خضر وزارت کے مستعفی ہونے کے فوراً بعد ڈاکٹر گوپی چند بھارگو، سردار پرتاب سنگھ کیرو، ممبر کانگرس ورکنگ کمیٹی، چودھری کرشن گوپال دت، چودھری لہری سنگھ، سیٹھ سدرشن اور مسٹر لیشیال خازن پنجاب کانگرس کمیٹی جیسے کانگرسی رہنماؤں نے قومیت متحدہ کے بلند بانگ دعویٰ کو پس پشت ڈال کر ماسٹر تارا سنگھ اور گیانی کرتار سنگھ جیسے اکالی رہنماؤں سے گٹھ جوڑ کیا، اور لنگر لنگوٹ کس کر یہ اعلان کرتے ہوئے نہ شرمائے، کہ ہم ہر قیمت پر صوبہ میں مسلم اکثریت کو اس کے جائز حق سے محروم رکھیں گے، خواہ اس سے صوبے کے امن اور انسانی جانوں کو کتنا ہی نقصان کیوں نہ پہنچے

واضح رہے کہ یہ صورتِ حال اضطراری نہیں بلکہ پہلے سے طے شدہ سکیموں اور سازشوں کا بدیہی ردِ عمل ہے جس کا علم ملک کو پہلے پہل اس وقت ہوا تھا، جب ماسٹر تارا سنگھ نے گورنمنٹ ہند اور برطانوی حکومت کو تسلی دینے کے لیے روزنامہ "اجیت" کے "کلغی دھر نمبر" میں مورخہ ۱۰۔ جنوری ۱۹۴۵ء کو ایک توضیحی مضمون اپنے نام سے چھپوایا تھا۔ اس سے ایک طرف تو ماسٹر صاحب کا مقصد یہ تھا کہ ان کی پارٹی کے متعلق انگریز دشمنی کے الزامات کی تردید ہو جائے، اور ساتھ ہی ہندو فسطائیت کو یہ یقین دلایا جائے کہ اکالی سورماؤں نے مہاراجہ پٹیالہ کی امداد سے سکھوں کو بندوقوں وغیرہ سے مسلح کر لیا ہے، تاکہ انگریز کے ملک چھوڑنے پر پنجاب سے مسلمانوں کو بھی زبردستی بے دخل کر دیا جائے۔ دوسری طرف ہندو فسطائیت کے عزائم کا ذمہ دارانہ اعلان اس وقت ہوا جب میرٹھ کانگرس کے مشترک پلیٹ فارم سے بہار، گڑھ مکتیشر، کلکتہ اور نواکھلی کے انسانیت سوز فسادات کے سلسلے میں ایک طرف تو راشٹریہ سیوک سنگھ کی بہیمانہ کارروائیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے صدرِ کانگرس نے عائد کردہ الزامات کو مذاق میں اڑا دیا اور دوسری طرف کانگرس کے نفسِ ناطقہ سردار پٹیل نے فسطائی گرج میں اعلان کیا کہ مخالفین کو تلوار کا جواب تلوار سے دیا جائے گا، جس کے بعد ملک کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک اکالی سینیاؤں اور راشٹریہ سیوا دل کی تنظیم کا کام باقاعدگی کے ساتھ شروع کر دیا گیا۔

مجلس عاملہ کی رائے میں پنجاب کے حالیہ فسادات بھی اسی غیر مسلم فسطائی سازش کا قدرتی نتیجہ ہیں، جس کا مقصد محض غیر مسلم اقتدار کو بہر حال

ملک پر مسلط و قابض کرنا ہے، خواہ اس کے حصول کے لیے جنگ کے ہولناک سیلاب ہی سے گزرنا پڑے۔ ظاہر ہے کہ اس صورتِ حال کو کوئی بھی ذمہ دار جماعت جسے ملک میں آبرومندانہ اور منصفانہ زندگی بسر کرنی ہو کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔

مجلس احرار ہمیشہ سے ملّت کی سربلندی اور آزادیٔ وطن کی حامی رہی ہے، اور اس کے حصول کے لیے ہر قسم کی قربانی اور آبرومندانہ اشتراک و تعاون کی داعی چلی آئی ہے۔ اب جبکہ حکومت کے انتقالِ اقتدار کے اعلان سے غیر مسلم فسطائی قوتیں کانگرس کی مشترک وطنی روایات و پالیسی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے اندر اور باہر حصولِ اقتدار کے لیے عریاں طریقے پر برسرِ کار نظر آتی ہیں۔ مجلسِ عاملہ تمام مسلم جماعتوں کو توجہ دلاتی ہے کہ وہ اس نہایت نازک مرحلے پر سیاسی اختلافات کو نظر انداز کرتے ہوئے مشترک دشمن کی جارحانہ سرگرمیوں کے مقابلے کے لیے زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے کے قریب ہوں، تاکہ ملّتِ مسلمہ کے ننگ و ناموس اور مستقبل کی حفاظت کی جا سکے۔

مجلسِ عاملہ کو اگرچہ پنجاب کے حالیہ فسادات میں انسانی مال و جان کے اتلاف کا دلی رنج ہے، جس کی تلافی عرصہ تک نہیں ہو سکتی۔ پھر بھی مجلسِ عاملہ ان مسلم و غیر مسلم افراد کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے جنہوں نے سفاکی اور بربریت کے اس دور میں جب انسان انسانیت کے دائرے کو تار تار کر چکا تھا حقِ ہمسائیگی اور انسانی اخلاق کو سربلند رکھا اور عورتوں، بچوں اور ان کے متعلقین کو پناہیں دیں۔

مجلس احرار اسلام کی مجلسِ عاملہ جملہ رضا کارانِ احرار اور کارکنان و

ہمدردانِ احرار کو بھی مبارک باد دیتی ہے کہ انہوں نے ہر جگہ امن کی بحالی اور مظلومین کی خدمت کے فرائض تا بحدِ امکان ہر قسم کے خطرات اور حوصلہ شکن واقعات کے باوجود جوانمردی کے ساتھ ادا کیے اور مجلس توقع رکھتی ہے کہ وہ اس نیک کام کو زیادہ سے زیادہ تیزی کے ساتھ جاری رکھیں گے۔ اس کے ساتھ ہی انہیں یہ بھی واضح کر دینا چاہتی ہے کہ ملّت اسلامیہ ابھی تک خطرے سے محفوظ نہیں ہوئی۔ اس لیے جہاں تک ممکن ہو جیوشِ احرار اسلام کی تنظیم میں بیش از بیش سرگرمی کا اظہار کیا جائے اور اپنی اپنی جگہ دیگر اسلامی جماعتوں سے اشتراک و تعاون سے اس نیک مقصد کے حصول کے لیے کوششیں جاری رکھیں۔ واضح رہے کہ ابتلاء و آزمائش کے اس نازک ترین دور میں ملّت اسلامیہ کی حفاظت ہمارا اوّلین فرض ہے، جس کی بجا آوری کے لیے سیاسی اختلافات بہر نوع سدِّ راہ نہیں بننے چاہییں۔"

عطاء اللہ شاہ شہید کر دیے گئے

ایک طرف برطانیہ ہندوستان کو آئین کے ذریعے اس کے حقوق منتقل کر رہا تھا، تو دوسری طرف غیر آئینی سرگرمیاں اس قدر تیز ہو چکی تھیں کہ انسان انسانیت سے ماوراء ہو کر ایسی حرکتوں پر اتر آیا کہ خونِ انسانی کی ارزانی سے انسانیت کا دامن ہمیشہ کے لیے داغدار ہو کر رہ گیا۔ اس ہنگامی دور میں وائسرائے لارڈ ویول کی بر طرفی کے بعد ۲۲۔ مارچ ۱۹۴۷ء کو لارڈ مونٹ بیٹن نے بطورِ وائسرائے اپنے عہدے کا چارج لیا اور ساتھ ہی واقعات تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔

امیر شریعت ان دنوں اپنے بال بچوں سمیت لاہور میں قیام پذیر تھے۔ مشرقی پنجاب سے اجڑ کر آنے والے لوگوں کی خون آشام داستانیں سن کر اس قدر پتھر دل

ہو گئے تھے کہ تمام دن دفتر میں خاموش بیٹھے رہتے، نہ کسی سے بات کرتے، نہ کوئی مشورہ ہی دیتے۔

جو آدمی اپنے وجود میں خود ایک انجمن تھا، جس کی مسکراہٹوں سے بہاروں کا جوبن نکھرتا رہا، جس کے ایک بول پر سینکڑوں خاموشیاں رقص کناں تھیں، انسان کے بگڑے ہوئے چلن نے آج اسے پتھر کی تصویر بنا دیا تھا۔

اپریل اور مئی کے مہینے اسی پر آشوب طریق سے گذرے کہ ۳۔جون ۱۹۴۷ء کو متحدہ ہندوستان میں برطانیہ کے آخری نمائندے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مسلم لیگی اور کانگرسی رہنماؤں کے مشورے پر حکومت برطانیہ کا وہ تاریخی اعلان کیا جس کی رو سے برصغیر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا، اور ساتھ ہی پنجاب اور بنگال کی تقسیم پر بھی اپنی مہر ثبت کر دی۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سکھوں اور ہندوؤں نے وہاں کی اقلیتی آبادی کا قتل عام شروع کر دیا۔انہی دنوں ۱۴۔اگست کو امرتسر کے اہل حدیث رہنما مولوی ثناء اللہ کے لڑکے مولوی عطاء اللہ کو ہندوؤں نے اپنے محلہ میں گولی مار کر شہید کر دیا۔لیکن اخبارات میں یہ خبر چھپی کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو امرتسر میں شہید کر دیا گیا۔اس خبر نے پنجاب اور سارے ہندوستان کو پریشان کر دیا۔چنانچہ چنیوٹ کے ملک اللہ دتہ بلوچ نے اس خبر کی تصدیق کے لیے اپنے ایک عزیز کو لاہور بھیجا۔جیسے ہی اس نے شاہ جی کو دفتر میں سلامت پایا وہ باغ باغ ہو گیا، اور اس نے دوستوں کی تسلی کے لیے امیرِ شریعت کے ہاتھ کی تحریر چاہی۔آخر امیرِ شریعت نے بڑے اصرار کے بعد ۲۰۔اگست کو ملک اللہ دتہ کے نام حسب ذیل خط تحریر کیا۔

لاہور۔ ۲۰۔ اگست ۱۹۴۷ء

عزیزانِ من نذر محمد و ملک اللہ دتہ!

السلام علیکم۔میں اپنے اہل و عیال اور دوستوں سمیت خیریت سے

ہوں - مارچ کے مہینے سے لاہور میں ہوں - اب خان گڑھ ضلع مظفرگڑھ میں نواب نصراللہ خاں کے یہاں چلا جاؤں گا - ارادہ کرلیا ہے -

امرتسر بالکل تباہ ہو چکا ہے، اور آئندہ مسلمانوں کے وہاں آباد ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی - اس وقت ایک لاکھ کے قریب مسلمان لاہور پہنچ چکا ہے، اور اب فیروزپور، ہشیارپور وغیرہ کی آمد شروع ہوگئی ہے - مشرقی پنجاب کا مسلمان اس وقت تباہ ہو چکا ہے، باقی ہو رہا ہے -

سکھ قوم کی خباثت کو انگریز کی اور ہندو کی تائید حاصل ہے، اور وہ تباہی مچا رہی ہے، اور نہ جانے کب تک یہ سلسلہ باقی رہے -

میرا ایک مکان خاک میں مل چکا ہے، دوسرا جس میں میں رہتا تھا، ابھی تک تو موجود ہے - میری زندگی کی ساری کمائی یعنی میری ساری کتابیں اور سامانِ زندگی وہیں ہے - اللہ کے حوالے ہے، ابھی تک کوئی صورت سامان برآمد کرنے کی نظر نہیں آتی - پہلے بھی فقیر ہی تھا، لیکن اب سر چھپانے کی جگہ بھی نہیں ہے، دعائے خیر سے یاد کریں ملکی حالات اتنے خراب اور خطرناک، ہیبت ناک ہیں کہ ان سطروں میں بیان نہیں ہو سکتے --- میں انشاء اللہ تعالیٰ کل کراچی میل سے ملتان کی طرف روانہ ہو جاؤں گا -

زندگی رہی تو آئندہ ملاقات پر باتیں ہوں گی - والسلام دونوں اور عزیزوں کو سلام و دعا -

(سید عطاء اللہ شاہ)

مندرجہ بالا خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ امیر شریعت تقسیم ملک کے بعد رونما ہونے والے واقعات سے کس قدر متاثر تھے - حالات نے انھیں اس حد تک

رقیق القلب کر دیا تھا کہ ذرا ذرا سی بات پر آنسوؤں کی جھڑی باندھ دیتے۔ اپنے علمی اثاثے کے ضائع ہونے کا تو انہیں زندگی بھر احساس رہا۔ جب کبھی مسائل پر بحث چھڑتی تو فوراً ان کا ذہن اپنی امرتسر ضائع ہو جانے والی لائبریری پر جاتا اور ساتھ ہی سرد آہ بھر کر خاموش ہو جاتے۔

اچھی کتاب اور اچھا رفیق دورِ رواں میں کہاں ملتے ہیں۔ زندگی میں ان کا بچھڑ جانا موت سے زیادہ وزنی ہوتا ہے، بشرطیکہ پہلو میں حساس دل ہو۔

۱۹۴۷ء کے انسانیت سوز واقعات نے زندگی کی تمام عبارت کو اس بری طرح پریشان کیا کہ امیر شریعت جیسا خوددار انسان بھی دل و نظر پر قابو نہ رکھ سکا۔

عورت کی عظمت بھی مذہب کے تقدس سے وابستہ ہے۔ جب انسان نے مذہب کی دیواروں پر کھڑے ہو کر عورت کا نیلام شروع کر دیا، تو مذہب کی پاکیزگی کیوں کر محفوظ رہ سکتی ہے۔ سال ۱۹۴۷ء میں انسان نے اپنی ضرورت کے لیے جن نقشوں کو آدمی کے لہو سے خوبصورت بنانا چاہا، انہی نقشوں کی لکیروں پر سے انسان کے اپنے پھسلنے کا احتمال بھی تھا۔ ایسی ناپائیدار عمارت کی خوبصورتی نگاہوں کو سکون تو دے سکتی ہے مگر دلوں کی تسلی نہیں کر سکتی۔

امیر شریعتؒ، جس نے زندگی بھر عظمت آدم کا احترام کیا تھا جب وقت کے اس موڑ پر پہنچا، تو آپے سے باہر ہو کر کہہ اٹھا ؎

تو نے یہ کیا غضب کیا، مجھ کو بھی رسوا کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

خان گڑھ میں قیام

مارچ سے جولائی ۱۹۴۷ء تک امیر شریعتؒ لاہور میں رہے اور اگست کے آخری ہفتے بچوں سمیت ضلع مظفر گڑھ کے ایک گاؤں خان گڑھ چلے گئے۔ اس علاقے کے رئیس نوابزادہ نصر اللہ خاں ان دنوں

آل انڈیا مجلسِ احرار کے ناظمِ اعلیٰ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ دے رکھا ہے۔ وہ امیرِ شریعتؒ کے میزبان تھے۔ آموں کے باغ جو اس ضلع کی خصوصیات ہیں، امیرِ شریعت کے لیے اپنی تمام بہاریں لے کر حاضر تھے۔ گھر کا سامان، شب و روز خدام کی حاضری نے گو امیرِ شریعت سے اجنبیت چھین لی تھی، لیکن دل کا سکون یہاں بھی بیگانہ رہا۔ یہیں سے ۲۴ دسمبر ۱۹۴۷ء کو صدر مجلسِ احرار کے نام امیرِ شریعتؒ نے حسبِ ذیل تاریخی خط لکھا، جس کی بنا پر مجلسِ احرار کی آئندہ پالیسی وضع کی گئی:

خان گڑھ۔ ۲۴۔ دسمبر ۱۹۴۷ء

برادرِ محترم ماسٹر جی[1]! السلام علیکم

ملتان کی میٹنگ میں حالات کی وجہ سے شریک نہ ہو سکا۔ اس کے بعد بیماری آہستہ آہستہ بڑھتی گئی اور آخر غالب آگئی، نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت نشست و برخاست بھی آسانی سے نہیں کر سکتا۔ تفصیل کیا لکھوں کیا گزری ہے، پھر محسنؒ[2] اور مہیمنؒ[3] بیمار ہو گئے اور ایک وقت ایسا بھی آگیا کہ ہم محسن سے تھوڑی دیر کے لیے ہاتھ دھو بیٹھے، آخر اللہ تعالیٰ نے کرم کیا، اب اس کی حالت اچھی ہے لیکن مہیمن بہت کمزور ہے اور بخار میں مبتلا ہے۔ رات ننھی سالمہ[4] سخت بخار میں تھی۔

یہ ہے میرا مختصر سا حال۔ اس وقت میں اپنے بچوں کی خدمت کے قابل بھی نہیں اور گھر میں کوئی دوسرا شخص بھی نہیں، جو پرسشِ احوال کر سکے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی سہارا نہیں۔ حسبنا اللہ ونعم الوکیل

---

[1] ماسٹر تاج الدین انصاری جو ان دنوں مجلسِ مرکزیہ کے صدر تھے [2] امیرِ شریعت کے بڑے سے چھوٹے صاحبزادے [3] سب سے چھوٹے صاحبزادے [4] سب سے چھوٹی صاحبزادی۔

ملتان میں آپ کے اجلاس کو کامیاب دیکھنا چاہتا ہوں۔ چند باتیں لکھ دیتا ہوں۔ اگر احباب کو پسند ہوں تو بہتر ہے۔

۱۔ لیگ سے ہماری سیاسی کشمکش ختم ہو چکی ہے اور الیکشن کے ساتھ ہی ختم ہو چکی تھی۔ اس وقت لیگ قوت حاکمہ ہے۔ مسلمانوں نے اسے بنایا اور قبول کر لیا ہے۔ پاکستان نہ صرف مسلم لیگ کا بلکہ کانگرس کا تقسیم پنجاب کے اضافے کے ساتھ تسلیم کردہ معاملہ ہے، جس پر "حضور" برطانیہ کی مہر ثبت ہے۔ اس میں صرف مسلم لیگ کو ہدفِ ملامت بنانا آئینِ شرافت سے بعید ہے۔ اگر اچھا کیا تو کانگرس اور لیگ دونوں نے، اگر برا کیا تو دونوں نے۔ اب پاکستان بن چکا اور تقسیم پنجاب کو کانگرس نے پیش کر کے مسلمانوں سے پاکستان کی بہت بڑی قیمت ادا کرائی اور کرا رہی ہے۔ ابھی نہ جانے کب تک مسلمانوں کو سود در سود ادا کرنا پڑیگا۔

میری آخری رائے اب یہی ہے کہ ہر مسلمان کو پاکستان کی فلاح و بہبود کی راہیں سوچنی چاہییں، اور اس کے لیے عملی اقدام اٹھانا چاہیے۔ مجلس احرار کو ہر نیک کام میں حکومت پاکستان کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے، اور خلافِ شرع کام سے اجتناب۔ اصلاحِ احوال کے لیے ایک دوسرے سے مل کر "الدّین نصیحۃ" پر عمل ہونا چاہیے۔ یہ ارشاد ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا۔

۲۔ مجلس کا قیام و بقا بہر حال ایک شرعی امر ہے، تبلیغ اعتقادِ صحیحہ اور تنقیدِ رسوماتِ قبیحہ، اعلائے کلمۃ الحق، اعلان و بیان ختم نبوّت و اظہارِ فضائل صحابہ و اہلِ بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین مجلس کے فرائض میں سے ہیں۔ خصوصاً اس دورِ لادینی میں جنسِ انسانی کی تمام مشکلات

کے لیے شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو ہی بطور حل پیش
کرنا ہمارا وہ فریضہ ہے کہ اگر ہمیں دار ورسن تک بھی رسائی ہو جائے
تو الحمد للہ۔ اس لیے مجلس کے قیامِ بقا کی بہرحال کوشش رہنی چاہیے
اگر دوستوں کو یہ باتیں معقول و مدلّل نظر آئیں تو ان بنیادوں پر
آئندہ زندگی کی عمارت استوار کریں، ورنہ جیسے ان کی مرضی، میں کسی کی
راہ میں حائل نہیں، اب میں تھک گیا ہوں۔ ورنہ مفصل بھی لکھ سکتا تھا
غریب الدیار۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔

بچی کی وفات

انسان اور مصائب کے رشتوں پر سے صدیاں گذر چکی ہیں کبھی انسان غالب آجاتا ہے، کبھی مصائب انسان کو زیر کر لیتے ہیں، لیکن دونوں کے تعلقات میں بال برابر خلیج حائل نہیں ہوئی۔

امیرِ شریعتؒ عوام کی کہانیاں سنتے سنتے خود مصائب کا پہاڑ بن کر رہ گئے۔ اجڑے ہوئے دلوں پر غموں کا رین بسیرا، مسکراتی رہنے والی آنکھوں میں آنسو، سرخ و سفید چہرے پر موت کے دھبے۔ امیرِ شریعت کا ان دنوں ایسا ہی حال تھا کہ ۷۔ فروری ۱۹۴۸ء کو عزیزی سالمہ کا انتقال ہو گیا۔ معصوم بچی جو غم کی اندھیری رات میں گھر کا چراغ اور سوگوار دلوں کا کھلونا تھا۔ اس کی موت نے سارے گاؤں میں صفِ ماتم بچھا دی۔

ننھی سالمہ اس اعتبار سے خوش نصیب رہی کہ باپ اس کے جنازے میں شریک تھا، ورنہ اس سے قبل امیرِ شریعتؒ کی دو بچیاں فوت ہوئیں تو وہ جیلخانوں میں تھے۔

پاکستان ۱۹۴۷ء

برصغیر کی غلامی کا آخری سورج جب اپنی پنہائیوں میں غروب ہوا تو ہندوستان تقسیم ہو چکا تھا۔ ایک ہی دھرتی کی کوکھ سے جنم لینے والے لاڈلے بیٹوں نے اپنی آشاؤں کے لیے ماں کو دو حصوں میں بانٹ

لیا ۔ آہ! انسان کتنا خود غرض ہے ۔

آسمان نے یہ سارا تماشا دیکھا ۔ زمین کے ذرات انسانی گناہوں سے لرزہ براندام ہو گئے ۔ لیکن خلافت ارضی کا وارث تختِ شاہی کی طلب میں ایسا کھویا کہ دامن یزداں کی بجائے اشارہ ابلیس پر رقص کرنے لگا ۔ اور اسی طرح ۱۹۴۸ء اپنے جنو میں گزشتہ سال کی خون آشام تاریخ لے کر نمودار ہوا ۔ شفق اپنے دامن سے خون نچوڑ رہا تھا ۔ انسانوں کی بے گور و کفن لاشوں نے درندوں کو بھوک سے بے نیاز کر دیا تھا ۔ فطرت حیران تھی کہ شاید انسان کا انسانیت سے علیحدگی کا یہ آخری سال ہے ۔ مگر نہیں ؂

یہ کہہ رہی ہے پلٹ کر نگاہِ یار ابھی!
زمانہ اور بھی بدلے گا ایک بار ابھی!

امیر شریعتؒ ۱۹۲۱ء میں برطانوی سامراج سے اپنے وطن کو آزاد کرانے کے لیے جذبات کا ایک الاؤ سینے میں لے کر نکلے تھے ۔ ۱۴ ۔ اگست ۱۹۴۷ء کو جب یہ مراد بر آئی تو جوانی کے ساتھ ساتھ جذبات کی آگ بھی دھواں دے رہی تھی ، وہ جس پودے کو خون کی آبیاری سے ثمر آور دیکھنا چاہتے تھے ، جب اس پر بہار آئی تو اسے کانٹوں نے گھیرا ہوا تھا ۔ بادِ نسیم منہ تکتی رہ گئی ، مگر بادِ سموم کے تیز جھونکوں نے گل بوٹوں کی تمام پتیاں خزاں کے حوالے کر دیں ۔

اس سال امیر شریعتؒ اپنی عمر کے ستاون برس گزار رہے تھے ۔ ہمت جواب دے چکی تھی ۔ دانت ساتھ چھوڑ گئے تھے ، چہرے پر عمرِ رفتہ کی پگڈنڈیاں گذرے ہوئے وقتوں کو پکار رہی تھیں ۔ جن آنکھوں میں بلا کی چمک تھی وہ خشک ندی نالوں کی طرح اداس دکھائی دیتی تھیں ۔ ہاتھوں میں تلوار اور کلہاڑی کی جگہ معمولی چھڑی نے لے لی تھی ۔ آنکھوں پر عینک ، خمیدہ کمر کے ساتھ چھڑی کے سہارے امیر شریعتؒ بازار سے گذرتے تو یوں لگتا جیسے دیمک کھائی ہوئی گذشتہ

ربع صدی کی تاریخ گذر رہی ہے۔

جس کی آواز سے ایوانِ افرنگ میں زلزلہ آجاتا تھا، ۱۹۴۷ء کے حادثات نے اسے اس قدر مضمحل کر دیا کہ وہ پنجاب کے دور افتادہ گاؤں (خان گڑھ) میں بیٹھا اپنی آواز کو ترس رہا تھا۔

دردِ گردہ کی تکلیف کا آغاز بھی انہی دنوں ہوا۔

قریباً ایک سال خان گڑھ خاموش رہنے کے بعد اپریل ۱۹۴۸ء کو امیر شریعت رضا کاروں کے اصرار پر ملتان آئے اور جلسۂ عام کو خطاب کرتے ہوئے کہا:۔

"میرے بزرگو اور عزیزو!...... ایک سال کا عرصہ ہوگیا کہ میں نے کسی اجتماع میں تقریر نہیں کی۔ اب بھی خدا شاہد ہے کہ با دلِ نخواستہ اٹھ کر آیا ہوں، اس ڈر سے کہ رضا کار ناراض نہ ہو جائیں۔ ورنہ قریباً انتیس سال سے جو کچھ میں نے آپ سے کہا اگر اسی کو سمجھ لیتے تو کافی تھا۔ لیکن میری تو کوئی سنتا ہی نہیں۔ میرا تو شکاری کتے کا سا حال ہے جو شکار کو دیکھ کر بھونکتا ہے، کیونکہ وہ جو کچھ اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے، اسی کی آواز لگاتا ہے۔ وہ دوڑتا ہے، کودتا ہے، پھڑکتا ہے، پھدکتا ہے کہ شکار سے لپٹ جاؤں، اور بھونکتا ہے کہ اپنے مالک سے اس کی خبر کردوں۔ اسی طرح میں دیکھ رہا تھا شکار کو اور تمہارے دروازے پر بھونکا، جس دروازے پر گیا اسی نے لاٹھی رسید کی "بے ایمان سونے نہیں دیتا" حالانکہ جو کچھ میں دیکھتا ہوں، اسی کی صدا لگاتا تھا۔

عزیزو! میری صحت خراب ہوگئی ہے، کیونکہ میں نے حسین وجمیل دنیا اجڑتی دیکھی ہے۔ دلکش و دلفریب دنیا، اچھی دنیا، بری دنیا، معزز بزرگ، معزز بیٹیاں، عصمت مآب بیٹیاں، سب اجڑے اور ہم سب کے ساتھ اُجڑے

وہ اجڑے تو میں بھی اجڑا، اور سب ایک ساتھ اجڑے۔ عزیزو! کیا حال بتاؤں کیسے بتاؤں؟ اگر کسی کا حال مجھ سے بہتر ہو تو بتاؤ، اللہ جانے کس پر کیا گزری؟

اس وقت یہاں سزا کے طور پر کھڑا ہوں، رضا کاروں نے مجھے سزا دی ہے، اور میں نے اس سزا کو قبول کر لیا ہے، تقریر کا ارادہ نہ تھا اور نہ ہے بس یونہی دو ایک باتیں کرنے آیا ہوں۔ صحت تباہ ہو گئی ہے، دراصل ساری بات صحت پر ہوتی ہے۔ دیکھنے کو بوڑھا ہوں آپ کے درمیان، مگر کفر کے لیے ویسا ہی توانا، کفر کے لیے توانا مجھ ساماں نے آج تک نہیں جنا۔ یہ ضعیفی، یہ پیری، ادھر تم زور آور، اور حبیب جی جا پکڑ کر میدان میں چھوڑ دیا۔ تم دعا دو تب بھی خوش۔ ہم تو اسی میں خوش ہیں، جس میں آپ کی خوشی ہے۔ ہماری اپنی تو خوشی رہی ہی نہیں۔ اب تو اپنا حال یہ ہے اللہ کو خوش کروں یا نہ کروں، مگر تم کو ناراض نہ کروں۔ تمہارے لیے میں اگر جہنم میں چلا گیا تو کیا ہوا، پر میرے جانے سے تم تو خوش رہتے ہو نا۔ بھئی! یہ سیدھی سی بات ہے کہ اگر ایک شخص کے جہنم جانے سے قوم یا ملت بچ جائے تو ایسا کام سبحان اللہ! ہم یہ سمجھیں گے کہ یہ بھی تیرے لیے کر دیا۔

بیماری کی وجہ سے اور کچھ ایسی یاد کی وجہ سے وہی نقشے، وہی گلیاں وہی زمانہ، وہی کوچے، وہی باغ و بہار، جب یاد آتے ہیں تو دل بیٹھنے لگتا ہے۔

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ رضا کاروں کا ڈر تھا جو حاضر ہو گیا ہوں۔ ان [illegible] کہیں کہ بھائی مجھے چھوڑ دو۔ میں اب نہیں بول سکتا۔ ممکن ہے دو [illegible] ایسا آ جائے کہ میں خود بول اٹھوں۔ مگر انہیں سمجھائے کون!

جی کی بات ہے، اب وہ بولنے نہیں دیتا۔ تیس۳۰ سال بولتا رہا ہوں، اب خدا سے دعا ہے جس نے تیس سال بولنے کی توفیق عطا کی کہ اب نہ بلوائیے۔

ابھی جو مولانا غلام غوث اور ماسٹر تاج الدین آپ کے سامنے کہہ گئے ہیں، مجھے بے چین کرنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ تم (آہِ سرد بھر کر) کہہ کر بھی بھول جاتے ہو اور اپنا یہ حال ہے کہ نہ کہا بھولتا ہے اور نہ کسی کا سنا بھولتا ہے۔ اب اس کا کیا جواب؟ کنگھی تو میری جیب میں بھی ہے، جب جی چاہتا ہے اسے میں کر لیتا ہوں۔ گو تم نے سَر میں بال نہیں چھوڑے، بہت کم رہ گئے ہیں۔ اگر دو چار دن زندہ رہا، اور یہی حالت باقی رہی تو انشاء اللہ ایک بال بھی باقی نہیں رہے گا ہاں (سرد آہ بھر کر) تم جیتے رہو۔ ہمارا کیا پوچھنا میاں، فقیرانہ آئے صدا کر چلے، اور اس کا فیصلہ تو وہاں ہوگا میدانِ قیامت میں، جہاں سیاہ اور سفید چہرے الگ الگ کر دیے جائیں گے۔

بہرحال اب میں یہ کہوں کہ قرآن کے چار جملے ہیں، مجھے یہی آتا ہے اور وہ تمہیں پسند نہیں۔ جو تم چاہتے ہو وہ میرے پاس نہیں۔ کوئی نئی بات نہیں، وہی ایک بات اسی کتاب کی، جسے آجکل کی زبان میں فرسودہ نظام کہا جاتا ہے، جسے تم کہتے ہو یہ ہمیں فِٹ نہیں آتا، تو یہ نکاح، یہ طلاق، یہ شادی، یہ قربانیاں، یہ مسجد، یہ نماز یہ کیسے فِٹ آئیں۔ پھر تو سرے سے چلو کہ یہ بیت اللہ سرے سے فِٹ نہیں۔ نہ وجود باری تعالیٰ ہے، نہ کوئی نبی ہے، نہ وحی ہے، نہ نزولِ وحی ہے۔ آتا ہے تو یوں سیدھے آؤ، یہ منافقت نہ کرو۔"

درمیان میں کسی نے امیر شریعت کا نعرہ لگایا۔

"دیکھیے بھائی! میری تقریر میں اس قسم کے نعرے نہ لگائیے۔ میں دونوں سے بے نیاز ہو چکا ہوں۔ نہ مردہ باد کے قابل ہوں۔ نہ زندہ باد کے لائق۔ مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ قبرستان میں اذانیں دے رہا ہوں۔ میں اضطراری طور پر چپ نہیں ہوں۔ سوچ سمجھ کر چپ تھا۔ تیس سال چیختا رہا ہوں۔ اب آرزو ہے کہ نہ بولوں۔ طبیعت پر خدا نے اپنا اختیار دیا ہے۔ جی چاہتا ہے، چپ رہوں۔

میں تو صرف نوجوانوں کی دلداری کے لیے آیا ہوں ——— نہ ورکنگ کمیٹی کے دباؤ سے اور نہ ماسٹر صاحب کے کہنے پر، بلکہ ان رضاکاروں کے دباؤ سے جنہیں مجھ سے محبت ہے۔"

حضرت امیر شریعتؒ کی یہ تقریر رات ڈیڑھ بجے تک جاری رہی۔ عوام اور خاص دونوں رو رہے تھے۔

نفاذ شریعت کانفرنس

پاکستان کی بنیاد کے ساتھ ہی علماء نے دین پسند طبقہ کو مجتمع کرنے کے لیے پشاور میں ۳۔۴۔۵ ستمبر ۱۹۴۸ء کو نفاذِ شریعت کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔

گھریلو پریشانیوں اور اپنی مسلسل بیماری کے باوجود امیر شریعت سرحدی علماء کے فیصلے پر پھول چڑھا کر سفر کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ اسی سلسلے میں سرحد کے مقتدر رہنما پیر مانکی شریف، قائداعظم کے پاس کراچی پہنچے اور ان سے تحریری وعدہ لیا کہ پاکستان کا آئندہ نظامِ حکومت اسلامی اصولوں کی بنیاد پر ہو گا۔ ان دنوں سرحد میں عبدالقیوم خاں کی حکومت تھی۔ کانفرنس کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں کہ حکومت نے دفعہ ۱۴۴ کے ذریعے کانفرنس کو خلافِ قانون قرار دے دیا۔ اس کے نتیجہ میں دین پسند لوگوں کو بہرحال تعجب

ہوا۔ مگر اس کے نتیجہ میں پیرانگی شریف مسلم لیگ سے علیحدہ ہو کر عوامی لیگ میں شامل ہو گئے۔

ملتان میں قیام

ملک کے سیاسی حالات ہنوز ابتر تھے، عوام اقتصادی لحاظ سے کمزور سے کمزور تر ہوتے جا رہے تھے۔ ہر آدمی خانگی پریشانیوں میں مبتلا تھا۔ نوزائیدہ مملکت کی سرحدیں غیر محفوظ تھیں۔ اس زمانے میں عوام سے نہ تو کوئی بات کہی جا سکتی تھی اور نہ ہی عوام اس کے لیے تیار تھے۔ ملک کی سیاسی جماعتیں وقتی طور پر اپنا وجود ختم کر چکی تھیں۔ پھر وہ لوگ جن کی زندگی خزاں کے خشک پتے کی طرح آوارہ نہیں تھی اس بازار میں کیونکر آتے، جہاں ہر دوکان پر جنسِ انسانی کوڑیوں کے مول تُل رہی ہو۔

امیرِ شریعتؒ بھی زندگی کی سنگلاخ وادیوں سے گزر کر آئے تھے، ان کے آبلۂ پا جن راہوں کو اپنے خون سے سیراب کر چکے تھے وہ راہیں ہنوز تشنہ تھیں لیکن سازِ زمانہ جن انقلابی سروں میں نغمے الاپ رہا تھا، سالارِ کارواں کے پاس اتنی مہلت کہاں تھی کہ جرسِ کارواں کو چھوڑ کر غبارِ کارواں پر توجہ دیتا۔

۱۹۴۸ء کے آخر میں خان گڑھ چھوڑ کر امیرِ شریعتؒ ملتان کے ایک گمنام محلّہ (ڈبّی شیر خاں) میں تیس روپے ماہوار کرایہ کے مکان میں آ بیٹھے اور گوشہ نشینی کا فیصلہ کر لیا۔ جماعت کے مستقبل کی پوزیشن ہنوز واضح نہیں تھی، اور وقت کا تقاضہ بھی تھا کہ بہار آنے پر گل و گلچیں سے کیونکر برتاؤ کیا جائے، صیّاد سے ہمارے راہ و رسم کن طور و اطوار سے ہوں، نسیمِ صبحگاہی سے اٹھکیلیاں ہوں تو کس طرح، اور اگر کبھی کبھار بادِ سموم چمن کو اجاڑنے لگے تو آشیانوں کا دفاع کس دامن کی اوٹ میں بیٹھ کر ہو؟ ——

سنہ ۱۹۴۹ء

خزاں پر سے کتنے موسم گزرتے ہیں کہ بہار آتی ہے، رات بھر نہ جانے کتنے ستاروں کا خون ہوتا ہے کہ صبح نمودار ہوتی ہے۔ جماعتوں کی تشکیل کا بھی یہی قانون ہے، ارادے باندھ کر کئی بار توڑنے پڑتے ہیں۔ دل و دماغ کو ہم آہنگ

رنے میں آنکھوں کو ساون بھادوں کی طرح کئی بار برسنا پڑتا ہے، پھر کہیں جاکر یہ کھیتی سیراب ہوتی ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مجلسِ احرار کا آخری سیاسی اجلاس

مجلس احرار نے ۱۹۲۹ء میں جنم لیا تو یہ غیر ملکی سامراج کے خلاف ایک نیا محاذ تھا۔ اور ۱۹۴۹ء کے آفتاب نے احرار کی سیاسی زندگی پر جب اپنے سائے ڈالے تو وقت مقتضی تھا کہ سامراج کا سورج غروب ہو چکا ہے، غلامی کی کڑیاں ٹوٹ کر گر چکی ہیں، فرنگی اپنی بساط لپیٹ کر سمندر پار جا چکا ہے، نیز وہ بادل چھٹ چکے، جن کے دامن میں بجلیاں پرورش پا رہی تھیں۔

احرار رہنماؤں نے امیر شریعت کو مجبور کیا کہ وہ نئی مملکت میں نئے زاویوں سے چلنے کی راہ سجھائیں، حالانکہ وہ ۲۴-ستمبر ۱۹۴۷ء کو اپنے خطاب میں فیصلہ دے چکے تھے، تاہم پارٹی نے انہیں مجبور کیا کہ وہ عوام میں آکر اعلان کریں۔ چنانچہ ۱۲، ۱۳، ۱۴۔ جنوری ۱۹۴۹ء کو لاہور دہلی دروازہ کے میدان میں دفاع احرار کانفرنس کے عنوان پر احرار کا آخری اور تاریخی اجلاس ہوا۔ جس میں قریباً پچاس ہزار احرار کارکن اور باوردی رضاکاروں نے شمولیت کی۔ تقسیمِ ملک کے بعد احرار کا یہ پہلا اجتماع تھا۔ ۳۱ ؎ کانفرنس کے آخری اجلاس میں حسبِ ذیل قرارداد شیخ حسام الدین نے پیش کی۔

"اس حیثیت کے پیشِ نظر کہ تقسیم ہند کے نتیجے کے طور پر ملتِ اسلامیہ کی فلاح و بہبود اور مستقبل کی ترقی اور فارغ البالی، پاکستان کی قوت اور استحکام ہی میں مضمر ہے۔ نیز بین الاقوامی تسلط حاصل کرنے کے لیے امریکہ اور برطانیہ ایک طرف اور روس دوسری طرف دنیا کے گوشے گوشے

ہیں کمزور اور پس ماندہ اقوام کو اپنے اپنے دھڑے میں شامل کرنے کے لیے ہر قسم کی حیلہ جوئی، لالچ اور دباؤ ہے۔ انسانیت کو پھر ایک دفعہ ناقابلِ تصوّر تباہی اور ہلاکت کا شکار بنا رہے ہیں۔ بالخصوص جمعیّت اقوام کے پردے میں یہودی وطن کی تخلیق، مشرقِ وسطیٰ اور مشرقِ بعید میں اقتصادی تحفظات کے نام پر ترکی، ایران، عراق، شرقِ اردن، سعودی عرب، فلسطین، یمن، شام، مصر، سوڈان اور انڈونیشیا وغیرہ اسلامی ممالک کی آزادی، امن اور ترقی کو برابر قربان کیا جا رہا ہے۔

سفید فام اقوام نسلی برتری اور سیاسی اجارہ داری کے تحفّظ اور بقا کے لیے جس منظم طریق سے انگریزی زبان بولنے والی قوموں اور مغربی یورپی اقوام وغیرہ کے نعروں کے فریب سے اپنے انسانیت سوز عزائم کو پورا کرتے نظر آ رہے ہیں۔ یقیناً ملّت اسلامیہ کی سلامتی اور عالمگیر امن کی خواہش رکھنے والے افراد اور گروہ اس صورتِ حال کو خاموشی سے نظر انداز نہیں کر سکتے۔

بنابریں وفاعِ پاکستان احرار کانفرنس کا یہ تاریخی اجلاس اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ ایسے نازک ترین وقت میں اسلامیانِ پاکستان بہت حد تک اس زہر کا تریاق پیدا کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ملّت کی رہنمائی اور ترقی کے لیے ان کی داخلی سیاست کو ہر قسم کی گروہ بندیوں سے آزاد کر کے ایک ہی مشترک پلیٹ فارم کو مضبوط سے مضبوط تر کیا جائے۔ اس سے ایک طرف ملّت اسلامیہ کے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کی سازشوں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے، وہاں پاکستانیوں میں صحیح اور سنجیدہ غور پیدا کرنے کی راہیں بھی کھل جائیں گی اور کم سے کم مدّت میں قوم میں ضبط و نظم

اور خود اعتمادی کی خصوصیات پیدا ہو سکیں گی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مجلسِ احرار کے مقاصد میں اسلام کی سربلندی کے ساتھ وطن کی آزادی بھی شامل تھی، جو قیامِ پاکستان کے بعد سیاسی طور پر اب پوری ہو چکی ہے، لہٰذا دفاعِ پاکستان احرار کانفرنس کا یہ اجلاس غیر مبہم الفاظ میں یہ اعلان کر دینا اپنا ملّی فرض سمجھتا ہے کہ آئندہ سے مجلس احرار اپنی سعی و عمل کو مسلمانوں کے دینی عقاید و رسوم کو درست رکھنے اور خصوصاً مسئلہ ختم نبوّت کی مرکزی اہمیّت کو برقرار رکھنے کے لیے تبلیغی سرگرمیوں تک محدود رہے گی۔ جو اراکین و ہمدردان احرار زمانہ حال کے موافق سیاسی خدمات سر انجام دینا چاہتے ہیں وہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے اپنے روایتی اخلاص اور عملی انہماک سے ملک و ملّت کی خدمت میں حصہ دار بن سکتے ہیں۔"

اس قرارداد کی تائید کرنے سے پیشتر حضرت امیر شریعت نے جیوش مجلس احرار کے عہدے داروں کو انعام میں تلواریں اور تمغے دیے۔ ان اہم ذمہ داریوں سے فارغ ہو کر امیر شریعت نے اپنی تقریر کا آغاز ایک فارسی کے شعر سے کیا اور پھر ایک واقعہ دہرایا کہ دہلی میں ایک مجذوب چتلی قبر کے آس پاس اکثر یہ مصرعہ دہرایا کرتا تھا ؏

اس لیے مجھ کو تڑپنے کی تمنّا کم ہے۔

بچّے اس کے پیچھے شور مچاتے "کس لیے" مگر وہ دوسرا مصرعہ زبان پر نہ لاتا، لوگ اسے تنگ کرتے، چھیڑتے، مگر وہ صرف یہی کہتا "اس لیے مجھ کو تڑپنے کی تمنّا کم ہے"۔ ایک روز کچھ نوجوانوں نے اسے گھیر لیا اور دوسرا مصرعہ سنانے کے لیے مجبور کر دیا۔ عاجز آ کر اس فقیر نے کہا

؎ وسعتِ دل ہے بہت وسعتِ صحرا کم ہے
اس لیے مجھ کو تڑپنے کی تمنّا کم ہے۔

یہ کہا اور ایک آہ کے ساتھ وہ سرد ہو کر رہ گیا۔

امیر شریعت نے فرمایا: "مجھ سے دل کی بات نہ پوچھو۔ میں اپنے دل کی بات کہنے نہیں آیا، تمہارے دلوں کی کہنے آیا ہوں"۔

بزرگانِ ملّت! برادرانِ عزیز! کافی عرصہ کے بعد آپ حضرات کی خدمت میں مجھے کچھ گزارشات پیش کرنے کا موقعہ ملا ہے۔ میں ناتواں ہوں، وہ نہیں جو آج سے دو چار برس پہلے تھا۔ اس لیے میری گذارش ہے کہ آپ حضرات اپنی خاموشی سے میری مدد کریں۔ میں زیادہ دیر تک آپ حضرات کا وقت نہیں لوں گا۔ میں آپ سے چند ضروری باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ اس وقت گردو پیش میں جو تاریک بادل چھائے ہوئے ہیں، نہ آپ ان سے بے خبر ہیں اور نہ میں۔ انہی حالات نے مجبور کیا ہے کہ میں آپ کے سامنے آؤں ـــــ میں جو کہنا چاہتا ہوں وہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ آج سے کافی عرصہ پہلے یعنی ۲۴۔ دسمبر ۱۹۴۷ء کو مجمل طور پر ایک تحریر کے ذریعے میں نے جماعت کو اپنا پیغام بھیج دیا تھا جو طبع شدہ ہے۔

دسمبر کے آخر میں جب طوفانِ حوادث تھم چکا تو لاہور میں ہماری جماعت کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ میں اس وقت بسترِ مرگ پر تھا۔ مسلسل تین ماہ سے بیمار تھا اور میرے بچنے کی بہت کم امید تھی۔ تو اس وقت میں نے اپنے دو عزیزوں نوابزادہ نصراللہ خاں اور سردار محمد شفیع کی معرفت ماسٹر تاج الدین انصاری کی خدمت میں یہ خط بھیجا تھا۔

مسلم لیگ سے ہمارا اختلاف صرف یہ تھا کہ ملک کا نقشہ کس طرح بنے۔ یہ نہیں کہ ملک نہ بنے بلکہ یہ کہ اس کا نقشہ کیونکر ہو۔ یہ کوئی

بنیادی اختلاف نہیں تھا۔ نہ حلال وحرام کا، نہ گناہ وثواب کا، اور نہ مذہب کا وہ تو ایک نظریے کا اختلاف تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ پورے چھ صوبے ملیں اور مسلم لیگ بھی چاہتی تھی۔ ہمارا اختلاف صرف مرکز کی علیحدگی پر تھا۔

مسلم لیگ بھی فرقہ وارانہ جماعت تھی اور مجلس احرار بھی، مسلم لیگ میں بھی کوئی غیر مسلم شامل نہیں ہو سکتا تھا، اور نہ احرار میں کوئی غیر مسلم شامل ہو سکتا ہے۔ بس، اختلاف تھا تو اتنا کہ ہم کہتے تھے کہ آزادی مل جائے، ذرا سنبھل لیں اور اس کے دس سال بعد مرکز سے بھی علیحدہ ہو جائیں گے۔ مگر لیگ کہتی تھی کہ نہیں۔ مرکز کے ساتھ ہمارا کوئی الحاق نہیں رہ سکتا۔ ورنہ تقسیم ملک کے ہم بھی قائل تھے۔ کرپس فارمولا اب بھی موجود ہے، اس میں تقسیم ملک ہی کا قصہ درج ہے، ہم پورے چھ صوبوں پر مصر تھے، لیکن کانگرس نے تقسیم در تقسیم کو قبول کیا، اور گائے کا قیمہ کر کے اس کے کوفتے بنا دیے۔

پس! اب ہمارا مسلم لیگ سے کوئی اختلاف نہیں، نہ پہلے ہمارے اور ان کے درمیان مذہبی اختلاف تھا۔ نہ خدا کا، نہ رسول کا، نہ ہم ولی ہیں اور نہ لیگ والے قطب، اگر لیگ والے گناہگار ہیں، تو ہم کون سے ولی اللہ ہیں۔ ہمارا اور ان کا اختلاف صرف مرکز سے علیحدگی پر تھا اور داغ کے الفاظ میں یوں کہنا چاہیے ؎

مدت سے میری ان کی قیامت کی ہے تکرار
بات اتنی ہے وہ کل کہتے ہیں میں آج

ہمارا اور لیگ کا اختلاف کوئی کفر اور ایمان کا اختلاف نہ تھا۔ یہ تو بالکل سطحی اختلاف تھا۔

بھائی حسام الدین نے آپ کے سامنے جو قرارداد پیش کی ہے، وہ مجلسِ احرار کی آئندہ پالیسی کی آئینہ دار ہے، ہم نے اپنی تیس سال کی کمائی حکومت اور مسلم لیگ کے حوالے کر دی ہے۔ ؎

سپردم بتو مایۂ خویش را

کانگرس کے سب سے بڑے لیڈر گاندھی جی نے کہا تھا کہ ہندوستان کی تقسیم گائے کے دو ٹکڑوں کے برابر ہے اور میں اسے کبھی قبول نہیں کروں گا، یہ خبر اخبارات میں آئی تو لیگ نے کہا "نہیں، دو ٹکڑے ہوں گے"۔ اب میں لیگ کا نام ہی کیوں لوں، یہ مطالبہ اسی بچاسی فیصد مسلمانوں نے کیا۔

چنانچہ گاندھی جی کی زندگی میں مونٹ بیٹن کے سامنے پنڈت نہرو اور قائداعظم نے ہندوستان کی تقسیم کو قبول کیا، یعنی کانگرس نے گائے کے دو ٹکڑے کر دیے۔ بنگال اور پنجاب کی تقسیم کا مطالبہ کانگرس نے کیا — کون کانگرس؟ نیشنلزم کی مدعی کانگرس، "ایک وطن، ایک تہذیب اور ایک ملک کا نعرہ لگانے والی کانگرس"، اس کانگرس نے ضلعوں کو بٹوایا۔ گئو ماتا کے دو ٹکڑے ہی نہیں کروائے بلکہ گائے کا قیمہ قیمہ کر کے اس کے کوفتے بنا دیے۔

(اس موقعہ پر بے انتہا قہقہے بلند ہوئے، تو آپ نے فرمایا)

یہ وقت مذاق کا نہیں نوجوانو! سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرو، زندہ رہنے کے عزائم سوچو، سپاہی بنو۔"

اس موقعہ پر چودھری غلام عباس جنہیں مجلسِ احرار نے اپنے اجلاس میں شامل ہونے کی دعوت دے رکھی تھی، پنڈال میں داخل ہوئے۔ جیوشِ احرار نے اپنے

روایتی انداز میں ان کا استقبال کیا۔ اس دوران "کشمیر ہمارا ہے" کے نعرے بھی بلند ہوئے۔ اس موقعے پر امیر شریعت نے چودھری غلام عباس اور دوسرے نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"چودھری صاحب کی آمد سے بات دوسری طرف چلی گئی"
عزیزو! خدا جانے اب آپ کس کشمیر کو لینے کے ارادے کر رہے ہیں، یا کس کشمیر کے متعلق سوچتے ہیں؟ ورنہ وہ کشمیر جو ذہنوں میں جنت کا نشان ہے، جس کے متعلق میری رائے ہے کہ پروردگار عالم نے آسمانوں پر اپنی موجودگی میں تیار کروا کے اسے زمین پر اتار دیا وہ جنت کا ایک ٹکڑا ہے، جس پر اب نہیں بلکہ ۱۹۳۱ء سے مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہے، اس زمانے میں ہم نے اسی کشمیر کے متعلق مسلمانوں سے بات کہی تھی، لیکن اس وقت کے رئیس مسلمانوں نے جن کا دخل فرنگی ایوانوں میں تھا ہماری بات نہ سنی، اگر اس زمانے میں جب ہم نے چالیس ہزار کے قریب مسلمانوں کو جیل میں بھجوایا اور بائیس نوجوانوں نے کشمیر کی آزادی کے لیے جام شہادت نوش فرمایا تھا ہماری بات مان لی ہوتی تو آج کشمیر کا نقشہ یہ نہ ہوتا۔ خیر — بہر حال.... اب آپ بھی سن لیں اور چودھری صاحب بھی! کشمیر تو آپ اپنے ہاتھ سے دے چکے۔ اگر فائر بندی کی بات نہ ہوتی تو ممکن ہے کوئی بات بن جاتی، مگر اب تو میری بات لکھ کر جیب میں ڈال لو، فرنگی اور ہندو اب آپ کو کشمیر نہیں دیتے۔ ہاں البتہ اگر کبھی فرنگی کو ضرورت ہو کہ وہ اس مستقل فساد کو ختم کرنا چاہے تو ممکن ہے اس کا کچھ حصہ آپ کے پاس آجائے۔"

آخر میں آپ نے فرمایا :۔

"مجلس احرار اب مذہبی اور اصلاحی کاموں میں سرگرم عمل رہے گی۔ مسئلہ ختم نبوّت اس کا بنیادی مسئلہ ہے۔ سیاست اب ہماری منزل نہیں، وہ جانے مسلم لیگ اور اس کا کام۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلم لیگ کے پاس قوت ہے اور ہم اس قوت سے ڈر گئے ہیں، نہیں، نہیں! بلکہ ملک کی ضرورت اور حالات ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم متحد ہو کر بغیر کسی اندرونی خلفشار کے پاکستان کی کمزور بنیادوں کی نگہداشت کریں۔ ان الفاظ سے میں اس قرارداد کی تائید کرتا ہوں"

امیر شریعت کی یہ تقریر رات دو بجے کے قریب ختم ہوئی۔

سیاسیات سے علیحدگی

میدان جنگ کے بعد سیاسی لڑائیاں ہمیشہ فکر و نظر کے تحت لڑی گئیں۔ کبھی شطرنج پر مہروں کی اٹھا پٹک سے اور کبھی افراد کی ذہنی کاوش سے، لیکن میدان میں مات کھانے والے لوگ نہ بزدل ہوتے ہیں اور نہ ہی انہیں بزدل کہا جاتا ہے۔

امیر شریعت اور ان کے رفقا نے زندگی کی بساط پر جو بازی لگائی، وہ اسلحہ کی لڑائی نہیں تھی بلکہ ایک نظریے کی جنگ تھی۔ ایک طرف اقتدار وہ بھی غیر ملکی، سمندروں کے پانی اور پہاڑوں کی بلندیاں جن کے پاؤں چھوتی تھیں۔ سورج جن کے جلو میں طلوع ہو کر جب شام کو شفق کی پنہائیوں میں غروب ہوتا تو یہاں بھی برطانوی پرچم کی اڑانیں ہی اسے پناہ دیتیں اور دوسری طرف یہ درویش منش لوگ، جن سے اپنے بھی ناخوش، جو اپنی تقدیر کے آپ خالق تھے، لیکن ان کی تدبیروں سے شہنشاہوں کے مقدر بنتے اور بگڑتے رہے۔ وہ آواز دیتے تو اقتدار کی زبانیں گنگ ہو جاتیں۔ ان کی رفتار سے کردار کو کئی راہیں ملیں، انہیں غیر ملکی راج کے وارثوں نے لوہے کی زنجیروں میں جکڑا،

بس دیوارِ زنداں اُن کے حوصلے توڑنے کی کوششیں کیں، پھانسی کے تختے ان کے راستے میں بچھائے، لیکن مردانِ حُر اپنی منزل سے دور نہ رہے اور آخر وقت آیا کہ برطانوی سامراج کا سانس اکھڑ گیا اور وہ موت کی ایسی غار میں دفن ہوا کہ نشان تک باقی نہ رہا۔

یہ فکر و نظر کی لڑائی کا نتیجہ تھا کہ ان لوگوں کی جیت ہوئی، جو ایمان کی قوت سے مسلح تھے، جن کے عزم و ارادوں نے وقت کی سب سے جابر سلطنت سے ٹکرا کر بھی فتح پائی۔

پاکستان دو نظریوں میں اختلاف کی جنگ تھی، نہ کہ مقصد کی جس پر لفظِ فتح اور شکست کا اطلاق کیا جائے، امیرِ شریعت اپنے مقصد میں کامیاب نکلے کہ برطانوی پرچم سرنگوں ہو گیا۔ بلاشبہ وقتی طور پر وہ اپنی رائے کی بازی ہار گئے، جس کا انہوں نے ۲۴۔ دسمبر ۱۹۴۶ء کے خط میں اعتراف کیا، لیکن اب یہ فیصلہ مستقبل کے ہاتھ میں ہے، کہ امیرِ شریعت کی رائے درست تھی یا، ۱۹۴۷ء کا برطانوی آئین؟

۱۴۔ جنوری کی قرارداد کے بعد امیرِ شریعتؒ سیاسیات سے کنارہ کش ہو کر ملتان میں گوشہ نشین ہو گئے۔ البتہ کبھی کبھار دیہات کے مذہبی اجتماعات میں شرکت کرتے اور وہ بھی بڑے اصرار پر، ورنہ مکان کی مردانہ بیٹھک میں عبادتِ الٰہی میں مصروف رہتے ملنے والے یہیں آجاتے تو پھر گھنٹوں ادبی محفلیں جمتیں۔ اسی طرح کی ایک محفل میں لاہور کے ایک ایڈووکیٹ بابو عبدالغفور نے امیرِ شریعتؒ سے سوال کیا ——

"شاہ جی! آج کل سیاست کیسی ہے"؟

جواب میں فرمایا

"ریاست میں سیاست کیسی بابو۔ اپنے بال بچوں کا پیٹ پالو، اگر ہو سکے تو نیکی کرتے رہو اور مر جاؤ۔"

کسی نے پوچھا "شاہ جی! پہلے آپ مسلم لیگ کی مخالفت کرتے تھے اور اب حمایت"؟

فرمایا "بھائی ان دنوں حضرت حسینؓ کی سُنّت ادا کرتا تھا، اور اب حضرت حسن کی"۔

انہی دنوں لاہور کے حاجی دین محمد، امیر شریعت کی خدمت میں حاضر ہوئے تو کرائے کا مکان دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے، اور کہا "شاہ جی! اگر آپ چاہیں تو لاہور شادباغ میں زمین خرید کر مکان تعمیر کرا دوں" جواب میں فرمایا۔

"حاجی صاحب! میرے پاس اتنی رقم کہاں"؟

حاجی صاحب نے کہا "نہیں تو پھر بیس ہزار روپیہ مجھ سے لے لیں، اور جہاں مناسب سمجھیں مکان بنا لیں"۔

امیر شریعت نے مسکرا کر جواب دیا "نہیں حاجی صاحب! شکریہ"!

اسی سال لائل پور کے جے، ایم، ہوزری کے مالک شیخ محمد طفیل بھی ملتان آئے کہ شاہ جی کے لیے مکان کا انتظام کیا جائے۔ گوجرانوالہ کے دوستوں نے تو زمین بھی خرید لی، لیکن ان سب کو امیر شریعتؒ نے ایک ہی جواب دیا۔

"میں تمام احباب کا ممنون ہوں، جو اپنی اپنی جگہ پر میرے لیے رہائش کا انتظام کر رہے ہیں۔ شاید انہیں نہیں معلوم کہ اسی طرح کی کوشش ایک دفعہ نواب بہاولپور نے بھی کی تھی، لیکن اگر میں نے مکان ہی بنانے ہوتے تو ہر شہر اور ہر بستی میں سونے کے مکان بنا سکتا تھا۔ لیکن جس نے اپنے امرتسر والے مکان کا کلیم داخل نہیں کیا جو میرا حق بنتا ہے وہ کسی دوسرے کا ممنونِ احسان کیونکر ہو سکتا ہے"۔

پٹنہ میں میرے ننہال کی خاصی جائیداد تھی۔ وہاں گیا تو دیکھا

کہ اس پر ہندوؤں نے مندر تعمیر کر لیا ہے۔ اس جائیداد کو میں نے یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ چلو اللہ کی عبادت ہی کریں گے۔ میرے عقیدے پر نہ سہی اپنے رنگ میں ہی سہی۔

بہرحال میں تمام دوستوں کا ممنون ہوں۔ اللہ تعالےٰ سب کو جزائے خیر دے۔"

مدرسہ قاسم العلوم ملتان کے مفتی محمد شفیع صاحب ایک دن امیر شریعتؒ سے ملنے گھر پہنچے تو دیکھا کہ مرغیوں کو دانہ کھلا رہے ہیں۔ مفتی صاحب نے سوال کیا۔

شاہ جی! یہ کام باقی رہ گیا تھا؟"

جواب میں فرمایا۔

"تیس سال تک میں نے آپ لوگوں کو بلایا ہے، مگر آپ مجھ سے بھاگتے رہے۔ اب یہ بے زبان ہیں، ذرا سی آواز دیتا ہوں تو فوراً چلے آتے ہیں۔ اس دور کے انسانوں سے تو یہ حیوان کہیں بہتر ہیں۔"

غرض اسی طرح کی ادبی اور نیم سیاسی گھریلو محفلوں میں اور کبھی کبھار شہری آبادی سے دور دیہاتی عوام میں مذہبی قسم کے وعظ کرتے ہوئے امیر شریعت نے ۱۹۵۰ء تک کا زمانہ گزار دیا۔



پانچواں باب ۱۹۵۰ء — ۱۹۶۱ء

استحکامِ پاکستان

برصغیر پاک و ہند کے آزاد ہوتے ہی برطانوی سامراج کی تمام نوآبادیات اپنی آزادی کے لیے پر تولنے لگیں۔ اسلامی ملک اور خاص کر عرب ریاستوں کو برطانوی اقتدار نے جن اطوار سے غلام بنا رکھا تھا، وہ آہستہ آہستہ دم توڑ رہے تھے۔ انہی دنوں پاکستان کے پہلے وزیراعظم خان لیاقت علی خاں کو روس نے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ اس سے پیشتر امریکہ نے بھی وزیراعظم پاکستان کو اپنے ہاں دورہ کی دعوت دے رکھی تھی، جسے لیاقت علی خاں نے فوراً منظور کر لیا، لیکن وہ روس کی بجائے امریکہ چلے گئے۔ یہ ۱۹۵۰ء کا واقعہ ہے۔

پاکستان کو روس اور امریکہ کی دعوتیں برطانوی منشا کے خلاف تھیں، جبکہ مصر اور ایران اپنے اپنے ملک سے برطانوی اقتدار کے خاتمے کی فکر میں تھے۔ ایک نوزائیدہ اسلامی ملک کا برطانوی منشا کے خلاف حرکت کرنا تعجب خیز تھا۔

ہنوز پاکستان کی بنیادیں بھی ناپختہ تھیں۔ ایک طرف ملکی استحکام متزلزل تھا، دشمن پاکستان کی کمزور دیواروں سے جھانک رہا تھا۔ تو دوسری طرف اندرون ملک کے حالات بھی موافق نہیں تھے۔ مرزائی جماعت کا الہامی عقیدہ تھا اور ہے کہ:۔

"پاکستان کا وجود عارضی ہے اور کچھ وقت کے لیے دونوں قومیں (ہندو، مسلمان) جدا جدا رہیں گی، مگر یہ حالت عارضی ہوگی اور ہمیں یہ کوشش کرنی چاہیے کہ جلد دور ہو جائے۔"

بہر حال ہم چاہتے ہیں کہ "اکھنڈ" ہندوستان بنے اور ساری قومیں باہم شیر و شکر ہو کر رہیں۔"

(اخبار "الفضل" ۵-اپریل ۱۹۴۷ء)

امیر شریعتؒ نے انہی دنوں ملتان میں تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

"عزیز نوجوانو! میں پورے ایک سال سے ارادتاً خاموش ہوں اور نہ اب تقریر کرنے آیا ہوں، ظاہر ہے کہ میں تم سے کہوں تو کیا کہوں؟ جو کہنا چاہتا ہوں وہ تم سنتے نہیں، اور جو تم سنتے ہو، وہ میرے بس میں نہیں۔ میں گھر کی چار دیواری میں بند ہوں، جس کے اندر سارا کچھ ہی ہے اور باہر کچھ بھی نہیں وہ ہے اسلام!

میرے پاس اللہ کی ایک کتاب ہے، جسے میں معاشرہ انسانی کے لیے ضابطہ حیات سمجھتا ہوں، اور اسی کی تبلیغ گذشتہ چالیس سال سے کر رہا ہوں، تم مانتے نہیں ہو اور میں خاموش نہیں رہ سکتا۔

جب بھی خطرے کی کوئی بات دیکھتا ہوں تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا، باہر نکل کر بھونکتا ہوں کہ چور دیواریں توڑ رہے ہیں، مگر تم چور کو تو دیکھتے نہیں الٹا مجھے مارنے دوڑتے ہو کہ کم بخت سونے نہیں دیتا۔ مگر کیا کروں عادت سی بن گئی ہے۔

بیماری نے میرا کچومر نکال دیا ہے، سارا جسم بغاوت پر اتر آیا ہے۔ ہوئی بھی تو کم نہیں اس کم بخت کے ساتھ، بغاوت نہ کرے تو کیا کرے۔

مرزا بشیر الدین محمود نے ایک الہام شائع کیا ہے جسے آجکل مرزائی بڑی تیزی سے ہوا دے رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے

ایک رویا دیکھا ہے جس کے معنی ہیں کہ گاندھی آئے ہیں اور حضور کے ساتھ ایک ہی چارپائی پر لیٹنا چاہتے ہیں اور ذراسی دیر میں اٹھ بیٹھے اور گفتگو شروع کر دی۔

اس الہام کی تعبیر میں وہ خود ہی (مرزا البشیر الدین محمود) کہتا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان اکھنڈ ہو جائیں گے۔ (یعنی ہندوستان اور پاکستان اکٹھے ہو جائیں گے)

میں تم سے پوچھتا ہوں، مسلمانو! جس ملک کو دس ہزار بیٹیوں کی آبرو دے کر اور چالیس لاکھ مسلمانوں کی بربادی اور تباہی کے بعد حاصل کیا ہے اسے کیا پھر ہندوستان کے ساتھ ملانے کے ارادے ہیں؟

مسلمانو! مرزائیت کے یہی ناپاک ارادے مجھے گھر کی چاردیواری سے نکال کر تمہارے سامنے لے آئے ہیں، ورنہ اب میں تھک چکا ہوں، رہی سہی کسر بیماری نے پوری کر دی ہے (میں ایک عظیم خطرے سے پھر تمہیں آگاہ کرنے آیا ہوں۔ مرزائیوں کے ناپاک عزائم خدا جانے کیا رنگ لائیں گے۔ انگریز گورنر اپنی روحانی اولاد کو چناب کے اس پار جو قیمتی زمین کوڑیوں کے بھاؤ دے گیا ہے یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ انگریزوں کا یہ خود کاشتہ پودا پاکستان میں بیٹھ کر بھی برطانیہ کی جاسوسی کر رہا ہے۔

میری حکومت نے اگر اس طرف توجہ نہ دی، تو مجھے ڈر ہے کہ اس ملک پر مرزائیوں کا قبضہ ہو جائے گا۔ میں اپنے پیارے وزیراعظم کی خدمت میں گزارش کروں گا کہ وہ اس سیاسی ٹولے پر خصوصی نظر رکھیں"

امیرِ شریعتؒ کی اس تقریر کو اس زمانے کے اخبارات نے کافی دلچسپی سے شائع کیا۔ امریکی دورے سے واپسی پر خان لیاقت علی خاں نے امیرِ شریعت سے ملنے کی خواہش کی، لیکن انہوں نے یہ کہہ کر وزیر اعظم کو ملنے سے انکار کر دیا کہ:۔

"یہ کام جماعت کے صدر کا ہے کہ وہ ملک کے کسی ذمہ دار آفیسر سے یا عہدے دار سے ملیں، میں تو ادنیٰ رضا کار ہوں"۔

ان دنوں مجلسِ احرار کے صدر ماسٹر تاج الدین تھے۔ انہوں نے بھی کہا مگر امیرِ شریعتؒ نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ کام آپ کا ہے۔

مسلم لیگ کی غلطی

اسی سال صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں پنجاب مسلم لیگ نے اپنے امیدواروں میں چھ مرزائیوں کو شامل کر کے انہیں ٹکٹ دے دیے۔ اس سلسلہ میں مجلسِ احرار نے ایک پریس بیان میں کہا:

"مجلسِ احرار براہِ راست سیاسیات میں دخیل نہیں، اور نہ ہی وہ الیکشن میں حصہ لینا پسند کرتی ہے۔ لیکن مسلم لیگ نے مرزائیوں کو ٹکٹ دیے ہیں، اب مجلسِ احرار ان کا مقابلہ کرنا اپنا دینی فرض سمجھتی ہے"۔

اس پر مجلسِ احرار نے پاکستان کے وزیر اعظم خان لیاقت علی خاں سے جو مسلم لیگ کے صدر بھی تھے، برقی تار کے ذریعے احتجاج کیا، جس کے جواب میں وزیر اعظم نے احرار رہنماؤں کو اپنے ایک ذمہ دار اور با اعتماد ذریعہ سے یقین دلایا کہ وہ ان حلقوں کا دورہ نہیں کریں گے جہاں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر مرزائی الیکشن لڑ رہے ہیں۔

انتخابات کے دنوں حضرت امیرِ شریعتؒ نے اپنی بیماری اور نقاہت کے باوجود شب و روز ان قصبات کا دورہ کیا، جہاں مرزائی اسلام اور مسلمانوں کا سا لباس

مہن کر الیکشن کی تیاریاں کر رہے تھے۔ جب اس الیکشن کا نتیجہ نکلا تو تمام مرزائی شکست کھا چکے تھے جس پر مسلم لیگ کو کافی شرمندگی اٹھانا پڑی۔

والد صاحب کا انتقال

ایران اور مصر کے حالات نے اس تیزی کے ساتھ کروٹ لی کہ برطانوی سامراج کے ہاتھوں کے طوطے اڑنے لگے ایران کے وزیر اعظم ڈاکٹر محمد مصدق نے اینگلو پرشین کمپنی کے مابین معاہدوں کو ختم کر کے تمام وسیع کاروبار کو قومی تحویل میں لے لیا۔ اس سے برطانوی مفاد پر خاصی ضرب پڑی۔ دوسری طرف مصر کے وزیر اعظم نحاس پاشا اس معاہدہ کے خلاف ہو رہے تھے، جس کی رو سے برطانیہ کو نہر سویز کی حفاظت کے لیے ایک مخصوص علاقے میں اپنی فوج متعین کرنے کی رعایت حاصل تھی۔

ایشیا میں یہی حالات برطانیہ کے خلاف وہاں کے عوام میں بغاوت پھیلا رہے تھے کہ بھارت کی فوجیں پاکستان کی سرحدوں پر متعین کر دی گئیں، جنہیں پاکستان کے لیے فوجی خطرہ محسوس کرتے ہوئے وزیر اعظم لیاقت علی خاں نے بھارت کے وزیر اعظم پنڈت نہرو سے احتجاج کیا اور ساتھ ہی ۱۷۔ جولائی ۱۹۵۱ء کو کراچی کے ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

"پاکستان جنگ نہیں چاہتا، لیکن حملہ آور کے لیے پاکستان کا "مکہ" تیار ہے۔"

یہی "مکہ" بھارت کے خلاف پاکستان کا قومی نعرہ بن گیا۔ ان تمام واقعات نے ایران، مصر اور پاکستان کو ایک دوسرے کی دھڑکنیں سننے پر مجبور کر دیا۔

پاکستان، بھارت کی ان جنگی سرگرمیوں کی وجہ سے میدان جنگ بن گیا اور ہر پاکستانی ملک کی حفاظت کے لیے کفن بردوش نظر آنے لگا۔ ان دنوں ۲۱ اگست ۱۹۵۱ء کو لاہور موچی دروازہ کے باغ میں پنجاب اسمبلی کے سپیکر آنریبل خلیفہ شجاع الدین کی

زیر صدارت امیر شریعتؒ نے کہا:

"حضرات اور صدرِ محترم! بزرگانِ ملت اور برادرانِ عزیز! جنگ کے متعلق کوئی مشورہ یا رائے دینا میرے بس کی بات نہیں، یہ وزارت جنگ جانے اور محکمہ جنگ، کہ کہاں لڑنا ہے اور کہاں نہیں، یا کب لڑنا ہے اور کب نہیں۔ یہ ہمارا کام نہیں، لیکن دعاگو ہوں کہ خدا تعالیٰ ہمیں کامیابی و کامرانی عطا فرمائے۔

۱۴۔ اگست کو ہم نے یوم آزادی منایا اور عوام نے دل کھول کر جوش کا مظاہرہ بھی کیا۔ میں دعا کرتا ہوں کہ خداوند تعالیٰ اس جذبے کو مستقل کر دیں۔

جب کچھ حاصل ہوتا ہے تو خوشی کا اظہار ہوتا ہے، لیکن خوشی میں اصل چیز کو نہیں بھول جایا کرتے۔

پاکستان کسی چار دیواری کا نام نہیں، اگر ہماری زندگی مقتضیات سے عبارت ہے تو پاکستان بھی آپ سے کچھ تقاضا کرتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ جنگ اچھی چیز نہیں، لیکن جب گلے پڑ جائے تو پھر اس کا مقابلہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اگر ناگہاں کوئی مصیبت آ جائے تو اس کو دور کرنا بھی ضروری ہے۔

ہندو مہا سبھا نے اعلان کیا ہے کہ ہم پاکستان کو بزورِ شمشیر فتح کریں گے۔ تشکیلِ پاکستان کے وقت "ملاپ" اخبار نے بھی لکھا تھا کہ "فی الحال چلو پھر قوت کے ساتھ واپس آئیں گے۔" اب تو بھارتی فوجیں پاکستان کی سرحدوں پر جمع بھی ہو گئی ہیں۔ لیکن خان لیاقت علی خان کے جواب میں پنڈت نہرو نے کہا: "ہم جنگ نہیں چاہتے، یہ فوجیں ہم نے امن کے لیے

جمع کی ہیں" خدا جانے پنڈت نہرو نے یونہی بے خبری میں کہہ دیا ہو لیکن خان لیاقت علی خان نے مکہ دکھایا ہے۔۔۔۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ جنگ نہیں ہوگی۔

اگر اعلانِ جنگ ہوا، تو بوڑھا بخاری بھی میدانِ جنگ میں کود پڑے گا۔ مجھے افسوس ضرور ہے کہ میں جوان نہیں لیکن دشمن کے مقابلے میں جوان ہوں۔ میری تمنا ہے کہ بستر پر ایڑیاں رگڑ کر مرنے کی بجائے میدانِ جنگ میں جان دوں۔

جنگ اور کشیدہ حالات کے لیے احکامات مختلف ہوتے ہیں۔ اب یہ ہمارا ملک ہے۔ ذہنیت کو تبدیل کرنا چاہیے۔ ہم کسی کے ملازم نہیں یہ قطعۂ زمین ہم نے بے پناہ قربانیوں کے بعد حاصل کیا ہے اور تیرہ سو سال میں آج تک کسی نے آزادی کے لیے اتنی قیمت ادا نہیں کی جتنی ہمیں کرنی پڑی ہے۔ اب اس بیش قیمت ملک کو بچانے کیلئے تیار رہنا چاہیے۔"

نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:۔

"ہوائی جہاز بھی قوت ہے، بمبار طیارے، سٹین گنیں، برین گنیں، رائفلیں، ٹینک یہ سب چیزیں قوت ہیں، انہیں اکٹھا کرو، اپنے فرائض کو سمجھو، حکومت کو مشورہ نہ دو، وہ اپنی ذمہ داری خود محسوس کرتی ہے، اور خدا کرے زیادہ سے زیادہ محسوس کرے۔

میں مجمع کی زیادتی کو دیکھنا نہیں چاہتا، اور نہ ہی پر جوش جلسہ دیکھنا پسند کرتا ہوں۔ یہاں سے اپنے مقدر کا فیصلہ کر کے اٹھو نوجوانو! یہ میدانِ کارزار کی بات نہیں، اس سے پہلے کی بات ہے۔ لڑائی کے وقت کیا کرنا ہوگا۔ اس کے لیے اور احکام ہیں، ابھی تو صرف آنے والے وقت کی تیاری

کرو، دھاک بٹھا دو، قرآن کے ارشاد کے مطابق اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کیلئے اتنا سامان مہیا کرو کہ دشمن مرعوب ہو جائے۔ قوت میں سب کچھ ہے، قوت کے بغیر کچھ بھی نہیں۔"

آخر میں مجلس احرار کے مؤقف کی وضاحت کرتے ہوئے اعلان کیا:

"یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے پاکستان کی مخالفت کی۔ لیکن جو کچھ کیا اور جو کچھ صحیح سمجھا وہی کچھ کیا۔ ہمارا ضمیر اس وقت بھی مطمئن تھا اور آج بھی شرمندہ نہیں ہے۔

آج ہم کسی سے دب کر کچھ نہیں کہہ رہے، بلکہ پوری آزادی سے کہتے ہیں کہ دفاعِ وطن کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اور اگر کوئی غدار ہو تو اسے کیفرِ کردار تک پہنچاؤ۔ میں آپ سے کچھ نہیں مانگتا۔ میرے پاس نہ دولت ہے نہ ثروت، صرف آپ کی خدمت میں پورے خلوص سے التجا کرتا ہوں، آپ کے پاؤں پر سفید داڑھی رکھ کر اپیل کرتا ہوں کہ آپ اسے منظور کریں! اور وہ یہ کہ ایک جوان بھی ایسا نہ رہے جو نیشنل گارڈ کی وردی نہ پہنے ہوئے ہو۔"

امیرِ شریعت کی اس تقریر نے سارے لاہور کو میدانِ کارزار کے لیے تیار کر دیا۔ حالات جوشِ جہاد کے جذبات سے آگے بڑھ رہے تھے۔ سارا ملک جنگی تیاریوں میں مصروف تھا۔ امیرِ شریعت کراچی، راولپنڈی، پشاور اور لاہور کے علاوہ دیہات و قصبات میں بھی جہاد کی تقریریں کر رہے تھے کہ ۱۶۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو راولپنڈی کے ایک عام اجتماع میں خان لیاقت علی خان کو گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔

اسی سال ۲۸۔ شعبان اتوار کے روز امیرِ شریعت کے والدِ محترم حافظ سید ضیاء الدین شاہ صاحب بخاری اٹھاسی سال کی عمر پا کر اپنے گاؤں ناگڑیاں ضلع گجرات میں انتقال کر گئے۔ اس وقت حضرت امیرِ شریعت کی اپنی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی، لیکن

اس مقام پر بھی حضرت امیرِ شریعت جب کبھی گاؤں جاتے تو والد صاحب انہیں مولوی عطاء اللہ کہہ کر پکارتے، یا بڑے پیار میں ہوں تو حافظ جی کہہ دیتے۔ مگر بقولِ امیرِ شریعتؒ ایسا وقت زندگی میں کم ہی آیا۔ کیونکہ حافظ سید ضیاء الدین شاہ صاحب بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت میں جلال ہی جلال تھا۔

والد صاحب کی موت نے امیرِ شریعتؒ کی صحت کو خستہ دیوار کی طرح گرا دیا۔ لیکن پاکستان کے حالات اور مرزائیوں کے ارادوں نے انہیں والد صاحب کے افسوس اور تعزیت کا بہت کم وقت دیا۔

ایک اہم انکشاف

پاکستان کے وزیر اعظم کی موت کے باوجود بھارت کے جنگی ارادے بدستور قائم رہے۔ اس کے پیشِ نظر ملک کے دفاعی انتظامات ہو رہے تھے کہ ۲۴۔۲۵ مارچ ۱۹۵۲ء استحکام پاکستان احرار کانفرنس میں شمولیت کے لیے امیرِ شریعت سرگودھا پہنچے۔ سارا علاقہ اپنے محبوب رہنما کی زیارت کے لیے اُمڈ آیا تھا آپ کی قیام گاہ پر ایک شخص نے امیرِ شریعتؒ سے علیحدگی میں گفتگو کر لینے کو کہا۔ جسے بڑے اصرار کے بعد امیرِ شریعتؒ نے مان لیا۔ قریباً آدھ گھنٹے کے بعد جب امیرِ شریعت واپس دوستوں میں آئے تو ان کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔

کمبل اوڑھے اسیاہ عینک لگائے دراز قامت یہ شخص کون تھا، کہ جب امیرِ شریعتؒ اس سے مل کر علیحدہ ہوئے تو تحریک ختمِ نبوّت کا آغاز ہو گیا۔ یہ راز صرف حضرت امیرِ شریعتؒ کے پاس محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گا۔ البتہ تحریک ختمِ نبوّت کے بعد ہائی کورٹ سے رہا ہوئے تو اپنے مکان (ملتان) میں بیٹھے بیٹھے راقم سے کہنے لگے:۔

"جانباز! تم اس سال سرگودھا کانفرنس میں موجود تھے جب ایک آدمی مجھے علیحدگی میں ملا تھا؟"

"جی میں وہیں تھا"

"بھلا وہ آدمی کون تھا اور اس نے کیا کہا تھا؟"

"حضرت! یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں تھا"

مسکرا کر فرمانے لگے "نام تو اب بھی نہیں بتاؤں گا، لیکن تھا وہ ایک سرکاری آدمی، اور بتایا اس نے یہ تھا کہ راجہ غضنفر علی (جو اُن دنوں ایران میں پاکستان کے سفیر تھے) اور سر ظفر اللہ خاں (جو پاکستان کے وزیر خارجہ تھے) کے درمیان حال ہی کی ملاقات میں یہ فیصلہ ہوا ہے کہ اس وقت ہم دونوں اقتدار پر ہیں کیوں نہ حکومت پاکستان سے ایسا قانون پاس کرا لیں کہ پاکستان میں کوئی فرقہ کسی فرقے کو کافر نہ کہے۔ اس کے لیے کوشش شروع ہو چکی ہے، شاہ صاحب! اگر آپ کچھ کر سکتے ہیں تو کریں۔

یہ واقعہ سنانے کے بعد امیر شریعتؒ نے کہا:۔

تمہیں یاد ہے کہ میں نے اسی رات بغیر جماعت کے مشورے کے سر ظفر اللہ کا شہر میں جنازہ نکلوانے کا اعلان کر دیا تھا، اگر اس رات یہ حرکت نہ کرتا تو ممکن ہے ملک میں کوئی قانون ایسا بن جاتا کہ باطل کو اپنی زندگی کے لیے قانون کا سہارا میسر آجاتا"

سازش محل میں ہو یا جھونپڑی میں، قانون دونوں جگہوں کو مجرم قرار دیتا ہے۔ راجہ غضنفر علی (شیعہ) اور چودھری سر ظفر اللہ خاں (مرزائی) اپنی سرکاری ذمہ داریوں کی اوٹ لے کر اگر اپنے ارادوں میں کامیاب ہو جاتے، اگر ان کی باہم سازش پاکستان میں کسی قانون کے بنانے کی مرتکب ہوتی، جس کی رو سے کفر کو کفر کہنا جرم قرار دے دیا جاتا، تو پھر استحکام پاکستان کے لیے صدیوں کی ضرورت پڑتی۔

امیر شریعتؒ کی فراست اور دور رس نگاہوں نے تھوڑی سی تلخی گوارا کر کے یہ زہر بھی پی لیا کہ وطن عزیز کا مستقبل باطل کے ہاتھوں تاریک نہ ہو جائے۔

بیٹی کی شادی

گھریلو رسم و رواج اور برادری کے مروّجہ آئین سے انحراف جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ پھر اس آدمی کے لیے جس نے عوام کو ہمیشہ مذہب کی راہیں سجھائی ہوں، اس وادی سے گزرنا اور بھی مشکل ہے۔

امیر شریعتؒ کے قدم اس راہ میں بھی نہیں ڈگمگائے، حالانکہ ان کی برادری بھی تھی اور خاندان کی رسمیں بھی، لیکن غیر ملکی سلطنت کے باغی اور اسلام کے داعی نے سماج کے بنائے ہوئے تمام قوانین کو ٹھکرا کر اسلام کے ضابطۂ حیات کو اپنی عاقبت کے لیے بہتر سمجھا، اور نہ تو بیٹی کا "ور" تلاش کرنے میں عجلت کی، اور نہ ہی خاندانی حصار میں رہے، بلکہ نیک سیرت، نیک خصلت اور تقویٰ کے پابند نوجوان کی جستجو میں بیٹی کے بالغ ہونے تک اپنی نظروں کو مصروف رکھا۔ آخر اس تجسس میں کامیاب نکلے۔ بحرِ حوادث کے باوجود ایسا موتی تلاش کیا کہ جس کی تردامنی پر فرشتے وضو کر سکتے ہیں۔

عبدالحکیم ضلع ملتان کے ایک گمنام سید محمد شفیع شاہ صاحب، جن کا آبائی وطن پسرور ضلع سیالکوٹ ہے کے لڑکے سید وکیل احمد شاہ سے اپنی لڑکی کی نسبت کر دی۔

وکیل احمد شاہ شادی سے قبل دینی کتب سے فارغ ہو کر بی۔ اے کے طالبعلم تھے۔ سیرت کے ساتھ مشاطۂ فطرت نے انہیں حُسنِ ظاہری سے بھی سنوارا ہے۔ بوٹا سا قد، چشمِ آہو، کھلی پیشانی، یہ سارا کچھ گندمی رنگ کے چہرے پر اس قدر خوبصورت اور دل آویز ہے کہ صانعِ فطرت کی بلائیں لینے کو جی چاہتا ہے۔

جہیز

بیٹی کا جہیز موجودہ زمانے کے رسم و رواج میں والدین کے لیے عذابِ دنیوی سے کم نہیں۔ یہ رسم قرض لے کر پوری کی جائے یا اثاثۂ حیات بیچ کر۔ دونوں صورتوں میں لڑکی کے والدین کا مستقبل تاریک ہو جاتا ہے، لیکن امیر شریعتؒ نے

کفر کی اس عمارت کو استقلال کے جن ارادوں سے چکنا چور کیا، اور عزیزہ بیٹی کو سنت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی چادر میں لپیٹ کر گھر سے رخصت کیا، یہ بھی ایک جہاد تھا، سوسائٹی کے مروّجہ رواج کے خلاف جس سے دورِ رواں میں نجات مشکل ہے۔

انصاف کلاتھ ہاؤس (لائل پور) کے مالک شیخ گلزار کا بیان ہے کہ:

"شاہ جی اپنی بیٹی کی شادی کے سلسلے میں کراچی آئے اور کہا تمہاری ہمشیرہ کی شادی کے لیے کپڑا خریدنا ہے بازار چلو۔ میں ہزار روپیہ جیب میں ڈال کر شاہ جی کے ساتھ ہولیا۔ پانچ سو سے کچھ کم کا کپڑا خرید چکے تو کہا "بس بیٹا!"

میں نے عرض کیا: "حضرت یہ تو کچھ بھی نہ ہوا"۔

جواب میں کہا "بیٹا! میری گرہ اسی قدر اجازت دیتی ہے"۔

اس پر میں نے عرض کیا۔ "حضرت! پیسے بہت ہیں"۔

فرمایا۔ "نہیں میرے عزیز! میں تمہیں اس لیے ساتھ نہیں لایا، کہ تمہارے پاس پیسے بہت ہیں، بلکہ مجھے اس کپڑے کی پہچان نہیں، اور دوسرا تمہارے ساتھ ہونے سے کچھ رعایت ہو گئی"۔

"چنانچہ شاہ جی نے تمام رقم اپنی گرہ سے ادا کی"۔

رسمِ نکاح مخدوم محترم حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری نے ادا فرمائی، اور اس طرح مارچ کے آخر یا اپریل ۱۹۵۲ء کے شروع میں امیر شریعت نے اپنے جگر گوشے کو آنسوؤں کے زیورات سے آراستہ کر کے گھر سے رخصت کیا۔

شادی کے بعد سید وکیل احمد شاہ نے عربی کا ایم۔اے کیا۔ اور اس پر سر سے پاتک کھدر کے لباس میں ملبوس، شرعی داڑھی، طبیعت میں سادگی لیے ہوئے یہ نوجوان آج میونسپل کالج اوکاڑہ میں پروفیسر ہے۔

تحریکِ ختمِ نبوّت

۱۸۵۷ء کے بعد غیر ملکی حکمرانوں نے اپنے دائمی استحکام کے لیے ہندوستان کی مختلف اقوام میں منافرت کا جو بیج بویا، اس کے برگ و بار میں مرزائیت ایک ایسی تحریک ثابت ہوئی کہ نہ صرف اسلام کے بنیادی ستون ہی متزلزل ہوئے بلکہ ہندوستان کی غیر ملکی غلامی کی عمر بھی طویل ہوتی چلی گئی۔ جیسے جیسے اجنبی راج کا اقتدار جڑ پکڑتا گیا، اسی رفتار سے مرزائیت کو پنپنے کے وسائل میسر آتے رہے۔

اپنی بنیاد کے دو سال بعد مجلسِ احرار نے اس تحریک کے مقابلے کے لیے قادیان میں اپنا دفتر قائم کیا۔ زعمائے احرار کے نزدیک غلامی سے آزادی تک کا راستہ مرزائیت کی موت کے بغیر طے نہیں ہو سکتا تھا۔ جڑ کاٹنے سے پیشتر درخت کے تنے اور شاخیں کاٹنا ضروری ہوتی ہیں۔

۱۹۲۰ء میں امیرِ شریعتؒ نے مرزا بشیر الدین محمود کو للکارا تھا۔ اس وقت ان کی یہ للکار انفرادی حیثیت رکھتی تھی لیکن ۱۹۳۱ء میں مجلسِ احرار نے جب مرزائیت کا محاسبہ کیا تو امیرِ شریعتؒ کے لاکھوں مرید اور ہزاروں رضا کاروں کی فعال جماعت ان کی پشت پناہ تھی۔

۱۹۴۷ء میں انگریزی سامراج کے خاتمے نے یہ امید دلائی تھی کہ پاکستان اسلامی ریاست ہونے ہوئے غیر اسلامی مذاہب کو اس قدر اہمیت نہیں دے گا کہ وہ براہ راست ریاست کے نظم ونسق پر حاوی ہو جائے۔ ان دنوں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان محلاتی سازشوں کا جال اس تیزی سے بچھایا جا رہا تھا کہ اندرونِ ملک کی سیاسی قلابازیوں سے حکمران طبقہ قطعاً نا آشنا تھا۔

خان لیاقت علی خان کی موت کے بعد خواجہ ناظم الدین وزارتِ عظمیٰ کی کرسی پر جا بیٹھے، اور اپنی جگہ ملک غلام محمد جو وزیرِ خزانہ تھے کو پاکستان کا گورنر جنرل بنا دیا اور وزیرِ خزانہ کی کرسی چودھری محمد علی کے حوالے کر دی گئی۔ اس عاجلانہ تبدیلی نے پاکستان کی

سابقہ خارجہ پالیسی پر بھی اثر کیا۔ شہید وزیر اعظم نے اسلامی ممالک سے جو راہ و رسم بڑھائے تھے، خواجہ ناظم الدین نے اپنی حکومت کا رُخ ان سے مختلف کر دیا۔ مصر اور ایران کی حمایت کرنے کی بجائے برطانوی قرابت داری کو مقدم سمجھا گیا۔

اس افراتفری میں صوبائی اور مرکزی حکومت کے مابین اختلافات میں اور کشیدگی پیدا ہوئی۔ پنجاب میں میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ اور سرحد میں خان عبدالقیوم نے من مانی کارروائیاں شروع کر دیں۔ اس طرح سندھ کے گورنر شیخ دین محمد نے صوبے کے وزیر اعلیٰ محمد ایوب کھوڑو اور وزیر مال قاضی فضل اللہ کے خلاف پیروڈا کے تحت مقدمات دائر کر دیے۔ مشرقی پاکستان میں اردو کے مقابل بنگالی زبان کو پاکستان کی قومی زبان بنانے پر وہاں کے طلباء نے ایجی ٹیشن شروع کر دی۔ غرض ہر صوبہ کے حاکم اعلیٰ نے اپنی اپنی سیاسی ضرورت کے لیے کبھی الیکشن کا ہنگامہ، کبھی آٹے کی قلت کا سوال اور کہیں بنگالی اور اردو کے تصادم سے عوام کو مرکزی حکومت کے خلاف اکسایا۔

پاکستان کے ایسے حالات کو مرزائیوں نے اپنے لیے مفید پا کر اکھنڈ بھارت کے الہامی عقیدے کی تبلیغ شروع کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے مختلف الخیال رہنماؤں کو مرزائیت کے متعلق سوچنا پڑا۔ امیر شریعتؒ ۱۹۴۹ء میں سیاسیات سے علیحدگی کے بعد قادیانیت کے استحصال کے لیے ہمہ تن مصروف تھے کہ ۹ مئی ۱۹۵۱ء کو برکت علی ہال لاہور میں ایک کنونشن بلایا گیا، جس میں امیر شریعتؒ بھی شریک ہوئے۔ اس اجلاس کے اختتام پر مرزائیت کے خلاف سارے مغربی پاکستان میں تحریک کا آغاز ہوا، لیکن حکومت کے سامنے مطالبات رکھنے کے لیے کنونشن کے مختلف اجلاس لاہور اور کراچی میں ہوئے۔ اس اثناء میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے مابین حالات نے کئی کروٹیں لیں۔ حکمرانوں کو غافل پا کر مرزائی لیڈر مرزا بشیر الدین محمود نے کہنا شروع کر دیا:

۱۔ "احمدیت کے مخالف عنقریب مرزا صاحب یا ان کے کسی جانشین کے

سامنے مجرموں کی طرح پیش ہوں گے"۔

(خطبہ جمعہ بشیر الدین محمود-۳-جنوری ۱۹۵۲ء)

۲: "احمدیوں کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ فوجی محکموں کی طرح گورنمنٹ کے دوسرے محکموں میں بھرتی ہونے کی کوشش کریں تاکہ تبلیغی پروگرام کو تقویت پہنچے"۔

(خطبہ جمعہ بشیر الدین محمود "الفضل" ۱۱ جنوری ۱۹۵۲ء)

نیز مرزائیوں کو ہدایت کی گئی:

"ایسے حالات پیدا کر دو کہ ۱۹۵۲ء گزرنے سے پہلے پہلے دشمن احمدیت کے آغوش میں گرنے پر مجبور ہو جائیں۔

("الفضل"-۱۷-جنوری ۱۹۵۲ء)

مرزائیوں کی ان اشتعال انگیز تحریروں نے پاکستانی عوام کو اس قدر مشتعل کیا کہ وہ وطن عزیز اور ایمان ایسی گرانبار دولت کو محفوظ رکھنے کے لیے تدبیریں سوچنے لگے۔

امیر شریعت کی صحت اور ... ان کا ذاتی معالج (حکیم عطاء اللہ خاں) انہیں کسی قسم کے سفر کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ لیکن توہینِ خاتم الانبیاءؐ کے باعث امیر شریعتؒ اپنی بیماری کو بھول چکے تھے۔ تحریک راجپال کے بعد یہ دوسرا موقعہ تھا کہ امیر شریعتؒ مرزائیت کے خلاف اس قدر جذباتی ہو گئے تھے کہ اس سے پیشتر انہیں کبھی اتنا متشدد نہیں دیکھا گیا تھا۔

"لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کے آگے "لا نبی بعدی" کا جملہ ہر مجمع میں کہتے اور عوام کو تاکید کرتے کہ:

"مقامِ نبوت ایسے خطرناک موڑ پر آن پہنچا ہے، اگر آج اس کی حفاظت نہ کی گئی، تو قیامت کے دن ہم سب کی بخششوں کا کوئی امکان نہیں ہو سکتا"۔

ایک سوال پر گواہ نے کہا کہ جگہ شارٹ ہینڈ نوٹوں میں چھوڑ دی تھی۔

س : کیا یہ ہدایات دی گئی تھیں کہ جہاں آپ کا خیال ہو جگہ چھوڑ دو یا کوئی خاص جگہ چھوڑنے کے لیے کہا گیا تھا۔

ج کہیں ایک لائن کہیں دو لائنیں۔

س : میرا سوال یہ ہے کیا یہ قطعی سہولت دی گئی تھی کہ کس طرح جگہ خالی چھوڑی جائے ؟

ج : نہیں ! خاص طریقے کی ہدایت نہیں دی گئی تھی۔

س : یہ ہدایات کس کی تقریروں کے متعلق تھیں ؟

ج : سید عطاء اللہ شاہ کی تقریر کے متعلق۔

س : تقریر کہاں کرنی تھی ؟

ج : پیر غازی میں۔

س : کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ کو جگہ چھوڑنے کے متعلق کیوں ہدایت کی گئی تھی ؟

ج : مجھے پتہ نہیں۔

س : آپ کو پتہ نہیں تھا اور آپ نے کسی سے خیال بھی ظاہر نہیں کیا ؟

ج : نہیں۔

س : آپ قیاس بھی نہیں کر سکتے تھے ؟

ج : قیاس تو ہر شخص کر سکتا ہے ایک معمولی سا ملازم بھی۔

عدالت سے تحفظ کی درخواست

س : کیا پہلا موقع تھا جب آپ نے اس طرح خالی جگہ چھوڑی ؟

ج : اگر عدالت مجھے تحفظ دے تو میں اس سوال کا جواب دے سکتا ہوں۔

چیف جسٹس : آپ کو تحفظ دیا جاتا ہے، لیکن اگر یہ خیال ہوا کہ آپ کا جواب غلط ہے تو مقدمہ چل سکتا ہے، اگر درست ہوا تو نہیں۔

لدھارام : میری عرض یہ ہے کہ میں جن واقعات کے متعلق جواب دوں گا، اس میں مقدمہ چل کر سزا ہو سکتی ہے۔

مسٹر سلیم : مائی لارڈ، میری درخواست ہے کہ یہ کارروائی میں لکھا جائے کہ گواہ کو مجبور کیا گیا کہ وہ اس سوال کا جواب دے۔ اس میں سب کچھ آجاتا ہے۔

میاں عبدالعزیز : لیکن اس صورت میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گواہ جواب دینے سے انکار کر دے۔

چیف جسٹس : محض یہ سوال دریافت کیا جائے کہ کیا گواہ کو پہلے بھی یہ ہدایت ملی تھی۔

مسٹر سلیم نے یہی سوال کیا جس کے جواب میں گواہ نے کہا کہ مجھے اس سے پہلے بھی اسی طرح کی ہدایات ملی تھیں۔

مسٹر سلیم : آپ کو ہدایات کب ملی تھیں؟

اس مرحلے پر وکیل صفائی میاں عبدالعزیز نے درخواست کی کہ اس سوال کے جواب میں گواہ کو تحفظ دیا جائے۔

چیف جسٹس : یہاں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ گواہ پہلے کہہ چکا ہے کہ اسے پہلے بھی ہدایات ملتی رہی ہیں۔

میاں عبدالعزیز : لیکن اس معاملہ میں گواہ کو ضرور تحفظ ملنا چاہیے۔

چیف جسٹس : صرف اس خاص سوال کے جواب میں تحفظ دیا جائے گا۔

مسٹر سلیم : (گواہ سے) سید بخاری کے جلسے کے متعلق آپ کو جو ہدایات دی گئی تھیں، کیا اس وقت بھی کوئی چٹھی آئی تھی؟

جج : چٹھیاں تو کئی آتی رہتی ہیں۔

مسٹر جسٹس رام لال : کیا اس خاص جلسے کے متعلق کوئی چٹھی دکھائی تھی؟

لدھارام : جی ہاں۔

ختم المرسلینؐ کی عزت و آبرو پر قربان ہونے والو، مبارک ہیں ان کے والدین کہ ان کے نذرانے سرکار رسالتمآبؐ میں شرف قبولیت حاصل کر گئے۔

یوں تو اس دنیا میں ہزاروں بچے جنم لیتے ہیں اور مر جاتے ہیں ہزاروں کلیاں کھلتی ہیں اور بادِ سموم کے تھپیڑوں کی تاب نہ لا کر مرجھا جاتی ہیں۔ مگر وہ موت جو حق اور راستی کی راہ میں آئے، حیاتِ جاوداں بن کر آتی ہے سہ

جو موت آئے تو زندگی بن کے آئے

قضا کی نرالی ادا چاہتا ہوں

مجلسِ عمل کا قیام

صدرِ مملکت بننے کی خواہش میں ملک غلام محمد گورنر جنرل، خواجہ ناظم الدین کی کیبنٹ میں اپنا اثر بڑھا رہے تھے، اور اس میں وہ اچھے خاصے کامیاب رہے۔ کیبنٹ کے پارلیمانی اختیارات آہستہ آہستہ گورنر جنرل کے ہاتھ میں آگئے اور فیصلوں کی تمامتر ذمہ داری گورنر جنرل کے قبضے میں چلی گئی۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی اس باہم کھینچا تانی نے مرزائیت کے خلاف تحریک کو زیادہ ہوا دی۔

پنجاب کے وزیر اعلیٰ میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ کی نواب افتخار حسین آف ممدوٹ سے اندرون خانہ چل رہی تھی۔ نواب ممدوٹ نے سرحد کے عبدالقیوم خان سے دولتانہ کے خلاف سمجھوتہ کر لیا تھا۔ دوسری طرف دولتانہ مرکزی حیثیت حاصل کرنے کی غرض سے خواجہ ناظم الدین کے خلاف ابھرتی ہوئی مسلمان ایجی ٹیشن کو ارادتاً نظر انداز کر رہے تھے۔

یہ تھا پس منظر جس نے عوام میں یہ تاثر دیا کہ مرزائیت کے خلاف تحریک دولتانہ کی پیداوار ہے۔ حالانکہ دولتانہ مرکز سے اور نواب ممدوٹ سے اپنا سیاسی انتقام لے رہے تھے۔

ایسے حالات میں مرزائیوں کی بڑھتی ہوئی ریشہ دوانیوں نے عوام کو موقعہ دیا کہ وہ

حکومت سے مرزائیوں کو مسلمانوں سے الگ غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کریں۔
جہانگیر پارک میں ظفر اللہ خاں کی تقریر کے بعد کراچی میں ۲۔جون ۱۹۵۲ء کو آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن طلب کیا گیا۔جس میں دو دن کی مسلسل بحث کے بعد حسب ذیل قرارداد کی تشکیل کی گئی۔

۱۔مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔
۲۔چودھری ظفر اللہ وزیر خارجہ کو اس کے عہدے سے الگ کر دیا جائے۔
۳۔مرزائیوں کو تمام کلیدی آسامیوں سے ہٹا دیا جائے۔"

ان مطالبات کی تصدیق کے لیے ۱۳۔جولائی ۱۹۵۲ء کو لاہور برکت علی ہال میں آل مسلم پارٹیز کنونشن کا پھر اجلاس ہوا، جس میں حسب ذیل حضرات کی ایک مجلس عمل مرتب کی گئی۔

۱ ـــــ مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری صدر جمعیۃ علمائے پاکستان
۲ ـــــ مولانا امین احسن اصلاحی (جماعت اسلامی)
۳ ـــــ ماسٹر تاج الدین انصاری (احرار)
۴ ـــــ شیخ حسام الدین (احرار)
۵ ـــــ مولانا عبدالحلیم قاسمی (جمعیۃ علمائے اسلام)
۶ ـــــ مولانا محمد طفیل (جمعیۃ علمائے اسلام)
۷ ـــــ مولانا محمد بخش مسلم (جمعیۃ علمائے پاکستان)
۸ ـــــ مولانا غلام محمد ترنم (حزب الاحناف)
۹ ـــــ مولانا غلام دین (حزب الاحناف)
۱۰ ـــــ مولانا داؤد غزنوی (جمعیۃ اہل حدیث)
۱۱ ـــــ مولانا عطاء اللہ حنیف (جمعیۃ اہل حدیث)

۱۲ ——— مولانا نصراللہ خاں عزیز (جماعت اسلامی)

۱۳ ——— حافظ کفایت حسین (ادارہ تحفظ حقوق شیعہ)

۱۴ ——— مظفر علی شمسی (ادارہ تحفظ حقوق شیعہ)

۱۵ ——— مولانا نور الحسن شاہ بخاری (تنظیم اہل سنت والجماعت)

۱۶ ——— صاحبزادہ فیض الحسن (انجمن سجادہ نشیناں پنجاب)

۱۷ ——— مولانا عبدالغفور ہزاروی (انجمن سجادہ نشیناں پنجاب)

۱۸ ——— علامہ علاؤ الدین صدیقی (نامزد)

۱۹ ——— مولانا اختر علی خاں (نامزد)

۲۰ ——— مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش (نامزد)

مجلس عمل نے ۲۲۔ جنوری ۱۹۵۳ء کو وزیر اعظم پاکستان سے مل کر انہیں اپنے مطالبات پیش کیے اور ایک ماہ کا نوٹس دے دیا کہ اگر ۲۲۔ فروری ۱۹۵۳ء تک مجلس عمل کے متذکرہ مطالبات منظور نہ کیے گئے تو مجلس اپنے مطالبات منوانے کیلئے راست اقدام کرنے پہ مجبور ہوگی۔

اس دوران دوسری جماعتوں کے مقررین کے علاوہ امیر شریعت نے پنجاب، سندھ اور سرحد میں تقریریں کر کے مسئلہ ختم نبوت کو عوام کے سامنے بڑی وضاحت سے بیان کیا اس ضمن میں پشاور کے چوک یادگار کی ایک تقریر کے اقتباس خاص اہمیت رکھتے ہیں مفتی سرحد مولانا عبدالقیوم پوپلزئی کی صدارت میں تقریباً ساٹھ ہزار نفوس کی حاضری میں امیر شریعتؒ نے فرمایا:

"اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کا جہاں ذکر کیا ہے وہاں ہر نبی کے بعد آنے والے دوسرے نبی کی پہلے اطلاع دے دی۔ چنانچہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام اپنے بعد آنے والے نبی کی بشارت

دیتے رہے حتیٰ کہ یہ سلسلہ نبوت خاتم الانبیا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک آن پہنچا۔

آپ نے فرمایا کہ مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّن رِّجَالِکُمْ وَلٰکِن رَّسُولَ اللهِ وَخَاتَمَ النَّبِیِّیْنَ ۝

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں، لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور تمام نبیوں کے ختم کرنے والے ہیں۔

اگر حضور کے بعد کسی اور نبی نے آنا ہوتا اور یہ سلسلہ نبوت جاری رہنا ہوتا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام یہ اعلان نہ فرماتے کہ "انا خاتم النبیین لا نبی بعدی" یعنی میں آخری نبی ہوں۔ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئیگا۔

یہ تاجدارِ مدینہ رحمت دو عالم، خاتم الانبیا، کی شانِ اقدس پر انتہائی کمینہ اور گستاخانہ حملہ ہے کہ ایک انگریز کا پروردہ اٹھ کر یہ اعلان کرے "کہ قرآنِ پاک کی وحی الٰہی میں میرا نام محمد رکھا گیا اور رسول بھی"۔

(ایک غلطی کا ازالہ)

امیرِ شریعت نے فرمایا:

"اگر میں آج یہ اعلان کروں کہ میں قائداعظم ہوں تو کیا تم برداشت کرو گے"؟

سامعین: "ہرگز نہیں"۔

امیرِ شریعت: "اگر تم اپنے ایک دنیوی لیڈر کا مقام کسی دوسرے شخص کو دینے کی اجازت نہیں دیتے تو پھر یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ برطانیہ کا پٹھو تاجدارِ مدینہ خاتم الانبیا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے یہ دعویٰ کرے کہ میں محمد ہوں۔

اسی اصول اور ضابطے کے مطابق ہم اپنی حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ مرزائیوں نے چونکہ حضور پرنور کے بعد مرزا غلام احمد کو اپنا نبی تسلیم کر کے اپنا تعلق سرکار مدینہ سے توڑ لیا ہے۔ اسلامی آئین کے مطابق حضور کے بعد کسی دوسرے نبی کو ماننے والا مرتد اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔"

امیر شریعت نے قادیانی الہام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ:

(مرزا بشیر الدین محمود کہتا ہے کہ "موجودہ ملکی تقسیم غلط ہے، یہ تقسیم ختم کرا لے اور دونوں ملکوں کا باہمی افتراق دور کرانے کی وہ ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اس عارضی تقسیم کو کسی نہ کسی طرح ختم کیا جائے گا اور ہند و پاکستان کو پھر اکھنڈ ہندوستان بنایا جائے گا۔")

جو آزادی ایک لاکھ ماؤں، بہنوں کی عزت و آبرو قربان کر کے اور دس لاکھ مسلمانوں کا خون بہا کر ایک کروڑ مسلمانوں کی خانہ بربادی کے بعد حاصل کی گئی ہے اس کو عارضی آزادی سمجھنے والا ملک و ملت کا بدترین دشمن نہیں تو اور کیا ہے۔"

یہ بصیرت افروز تقریرات ایک بجے تک جاری رہی۔

راست اقدام

۲۳۔ جنوری (۱۹۵۳ء) سے ۲۲۔ فروری (۱۹۵۳ء) تک واقعات نے کئی کروٹیں لیں۔ صوبائی اور مرکزی حکام نے مجلس عمل کے رہنماؤں کو دھمکایا بھی اور اکثر کارکنوں پر مقدمات بھی دائر کیے۔ اخبارات پر قدغن بھی لگائی گئی لیکن مرزائیت کے خلاف عوام کا غصہ اُبلتے ہوئے لاوے کی طرح تیز تر ہوتا چلا گیا تا آنکہ ۲۲۔ فروری کا سورج طلوع ہوا۔

خُدا اور رسولؐ کے نام پر حاصل کی ہوئی مملکت کے حاکموں پر مسلمانوں کو یقین تھا کہ کچھ بھی ہو، پاک سرزمین پر تختِ ختم نبوّت تک پہنچنے والے پاؤں سلامت نہیں رہ سکتے۔

وہ ہاتھ جو سرتاج انبیاء کے گریبان تک پہنچنے کی گستاخی کرے گا، شل کر دیا جائے گا، وہ آنکھ پھوڑ دی جائے گی، جس کے ارادوں میں برائی جھلک رہی ہوگی، مگر اپنی کرسیوں کے لیے لڑنے والے حاکموں نے پیغمبرِ خدا علیہ السلام کی نبوت کو لاوارث قرار دے کر اس سے ایسی بے اعتنائی برتی کہ ۲۲۔فروری کا دن امید و یاس کے درمیان گذر گیا۔اس سے پیشتر لاہور سے کراچی روانہ ہوتے ہوئے امیر شریعتؒ نے دہلی دروازہ کے باغ میں اپنی تقریر کے دوران فرمایا کہ:

"عزیزانِ من! مرزائیت جیسے فتنے کی پرورش برطانیہ نے کی ہے اگر افغانستان ہوتا تو اس فتنے کا کبھی کا فیصلہ ہو گیا ہوتا۔امیر حبیب اللہ پر خدا کی ہزار ہزار رحمت ہو، جس نے افغانستان کی حدود میں مرزائیت کو داخل نہ ہونے دیا۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے امیر حبیب اللہ کو ایک خط لکھا کہ میں نبی بن گیا ہوں تم مجھ پر ایمان لاؤ۔

امیر حبیب اللہ نے مرزا غلام احمد قادیانی کو جواب دیا "ایں جا بیا"۔۔۔ مرزا غلام احمد وہاں کیسے جاتا، اور اگر چلا جاتا تو کچھ نہ کچھ ہو جاتا اور مرزا غلام احمد کا دماغ درست ہو جاتا۔

آج یہ اجتماع تاریخی اجتماع ہے، جو مرزائیوں اور سر ظفر اللہ کے خلاف مظاہرہ کرنے کے لیے منعقد ہوا ہے۔یہ اجتماع مجلس عمل کے زیرِ اہتمام ہو رہا ہے۔

میں خواجہ ناظم الدین صدر مسلم لیگ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں کیونکہ مسلم لیگ کو قوم کی واحد نمائندگی کا دعویٰ ہے۔آج لاہور کے تمام مسلمان جمع ہیں جو مرزائی وزیر خارجہ کے خلاف عدم اعتماد اور اپنی بیزاری کا اظہار کر رہے ہیں۔

یہ وہی جلسہ گاہ ہے جہاں کئی سیاسی تحریکات نے جنم لیا، اور پروان

چڑہیں۔ منیر رپورٹ کے سلسلہ میں بھی غالباً اسی باغ میں تاریخی اجتماع ہوا تھا، اور آج مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے اور سر ظفر اللہ کو اس کی ذمہ داریوں سے علیحدہ کرنے کے لیے بھی اسی باغ میں اجتماع ہو رہا ہے۔

میں کہتا ہوں خواجہ ناظم الدین صدر مسلم لیگ کی حیثیت سے اس باغ میں ایک جلسہ منعقد کریں اور اسلامیانِ لاہور کو اس میں شرکت کی دعوت دیں جلسہ کی صدارت خواجہ صاحب خود کریں، اور پھر ظفر اللہ کے متعلق عوام کا ووٹ حاصل کریں، ان باتوں کا فیصلہ آج ہی ہو جائے گا۔ اگر خواجہ صاحب کے فرمان پر کوئی آدمی بھی نہ آیا تب بھی فیصلہ ہو گیا، اور اگر لوگوں نے آکر ظفر اللہ کے خلاف عدم اعتماد اور بیزاری کا اظہار کر دیا تب بھی فیصلہ ہو گیا۔

خواجہ صاحب نے پچھلی دفعہ ایک تقریر میں کہا تھا کہ کسی کے پیچھے ہجوم کا ہو جانا کسی جلسے میں زیادہ حاضری اور کثیر اجتماع اس امر کی دلیل نہیں کہ اسے عوام کا اعتماد حاصل ہے۔

میں پوچھتا ہوں کہ "خواجہ صاحب ساری زندگی تو اسے دلیل اور مدار قرار دیتے رہے، وہ اب کیوں گریز فرما رہے ہیں؟ اور اگر اجتماع دلیل نہیں اور کسی کے ساتھ اکثریت کا ہو جانا مدار نہیں تو پھر مسلم لیگ کو واحد نمائندگی کا حق کیسے حاصل ہے؟ اور پھر آپ کس واحد نمائندہ جماعت کے صدرِ اعظم ہیں"؟

امیر شریعتؒ نے آئی۔ جی پولیس میاں انور علی سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"کیا میاں صاحب نے "الفضل" میں شائع شدہ مرزا محمود کا خطبہ یا بیان پڑھا ہے؟ اگر نہیں پڑھا تو اب پڑھیں، اور اس کے ساتھ ان پرچوں کو بھی پڑھیں جن میں "الفضل" نے "خونی ملّا کے آخری دن" لکھ کر علمائے کرام کو قتل کی دھمکی دی تھی"۔

"الفضل" کی عبارت

"ہاں آخری وقت آن پہنچا ہے۔ ان علمائے حق کے خون کا بدلہ لینے کا، جن کو یہ علما قتل کراتے آئے ہیں۔ اب ان کے خون کا بدلہ لیا جائے گا۔
(۱) سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے (۲) ملّا بدایونی سے، (۳) ملّا احتشام الحق سے (۴) ملّا محمد شفیع سے (۵) ملّا مودودی پانچویں سوار سے۔"
("الفضل"۔ ۱۵۔ جنوری ۱۹۵۲ء)

آپ یہ اقتباس پڑھ کر سنا رہے تھے کہ مجمع سے ایک آواز آئی "حکومت اس وقت کہاں سو رہی تھی؟"

"حکومت تو وہیں سو رہی تھی جہاں اب ہے، لیکن تم کہاں سو رہے ہو؟ جو اس مشین کے پرزے ہو۔ میں نے پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ میاں دولتانہ سے ملاقات کی اور ڈائریکٹر تعلقاتِ عامہ کی وساطت سے اخبار "الفضل" کا یہ اقتباس پڑھ کر سنایا تو میاں صاحب نے ایکشن لینے کا وعدہ کیا۔"

آخر میں امیر شریعت نے فرمایا:

"مجلسِ عمل کا جو وفد خواجہ ناظم الدین سے ملا تھا، اس وفد کے سامنے خواجہ صاحب مرزائی وکیل کی حیثیت سے پیش آئے اور ظلّی بروزی کا جھگڑا لے بیٹھے۔

میں پوچھتا ہوں، خواجہ صاحب ایک وزیر ہیں، انہیں شیخ الاسلام کس نے بنایا؟ ایسا معلوم ہوتا ہے، علامہ شبیر احمد عثمانی کی وفات کے بعد خواجہ صاحب خود بخود شیخ الاسلام کے فرائض بھی انجام دینے لگ گئے ہیں۔"

عوام سے خطاب کرتے ہوئے امیر شریعتؒ نے کہا:

"تم ناموسِ مصطفیٰؐ کا تحفظ کرو۔ میں تمہارے کتے پالنے کو تیار ہوں،

میں تمہارے سور چڑاؤں گا۔ میں کہتا ہوں مسلم لیگ نے پاکستان بنایا، ملک تقسیم کرایا ہے، یہ انجمن احمدیہ نے نہیں بنایا۔ مرزا محمود اور ظفر اللہ کا پاکستان سے کیا تعلق ہے یہ دم بریدہ سگانِ برطانیہ" آج پاکستان میں دندنا رہے ہیں۔ ہم ان کی یہ غدارانہ سرگرمیاں ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔

گرفتاری

۲۲۔ فروری کے بعد مجلس عمل نے راست اقدام کے طریق کار پر غور کرنے کے لیے ۲۶۔ فروری ۱۹۵۲ء کو کراچی میں اپنا ایک اجلاس منعقد کیا۔ جس کی صدارت مولانا ابوالحسنات نے کی اور حسب ذیل قرارداد منظور کی۔

"۱۸۔ جنوری کے کنونشن میں مرکزی حکومت کو جو نوٹس دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا، وہ چونکہ مجلس عمل کے ایک وفد نے اس حکومت کے حوالے کر دیا تھا اور ۲۲۔ فروری کو اس نوٹس کی میعاد ختم ہو گئی ہے، بلکہ مزید چار دن بھی گذر چکے ہیں، اس لیے اب پرامن راست اقدام کی شکل کا فیصلہ کیا جانا ضروری ہے۔

راست اقدام کی شکل کے متعلق یہ فیصلہ کیا گیا کہ پانچ رضا کار ایسے جھنڈے اٹھائے ہوں گے جن پر مطالبات ثبت ہوں گے۔

شاہراہ عام پر سے نہیں بلکہ چھوٹی سڑکوں پر سے ہوتے ہوئے وزیر اعظم کی کوٹھی پر جائیں گے۔ اگر وہاں سنتری ان رضا کاروں کو روکے گا تو وہ اس سے کہیں گے کہ وہ وزیر اعظم کی خدمت میں مطالبات پیش کرنے اور ان کو تسلیم کرنے کی درخواست کرنے آئے ہیں، اور وہ اسی صورت میں واپس جائیں گے کہ وزیر اعظم ان مطالبات کو تسلیم کرنے کا اعلان کر دیں۔

اگر یہ رضا کار گرفتار کر لیے جائیں گے تو مجلس عمل پانچ رضا کاروں کا ایک اور دستہ بھیج دے گی اور یہ سلسلہ پرامن طریقے پر اس وقت تک جاری

رہے گا جب تک مطالبات تسلیم نہ کیے جائیں گے۔

گورنر جنرل کی کوٹھی پر بھی اسی قسم کا پہرہ لگایا جائے گا، تاکہ یہ نہ سمجھا جائے کہ اس تحریک کا رخ محض خواجہ ناظم الدین کی طرف ہے، کہ وہ بنگالی ہیں۔

مولانا ابوالحسنات محمد احمد اس متبرک تحریک کے پہلے ڈکٹیٹر مقرر کیے گئے اور نہیں گرفتاری کی صورت میں اپنے جانشین کی نامزدگی کا اختیار دے دیا گیا۔ یہ بھی قرار دیا گیا کہ اسی دن شام کو آرام باغ میں جو جلسہ عام ہو رہا ہے اس میں عوام کو مشورہ دیا جائے کہ وہ حسب معمول اپنے کاروبار میں مصروف رہیں اور رضاکاروں کے ساتھ نہ جائیں۔"

۲۶۔فروری کو آرام باغ میں مجلس عمل کا عظیم اجتماع ہوا، جس میں راست اقدام کمیٹی کے منتخب ارکان کے علاوہ حضرت امیر شریعتؒ نے حسب ذیل تقریر کی:۔

خطبہ مسنونہ کے بعد آپ نے فرمایا:

"مرزائی افسروں نے اپنے عہدوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلامیان پاکستان کو کافر اور مرتد بنانے کی ایک ہمہ گیر تحریک کے ساتھ ساتھ اپنے الہامی عقیدے کی بنا پر پاکستان کو ہندوستان سے ملانے کی ناپاک تحریک بھی شروع کر رکھی ہے۔ بھولے اور سادہ لوح مسلمان اقتصادی بدحالی اور معاشی الجھنوں سے تنگ آکر ان کے دام تزویر کا شکار ہو رہے ہیں، اور اس طرح مرزائی ان کے ایمان پر ڈاکہ ڈالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں

۶۔اگست ۱۹۵۲ء کو پاکستان کے وزیر اعظم نے اپنے ایک آرڈیننس کے ذریعے سرکاری ملازمین پر پابندی عائد کی تھی کہ وہ کسی مخصوص فرقہ کے

عقائد کی تبلیغ نہیں کر سکتے۔

مرزائی افسران نے اس آرڈیننس کا جو مذاق اڑایا وہ حکومت اور عوام دونوں کے سامنے ہے۔

سب سے پہلے مرزائی وزیر خارجہ سر ظفر اللہ نے اس قانون کی مخالفت کرتے ہوئے بیان دیا کہ ہم اپنے مذہبی عقاید اور ضمیر کی تبلیغ سے باز نہیں رہ سکتے۔ اس کے بعد میاں نصیر احمد فاروقی چیف سیکرٹری حکومت سندھ، خان بہادر ڈاکٹر سید احمد سپرنٹنڈنٹ راڈ ریسنی ٹوریم، کرنل سید شبیر حسین شاہ انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات اور ان کے علاوہ دوسرے مرزائی افسران نے کئی بار کھلے جلسوں کی صدارتیں کر کے کفر و ارتداد کی تبلیغ کی، اور سرکاری احکام کا کھلم کھلا منہ چڑایا، لیکن ان کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا گیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دراصل حکومت خود مرزائیت کی تبلیغ کروا رہی ہے۔

ان کے مقابل اگر مسلمان اپنے دینی عقاید اور اسلامی روایات کی تبلیغ کریں تو اسے سرکاری اثر ڈال کر بند کرانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

"تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کی قومیں ارباب اقتدار سے اپنے مطالبات کرتی ہیں، اور حکومتیں انہیں تسلیم بھی کرتی ہیں۔ مگر ہمارے ارباب اقتدار عجیب ہیں۔ پوری قوم متفقہ طور پر ان سے مطالبہ کر رہی ہے لیکن ارباب اقتدار کے بہرے کانوں تک کوئی آواز نہیں پہنچ رہی اور وہ ملت اسلامیہ کی آواز کو سنی ان سنی کر رہے ہیں۔ مسلمانان پاکستان نے تاج و تخت ختم نبوت کے تحفظ کے سلسلے میں مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے اور مرزائی وزیر خارجہ کو وزارت سے برطرف کرنے کے متعلق حکومت سے جو مطالبات کیے تھے ارباب اقتدار ان مطالبات کو تسلیم نہیں کر رہے ہیں اور مختلف حیلوں بہانوں سے

تحفظ ختم نبوّت کی تحریک کو دبانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا خواجہ ناظم الدین بھی مرزا بشیرالدین محمود کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں۔ جبھی تو مرزائیوں کے متعلق پوری قوم کے مطالبات کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھ رہے ہیں۔ مجھے خصوصی حلقوں سے معلوم ہوا ہے کہ خواجہ ناظم الدین اور مرزائیوں کے درمیان کوئی رشتے ناطے بھی ہو چکے ہیں اگر یہ صحیح ہے تو مسلمان کسی قیمت پر بھی برداشت نہیں کریں گے، کیونکہ مسلمان قوم کے حکمران وہی ہو سکتے ہیں جو مسلمان ہوں اور محمدؐ عربی کے غلام۔ محمدؐ عربی کے باغی، کافر اور مرتد مسلمان قوم کے حکمران نہیں رہ سکتے۔"

تقریر کے آخر میں آپ نے غصے اور جذباتی لہجے میں فرمایا:

"آل مسلم پارٹیز کنونشن نے حکومت کو ایک ماہ کا نوٹس دیا، جس کی میعاد چار دن ہوئے ختم ہو چکی ہے۔ ایک ماہ کے مسلسل صبر آزما اور توجہ کے باوجود حکومت نے جس بے اعتنائی کے ساتھ مسلمانانِ پاکستان کے متفقہ مطالبات کو ٹھکرایا یہ اس حکومت کے زوال کی نشانی ہے۔"

عوام سے خطاب کرتے ہوئے:

"آپ حضرات میری زندگی کے گزشتہ تیس، بتیس سالوں کو جانتے ہیں میں نے جس کام میں ہاتھ ڈالا، اپنے ضمیر سے مطمئن ہو کر ڈالا۔ پھر چاہے سامنے میں جو آئے، میں نے اسے ہمیشہ ٹھکرا دیا۔ انگریز جیسی جابر سلطنت جب میرے مطالبہ کے سامنے نہیں ٹھہر سکی تو اس ملک کے حکمران، جنہوں نے یہ ملک اللہ اور رسولؐ کے نام پر حاصل کیا تھا اور آج اسی ملک میں وہ اپنے قوانین اور حکومت کے زور پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کے مرتکب ہو رہے ہیں، کیونکر ٹھہر سکتے ہیں۔

۲۲ فروری کے بعد تا ایں دم ہم حکومت کے فیصلے کے منتظر رہے، مگر وہ خاموش تماشائی کی طرح ہمارے جذبات کا امتحان لیتی رہی۔ اس رات کے بعد قوم جو قدم اٹھائے گی، اس کی ذمہ داری پھر حکومت پر ہوگی۔ مسلمان ناموسِ مصطفےٰ کے تحفظ کے لیے اپنی جان تک کی بازی لگانے سے دریغ نہیں کریں گے۔"

اس اجتماع میں غیر ملکی پریس اور فوٹوگرافرز کے علاوہ امریکن ایمبیسی کے ارکان بھی موجود تھے۔ امیر شریعت کے اندازِ خطابت، طرزِ تکلم کو دیکھ کر انہوں نے بے ساختہ کہا،

"اگر یہ شخص امریکہ میں ہوتا تو تمام عمر امریکہ کا صدر رہتا۔"

آرام باغ کی اسی تقریر سے متاثر ہو کر سندھ کے ایک وڈیرے نے سعودی عرب سے اپنے ایک دوست کو خط کے ذریعے اطلاع دی۔

"اگر ۲۶۔ تاریخ کو آرام باغ میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر نہ سنتا، تو شاید میں گمراہ ہو جاتا۔ الحمد للہ کہ ان کی تقریر نے مجھے گمراہی سے بچا لیا۔ ورنہ قریب تھا کہ میں مرزائی ہو جاتا۔"

رات دو بجے کے قریب یہ اجتماع ختم ہوا۔ تمام رہنما دفتر تحفظ ختم نبوت (بندر روڈ کراچی) میں آرام کرنے کے لیے چلے گئے۔ ابھی وہ نیند سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے کہ پولیس کی بھاری جمعیت نے دفتر کی تمام عمارت کو اپنے محاصرے میں لے لیا۔ کراچی کے ذمہ دار پولیس افسروں نے رہنماؤں کو جو اس وقت دفتر میں موجود تھے، گرفتار کر لیا۔ یہ ۲۷ فروری صبح چار بجے کا واقعہ ہے، جس میں حضرت امیر شریعتؒ اور ان کے رفقاء مولانا سید ابوالحسنات قادری، ماسٹر تاج الدین انصاری، صاحبزادہ فیض الحسن، مولانا تجمل حسین اختر، سید مظفر علی شمسی اور مولانا عبدالرحیم جو ہر قابل ذکر ہیں۔

امیر شریعت کی گرفتاری کے بعد مغربی پاکستان سے سینکڑوں افراد کو گرفتار کر لیا گیا۔ سارے ملک نے بغاوت کی سی شکل اختیار کر لی۔ ہر شہر میں حکام اور عوام کے

درمیان تصادم ہوا۔ منڈیاں بند ہوگئیں، شہروں میں ہڑتال کردی گئی، سرکاری عمارات کو نقصان پہنچایا گیا۔ ریل کی پٹڑیاں اکھاڑ دی گئیں۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے ۶۔ مارچ ۱۹۵۳ء کو لاہور شہر فوج کے حوالے کردیا گیا۔

کراچی جیل

زندگی کا سفر طویل ہو کہ مختصر، انسان اس راستے سے گزرتے وقت ان موڑوں یا صعوبتوں سے ناواقف ہوتا ہے، جہاں کبھی تو اس کا دامن تار تار ہوتا ہے اور کبھی خود آبلہ پا ہو کر صحرا کی ویران و خشک وادیوں کو گلہائے زنگار رنگ سے مزین کر دیتا ہے، اسی چمن زار کی بہاریں پھر نسیم صبحگاہی کو جب زندگی کا پیغام دیتی ہیں تو نہ صرف گل بوٹوں میں نکھار پیدا ہوتا ہے بلکہ آشیانوں میں طیور بھی لالہ و گل سے ہمکلام ہو کر فضاؤں میں جھومنے لگتے ہیں۔

یہ سارا کچھ انسان کے عزم پر موقوف ہے، اگر اس میں پختگی نہ ہو تو حوصلے کی بلندی بھی انسان کو پستی کی طرف لے جاتی ہے۔

تینتیس ۳۳ برس ہوئے کہ امیر شریعت صرف ایمان کو زادِ راہ بنا کر عزم و ارادے کے پیرہن میں گھر سے نکلے تھے، اس طویل سفر میں قدم قدم پر جن سنگلاخ وادیوں سے ان کا گزر ہوا، اس منزل کا ہر موڑ گواہ ہے اور اس راستے کی ہر شے شہادت دے گی کہ بادِ سموم کے تند و تیز جھونکے بھی اس مردِ درویش کے عزم و استقلال کی دیواریں نہ گرا سکے۔

سفینۂ برگ گل بنا لے گا، قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا

تحریک ختم نبوت سے پیشتر کئی سال ہوئے امیر شریعت کے تمام جسمانی اعضاء ان سے بغاوت کر چکے تھے، آنکھوں کی بینائی کمزور ہو چکی تھی کہ عینک لگانے کے عادی ہو گئے۔ دانت ایک ایک کر کے جواب دے گئے اور ان کی جگہ اجنبی دانتوں نے سنبھال لی۔ درد گردہ کے ایسے مریض ہوئے کہ معالج نے خوراک سے چاول ہمیشہ

کے پیسے نکال دیے۔ تبخیر معدہ کے باعث کئی کئی گھنٹے پریشان پڑے رہتے، پھر ان سب کی بڑھاپے نے اس قدر حوصلہ افزائی کی کہ ہر مرض بذاتِ خود بغاوت کا علم لے کر اٹھ کھڑا ہوا اور نقاہت کے آثار اس تیزی سے ابھرے کہ چہرے کی جھریاں صاف دکھائی دینے لگیں، اور امیرِ شریعتؒ تاریخ ماضی کے کھنڈرات کے سوا کچھ باقی نہ رہے، ان حالات میں وہ کراچی جیل خانہ میں لائے گئے۔

ستارے رات بھر کے سفر سے تھک ہار کر اونگھ رہے تھے۔ کائنات کی سیاہ چادر پر آسمان کی روشن قندیلیں صبح صادق کے اجالے سے منہ چھپا رہی تھیں کہ مؤذن نے اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْم کا اعلان کر کے مسجد کے میناروں کو گواہ بنا لیا کہ اس نے سوئی ہوئی انسانیت کو تلاشِ صداقت کا راستہ تجویز کر دیا ہے ورنہ انسان ہے کہ اپنا اثاثہ حیات ضائع کر کے ایسا سویا ہے کہ صورِ اسرافیل سے پہلے اس کا بیدار ہونا مشکل نظر آ رہا ہے۔

مولانا ابوالحسنات کی امامت میں امیرانِ ختم نبوت نے جیل خانہ میں صبح کی پہلی نماز ادا کی اور پروردگارِ عالم کے حضور دعا کی۔

> "اے رب العزت! ہمارا کوئی جرم اس کے سوا نہیں کہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی آبرو باقی رہے، ہم رہیں یا نہ رہیں۔ مگر تیرے دنیادار لوگوں نے ایوانِ سلطنت میں بیٹھ کر ہماری فردِ جرم پر ہمارے باغی ہونے کی مہر ثبت کی ہے، مگر تو دلوں کو جاننے والا ہے کہ ہماری لڑائی اپنی ذات، اپنے کسی منصب کے لیے نہیں بلکہ تیرے ارشاد کی تعمیل میں ہے کہ
> "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔"

رہنماؤں کی آنکھوں میں آنسو، دلوں میں جذبات کا طوفان امڈ آیا۔ امیرِ شریعت کی سفید داڑھی پر گرتے آنسو پھولوں پر شبنم کی بہاریں دکھا رہے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ جیل خان

عنایت اللہ خاں حیدر آبادی نے امیر شریعتؒ اور ان کے رفقاء سے کہا: ”آپ حضرات جن کوٹھڑیوں میں لائے گئے ہیں، یہ وہی خوش بخت کوٹھڑیاں ہیں کہ جہاں ۱۹۲۱ء میں مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو بغاوت کے جرم میں رہ چکے ہیں۔“ یہ سننا تھا کہ انگریزی اقتدار اور جور و ستم کی ساری تاریخ نقش بہ دیوار بن کر ابھر آئی۔ جیل خانے کی ایک ایک اینٹ پسِ دیوارِ زنداں کی کہانی بیان کرنے لگی۔

امیر شریعت نے جیل خانے کے در و دیوار سے خطاب کرتے ہوئے کہا:۔

”اے اونچی دیوارو، آہنی دروازو! تم گواہ رہنا کہ اگر مولانا حسین احمد مدنی، مولانا محمد علی جوہر اور ان کے رفقاء وطنِ عزیز کی آزادی کیلئے ۱۹۲۱ء میں تمہارے مصائب جھیل سکتے ہیں، تو ۱۹۵۳ء میں عطاء اللہ شاہ بخاری اور اس کے ساتھی بھی خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آبرو کے لیے تمہارے مصائب و آلام سے خائف نہیں ہوں گے۔“

امیر شریعتؒ کے ان الفاظ پر سپرنٹنڈنٹ جیل اور دوسرے افسران بہت متاثر ہوئے۔ کراچی جیل میں گو سرکاری طور پر کلاس کا اعلان نہیں کیا گیا تھا تاہم خوراک اونچے درجے کی ملتی رہی اور سپرنٹنڈنٹ جیل کے بہتر رویے سے وقت اچھا گزرتا رہا۔

امیر شریعت دیوبندی، ابوالحسنات قادری بریلوی، فیض الحسن بریلوی، تاج الدین انصاری دیوبندی اور مظفر علی شمسی شیعہ۔ عقیدہ ختم نبوت کی طفیل یہ سب اسیرانِ ختم نبوت پانچ وقت کی نماز مولانا ابوالحسنات کی امامت میں پڑھتے رہے۔ نہ تو کسی کا مذہب ضائع ہوا اور نہ ہی کسی کے عقیدے میں فرق آیا، بلکہ ان کی باہم رفاقت نے اکثر شبہات کا ازالہ کر دیا۔

امیر شریعتؒ کے اخلاق اور تواضع نے مولانا ابوالحسنات کو ان کا اس قدر گرویدہ کیا کہ وہ بے اختیار کہنے لگے:

”شاہ جی! آپ تو اس دور کے ولی ہیں۔ مجھے تو آپ سے متعلق بہت

کچھ کہا سنا گیا تھا لیکن آپ سے قرابت داری نے میری ساری غلط فہمیاں دور کر دیں، الحمد للہ۔"

امیر شریعتؒ یہ سن کر مسکرائے اور "استغفر اللہ" پڑھتے رہے۔

حکام کے پیغامات

اس دوران ایک روز سپرنٹنڈنٹ جیل، وزیر اعظم پاکستان خواجہ ناظم الدین کا پیغام لے کر آئے۔

"آپ کی گرفتاری کے بعد ملک بھر میں تشدد کی جو تحریک چل نکلی ہے اور اس کے نتیجے میں سرکاری اور غیر سرکاری املاک کو جو نقصان پہنچ رہا ہے آپ اس سے لاتعلقی کا اظہار کریں، تاکہ ملک میں امن قائم ہو۔"

اس کے جواب میں امیر شریعتؒ نے کہا:

"خواجہ صاحب کو میری طرف سے کہہ دو، روح پر قبضہ کر لینے کے بعد آپ جسم کو تڑپنے کی اجازت بھی نہیں دیتے۔"

یہ سن کر سپرنٹنڈنٹ جیل اپنا سا منہ لے کر چلے گئے۔

گرفتاریوں کے قریباً پندرہ روز بعد لاہور سے سی، آئی، ڈی کے دو ذمہ دار افسر کراچی جیل میں راہنمایانِ ختم نبوت سے ملنے آئے اور کہا:

"اگر آپ حضرات یہ کہہ دیں کہ تحریکِ ختم نبوت، دولتانہ کے ایما پر چلائی گئی ہے تو حکومت آپ کو رہا کرنے کے لیے تیار ہے۔"

ممکن ہے نکہتِ بادِ بہاری کی اس پیش کش پر نواسیرانِ قفس کی تیلیوں سے آزادیٔ پرواز کے شوق میں موسم گل سے نامہ و پیام کرتے، کہ امیر شریعتؒ درمیان میں بول اُٹھے۔

"یہ جھوٹ ہے، دولتانہ ایک دنیا دار انسان ہے، اور تحریک ختم نبوت پاک جذبات کی تحریک، اس کی ذمہ داری کسی فاسق و فاجر پر نہیں ڈالی جاسکتی، جاؤ اپنی حکومت سے کہہ دو یہ تحریک میں نے چلائی ہے، اور اس کا ذمہ دار

بھی میں ہوں"

امیر شریعت کے یہ تیور دیکھ کر سی، آئی، ڈی کو اپنے اداے کی ساری بساط الٹنی پڑی۔

سکھر جیل تحریک اپنے شباب پر تھی، عوام اور حکومت کے درمیان کچھ ڈیڑھ رہا تھا۔ محلاتی سازشوں کے جال صوبائی سیاست کو اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے۔

پاکستان کے گورنر جنرل ملک غلام محمد جو تحریک ختم نبوت سے پیشتر خواجہ ناظم الدین کی حکومت کے گرد سازش کا ایک مضبوط ہالہ تیار کر چکے تھے، جس کے باعث سندھ مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کے ممبر اور صوبائی مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے محمد ایوب کھوڑو، خواجہ ناظم الدین سے بغاوت کر چکے تھے۔ سرحد پہلے سے باغی تھا۔ تحریک ختم نبوت نے پنجاب کے حالات بھی گورنر جنرل کے حق میں ہموار کر دیے اور خواجہ ناظم الدین کے خلاف ان کی اندرونی سیاست بھی کامیاب ہو کر رہی کہ انہوں نے ۱۷۔ اپریل ۱۹۵۳ء کو یکایک خواجہ ناظم الدین کی حکومت کو برخاست کر دیا۔ اس سے پیشتر پنجاب کے وزیر اعلیٰ مسٹر دولتانہ کی معزولی پر خواجہ ناظم الدین سے دستخط کرا لیے گئے تھے۔

خواجہ ناظم الدین کی جگہ مسٹر محمد علی بوگرہ کو جو ان دنوں امریکہ میں پاکستان کے سفیر تھے، نیویارک سے بلوا کر پاکستان کا وزیر اعظم مقرر کر دیا۔

یہ سارا کچھ ڈرامائی انداز میں ہوا کہ خود حاکموں کو بھی اپنی معزولی کا علم نہ ہو سکا، جیسے خواجہ ناظم الدین نے اپنی برطرفی کا اعلان ریڈیو پر سنا۔

حکام بالا ان کھیل تماشوں میں مصروف تھے۔ شہری عوام، پولیس اور فوج سے دست و گریباں تھے کہ ۲۷۔ اپریل ۱۹۵۳ء کو حضرت امیر شریعت اور ان کے ساتھ مولانا ابو الحسنات، صاحبزادہ فیض الحسن، مظفر علی شمسی، عبدالرحیم جوہر کو کراچی سے سکھر جیل میں منتقل کر دیا گیا۔

مغربی پاکستان میں جن جیل خانوں کو اپنے اندرونی ماحول کے باعث خوف و ہراس کا مرکز قرار دیا گیا ہے یا جن کے تاثر کو جرائم پیشہ عناصر نے قبول کرنے سے پناہ مانگی، ان

میں سرحد کی ہری پور جیل، پنجاب میں ساہیوال اور میانوالی کے جیل خانے، بلوچستان میں مچھ جیل اور سندھ میں سکھر کا جیل خانہ مشہور ہے۔

آخرالذکر جیل خانہ کو دریائے سندھ سے نکلی ہوئی نہر پر تعمیر کیا گیا ہے، جس کی وجہ سے مچھر اور کھٹمل اس بندی خانے کی خاص سوغات ہیں۔ موسمِ گرما میں سندھ کی تپتی ہوئی ریت بادِ سموم کے دنوں جب آگ اگلتی ہے تو سارا سندھ جہنم کدہ معلوم دیتا ہے۔ اس پر بھی سکھر جیل کی پیداوار (کھٹمل اور مچھر) محدود نہیں ہوتی۔ حالانکہ پنجاب کی گرم ہوائیں ان بلاؤں کا خاتمہ کر دیتی ہیں لیکن سکھر کا جیل خانہ اپنی ان خصوصیات کے ساتھ نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

حضرت امیر شریعتؒ اور ان کے رفقاء جب اس جیل میں داخل کیے گئے تو موسمِ گرما اپنے شباب میں قدم رکھ رہا تھا۔ سندھ کے ریگستانوں میں بالو ریت کے گھروندوں سے بادِ سموم کی اٹھکیلیاں سسّی کے قدموں کی تلاش میں سرگرداں تھیں، لیکن پنوں کو لے جانے والے اونٹ ان نشانوں کو بھی سمیٹ کر لے گئے تھے۔ مگر عشق ہے کہ ہنوز تلاشِ محبوب کا روپ دھارے صحراؤں کے دامن تار تار کر رہا ہے۔

موسم کے اس جلاد میں امیر شریعتؒ کو قانون اور سیاسی انتقام کے ملے جُلے جذبات سے سکھر کے جیل خانہ میں ڈال دیا گیا۔

خوراک

غیر ملکی حکمرانوں نے اپنے سیاسی حریف سے جیل خانوں میں ہمیشہ شرافت کا برتاؤ کیا۔ تعلیم، شہرت، خاندانی رکھ رکھاؤ، سزا دیتے وقت وہ ان سب کے پس منظر میں ایک نظر جھانک لیتے تھے اور سیاسی مجرم کے ذاتی اور اجتماعی حقوق ہمیشہ بحال رکھتے، لیکن ۱۹۵۳ء کے مسلمان حکمرانوں نے مذہبی رہنماؤں سے جو سلوک کیا، ماضی قریب کی تاریخ کا اس قدر گھناؤنا باب ہے کہ اس کی پردہ دری سے شرمندگی کے علاوہ اور کچھ نہیں ملتا۔

حضرت امیر شریعتؒ ۱۹۲۱ء میں پہلی مرتبہ جیل خانے گئے تو انگریزی قانون نے

انہیں اپنے خیال میں بغاوت کا مجرم قرار دیا تھا، اس پر بھی انہیں سپیشل کلاس قیدیوں کی خوراک دی گئی۔ نیز ۱۹۴۰ء تک وہ جب بھی اسیر فرنگ ہوئے، انہیں اسی درجے کا مستحق سمجھا گیا، لیکن ۱۹۵۳ء کی تحریک نہ تو حکومت کے خلاف تھی اور نہ ہی اسے ملکی بغاوت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ خالص مذہبی نوعیت کی تحریک کو بغاوت کہنا اسلام کے بنیادی اصولوں سے عدم واقفیت کے مترادف تھا، مگر اس دور کے مسلم لیگی حکمرانوں نے صرف ذاتی وقار کے لیے اس تحریک کے قیدیوں سے جیل خانوں میں ایسا برتاؤ کیا کہ جیل مینول (JAIL MANNUAL) بھی اس کی اجازت نہیں دیتا۔

سکھر جیل کا بلاک نمبر ۶ جس کا رقبہ اپنی وسعت کے اعتبار سے ان قیدیوں کی حیثیت کے مطابق نہیں تھا۔ لیکن حکام جیل نے انہیں یہیں رکھنا مناسب سمجھا۔ اس کے صحن میں نہ تو سائے کے لیے درخت تھا اور نہ پانی کا معقول انتظام، ہر قیدی کو نہانے کے لیے صرف ایک لوٹا پانی ملتا تھا، نو قیدی نو لوٹے پانی لے کر ایک قیدی کے نہانے کا انتظام کرتے اور اس طرح ایک آدمی کی باری نو دن کے بعد آتی تھی۔ خوراک میں چاول کے آٹے کی روٹی، گھاس پھوس اور تیل کے بگھارکی سبزی، مسور کی دال، قریباً پندرہ دن یہی خوراک دی جاتی رہی کیونکہ بی کلاس کے کاغذات آنے میں دیر ہو گئی تھی، حالانکہ قیدی کی ایک جیل سے دوسری جیل میں تبدیلی کے ساتھ ہی اس کے متعلقہ کاغذات بھیج دیے جاتے ہیں، مگر ختم نبوّت تحریک کے قیدیوں سے امتیازی سلوک کے پیش نظر حکام کی یہ حرکت بھی اپنی جگہ عجیب رہی۔ اس غفلت اور سی کلاس خوراک کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت امیر شریعتؒ کی بیماری (شوگر اور درد گردہ) میں اس قدر اضافہ ہوا کہ آخر کو یہی امراض جان لیوا ثابت ہوئیں، کیونکہ حکماء کی تاکید تھی کہ چاول کبھی استعمال نہ کریں۔ لیکن چاول کی روٹی بہر حال کھانی پڑی اور بہتر خوراک کے کاغذات پہنچنے تک امیر شریعتؒ اپنی رہی سہی توانائی بھی ضائع کر بیٹھے اور مسور کی دال کا بینائی پر بھی اثر ہوا۔ ان دنوں سکھر جیل کا

درجہ حرارت ۱۲۴ ڈگری تک پہنچ چکا تھا۔ جیل میں پانی کی قلت اسائے کی کمی اور خوراک کی بے ضابطگی ایسی بے اعتدالیوں کو دیکھ کر حضرت امیر شریعتؒ سکھر کے جیل خانہ کو سقر (جہنم) کہا کرتے تھے۔

محمد علی بوگرہ کی آمد

تحریک ختم نبوت کے باعث پاکستان کی سیاست میں عاجلانہ طور سے اکثر ایسی تبدیلیاں آئیں کہ عوام اور خود حکمران پارٹی کو بھی اس کا یقین نہیں تھا۔ مثلاً صوبہ سرحد کے خان برادران کا وجود مسلم لیگی حکمرانوں کے لیے دشمنی کا انتہائی بلند مقام رکھتا تھا۔ لیکن سیاسی ضرورت نے راتوں رات دشمنی کو دوستی میں بدل دیا۔ ملک غلام محمد گورنر جنرل پاکستان نے اپنی کابینہ کے رکن سکندر مرزا کے مشورے پر ڈاکٹر خان کو حکومت کے قریب کر لیا۔ عبد القیوم خاں پہلے سے ہی محمد علی بوگرہ کی وزارت میں شامل ہو چکے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صوبہ سرحد کی سیاسی چپقلش ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ لیکن پنجاب کے امن کی باگ ڈور تحریک ختم نبوت کے رہنماؤں کے ہاتھ میں تھی۔ اور وہ سب کے سب جیل خانوں میں تھے، چنانچہ اس کام کے لیے گورنر جنرل پاکستان نے اپنے نامزد وزیر اعظم کو سکھر جیل میں بھیجا۔

> "آپ حضرات اگر اپنی تحریک کے سلسلے میں حکومت کے روبرو معذرت کر دیں تو آپ کو رہا کر دیا جائے گا۔ میں اسی کام کے لیے آپ سے ملنے آیا ہوں"

وزیر اعظم پاکستان کے یہ الفاظ حضرت امیر شریعتؒ اور ان کے ہم اسیران قفس کے لیے نئے نہیں تھے اس سے پیشتر اس قسم کی پیش کش کراچی جیل میں سابق وزیر اعظم کی طرف سے بھی ہو چکی تھی۔

امیر شریعت نے محمد علی بوگرہ کو نہایت مختصر جواب میں فرمایا:

> "آپ حضرات کو ہماری اس قدر فکر کیوں ہے، سہ

صبو اپنا اپنا ہے جام اپنا اپنا
کیے جاؤ مے خوارو! کام اپنا اپنا

وزیراعظم پاکستان امیر شریعتؒ کا یہ شعر سن کر تھوڑی دیر ٹھہرے اور واپس چلے گئے۔

بھوپت ڈاکو

جب برائی اپنی منزل پر پہنچ کر دم توڑ دیتی ہے، تو نیکی اپنے سفر کا آغاز کرتی ہے۔

برائی گفتار میں ہو کہ کردار میں، انسانیت کے لیے سم قاتل ہے، جب اس میں زندگی سرایت کرتی ہے تو اچھا بھلا آدمی آدمیت سے محروم ہو کر سماج کی نظر میں آدمی نہیں رہتا۔ بلکہ اس کا ہر کردار سوسائٹی میں برائی کا ہر بیج کانٹا بن کر اس کے اپنے حلق میں پیوست ہو جاتا ہے اور یہی نیکی اور برائی کا سنگم ہے، اگر کانٹا حلق سے نیچے اتر جائے تو سمجھیں آدمی برائی کا خالق بن کر ابلیس کے بھی پر کترنے لگتا ہے ورنہ سرشت اچھی ہو تو کانٹا اگل دینے میں دیر نہیں لگتی۔

۱۹۴۷ء کے بعد بھارت کی سرزمین کو وہاں کے دانش وروں نے اپنی غلط کاریوں کے باعث انسانوں کے لیے جہنم کدہ بنا دیا۔ بھوک، افلاس اور فرقہ پرستی نے آدمی کو آدمیت سے اس قدر بیگانہ کر دیا کہ پھر اس دھرتی کی کوکھ سے چور، ڈاکو اور قاتلوں نے جنم لینا شروع کیا۔ بھوپت ڈاکو اسی دور کی پیداوار ہے۔ راجپوتانہ کا علاقہ اس کی زد میں تھا۔ آس پاس کی خشک پہاڑیاں اس کی آماجگاہ تھیں۔ دولت مندوں کو لوٹ کر ان کا سرمایہ غریبوں میں تقسیم کرنا اور اس کے لیے اس کی قتل و غارت گری نے تمام راجپوتانہ کے اُمراء کو ہراساں کر دیا تھا۔ بھارت کا قانون، پولیس اور فوج اپنی ساری قوت کے باوجود بھوپت ڈاکو کو اس کی غیر آئینی حرکات سے روک نہ سکی۔ حالانکہ راجپوتانہ کے پتھر اور ریت کے ذرات تک حکومت کے معاون تھے، اونچے پہاڑوں کی چوٹیاں بھوپت ڈاکو کی چغلی کھا رہی تھیں، مگر برائی عزم انسانی کی ہمراہی میں اس قدر توانا ہو چکی تھی کہ حکومت کے ذرائع بھی اسے شکست دینے میں ناکام رہے۔
۱۹۵۳ء کے شروع میں بھوپت ڈاکو اپنے غیر آئینی افعال کے باعث بھارت سے

بھاگ کر تھر پارکر کے راستے پاکستان میں داخل ہوتے ہی سرحد پر گرفتار کر لیا گیا۔ اسے سکھر جیل میں امیر شریعتؒ کے برابر والے احاطے میں رکھا گیا تھا۔

جیل خانے کی . . . . . آہنی دیواریں توڑ کر بھوپت ڈاکو ہر روز امیر شریعتؒ سے کسی نہ کسی طرح ملنے آجاتا اور پہروں بیٹھا رہتا۔ اس کی مسلسل اور پیہم بیٹھک نیز حضرت امیر شریعتؒ کے اخلاقی اور روحانی اثر نے بھوپت ڈاکو کو امیر شریعتؒ کا گرویدہ بنا دیا۔

سکھر جیل کے مصائب نے امیر شریعتؒ کو اس قابل نہیں رہنے دیا تھا کہ وہ اپنی صحت کے سوا کسی دوسرے کی فکر کرتے، مگر اسلام کے اس عظیم مبلغ نے اس جہنم کدہ میں بھی اپنے فرائض سے کوتاہی نہیں کی۔ قرآن کریم اور حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روزانہ درس نے بھوپت ڈاکو کو انسانیت کی وہ راہیں دکھائیں جس سے بھٹکے اسے برسوں گزر چکے تھے۔ گناہوں کی وہ آگ جس نے بھوپت کی انسانیّت کو جلا کر راکھ کر ڈالا تھا اور اسے اپنے انسان ہونے پر شبہ ہونے لگا تھا۔ اس آگ کی ایک ایک چنگاری رشد و ہدایت کے پھول برسانے لگی۔ وہ اسلام کو اس قدر سمجھ چکا تھا کہ ممکن ہے مسلمان ہو جاتا۔ مگر بھارت گورنمنٹ نے اپنے مجرم کا پاکستان گورنمنٹ سے مطالبہ کر لیا، اور بین الاقوامی قانون کے مطابق بھوپت ڈاکو کو بھارت سرکار کے حوالے کر دیا گیا۔

لاہور سنٹرل جیل مسلم لیگی حکمرانوں کی ناعاقبت اندیشی اور عوام کے مذہبی جذبات کے باعث ۱۹۵۳ء میں جو کچھ ہوا تاریخ نے اسے ہمیشہ کے لیے اپنے دامن میں محفوظ کر لیا ہے اور جب بھی یہ گرہ کھلے گی تو حقیقت شفاف پانی کی طرح نظر آئے گی۔

۱۹- جون ۱۹۵۳ء کو گورنر پنجاب نے آرڈی ننس نمبر ۳ ۱۹۵۳ء صادر کیا۔ جس کی رو سے ان واقعات کی تحقیقات مقصود تھی، جن کے باعث ۱۹۵۳ء میں مسلمانوں اور مرزائیوں کے درمیان ہنگامہ ہوا۔ چنانچہ چیف جسٹس مسٹر محمد منیر (صدر تحقیقاتی عدالت) اور مسٹر ایم آر کیانی

(ممبر تحقیقاتی عدالت) پر مشتمل ایک ڈویژن بنچ مقرر کیا، جس نے یکم جولائی ۱۹۵۳ء کو اپنی کارروائی کا آغاز کیا۔

تحقیقاتی عدالت نے دیگر جماعتوں کی طرح مجلس احرار کو بھی فریق قرار دیا۔ احرار رہنماؤں نے جو ان دنوں لاہور سنٹرل جیل میں محبوس تھے، تحقیقاتی عدالت کے ذریعے حکومت مغربی پاکستان سے مطالبہ کیا کہ مجلس احرار کے ممتاز رہنما چونکہ مختلف جیلوں میں بند ہیں ان سے باہم مشورہ ضروری ہے، لہٰذا ان سب کو لاہور سنٹرل جیل میں اکٹھا کیا جائے تاکہ تحقیقاتی کمیشن کے راستے میں الجھاؤ پیدا نہ ہو۔ زعمائے احرار کے اس مطالبے میں جیسے جیسے تاخیر ہوتی گئی، تحقیقاتی کمیشن کا اصرار بڑھتا رہا۔ تا آنکہ ۲۵ جولائی ۱۹۵۳ء کو سکھر جیل کے اسیران جن میں امیر شریعتؒ کے علاوہ مولانا ابوالحسنات، مظفر علی شمسی، صاحبزادہ فیض الحسن اور دیگر رہنما شامل تھے، لاہور سنٹرل جیل میں لائے گئے۔

لاہور کا یہ تاریخی جیل خانہ جس کی جگہ اب "شادمان کالونی" آباد ہے، اپنی تاریخ کا واحد جیل خانہ تھا۔ اس کی ایک ایک کوٹھڑی، ایک ایک بارک حریت پسندوں پر کیے جانے والے ظلم و جور کی داستانیں سن سکتی تھیں، اس کی آنکھوں نے ان نوجوانوں کو پھانسی چڑھتے دیکھا تھا، جن کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ غیر ملکی سامراج کے خلاف صف آراء تھے۔ اس کے کانوں نے بید زنی کی وہ آوازیں سنی تھیں، جو رضاکاروں کو ٹکٹکی سے باندھ کر صرف اس جرم میں مارے جاتے کہ وہ اپنے ملک میں غیر ملکی راج پسند نہیں کرتے تھے لاہور سنٹرل جیل کی اونچی دیواروں نے ان نوجوانوں کو بھوک سے سسکتے اور...... مرتے ہوئے دیکھا تھا جو جیل خانے کے غلط نظام کی اصلاح چاہتے تھے۔ آزادیٔ وطن کے جرم میں تڑپ تڑپ کر مرنے والوں کا تماشہ دیکھنا تو اس بندی خانے کا روز کا مشغلہ بن گیا تھا۔

اگر برصغیر کی تقسیم میں انگریز کا دخل نہ ہوتا تو لاہور سنٹرل جیل قومی عجائبات کے لیے محفوظ کر لی جاتی، مگر...... ع

منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

۱۹۴۲ء کے مشہور متدمنہ بغاوت کے بعد امیر شریعتؒ پہلی بار اس جیل میں آئے تھے، قفس کے دیوار و دَر دیرینہ مجرم کو دیکھ کر اس قدر بے قابو ہوئے کہ اسیرانِ قفس بھی اپنی تیلیاں توڑ کر موسم بہار کا مزہ لینے لگے۔ امیر شریعتؒ کے اکثر رفقاء پیشتر سے اس جیل میں موجود تھے، جن میں شیخ حسام الدین، مولانا محمد علی جالندھری، مولانا محمد حیات ان سب کو دیوانی احاطے میں رکھا گیا تھا۔ امیر شریعتؒ اور مولانا ابوالحسنات بھی یہیں رہے۔

سنٹرل جیل میں امیر شریعتؒ کی آمد سے محفل عشاق میں رونق آگئی، گو امیر شریعت کے پاس دلِ زندہ کے سوا اب کوئی دولت باقی نہیں تھی۔ صحت عمر رفتہ کے۔۔۔ ساتھ رخصت ہو چکی تھی۔ رہی سہی کسر سکھر جیل نے پوری کر دی۔ نقاہت کے باعث امیر شریعت کا پُر بہار چہرہ پت جھڑ کے موسم کی طرح اپنا رنگ و روغن ضائع کر چکا تھا، تاہم وہ اپنی گراں بہا دولت کہ "زندگی زندہ دلی کا نام ہے" کے سہارے جنگل میں منگل بنا کر اسیرانِ ہم قفس کے ساتھ وقت گزارنے لگے۔

مؤقف اور اعتماد

عوامی زندگی میں ہمسفروں پر اعتماد اسی قدر لازمی ہے جس قدر انسانی اعضاء پر بھروسہ کرنا ضروری ہے، ورنہ نہ تو گھر کا نظام چل سکتا ہے اور نہ ہی سیاسی جماعتیں زندہ رہ سکتی ہیں۔

امیر شریعتؒ نے صاحب رائے اور قادر الکلام ہونے پر بھی زندگی میں رضا کاروں تک کو اپنے بھروسے میں لیا اور قافلۂ ہائے حیات کے ایک ایک فرد پر اعتماد کی ایسی عمارت استوار کی کہ ہر آدمی کو اپنے اعتماد کا وارث قرار دے دیا۔

تحقیقاتی عدالت کے روبرو مجلس احرار اور مجلس تحفظ ختم نبوت کا موقف واضح کرنے کا سوال آیا تو مشترک رہنماؤں کا ایک خصوصی اجلاس جیل میں منعقد ہوا، جس میں مختلف احباب نے اپنا اپنا نظریہ بیان کرتے ہوئے تحقیقاتی کمیشن کے ساتھ تعاون پر زور دیا۔

اجلاس میں دوستوں کی رائے سن کر امیر شریعتؒ نے ایک سرد آہ کے ساتھ فرمایا:

"آپ دوست جو فیصلہ چاہیں اگرچہ میں اس سے انحراف نہیں کروں گا، آپ حضرات کی باتوں نے میرے دماغ کو متاثر کیا ہے، لیکن میں اپنے دل کو کیا کروں، یہ میرا ساتھ نہیں دے رہا۔ دل گواہی دیتا ہے کہ یہ کمیشن ہمارے ساتھ انصاف نہیں کرے گا، بلکہ ارباب حکومت نے ہمیں رسوا کرنے کے لیے ایک خوبصورت چال چلی ہے۔

اگر میری مانو تو ہمیں کمیشن سے عدم تعاون کا اعلان کر دینا چاہیے، پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

ویسے آپ لوگوں نے شہید گنج اور ۱۹۴۶ء کے انتخاب کے موقع پر بھی میری بات نہیں مانی تھی اور آخر وہی ہو کر رہا جس کا میں نے اظہار کیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اب بھی آپ میری بات نہیں مانیں گے۔ تاہم اگر آپ حضرات اس پر مصر ہیں، تو پھر ہمیں مشروط تعاون پر آمادگی ظاہر کرنی چاہیے کہ ہمارا اصل فریق مخالف چونکہ قید و بند سے باہر ہے، اس لیے یا تو اسے بھی ہمارے ساتھ یہاں لایا جائے تاکہ مقدمہ کی پیروی کے لیے ہم دونوں کے وسائل اور ذرائع یکساں ہوں، یا پھر ہمیں آزاد کر دیا جائے تاکہ ہم بھی اپنا موقف آزادانہ ماحول میں واضح کر سکیں۔

ایک فریق کو آزاد اور دوسرے کو سلاخوں میں بند کرنا، عملی صورت ہی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ارباب حکومت اپنا فیصلہ صادر فرما چکے ہیں۔ میری مانو، تو اپنی زندگی کا باقی حصہ قید و بند کی نظر کر دو، اور اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دو۔ وہ بہتر کارساز ہے۔ لیکن اگر آپ حضرات اس کے لیے آمادہ نہ ہو سکیں تو میں آپ کے فیصلے کا پورا پابند رہوں گا اور انشاء اللہ اس پر عمل کروں گا۔

ہمارے ہاں تو جماعت نام ہے چند دوستوں اور ساتھیوں کی رفاقت کا۔"

امیر شریعت کی اس تقریر کے باوجود اجلاس نے فیصلہ کیا کہ مجلس احرار کو متوقع نتائج سے بے پرواہ ہو کر من حیث الجماعت تحقیقاتی عدالت کے سامنے اپنا موقف پیش کر دینا چاہیے۔

سکھر جیل کا تذکرہ

جیل کی زندگی اسیرانِ بلا کے لیے عجیب وغریب ہوتی ہے۔ گاہ یہ لوگ خزاں میں بھی بہاروں کا ساسماں پیدا کر لیتے ہیں، اور گاہ ان کی زندگی میں ایسا موڑ آتا ہے کہ گھروں کی یاد بہاروں کا موسم بھی ویران کر دیتی ہے۔ اسی قسم کی ایک محفل آرائی میں امیر شریعت نے دوستوں کے اصرار پر سکھر جیل کے واقعات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"کراچی کے ارباب اختیار نے ہم بوڑھوں (مولانا ابوالحسنات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کے ساتھ کیا سلوک کیا، اور پھر سکھر جیل کے افسروں کی اخلاق باختگی اور ان کی سرد مہری کے واقعات سناتے اور کہا کہ جون جولائی کی ہلاکت خیزیاں، سکھر جیل، پھر اس کے رحم دل اور ذرہ نواز ارباب اختیار، بس یہ تو میرے اللہ میاں کا فضل و کرم ہوا کہ ہم وہاں سے زندہ اور سلامت آ گئے ہیں ورنہ ان لوگوں نے اپنی جانب سے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔

چاول اور نامعلوم اشیاء کے امتزاج سے جو سخت سے سخت روٹی تیار ہو سکتی تھی وہ ہمارے لیے مہیا کی جاتی تھی۔ ساگ پات کی جگہ گھاس پھونس اور مسلسل مسور کی دال، یہ ہمارے لیے سب سے بہتر خوراک تھی اور یہ تھا صحت افزا مقام تپتے ہوئے مختصر قبر نما کمرے جن سے معمولی ہوا کا گزر بھی مشکل سے ہو سکے، یہ تھی ہماری قیام گاہ۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان تکلیف دہ اور دلگداز حالات میں میری صحت کا ستیاناس ہو گیا۔ جسم پر پہلے گرمی کے دانے نمودار ہوئے پھر وہ سخت پھوڑے سے بن گئے، جنہوں نے میرے بدن میں اس طرح آگ لگا دی جس طرح کہ دہکتے ہوئے انگارے جسم پر رکھ دیے گئے ہوں۔

متحدہ ہندوستان میں میں نے سخت سے سخت جیل خانے دیکھے ہیں اور سفاک سے سفاک جیل کے انگریز افسروں سے بھی واسطہ پڑا ہے اور بعض افسروں سے تو ایسی ٹھنی کہ رہائی تک اکھاڑہ جما رہا، لیکن سکھر جیل میں ہمارے ساتھ کچھ نرالا ہی سلوک ہوا ہے۔

میں قید و بند کے مصائب بیان کرنے کا عادی نہیں ہوں، بلکہ ان کا تذکرہ معیوب سمجھتا ہوں۔ لوگ حوالات میں ایک رات کاٹ آئیں تو باہر آکر اخبارات کے نمبر نکال لیتے ہیں اور زنداں کی ساعتیں منٹوں میں حساب لگا کر بیان کی جاتی ہیں۔ بابو! یہ پروپیگنڈے کی دنیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے تو ہمارے لیے جیل خانہ ایک گلشن بنا دیا ہے۔ پھولوں تک رسائی کانٹوں سے الجھنے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ ایسے ہی گلشن زندگی میں ہم تلخیوں اور تنگیوں کے بعد ہی ثمر مراد پا سکتے ہیں۔ سبحان اللہ! انہوں نے کتنی بلند بات کی ہے۔ رَبِّ السِّجۡنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدۡعُوۡنَنِیۡۤ اِلَیۡہِ (اے میرے پروردگار یہ قید خانہ مجھے اس سے کہیں زیادہ محبوب ہے، جدھر وہ مجھے بلا رہے ہیں۔)

یوسف علیہ السلام کے ذکر سے مجھے ڈمڈم جیل یاد آگئی۔ ۱۹۳۰ء کے ایام اسیری میں ایک رات میں سورۂ یوسفؑ کی تلاوت کر رہا تھا، چاندنی رات پورے نکھار پر تھی، فضا میں سناٹا اور ماحول دم بخود تھا۔ ایسے میں تلاوت قرآن مجید میں رات کا کچھ سماں بیت گیا۔ اتنے میں داروغہ جیل پنڈت رام جی لال نے مجھے پیچھے سے پکارا۔ مڑ کر دیکھا تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہو رہی تھی۔ کہنے لگا "شاہ جی! خدا کے لیے بس کردو۔ میرا دل قابو سے باہر ہو رہا ہے۔ اب مجھ میں رونے کی سکت نہیں رہی"۔ بھائی! قرآن پڑھا جائے تو آج

بھی اس کے اعجاز دکھائی دیتے ہیں۔"

خیر! ۔ تو ذکر سکھر جیل کا ہو رہا تھا ۔ میری تو بھلی پوچھیے، میں تو سرد گرم چشیدہ تھا اور پوری زندگی جیل یا ریل کی نظر ہو گئی ہے ۔ یہ بڑے میاں (مولانا ابوالحسنات) بے چارے اس وادیٔ پرخار میں پہلی بار قدم رنجہ ہوئے تھے مجھے ان کا بڑا احساس رہا۔ لیکن ماشاءاللہ ان کو تو میں نے اپنے سب ساتھیوں سے صابر و شاکر پایا۔"

مولانا مجاہد الحسینی کا کہنا ہے کہ شاہ جی کے ان ارشادات کے بعد میں نے استفہاماً شاہ جی کی خدمت میں عرض کیا۔ "آپ حضرات کے ساتھ اس قسم کے افسوسناک سلوک کا محرک کہیں انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات (جو مرزائی تھا) کا انتقامی جذبہ تو نہیں ہے؟" اس پر شاہ جی نے ایک بار میری جانب دیکھا، اور پھر خاموش ہو گئے۔

اسیرانِ مارشل لاء

تحریکِ ختمِ نبوّت میں جن لوگوں کو مارشل لاء کے تحت سزائیں ہوئیں وہ سب کے سب لاہور سنٹرل جیل میں ہی میعادِ اسیری گزار رہے تھے ۔ ان کی خواہش ہوئی کہ حضرت امیرِ شریعتؒ سے ملاقات کریں ۔ چنانچہ ایک دن صبح ناشتے پر بیٹھے ہی تھے کہ دیوانی احاطہ کے انچارج نے امیرِ شریعتؒ سے عرض کی کہ اسیرانِ مارشل لاء شوقِ دید میں حاضر ہونا چاہتے ہیں ۔ امیرِ شریعتؒ ننگے پاؤں اور ننگے سر ان لوگوں سے ملنے کے لیے بے محابہ دروازے پر پہنچ گئے ۔ قیدیوں نے ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کی جھنکار سے امیرِ شریعتؒ کا استقبال کیا۔

امیرِ شریعتؒ نے اسیران کو گلے لگایا، اور ان کے آہنی زیورات کو بوسہ دیا اور پھر اشک بار آنکھوں اور غمناک لہجے میں فرمایا:

"آپ لوگ میرا سرمایۂ نجات ہیں، میں نے دنیا میں آپ کو روٹی اور پیٹ یا کسی مادی مفاد کے لیے نہیں پکارا۔ لوگ اس کے لیے بھی بڑی بڑی قربانیاں

کرتے ہیں، میں نے تو آپ کو اپنے نانا حضرت خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عزّت وناموس کے تحفّظ کی دعوت دی ہے۔ اور آپ لوگ صرف اور صرف اس مقدس مقصد کے لیے قید وبند اور طوق وسلاسل کی یہ صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں۔

آپ میں سے ایسا کوئی نہیں، جو سیاسی شہرت یا ذاتی وجاہت چاہتا ہو۔ آپ جیل میں بھی غیر معروف ہیں، اور جب اس دیوارِ زنداں سے رہا ہوں گے، تو باہر آپ کا استقبال کرنے والا اور پھولوں کے ہار ڈال کر نعرے لگانے والا بھی کوئی نہیں ہو گا۔

نیّت اور ارادے کے اعتبار سے جس کی آمد اس مقصد کے لیے ہوئی ہے، وہ یہی مقصد لے کر واپس چلا جائے گا۔ میرے لیے اس سے بڑا سرمایہ افتخار کیا ہو سکتا ہے"

کسی ایک قیدی نے ایک دوسرے قیدی کا تعارف کراتے ہوئے کہا،

"شاہ جی! تحریک میں اس کا بھائی گولی کا نشانہ بن چکا ہے، اس کے لیے دعا فرمائیں۔"

امیر شریعت نے تحریک کے دوران حکومت کی طرف سے تشدّدانہ کارروائیوں کی مذمّت کرتے ہوئے فرمایا:

"بھائی! ہم ہرگز یہ نہیں چاہتے تھے کہ حکومت یا عوام تشدّد پر اتر آئیں، اور کوئی ناخوشگوار صورت نمودار ہو جائے۔ میں نے کراچی جیل میں جب لاہور اور دوسرے مقامات پر گولی چلنے کے واقعات سنے اور معلوم ہوا کہ کئی بوڑھے باپوں کی لاٹھیاں ٹوٹ گئی ہیں، ماؤں کے چراغ گل ہو گئے ہیں اور کئی سہاگ اُجڑ گئے ہیں تو مجھے اس کا بڑا صدمہ پہنچا اور میں نے وہاں کہا تھا ــــ

"کاش! کوئی مجھے باہر لے جائے، یا اربابِ اقتدار تک میری یہ آرزو

پہنچا دی جائے کہ تحفظِ ناموسِ رسولؐ کے سلسلہ میں اگر کسی کو گولی مارنا ضروری ہو تو وہ گولی میرے سینے میں مار کر ٹھنڈی کر لو۔ کیونکہ میں اس جرم کا سب سے بڑا مجرم ہوں۔ اور کاش! اس سلسلہ میں اب تک جتنی گولیاں چلائی گئی ہیں وہ مجھے ٹکٹکی پر باندھ کر ماری جاتیں۔ مگر ع

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

داستانِ پارینہ جیل خانے کی محدود دنیا میں بھی حضرت امیرِ شریعتؒ اپنی انجمن آپ تھے۔ عبادتِ الٰہی جیل خانے میں ان کا سب سے بڑا مشغلہ تھا چنانچہ نمازِ فجر سے فارغ ہو کر قرآن حکیم کی تلاوت کرتے یا درود و وظائف اور ذکرِ الٰہی میں منہمک رہتے۔ تہجد کے وقت جب کبھی آپ اللہ اللہ کا ذکر بالجہر کرتے یا دوسرے اوقات میں تلاوت قرآن مجید کرتے تو خود ہی وجد میں آجاتے اور اپنا روایتی لب و لہجہ اختیار کرتے تو سکوتِ زنداں میں ایک ارتعاش پیدا ہو جاتا۔ ریاضت سے فراغت پاتے تو داستانِ پارینہ کے ورق الٹنے لگتے۔ اسی طرح ایک دن جیل کے باورچی فتح دین کا ذکر آگیا۔ اس باورچی نے اگرچہ کھانا پکانے میں خاصی مہارت حاصل کر لی تھی لیکن مولانا ابوالحسنات جنہیں امیرِ شریعتؒ "ہرفن مولا" کہا کرتے تھے باورچی کی ایک نہ چلنے دیتے اور ہر روز نئی ہدایت جاری فرما دیتے تھے۔

اس موقعہ پر امیرِ شریعتؒ نے مختلف باورچیوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ:

"میں نے ایک بار انگریزوں کے خلاف خانساماؤں کی تحریکِ عدمِ تعاون بھی چلائی تھی۔ مجھے جہاں کہیں سے اطلاع ملی کہ اس انگریز افسر کے ہاں کوئی مسلمان ملازم خانساماں کی خدمات سرانجام دے رہا ہے تو میں اسے عدم تعاون پر آمادہ کرتا۔ چنانچہ اس سلسلے میں امرتسر میں ایک خانساماں کانفرنس بھی منعقد کی جس کے اچھے اثرات ظاہر ہوئے۔"

"تحریکِ خلافت کے دنوں امرتسر میں میں نے زنانِ بازاری کے خلاف

مہم چلائی تھی، جس کے نتیجے میں "اس بازار کی" اکثر عورتوں نے شادی کر لی، اور کچھ نے گناہ کے کاروبار سے تائب ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس طرح سے کڑہ رام باغ جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی تھیں، گندگی سے پاک ہو گیا۔"

دوسری ایک محفل میں فرمایا:

"ایک دفعہ کسی سفر کے لیے امرتسر ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی، اور ایک ڈبے کے سامنے عوام کی خاصی بھیڑ جمع تھی۔ دیکھا تو چار گورے (فرنگی) پورے ڈبے پر قابض ہیں۔ حالانکہ اس میں پچاس مسافروں کی گنجائش تھی مگر وہ کسی ہندوستانی کو اس میں بیٹھنے نہیں دیتے تھے۔

ان دنوں میرے ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا ہوتا تھا، اور اس نسبت سے لوگ مجھے بخاری ڈنڈے والا کہا کرتے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر ڈنڈے کے زور سے ڈبے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو کر وہی ڈنڈا گورے سپاہیوں پر اس انداز سے لہرایا کہ وہ خوفزدہ ہو کر چاروں کے چاروں ایک کونے میں سہم کر بیٹھ گئے اور پھر میں نے تمام مسافروں کو اس ڈبے میں بٹھا دیا اور خود برابر والے کمرے میں جا بیٹھا۔ غالباً مجھے انبالہ تک جانا تھا۔ اس دوران ہر اسٹیشن پر جہاں گاڑی رکتی میں نیچے اتر کر ایک نظر گوروں پر ڈالتا اور ساتھ ہی ڈنڈا ہوا میں لہراتا۔ مگر وہ اسی کونے میں دبکے پڑے رہے۔ میں انگریزی نہیں جانتا تھا، وہ پنجابی نہیں سمجھتے تھے، مگر ڈنڈے کے قربان جائیے کہ اس نے بگڑے ہوئے کام کو سنوار دیا۔"

کبھی کبھار صحت اجازت دیتی اور موڈ میں ہوتے تو گراؤنڈ میں والی بال یا کوئی دوسری IN DOOR GAME کھیلنے چلے جاتے۔ بہر طور موسم باد بہاری سے بے نیاز ہو کر خزاں کے یہ دن بھی بہار کی طرح کٹتے رہے۔

ساون بھادوں کے بھیگے ہوئے دن اسیرانِ قفس کے لیے بہاروں کی ساری یادیں تازہ کر دیتے ہیں۔ برستے ہوئے بادلوں سے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہونے لگتی ہیں۔ ایسے میں نکہتِ بادِ بہاری کی تمام آرزوئیں اونچی دیواروں سے سر ٹکرا کر رہ جاتی ہیں۔ بہارِ لالہ و گل جب صحنِ چمن میں اٹھکیلیاں کرتی ہے تو نسیمِ سحر گاہی قفس کی اوٹ سے جھانکنے والوں کا مذاق اڑاتی ہے لیکن اسے کیا خبر کہ یہ دیواریں گر بھی سکتی ہیں، یہ تیلیاں ٹوٹ بھی سکتی ہیں۔ جن کے حوصلے بلند ہوتے ہیں ان کے مقام سوا ہوتے ہیں۔ وہ قفس کی تیلیاں اور جیل خانے کی دیواروں کو اپنے راستے کی رکاوٹ نہیں سمجھتے، ہاں زمانے کی آسائشیں ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ ڈھلتے سورج کی طرح اپنا مقام بدلتی رہتی ہیں مگر دوام انہی کو حاصل رہا، جن کے عزم کی دیواریں کوتاہ نہیں ہوتیں۔

ایسے ہی برسات کے موسم میں ایک دن کا ذکر ہے کہ امیر شریعتؒ ایکا ایکی کتابِ زندگی کے ورق پلٹنے لگے، خستہ یادوں کی بھولی بسری کہانیاں ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں تو امیر شریعتؒ مسکرا دیے۔ بوڑھے جسم کی جوان آنکھوں میں روشنی کا سیلاب اُمڈ آیا، اور اپنے اردگرد دیکھنے لگے، جیسے وہ کسی واقعہ کا گواہ تلاش کر رہے ہوں۔ پھر آپ سے آپ گویا ہوئے؛

"۱۹۴۲ء میں میری زندگی میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ نواب جان کے بیٹے افضل کو میری گود میں ڈال دیا گیا۔ ناپاک دامن میں پرورش پانے والا معصوم، گناہوں کی بستی سے بغاوت کر کے ایمان کی اوٹ میں امان چاہتا تھا۔"

نواب جان اس بازار کی جنس تھی جہاں عورت تاش کے پتوں کی طرح تقسیم ہوتی ہے۔ حُسن اس کے چہرے پر ہی نہیں آواز میں بھی تھا۔ جب وہ لاہور ریڈیو سے آواز کا جادو بکھیرتی تو ہوائیں جھولیاں بھر کر اسے کائنات میں پھیلاتیں۔ اس حُسن بے پروا کی

بلائیں لینے والوں میں کچھ پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں۔ افضل نواب جان کی تمناؤں کا آخری سہارا تھا۔ اگرچہ دو لڑکیاں بھی نواب جان کی وراثت میں شامل تھیں، لیکن تیرہ سالہ افضل اب ماں کے گندے اور ناپاک دامن پر پاؤں رکھنا بھی گناہ سمجھتا تھا۔ اسے خاندانی بغاوت کے جرم میں گھر سے نکال باہر کیا گیا، اور وہ امیر شریعتؒ کی جھولی میں آ گرا۔

انسان بھی کیا شے ہے، بُرائی کا رُخ کرتا ہے تو راستے کی ہر شے معاونت کرتی ہے، اور جب نیکی کی طرف مڑتا ہے تو اپنے بھی پرائے ہو جاتے ہیں۔

امیر شریعتؒ کا کہنا ہے کہ:

"جب میں اس سنڈاس کے قریب پہنچا تو گناہ آلود دامن میرے گرد جال بننے لگا، انتقامی نگاہیں میرے تعاقب میں رہنے لگیں۔ برائی اپنے تمام وسائل سمیٹ کر میری دشمنی پہ آمادہ ہو گئی، لیکن افضل رلاد کی طرح دل کے حرم میں مقیم رہا۔"

بیٹے کی ناراضگی نے ماں کی ممتا کو بیدار کر دیا۔ لیکن افضل کا ماں سے مطالبہ تھا کہ وہ یہ دھندا ترک کر کے شرافت کی پناہ میں بیٹھ جائے، اور میری دونوں بہنوں کو بھی ازدواجی زندگی سے منسلک کر دے۔

گناہوں سے تھکی ہاری زندگی شاید نیکی کی آواز پر لبیک کہتی، مگر برسوں سے خاندانی پیشہ قدم قدم پر رکاوٹیں ڈال رہا تھا، جنہیں راستے سے ہٹانا عورت کے بس کا روگ نہیں تھا۔ ماں کی ممتا اور خاندانی وقار! نواب جان اس دوراہے پر کھڑی تھی، کہ حالات بگڑتے چلے گئے۔

امیر شریعتؒ فرماتے ہیں:

"ایک دن میں میلسی (ضلع ملتان جہاں نواب جان کا گھر تھا) سے دس میل دور قصبہ فتح پور سے واپس آ رہا تھا، مجھے اطلاع ملی کہ میلسی کے پولیس تھانے

میں علاقے کے زمیندار، وکلاء اور نواب جان کے رشتے دار جمع ہیں کہ جیسے ہی
میں میلسی میں داخل ہوں، مجھے افضل کے اغوا میں بمعہ گھر کے زیورات اور پارچات
چوری کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا جائے۔

مولانا خدا بخش نے جو شہر کی جامع مسجد کے امام تھے، مجھے یہ قصہ سنایا تو میں
نے کوچوان سے کہا، "تانگہ تھانے لے چلو" سب دوست حیران ہوئے، جیسے
ہی تانگہ تھانے کے قریب پہنچا۔ انچارج تھانہ، وکلاء علاقے کے رؤسا میرے مذہبی
اور سیاسی حریف، جن میں ضلع کا مال افسر بشیر احمد تارڑ بھی تھا۔ مجھے دیکھتے ہی سب
کے سب سلام کرنے تھانے سے باہر چلے آئے، میں نے کہا، "مجھے منافق قسم
کا سلام قبول نہیں۔ میں آگیا ہوں اتم اپنی کارروائی جاری رکھو" یہ کہہ کر میں اپنے
میزبان کے گھر جو نواب جان کے گھر کے برابر تھا، چلا گیا۔ افضل اس وقت بھی
میرے ساتھ تھا"

جب واقعات اس موڑ تک آن پہنچے تو نواب جان نے اپنے عزیز و اقارب سے کہا
"میں شاہ صاحب کے خلاف تھانے میں کوئی رپورٹ درج کرانا نہیں چاہتی۔ وہ سید ہیں اور
درویش بھی"۔ یہ کہہ کر نواب جان نے امیر شریعتؒ کے نام ایک دستی خط لکھا، جس کا مفہوم کچھ اس
طرح سے تھا۔

پیر سائیں!

السلام علیکم۔ میں اور میرا خاندان برسہا برس سے گناہوں کی زندگی
گزار رہا ہے، افضل بھی میری اسی گناہ کی کمائی کا نتیجہ ہے۔
جس دامن پر گندگی کے چھینٹے پڑ چکے ہوں وہ دامن اس قابل ہے کہ آپ
تک رسائی حاصل کر سکے۔

امیر شریعتؒ نے اسی وقت جواب میں کہا،

"عیب وثواب انسانی زندگی کا خاصہ ہیں۔ موت وحیات کے درمیان کئی موڑ آتے ہیں، جہاں انسان پھسل کر سنبھلتا ہے اور سنبھل کر پھسلتا ہے۔ ثبات صرف اسی ایک ذاتِ باری کے لیے ہے۔

میں تیرے حالات سے ناآشنا ہوں، ناشناہی جانتا ہوں، اور وہ بھی تیرے بیٹے کی زبانی سنا ہے کہ تو گناہ کی زندگی میں مبتلا ہے، اور اپنی اولاد کو بھی خراب کر چکی ہے۔ حاشا وکلا مجھے اس کا کوئی علم نہیں۔ ندامت کے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی چادر میں لپیٹ کر اگر تو میرے مولا کریم کے سامنے توبہ کی بھیک مانگے گی تو تیری جھولی خالی نہیں آئے گی۔ میں بھی تیرے لیے دعا کروں گا۔"

اس خط کے جواب میں دوسرے دن نواب جان کا ایک اور دستی خط آیا۔

پیر سائیں! السلام علیکم

اگر ندامت کے آنسوؤں سے گناہ کے داغ دھل سکتے ہیں تو میں ساری رات گھر والوں سے چوری روتی رہی ہوں۔ میرے ایسے گناہ کی گٹھڑی کو کون اٹھائے گا۔ تاہم آپ حکم کریں تو میں کسی سے نکاح کر لوں، جبکہ میرے گرد حرص و ہوس کے انسانوں کی بے شمار دولت جمع ہے اور میرے خاندان کے لوگ اس دولت کے پجاری ہیں۔

پیر سائیں! مجھے ان کے چنگل سے نجات کے لیے وقت کی ضرورت ہے، میں کوشش کرتی ہوں، آپ دعا کریں۔ میرے افضل سے کہنا، وہ بھی ماں کے گناہ معاف کر دے۔ میری مجبوریوں سے وہ واقف ہے۔"

اس خط کا امیر شریعتؒ نے مختصر جواب دیا:

"انسان کو نیکی کرنے کی توفیق تو اللہ تعالیٰ دیتے ہیں۔ اسلام کا ایک ادنیٰ مبلغ ہونے کی حیثیت سے میں تیرے لیے دعا گو ہوں۔ پروردگار تجھے نیکی کی راہ پر

چلنے کی توفیق دے ۔ (آمین)

تو سیس گُندا لے، چندر یا رنگا لے

اری کیا کرے گی کھڑی دلن کے دن

نوٹ (خطوط کے یہ مفہوم یادداشت پر مبنی ہیں، نہ تو ان کی نقل امیر شریعتؒ کے پاس تھی اور نہ ہی کسی دوسری جگہ۔ لیکن گفتگو کا یہی انداز تھا جو امیر شریعتؒ نے بیان کیا، جن پر خطوط کی عبارت ترتیب دی گئی ہے۔)

نواب جان کی یہ کہانی دنوں اور مہینوں میں نہیں، سالوں میں جاکر ختم ہوئی۔ اور اس میں کئی موڑ آئے۔ آخر ہوا یہ کہ امیر شریعتؒ کی دعائیں کام آئیں، اکہ ضلع ملتان کی اس مشہور طوائف نے بیٹے کا کہا مان کر اپنی سابقہ زندگی سے توبہ کر کے تحصیل میلسی کے ایک زمیندار خدا بخش بھٹہ سے شادی کر لی، جس سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ یہ زمیندار ۱۹۶۰ء میں انتقال کر گیا۔ نواب جان نے اپنی دونوں لڑکیوں کے نکاح بھی شریعت کے مطابق کیے۔ افضل اپنی ماں کے پاس واپس چلا گیا اور آجکل دونوں ماں بیٹا میلسی میں مقیم ہیں۔ افضل محکمہ نہر میں پٹواری ہے اور اسی ضلع میں کہیں تعینات ہے۔

آخری سازش

ایامِ اسیری پرانی یادوں کے انہی کھنڈرات پر سے گزر رہے تھے۔ ہر قیدی اپنے بیتے دنوں کی کہانیاں سنانے میں مصروف تھا کہ انہی دنوں حضرت مولانا داؤد غزنوی ایک تحریری بیان لے کر لاہور سنٹرل جیل میں ان رہنماؤں سے ملے اور کہا کہ

"مجھے وزیر اعلیٰ صوبہ مغربی پاکستان ملک فیروز خاں نون نے بھیجا ہے اگر آپ حضرات اس بیان پر دستخط کر دیں تو حکومت آپ کو رہا کرنے کو تیار ہے۔"

بیان کا متن:

"تحریک ختم نبوت کو چلانے کا ہمارا اس طرح کوئی ارادہ نہیں تھا اور نہ ہی آئندہ ہم ایسی کسی تحریک کے چلانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ماضی قریب میں جو کچھ ہوا اس میں عوام کو زیادہ دخل تھا۔

ہم حکومت کو یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ ہم ایسی کوئی تحریک نہیں چلائیں گے جس سے ملک کا امن خطرے میں پڑ جائے۔"

مولانا داؤد غزنوی سے یہ تحریر لے لی گئی اور جواب کے لیے انہیں دوسرے روز آنے کو کہا گیا۔ مولانا ابوالحسنات، صاحبزادہ فیض الحسن اور تحریک کے دوسرے رہنما مولانا داؤد غزنوی کو اپنے انداز سے سوچتے اور پڑھتے رہے۔ لیکن امیر شریعت کا انداز الگ رہا۔ انہوں نے رات بھر اسیران قفس سے مشورہ کے بعد فیصلہ کیا کہ اس تحریر پر دستخط کرنے سے بہتر ہے کہ ہم جیل کے غیر اخلاقی قیدیوں کے ہاتھوں قتل ہو جائیں۔ یہ تحریر ہماری سیاسی اور مذہبی موت کے مترادف ہے، چنانچہ دوسرے دن مولانا داؤد غزنوی تشریف لائے تو حضرت امیر شریعتؒ نے ان سے کافی تلخ کلامی کی۔

تحریک ختم نبوت کے خلاف اپنوں اور بیگانوں نے جو سازشیں کیں یہ سازش اس کی آخری کڑی تھی۔ دشمنوں کا یہ جال جو دوست کے ہاتھ سے پھیلایا گیا تھا، اپنے ہی زور پر تار تار ہو کر رہ گیا۔ اور ہر مخالف جس نے تحریک ختم نبوّت کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی، آپ سے آپ بندھنوں میں الجھتا چلا گیا۔

جماعتِ اسلامی کے رہنما جو اس تحریک کی نیو اٹھانے میں برابر کے شریک تھے، جب عتابِ ملوکیّت نظر آیا تو عزیزِ مصر کی بیوی کی طرح سارا گناہ حضرت یوسفؑ کی جھولی میں ڈال کر اپنی پاک دامنی کے گواہ تلاش کرنے لگے۔ مجلس احرار کو اس تحریک کا مجرم ٹھہرا کر جماعت اسلامی کے بزدل رہنماؤں نے اپنی جماعت کو اس بری طرح داغدار کیا کہ تحریک کے ساتھ اپنی عاقبت پر بھی چھینٹے ڈال لیے۔

اس طرح تحریک ختم نبوّت میں پنجاب کے ہر سیاستدان نے خواہ اس کا تعلق حکومت سے تھا یا دوسری سیاسی جماعتوں سے، عوام کے دباؤ کی وجہ سے اس تحریک میں ملوّث ہونے کی کوشش کی۔ چنانچہ ان دنوں سید حسین شہید سہروردی سابق وزیر اعظم پاکستان اپنی جماعت (عوامی لیگ)

کو عوام میں متعارف کرانا چاہتے تھے اور اس غرض سے انہوں نے اس تحریک کے رہنماؤں سے جیل میں رابطہ قائم کیا تاکہ تحقیقاتی عدالت میں احرار کی قانونی امداد کر سکیں لیکن ان کا محنتانہ اس قدر زیادہ تھا کہ مجلس احرار اس کی متحمل نہیں تھی اور دوسری طرف مولانا مظہر علی اظہر تھے جنہوں نے معمولی رقم پر سارا مقدمہ لڑا۔

یہ قصہ چل رہا تھا کہ میاں محمود علی قصوری بار ایٹ لاء، رہنما نیشنل عوامی پارٹی کو خیال آیا اور وہ بھی اس ٹوہ میں رہے کہ آیا حکومت نے تحریک ختم نبوّت کے نظر بندوں پر ان کی ابتدائی میعاد نظر بندی (چھ ماہ) کے ختم ہونے پر دوسرے نوٹس کی تعمیل کرائی ہے؟ اور جیسے ہی انہیں حکومت کی اس آئینی کمزوری کا علم ہوا، اور ساتھ ہی پتہ چلا کہ کراچی میں گرفتار ہونے والوں سے بھی دوسرے نوٹس کی تعمیل نہیں کرائی گئی تو انہوں نے آگے بڑھ کر اپنا سیاسی داؤ کھیلا، مولانا ابوالحسنات اصاحبزادہ فیض الحسن اور ماسٹر تاج الدین کی طرف سے لاہور ہائیکورٹ میں ایک رٹ دائر کر دی، جس کی سماعت جسٹس رحمان نے کی اور نظر بندوں کو انتظامیہ کی کمزوری کا فائدہ دیتے ہوئے ۸۔فروری ۱۹۵۴ء کو رہا کر دیا اس ضابطے کے تحت ۱۸۔فروری ۱۹۵۴ء کو حضرت امیر شریعتؒ بمعہ اپنے دوسرے رفقاء کے لاہور سنٹرل جیل سے رہا کر دیے گئے۔

نئے سفر کا آغاز

بلا شبہ زندگی جہد مسلسل کا نام ہے اور مبارک ہیں وہ لوگ جنہوں نے اس کارگاہ عالم میں اپنے وجود تک کو اس راہ میں صرف کر دیا اور سنگِ میل بن گئے رہروِ نئے منزل کے لیے۔

امیر شریعتؒ اب کے بار جیل خانے سے رہا ہوئے تو یقین تھا کہ عمرِ رواں کا باقی حصہ سکونِ قلب، تنہائی اور یادِ الٰہی میں گذار دیں گے۔ صحت تمام جسم سے بغاوت کر چکی تھی خاص کر سکھر جیل کے چند دنوں کی "سی کلاس" خوراک نے رہا سہا بھرم بھی گنوا دیا۔ انہی دنوں عزیز بیٹی نے بھی اکثر اصرار کیا کہ ابا! اب آپ آرام کریں۔" تو بڑے جلال میں فرمایا:

"بیٹی! تم یہ پسند کرتی ہو کہ تمہارا باپ چارپائی پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرے"

یہ پسند نہیں کرتی کہ میں حضورؐ کی ختم نبوت کے لیے جان دے دوں۔"

نقاہت، بڑھاپا اور بیماری کے باعث کچھ دن گھر میں آرام کیا۔ لیکن شب و روز ملنے والوں کے ہجوم میں آرام کہاں۔ دن بھر محفلیں جمتیں، ادب پر بات چل نکلی تو گھنٹوں اسی پر بحث ہو رہی ہے۔ سیاسیات کی بات آ گئی تو بڑے بڑوں کے بخیے ادھیڑے جا رہے ہیں۔ ان دنوں کراچی میں ملک غلام محمد گورنر جنرل، پاکستان اِلساط پر اپنی ضروریات کے مہرے کھلا رہے تھے۔ لاہور اور کراچی میں اٹھا پٹخ کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری تھا۔ انہی واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کسی دوست نے سوال کیا "شاہ جی! یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے"۔؟

بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

"بھیا! کتے بھونک رہے ہیں، جن کو راتب مل گیا ہے، وہ کھا کر سو گئے ہیں اور جن کو نہیں ملا وہ بھونک رہے ہیں۔"

اس پر تمام محفل کشتِ زعفران بن گئی۔

اسی طرح راقم ایک دن لائل پور سے ملتان حاضر ہوا، تو حسبِ معمول بڑے تپاک سے ملے۔ اھلاً و سھلاً مرحبا کے بعد فرمایا:

"جانباز! ایک کیبنٹ پاکستان کی میں نے بھی بنائی ہے۔ اس میں ایک آدمی کی کمی تھی۔ تمہارے آنے پر وہ نام یاد آ گیا۔ دیکھو، اگر ان لوگوں پر مشتمل کیبنٹ بن جائے تو کتنے دن چلے۔"

کیبنٹ ۱: مولانا ظفر علی خاں ۲۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

۳۔ علامہ عنایت اللہ المشرقی ۴: مولانا عبدالستار نیازی

۵۔ قاسم رضوی (حیدر آباد دکن) ۶: غازی محمد نیر (داو کاڑہ)

میرے آنے پر یہ نام یاد آیا ہے۔ ۷۔ حافظ سید عطاء المنعم شاہ بخاری۔

مندرجہ بالا حضرات کی اکثریت اپنی انفرادی زندگی میں ایثار و قربانی کا مجسمہ رہی ہے۔

ان کے خلوص پر بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ گذشتہ ربع صدی کی تاریخ ان کے سیاسی و مذہبی کردار کو فخر و مباہات کے دامن میں گرہ دیئے ہوئے ہے۔ لیکن اجتماعی زندگی میں یہ لوگ اپنے چلن کے خلاف مظاہرہ کرتے رہے۔

مولانا ظفر علیخاں نے اتحاد ملّت بنائی۔ علامہ عنایت اللہ المشرقی نے خاکسار تنظیم۔ مولانا مودودی نے جماعت اسلامی ترتیب دی، اور خود ہی یہ لوگ ان جماعتوں کے صدر یا ڈکٹیٹر بنے رہے۔ ورکنگ کمیٹی بھی اپنے ڈھب کی انتخاب کی، جیسے ہی جماعت کے اندر سے ان کے اس فعل پر کوئی معترض ہوا، تو پہلے بگڑ گئے، اس پر بھی بات نہ بنی تو جماعتی پالیسی سے انحراف کے جرم میں متعلقہ ممبر کو جماعت سے الگ کرنے کی کوشش کی، اس پر بھی اگر کچھ لوگوں نے متعلقہ ممبر کے موقف کو درست قرار دیا تو جماعت کو توڑ تاڑ کر یہ گئے وہ گئے۔

ان دنوں پاکستان کی ہر حکومت کی عمر ڈوبتے سورج کی طرح ہر شام غروب ہو رہی تھی۔ ایسے وقت میں امیر شریعتؒ نے مندرجہ بالا تلوّن مزاج حضرات پر مشتمل پاکستان کی گھریلو کیبنٹ (کابینہ) ترتیب دے کر حکومت وقت پر ایک ایسا بھرپور طنز کیا کہ طنز و مزاح کی دنیا میں یہ نشتر ہمیشہ پیوست رہے گا۔

دھوپ کے سائے ڈھلتے ہی ان محفلوں کے رسیا اپنی اپنی راہ لیتے۔ امیر شریعتؒ ہر شام کندھے پر چادر اور ہاتھ میں بید کا کھونٹا لیے سلیمی دواخانے پر آ بیٹھتے۔ یہاں روح اور جسم دونوں کا علاج ہوتا تھا۔ بزم لطائف اور شعر و شاعری کا بازار نماز عشار تک گرم رہتا۔

مجلسِ تحفظِ ختم نبوّت کی صدارت

اسی سال (۱۳ ستمبر) امیر شریعتؒ کو اکثر احباب کے اصرار پر ملتان کے ایک خصوصی اجلاس میں مجلس تحفظ ختم نبوّت کا صدر منتخب کیا گیا، آپ نے صدر منتخب ہوتے ہی حسب ذیل بیان پریس کے نام جاری کیا۔

" مسئلہ ختم نبوّت جانِ اسلام اور روحِ قرآن ہے۔ اگر مسلمان عقیدۂ ختم نبوّت

سے بال برابر ادھر ادھر ہو جائیں گے تو پھر نہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآن باقی رہتا ہے اور نہ ہی خدا تعالیٰ کا وہ تقدس اور توحید باقی رہتی ہے، جن پر آدم علیہ السلام سے لے کر حضور ختمی المرتبت تک تمام انبیاء علیہ السلام متفق ہیں۔

مرزائیت اس روح پر اس جان قرآن اور جانِ اسلام پر مرتدانہ ضرب ہے۔ میں اس کے استحصال کو ہر مسلمان کے لیے فرض جانتا ہوں اور اپنی زندگی کی آخری بازی۔ پاکستان کے جسم میں یہ سیاسی ناسور ہے۔ اگر حکومت نے اس کا اپریشن نہ کیا تو یہ ناسور سارے جسم کو تباہ کر کے رکھ دے گا۔

مبلّغین کو وصیّت

تحفّظ ختم نبوّت کے تمام مبلّغین کو امیر شریعتؒ نے اپنے مکان کی بیٹھک میں بلا کر حسبِ ذیل وصیّت فرمائی۔

"عزیزو! اسلام کی تبلیغ کانٹوں کا تاج پہننے کے مترادف ہے، جدھر منہ کرو گے مخالف ہی مخالف نظر آئیں گے، حتیٰ کہ ایسے ایسے مقامات سے گزر ہوگا اور مخالفت ہوگی، جہاں تمہارا گمان بھی نہیں پہنچ سکتا۔ اگر تم اس عزم پر پکے اور پختہ رہے تو کامیاب ہو جاؤ گے۔ (پھر تھوڑا مسکرائے اور فرمایا) احرار بظاہر کسی تحریک میں کامیاب نہیں ہوئے لیکن جس عزم کو لے کر اُٹھے اس پر ڈٹے رہے تو نتیجہ یہ ہے کہ آج برسرِ اقتدار آنے والا ہر گروہ احرار کے نام سے لرزتا ہے۔

۲۔ وعظ کرنے کے لیے جانے سے پہلے داعی سے کرایہ کبھی وصول نہ کرنا، اگر اتنا بھی کرو گے تو منہ کھائے گا، آنکھ شرمائے گی، حق بیان نہ ہوگا۔ (فرمایا) آمدورفت کا کرایہ گھر سے لے کر چلنا۔ تقریر د بیان کے بعد اگر داعی کچھ خدمت کرے تو اس کے سامنے شمار نہ کرنا۔ اور اگر کچھ بھی نہ دے تو اپنی زبان سے طلب بھی نہ کرنا، بلکہ چپکے سے ہنس مکھ واپس آجانا۔ (فرمایا) ساری زندگی میرا یہی عمل

رہا ہے۔ جب کہیں جانا ہوتا تو میں تمہاری اماں سے پوچھا کرتا تھا کہ مجھے فلاں جگہ وعظ کہنے جانا ہے کرایہ ہے؟ اگر ہوتا تو آمدورفت کا خرچ گھر سے لیکر چلتا۔

(فرمایا) کچھ بھی خدمت نہ کرنے والا اگر پھر بھی بُلالے اور دعوت دے دے تو جانے سے انکار نہ کرنا۔ (فرمایا) اب اگر پچھلی اور پہلی مرتبہ ہدیہ، حق الخدمت وغیرہ نہ مل سکنے کے سبب جانے سے رک جاؤگے تو للہیت نہ ہوگی بلکہ نفسانیت ہوگی اور داعی کے سامنے شمار کرنے سے روکنے میں یہ حکمت فرمائی۔ ہوسکتا ہے داعی غریب اور مفلس ہونے کے سبب حق الخدمت یا کرایہ بھی پورا نہ دے سکے۔ اس سے خود کو بھی تردد ہوگا اور داعی کے دل میں بھی ہوک اُٹھے گی۔ ہائے! میں غریب تھا نا، کہ کرایہ بھی نہ دے سکا اور اس سے اس غریب کے دل سے ایک آہ نکلے گی۔ لہٰذا یہ نصیحت یاد رکھنا کہ غریب کی آہ اور دل دکھانے کے ہر پہلو سے پرہیز کرنا۔ اگر ان باتوں پر عمل کروگے تو انشاءاللہ کبھی بھوکے نہیں رہوگے اور یہی باتیں دنیا و عقبیٰ کی فلاح و بہبود اور ترقی و سربلندی کا موجب ثابت ہوں گی۔

ذیابیطس اور فالج

انسان جب جوانی کے نشے میں ہوتا ہے تو اپنے جسم پر بھی رحم نہیں کھاتا، اس دور کی غلطیاں اور جسم سے ناانصافیاں جب بڑھاپے میں عَلَمِ بغاوت بلند کرتی ہیں تو انسان مختلف بیماریوں کا بہانہ کرتا ہے، حالانکہ ان بیماریوں کا موجب وہ خود ہوتا ہے ــــ امیرِ شریعت فرماتے ہیں:

"انسان کے اندر ایک مستقل سلطنت آباد ہے، دل و دماغ اس کے بادشاہ اور وزیر ہیں، جب یہ دونوں اپنی رعایا کو تنگ کرتے ہیں تو آخر کو بغاوت کا احتمال تو ہوگا! یہی میں نے بھی کیا ہے، میں نے اپنے جسم پر کوئی رحم نہیں کھایا، رات دن کا سفر، مسلسل دس دس بیس بیس گھنٹے تقریریں، بے وقت

کی خوراک، وہ بھی میزبان کی مرضی پر، یہاں سے فرصت ملی تو جیل خانہ، یہ کوئی سال دو سال کا عمل نہیں، بلکہ میری زندگی کے چالیس سال اس دشت کی سیاحی میں گذرے ہیں، ان حالات میں اپنی صحت کا گلہ میں کس پر کروں"۔

۱۶۔نومبر ۱۹۵۴ء کو نمازِ عشا کے لیے گھر میں وضو کر رہے تھے کہ دائیں جانب فالج کا ہلکا سا حملہ ہوا، ذیابطیس کی شکایت پیشتر سے چلی آ رہی تھی۔ فالج کے اس حملے نے اس بیماری کو بھی توانائی دے دی۔ حضرت امیر شریعتؒ کا اپنا بیان ہے کہ:

"جب مجھ پر فالج کا حملہ ہوا تو تمام جسم بیکار معلوم ہونے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اب موت کا وقت قریب آگیا ہے، چنانچہ میں نے کلمہ پڑھنا شروع کر دیا اور چارپائی پر جا کر لیٹ گیا، لیکن تھوڑی دیر بعد بیماری کا اثر زائل ہو گیا"۔

پھر بے اختیار آپ رونے لگ پڑے اور خوب روئے۔ اس دوران حضور خاتم الانبیا کی یاد ذہن میں آئی اور یہ شعر بار بار پڑھتے رہے ؎

اس وقت ترا مستی سے کیا حال ہوا ہوگا
جب تو نے یہ مئے ساقی شیشے میں بھری ہوگی

حج بیت اللہ کی دعوت

غلام شخصیت کا ہو یا سلطنت کا اس کی رائے اور مذہب اپنے آقا کے محکوم ہوتے ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ سو سالہ برطانوی سامراج کی غلامی نے برصغیر کے مذاہب کو اپنی سیاسی ضرورت کے تابع رکھا۔ اسلام جیسا عظیم فطرتی مذہب بھی ایک وقت آیا کہ انگریزی حکمرانوں کا پابند ہو گیا۔ مثلاً حج اسلام کے پانچ ارکان میں سے ہے۔ ایک مسلمان کو اللہ تعالیٰ اگر ہمت دیتے ہیں کہ وہ حج بیت اللہ کے لیے جا سکے۔ لیکن انگریز بطورِ حاکم ملک اپنی سیاسی ضرورت کے تحت انہیں اس کی اجازت نہیں دیتا، جیسے کہ دوسری جنگ عظیم میں ہوا، اسلام فوٹو اتروانے کی ممانعت کرتا ہے، لیکن غیر ملکی قانون کہتا ہے کہ حج کی درخواست کے ساتھ فوٹو کا ہونا لازمی ہے۔

ایسی ہی کچھ پابندیاں تھیں کہ امیر شریعتؒ نے ہمیشہ حج بیت اللہ جانے سے پہلوتہی کی حالانکہ بڑے بڑے رؤسا اور امرا نے دعوتیں دیں، لیکن طرح دیتے گئے، مگر اندر کی بات وہی تھی کہ جاؤں تو اللہ کے گھر کی زیارت کے لیے اور اجازت مانگوں فرنگی سے، یہ نہ تو میرا ضمیر گوارا کرتا ہے اور نہ ایمان اجازت دیتا ہے۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۵۴ء حاجی دین محمد (لاہور) نے امیر شریعتؒ کو حج بیت اللہ کے لیے دعوت دی۔ جواب میں فرمایا:

"حاجی صاحب! ارادہ تو ہے، مگر چاہتا ہوں کہ گھر کے تمام افراد ساتھ چلیں اور اس سفر میں کسی کی امدادی رقم شامل نہ ہو۔"

اس پر حاجی صاحب نے کہا: "آپ کا ارادہ ہے کہ آپ گھر بار سمیت وہاں چلے جائیں اور پھر واپس نہ آئیں، مگر اللہ تعالیٰ نے آپ سے اگر کوئی کام لینا ہوا تو ــــ؟

اس پر امیر شریعتؒ مسکرا دیے۔

رُوحانی صدمہ

منزل سے پیشتر کاروانِ منزل، سالارِ کارواں کو غبارِ کارواں میں لپٹا چھوڑ کر الگ راہ اختیار کرلے تو امیرِ کارواں پر کیا گذرتی ہے؟ اس کا اندازہ وہی کرسکتا ہے، جس کی کشتی طوفان میں ہو، اور پتوار موجوں کے تھپیڑوں سے ٹوٹ جائے، اور وہ بے دست و پا ہو کر رہ جائے۔

رہائی کے بعد راہنمایانِ احرار دسمبر ۱۹۵۴ء کے دوسرے ہفتہ ملتان امیر شریعتؒ کے مکان پر جمع ہوئے، تاکہ آئندہ کے لیے راہیں سوچ سکیں۔ حسین شہید سہروردی تحریک ختم نبوت کے دنوں احرار رہنماؤں کے قریب آچکے تھے۔ بناء بریں کچھ ممبران کی رائے تھی کہ احرار کو سہروردی سے تعاون کر لینا چاہیے، اس پر تین دن کی بحث کے بعد یہ فیصلہ ٹھہرا کہ مسٹر سہروردی پر اپنا مؤقف واضح کر دیا جائے، اگر وہ قادیانیوں کو اقلیت قرار دلوانے کے مسئلے پر ہمارے فیصلے سے اتفاق کریں۔ تو جماعت ان سے تعاون کے لیے تیار ہے۔ چنانچہ ورکنگ کمیٹی نے اس کام کے لیے شیخ حسام الدین اور ماسٹر تاج الدین انصاری کو کراچی بھیجا

احباب جواب کے منتظر تھے کہ ۱۲ دسمبر ۱۹۵۴ء کو اخبارات میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی۔

"کراچی ۱۹ دسمبر مجلس احرار کے سابق رہنما شیخ حسام الدین اور ماسٹر تاج الدین انصاری نے آج اعلان کیا ہے کہ انہوں نے جناح عوامی لیگ میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ انہوں نے ایک بیان میں کہا ہے کہ وہ مسٹر سہروردی سے بات چیت کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جناح عوامی لیگ میں شامل ہو کر جمہوریت کی خدمت کر سکتے ہیں، وہ عوامی لیگ کے سیاسی نظریات سے متفق ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ ملک کو مسٹر سہروردی کی خدمات کی ضرورت ہے، جو ایک تجربہ کار رہنما ہیں۔ جمہوریت کے قیام کے لیے انہوں نے بڑی قربانیاں دی ہیں۔

شیخ حسام الدین اور ماسٹر تاج الدین نے کہا ہے کہ ان کا یہ اقدام پارٹی کے کسی فیصلے کا نتیجہ نہیں ہے۔

مجلس احرار ۱۹۴۹ء میں سیاسیات سے علیحدہ ہو چکی ہے۔ انہوں نے اپنے دوستوں اور حامیوں سے اپیل کی ہے کہ وہ عوامی لیگ میں شامل ہو کر پاکستان اور جمہوریت کے لیے استحکام کے لیے کام کریں۔

(روزنامہ تعمیر، راولپنڈی۔ ۲۱ دسمبر ۱۹۵۴ء)

اسی اخبار میں یہ خبر بھی شائع ہوئی کہ حسین شہید سہروردی کو پاکستان کی کابینہ میں شامل کر لیا گیا ہے۔

اچانک ان راہنماؤں کے عوامی لیگ میں شامل ہونے کے اعلان نے احرار حلقوں کو پریشان کر دیا۔ نیز امیر شریعت نے جب یہ خبر پڑھی تو سر پکڑ کر بیٹھ گئے اور ایک سرد آہ کے ساتھ پنجابی زبان کے یہ دوہے بار بار دہراتے رہے۔ ؎

چھڈ کے مدان نس گئے جیہڑے کہندے سی مراں گے نال تیرے

(جن کا یہ دعویٰ تھا کہ ہم تیرے ساتھ مریں گے وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گئے)

یاری توڑ گئے بکریاں والے دو گھُٹ دودھ بدلے

(بکریوں کا دودھ دوہنے والے فقط دو گھونٹ دودھ کے لیے یارانہ توڑ گئے)

رفیقوں کی اس جدائی سے امیر شریعتؒ کو جو روحانی صدمہ ہوا۔ اسے انہوں نے مدتوں محسوس کیا۔ اس سلسلے میں جب کوئی سوال کرتا تو ہلکی سی آہ کے ساتھ زیر لب مسکرا دیتے۔

گو یہ لوگ بعد میں عوامی لیگ سے مایوس ہو کر دوبارہ مجلس احرار میں شامل ہو گئے۔ لیکن امیر شریعتؒ کے دل میں تادمِ واپسیں یہ کسک باقی رہی۔

۱۹۵۵ء یہ سال بھی پاکستانی سیاستدانوں کے لیے انقلابی سال تھا۔ صوبائی اور مرکزی حکومتیں صبح و شام تبدیل ہو رہی تھیں۔ مسٹر محمد علی بوگرہ جنہیں امریکہ سے بلوا کر پاکستان کے راج سنگھاسن پر بٹھا دیا گیا تھا، ملک غلام محمد گورنر جنرل پاکستان کے اشارہ ابرو پر رقص کناں تھے۔ اس سے پیشتر ۲۲۔ نومبر ۱۹۵۴ء کو ریڈیو پر اعلان کیا گیا کہ پورے مغربی پاکستان کو ایک وحدت کی شکل دے دی جائے گی۔ اس خبر نے صوبائی سیاستدانوں میں کھلبلی مچا دی اور سبھی کو اپنی لیڈری خطرے میں نظر آنے لگی، چنانچہ ایسی افراتفری پیدا ہوئی کہ حکمران لوگ اپنی کرسیوں کی حفاظت میں عوام سے غافل ہو گئے۔ نتیجتاً ملک میں جرائم بڑھنے لگے۔ مجرم ضمیر لوگ محلّے اور شہر کی عزت و آبرو کے ڈاکو بن گئے۔ یہی دن تھے کہ گجرات شہر میں حسین بی بی نامی ایک عورت اپنی عزّت کے ساتھ جان بھی گنوا بیٹھی۔ مظلوم اور معصوم عورت کے ساتھ رات کے اندھیرے میں کیا کچھ ہوا؟ پھر اس کا قتل کیوں کر ہوا؟ ان سوالوں کے جواب میں قانون آج تک خاموش ہے۔

گجرات کا دل مٹی کے برتنوں کی طرح خوبصورت ہے، لیکن سوہنی کے گھڑے کی طرح دریا کے عین درمیان فریب دے دیتا ہے۔

امیر شریعتؒ کو جب اس واقعہ کی اطلاع اخبارات کے ذریعہ ملی تو کچھ دیر خاموش رہ

کر فرمایا:" قانون اپنی ضرورت کے لیے چپ ہے، لیکن عصمت مآب خاتون کا بیگناہ خون آج نہیں تو کل ظالموں کی آپ نشاندہی کرے گا، اور وہ دامن جس پر حسین بی بی کا خون چمک رہا ہے، گجرات کے کوچہ و بازار میں رسوا ہو گا۔"

حکومت کی اپنی پالیسی میں جب تضاد ہو، تو ملک کی دوسری جماعتیں اپنے لیے کیونکر راہِ عمل متعین کر سکتی ہیں۔

پاکستان کے دانشوروں نے ۱۹۵۲ء کے بعد سے جو ڈرامہ شروع کر رکھا ہے اس میں تماشائی کے علاوہ کوئی کردار بہتر نہیں تھا۔ حضرت امیر شریعت تبلیغی اجتماعات کے علاوہ کسی دوسرے جلسے میں شمولیت سے اجتناب کرتے رہے، ویسے بھی ان کی صحت، بیماری جو بڑھاپے کے دوش پر آگے بڑھ رہی تھی اس کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ انہی حالات میں ایک دوست نے سوال کیا:" شاہ جی! آپ کو یہ مرض (ذیابطیس) کب سے ہے؟" جواب میں کہا

"سکھر جیل سے اس مرض نے رفاقت شروع کی تھی، اور اب تک سنگت نبھا رہا ہے۔ خیال ہے کہ کم بخت موت تک ساتھ دے گا۔"

ڈسٹرکٹ جج کیمبل پور

۱۹۵۳ء کے بعد تحریک مرزائیت کو ہر پاکستانی نے سمجھ لیا تھا، اور اس کے خود ساختہ فوائد جو فرنگی سانچے میں ڈھل کر حقیقتِ اسلام کی برابری کر رہے تھے افسانہ ہو کر عوام کے سامنے آ گئے تھے۔

ایک (مرزائی) عورت مسمات امتہ الکریم کا نکاح کیپٹن نذیر (مسلمان) سے ہوا۔ اس انکشاف پر کہ عورت کا مذہب اسلام نہیں ہے کیپٹن نذیر احمد نے اسے طلاق دے دی۔ اس پر عدالت میں مقدمہ چلا اور ۲۔ جون ۱۹۵۵ء کو شیخ محمد اکبر ڈسٹرکٹ جج کیمبل پور نے میاں محمد سلیم سول جج راولپنڈی کے سابقہ فیصلے کی تصدیق کر دی، کہ قادیانی مسلمانوں کا فرقہ نہیں، اس لیے قادیانی عورت کا نکاح مسلمان مرد سے نہیں ہو سکتا۔

گو اس سے پیشتر سیشن جج بہاولپور اور سیشن جج گورداسپور کے فیصلے عوام میں آ

چکے تھے، لیکن تقسیمِ ملک کے بعد ڈسٹرکٹ جج کیمبل پور کے فیصلے نے ۱۹۵۲ء کے واقعات کی تائید کر دی۔

حضرت امیر شریعتؒ کو جب اس فیصلے کی اطلاع ملی تو خوشی میں آنسو نکل آئے اور اسی وقت شکرانہ کے چار نفل ادا کیے اور ساتھ ہی کہا:

"سو سنار کی، ایک لوہار کی، میری گذشتہ محنت سے ممکن ہے مرزائیت پر اس قدر ضرب کاری نہ لگی ہو، جس قدر کیمبل پور کے ڈسٹرکٹ جج کے قلم نے مرزائیت کو فنا کر دیا ہے، کیونکہ یہ فیصلہ حکومت کے اپنے آدمی نے رائج الوقت قانون کے تحت دیا ہے۔ اب میرے کہنے کی بات نہیں، حکومت خود سوچے کہ سیشن جج کیمبل پور کے اس فیصلے کے بعد مرزائیت کے متعلق اس کی کیا پالیسی ہے۔"

رہائی کے بعد پہلی تقریر

مئی (۱۹۵۵ء) کے آخری پندرھواڑے میں سر فیروز خاں نون پنجاب کی وزارتِ عظمیٰ سے الگ کر دیے گئے تو حالات نے نئی کروٹ لی، پیشتر اس کے کہ آنے والے کل کو حالات مزید بگڑ جائیں۔ مرکزی مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت نے ۱۱ سے ۱۴ جون (۱۹۵۵ء) تک اپنا مرکزی اجلاس لائلپور میں بلانے کا فیصلہ کیا۔

تحریک ختم نبوت کے دنوں مولانا داؤد غزنوی کی زعمائے احرار سے ملاقات، جماعت اسلامی کے لیڈر مولانا مودودی کا اس تحریک میں کردار، احرار رہنماؤں کی عوامی لیگ میں شمولیت سے عوام میں اکثر غلط فہمیاں پھیل رہی تھیں، ان کی وضاحت کے لیے لائل پور کا اجلاس بڑی اہمیت کا حامل تھا۔

لائل پور میں ان دنوں دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ تھا لہٰذا اجلاس میونسپل حدود سے باہر پیپلز کالونی میں رکھے گئے اور آخری دن امیر شریعتؒ نے تقریر کی۔ تحریک ختم نبوت کے بعد امیر شریعتؒ کی یہ پہلی تقریر تھی۔ عوام اور حکام دونوں کے کان تقریر کے منتظر تھے۔

آئرلینڈ کے مشہور محبِ وطن مسٹر ڈی ویرہ کے متعلق یہ روایت ہے کہ ایک دفعہ تقریر کر رہے تھے اور پولیس نے انہیں دورانِ تقریر گرفتار کر لیا۔ دو سال کے لیے جیل بھیج دیے گئے۔ رہائی کا دن آیا تو پارٹی کو اطلاع دی کہ میں رہا ہو کر سیدھا اسی جگہ پہنچوں گا، جہاں سے گرفتار کیا گیا تھا۔ لہٰذا آپ جلسے کا انتظام وہیں کریں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

ہجوم منتظر تھا۔ مسٹر ڈی ویرا کار سے اترے اور جلسہ گاہ میں چلے گئے۔ انہوں نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔ "تو حضرات میں یہ عرض کر رہا تھا۔" گرفتاری کے وقت جہاں سے بات چھوڑی، دو سال کے تعطل سے بات میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔

حضرت امیر شریعتؒ کچھ دن گھر میں سستائے، تازہ دم ہو کر نئے سفر کے لیے پھر نکل کھڑے ہوئے، تو سب سے پہلے آپ نے اہلِ لائل پور کو خطاب کیا۔ خطبہ مسنونہ سے پہلے فرمایا:

"اٹلی کے مشہور فلاسفر مسٹر گلیلیو نے پہلے پہل یہ دعویٰ کیا کہ میں دیکھ رہا ہوں زمین متحرک ہے، اس پر اس وقت کے قانون والوں نے اسے مجرم قرار دے کر گرفتار کر لیا اور عدالت کے سامنے پیش کیا:

عدالت: کیا تم نے کہا ہے کہ زمین متحرک ہے؟

گلیلیو: ہاں! میں نے کہا ہے کہ زمین متحرک ہے۔

عدالت، تو پھر بطور سزا کے یہ زہر کا پیالہ پی لو!

گلیلیو نے زہر کا پیالہ اٹھایا اور منہ کے قریب لے جا کر پھر زمین پر رکھ کر عدالت سے مخاطب ہوا۔

"اگر میں یہ کہہ دوں کہ زمین متحرک نہیں تو پھر؟"

عدالت: تو پھر جا سکتے ہو۔

گلیلیو اٹھا اور عدالت کے دروازے تک جا کر پھر پلٹ کر کہنے لگا۔ "مجھے تو اب بھی زمین متحرک معلوم ہوتی ہے۔" یہ کہا اور زہر کا پیالہ پی لیا۔

امیر شریعتؒ اس قصّے پر مسکرائے اور فرمایا ارشاد خداوندی ہے۔ ما کان محمّد
ابا احد من رجالکم ولٰکن رسول اللہ وخاتم النّبیّین ۔ اور حدیث
رسول اللہ انا خاتم النّبیّین لا نبی بعدی کے بعد میں کیسے کہہ دوں
کہ کوئی دوسرا نبی آسکتا ہے۔ میری تو اب بھی یہی رائے ہے کہ حضورؐ خاتم الانبیا
ہیں اور ان کے بعد جو نبوّت کا دعویٰ کرے گا میں اسے انسان بھی کہنے کے لیے
تیار نہیں، میں تختہ دار پر بھی یہی کہوں گا کہ حضورؐ خاتم النبیّین ہیں، تمہارا قانون میرا
کیا بگاڑ سکتا ہے، اب رہ بھی کیا گیا ہے جو بگاڑو گے۔ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ
ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ بھی میاںؐ کی عزّت پر نثار ہو جائے تو جان چھوٹے۔"

اس کے بعد آپ نے خطبہ مسنونہ پڑھا اور فرمایا:

"مجھے آپ سے تین باتیں کہنا ہیں۔ پہلی یہ کہ جس دھندے کو ہم لے کر
بیٹھے ہیں، یہ کیا چیز ہے؟ مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں، کسی کے مکان کی
چھت ٹپکنے لگے تو اس نے اپنے مکان کو پچھلی طرف سے لیپنا شروع کیا۔ جب
لیپ کر فارغ ہوئے تو دیکھا یہ تو ہمسایوں کا ہی مکان لیپا گیا ہے۔ یہ آج
کی نئی بات نہیں، چودہ سو برس سے اُمّت اسی پر ڈٹی ہوئی ہے۔ اس وقت
دنیا کی آبادی میں مسلمان تقریباً پچھتر کروڑ ہیں۔ حضورؐ کے عہد سے لے کر اس
وقت تک کتنے پیوندِ خاک ہو گئے، ان میں کتنے صحابی، تابعی، ولی، غوث
قطب، فقیہہ، امام اور بزرگ گزرے۔ تمام امّت کے اولیاء لاکھوں صحابہ
سب اسی عقیدے پر ڈٹے رہے کہ حضورؐ کے بعد نبوّت کسی کو نہیں ملی،
کوئی ماں نہیں ہے جو نبی جنتی۔

اللہ ایک ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں، ہم سب اس کے محتاج ہیں یہ
بنیادی عقیدہ ہے، آمنہ کا بیٹا، عبداللہ کے گھر کا چاند، عبدالمطلب کا پوتا،

صدیق اکبرؓ اور عمر ابن خطابؓ کا داماد، عثمانؓ اور علیؓ کا خسر، حسینؓ کا نانا، فاطمہؓ کا ابا، جن کا نام نامی ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، جن کے بعد کوئی نبی نہیں، پچھتر کروڑ مسلمان اس وقت اس عقیدے پر کھڑے ہیں اور اربوں پیوندِ خاک ہو چکے ہیں۔ صاحبِ فکر و عمل، علم و ہمت، صاحب فہم و فراست پیدا ہوئے اور پیوندِ خاک ہو گئے، وہ سب اسی عقیدے پر قائم رہے۔

اللہ نے فرمایا، ہم نے آپؐ کو تمام آدمیوں کے لیے خوشخبری سنانے اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے، اور فرمایا کہ اے نبی! اعلان کرو کہ مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں اور جس زمانے میں بھی ہوں اور جب بھی ہوں زمین پر، چاند پر، مریخ پر، مشرق میں، المغرب میں، نیچے، اوپر، تحت السریٰ میں اعلان کر دیجئے اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کہ میں تم سب کی طرف پیغمبر بن کر آیا ہوں، جی چاہے مانو، جی چاہے نہ مانو، یہ ہے اصل عقیدہ۔

اب اگر قرآن میں خاتم النبیین کی آیات نہ بھی ہوں تو بھی یہ لفظ کافی تھا۔

عقیدہ عقد سے ہے، اور عقد کہتے ہیں دل کی گرہ کو — قرآن سینہ بہ سینہ حضورؐ سے صحابہؓ تک پڑھتے پڑھاتے ہیں وراثت میں ملا ہے۔ عقیدے کے بغیر عمل بھی نہیں ہوتا، برا ہو یا بھلا اور عشق کا نام ہی عقیدہ ہے۔ نماز کی فوقیت دل میں نہ ہو تو وضو کیوں کرے، توحید بڑی چیز ہے، لیکن ختم نبوّت اگر اس سے نکال دو تو یہ بھی کچھ نہیں رہتی، ماننے کو تو مکّے کے لوگ بھی خدا کو مانتے تھے، چاہے عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا اور یہودی عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا، کعبے میں تین سو ساٹھ خدا رکھتے تھے اور ننگے ہو کر طواف کعبہ کرتے تھے۔

جب اللہ کی رحمت جوش میں آئی تو اللہ کے گھر میں چاند نکلا، کعبہ میں

جھاڑ دی، "اللہ" کا نام بلند کیا اور فرمایا کہ تم یوں پڑھ چڑھ کر ان کو خدا بناتے ہو، یہ سب جھوٹے ہیں۔

نبوّت کا مقام تو بہت ہی بڑا مقام ہے، ذرا کیریکٹر تو دیکھو حیا کے مارے کبھی نگاہ نہیں اٹھی، یہ تو نبوّت کی بات تھی، میرے مرشد حضرت مولانا رائے پوری دس سال کے بعد ضلع سرگودھا میں اپنے گھر آئے تو بڑی حقیقی ہمشیرہ کو نہ پہچانا جب تک کہ انہوں نے بات نہ کی۔ حضرت فرماتے تھے کہ بچپن ہی سے میں نے انہیں نظر اٹھا کر نہیں دیکھا، یہ شرم و حیا کی بات ہے۔

ہم خدا کو جانتے ہی نہیں، محمدؐ کو جانتے ہیں۔ ابوجہل صدیق اکبرؓ کے پاس آیا اور کہا کبھی کوئی آسمان پر گیا ہے ۔۔۔؟ صدیق اکبرؓ نے فرمایا "نہیں"۔ ابوجہل نے کہا "تیرا یار کہتا ہے میں وہاں سے ہو آیا ہوں"۔ صدیق اکبرؓ نے فرمایا: "تو وہ سچ کہتا ہے۔ اس نے کبھی جھوٹ نہیں کہا"

پیتو سال کی بات ہے، ایک آدمی کی وساطت سے مرزائی عرب شریف چلا گیا تھا اور مدینہ میں جاکر مرزا کی نبوّت کی تبلیغ کی۔ میں اس شخص کا نام نہیں لیتا جس کی وساطت سے مرزائی گیا۔ میں نے اس سے آج تک کلام نہیں کی اور نہ کروں گا۔ یہ مرزائیوں کا تبلیغی نظام ہے۔

میں اکتوبر ۱۹۲۳ء میں رہا ہو کر امرتسر آیا تو معلوم ہوا مولوی نور احمد مرحوم نے قادیان میں جلسہ کیا۔ بہت سے علماء کرام آئے اور وعظ کر کے چلے گئے تب ہم نے فکر کی کہ یہ انفرادی تبلیغ جماعتی تنظیم کے مقابلے میں کچھ نہیں، جماعت کا مقابلہ جماعت سے ہونا چاہیے۔

۱۹۳۱ء میں ہم نے سوچا، حضور علیہ السلام کی نبوّت کو مٹانے کا نظام بن رہا ہے، تب سے جماعت بنی اور اس کا شعبہ تبلیغ مقرر ہوا، جس کا تعلق

ملک کے سیاسی معاملات سے نہیں تھا۔

اسلام کی بنیاد مسئلہ ختم نبوّت پر ہے۔ جب حضور نے فرمایا لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ لَا رَسُوْلَ بَعْدِیْ وَلَا اُمَّتَ بَعْدَکُمْ شروع سے لے کر آج تک اور آج سے لے کر حشر کے گرم ہونے تک کوئی نہیں جو عقیدہ بدلے، ہم اس کو لے کر اٹھے ہیں، اس کا کسی ملکی معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔

بعض لوگوں کو شک ہے کہ ہم اس تحریک میں حکومت کے سامنے جھک گئے ہیں، ارے تم ہمیشہ انگریزوں کے سامنے جھکتے رہے ہو، تو ہم اگر مسلمان حکومت کے سامنے جھک گئے تو کیا ہوا، ارے ایرے اپنے میرا ساتھ چھوڑ گئے تو میں کسی کو کیا کہوں، آپ کسی پارٹی میں چاہیں جائیں، لیکن ادھر بھی توجہ رکھیں۔

اگر آپ کی سمجھ میں میری بات نہیں آتی تو سر ظفر اللہ سے ہی سمجھ لو، وہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل سے لے کر پاکستان کی وزارتِ خارجہ تک جہاں رہا، قادیان نہیں چھوڑا۔ آپ کو سرکار کا ملازم ہو کر تحفظ ختم نبوّت سے شرم کیوں آتی ہے؟ سو دفعہ جاؤ عوامی لیگ میں یا مسلم لیگ میں، لیکن تمہاری جوانیوں کا صدقہ تحفظ ختم نبوّت کی طرف بھی نگاہِ کرم ڈالتے رہو۔

کفر کا پروگرام کوئی آج کا نہیں ہے، جب سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے، تب سے مسیلمہ کذاب پیدا ہونے شروع ہو گئے حضرت ابوبکرؓ نے سات ہزار حافظِ قرآن صحابہ کو ختم نبوّت کی خاطر شہید کروا دیا تھا۔

کہتے ہیں نتیجہ کچھ نہیں نکلا، ارے نتیجہ تو نکل آیا۔ راولپنڈی کے سیشن جج کا فیصلہ تمہارے سامنے ہے۔

تحریک ختم نبوّت میں جو کچھ ہوا، اس کا میں اکیلا ذمّہ دار ہوں، تمام ذمہ داری میرے سر ہے، اور قیامت تک اس مسئلہ پر جس قدر لوگ مریں گے اس کی ذمّہ داری

بھی میرے سر رہے گی۔ میں مودودی نہیں ہوں کہ بددیانت ہو جاؤں۔ مجلس عمل کے اجلاس کراچی میں مودودی صاحب میرے زانوں کے ساتھ زانوں لائے بیٹھے تھے۔ ریزولیوشن میرے جانے سے پہلے پاس ہو چکا تھا، میں کیا کروں کسی کی کتابوں کو اور لٹریچر کو۔

میں اس سے پہلے اجلاس میں نہیں گیا تھا۔ دوسرے دن (مولانا) محمد علی میرے پاس آئے، اور کہا کہ آج تم چلو۔ میں نے کہ جو پاس کرنا ہے کرو میں عمل کروں گا۔ جب گیا تو داؤد غزنوی کے پاس جا بیٹھا، مودودی بھی پاس بیٹھے تھے، انہوں نے مجھے اپنے دائیں طرف جگہ دی، محمد علی (جالندھری) لوگوں سے دستخط کرا رہے تھے اور میرا نام بھی لکھوایا، ان کا نام بھی لکھا۔ آج وہ (مودودی) کہتے ہیں میں تحریک میں شامل نہیں تھا۔ میں کہتا ہوں شامل تھا۔ اگر مودودی شامل نہیں تھا تو میں ان سے حلفیہ بیان کا مطالبہ نہیں کرتا ہوں، بلکہ صرف یہ مطالبہ کرتا ہوں کہ وہ اپنے لڑکوں کے سروں پر ہاتھ رکھ کر اعلان کر دیں کہ میں شامل نہیں تھا۔ ورنہ میں اعلان کرتا ہوں کہ میں ذمہ دار ہوں، میں تحریک میں شامل تھا۔ ارے جو تحریک میں شامل تھا اس نے سال بھر جیل کاٹی اور جو نہیں شامل اس نے دو سال کاٹی۔ جب میں رہا ہونے لگا۔ تو ڈیوڑھی میں آکر مودودی نے کہا کہ جنہوں نے تقریریں کیں، وہ رہا ہو گئے اور جنہوں نے فقط سر ہلایا وہ پھنسے رہے، یہ ہے دیانت! ہزاروں شہید ہوئے، ماؤں کے سہاگ لٹے، کئی یتیم ہوئے، کئی اجڑ گئے"

آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے:

"اللہ! میں ذمہ دار ہوں، آج بھی ذمہ دار ہوں اور آنے والے کل کو بھی ذمہ دار ہوں گا، میں نے یہ سب کچھ تیرے نبی کے نام کی خاطر کیا تھا۔

ہزاروں کو مروا کر کہہ دوں کہ میں شامل نہیں تھا، کیا یہی دین ہے ؟ کیا
کروں علم کو اور ادب کو، میرا کلیجا پھٹتا ہے۔ میں بولنے پر آؤں، تو ادھار کیوں
رکھوں۔ ارے تم سے کافر گلیلیو ہی اچھا تھا جس نے زہر کا پیالہ پی لیا۔
جو ہوتا ہے ہونے۔ اللہ تعالےٰ ہم سے غلط قدم نہ اٹھوائے۔ کیا جیل
میں مَیں نے وہ بیان نہیں دکھایا جس پر سلطان احمد کے دستخط موجود ہیں،
جب کہا تو کہنے لگا یہ اصلاح کے لیے کیا تھا۔
رہی مولانا داؤد غزنوی کی بات کہ وہ مجھ سے جیل میں ملے تو اتنی ہی بات
کہہ کر ختم کرتا ہوں لعنۃ اللہ الا الکاذبین، وہ نیک آدمی ہیں، خدا جانے کسی
سیاسی مصلحت کی وجہ سے (ملک صاحب فیروز خاں نون وزیر اعلیٰ مغربی پاکستان)
نے ان سے یہ کام لیا ہے، اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائے۔
خدا میری بھی لاج رکھے جو کیا ہے اور جو کر رہا ہوں اسی پر قائم رکھے آمین"۔
جلسہ رات سوا دو بجے ختم ہوا۔ حاضری ڈیڑھ لاکھ کے قریب تھی۔
اسی موضوع پر امیرِ شریعتؒ نے سارے مغربی پاکستان میں تقریریں کیں، جس سے
غلط فہمیوں کے بہت سے بادل چھٹ گئے۔ چنانچہ اسی طرح کا اجتماع گوجرانوالہ میں بھی
ہوا۔ شیرانوالہ باغ عوام سے بھرا ہوا تھا۔ جیسے ہی امیرِ شریعتؒ تقریر کے لیے کھڑے ہوئے
مغرب کی جانب سے کالی گھٹائیں اٹھیں "یار بالیں پہ جو آیا تو قضا بھی آئی"۔ عوام کا
اضطراب بڑھا۔ دو طوفان آمنے سامنے کھڑے تھے۔ بادل اور بخاریؒ دیکھیں کس
کی جیت ہوتی ہے۔
امیرِ شریعتؒ نے عوام سے سوال کیا۔
"کیوں بھئی کیا ارادے ہیں ؟ اگر بارش سے ڈر کر بھاگ جانا ہو تو ابھی
کہہ دو۔ ورنہ بخاری تو کھڑا ہے۔ حالانکہ میں اس وقت بخار سے ہوں"۔

اس پر عوام نے بیک زبان کہا "ہم بیٹھیں گے شاہ صاحب!" بس پھر کیا تھا، بارش بھی ہو رہی تھی اور امیر شریعتؒ بھی برس رہے تھے۔ ایک رضاکار امیر شریعتؒ پر چھاتہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ آپ نے غصے میں کہا۔

"کتنے چھاتے لاؤ گے میاں! یہ جو سامنے انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے، ان میں جان نہیں؟ یا تو ان کے لیے بھی چھاتے لاؤ، ورنہ بیٹھ جاؤ۔"

آخر موسلا دھار بارش کا پانی عوام کی کمر تک آن پہنچا، مگر اس پر بھی لوگ اسی طرح جمے رہے، جیسے ان کے سروں پر پرندے بٹھا دیئے گئے ہوں۔ جب عوام پانی میں تیرنے لگ پڑے تو امیر شریعت نے کہا:

"بس بھائی! اب میں آپ کا اور امتحان نہیں لیتا، یہ بھی ایک ریکارڈ رہے گا میری زندگی کا۔"

انہی دنوں مریدکے ضلع شیخوپورہ میں دورانِ تقریر کہا:

"اگرچہ اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں، مگر اپنے مقصد کے لیے اب بھی جوان ہوں۔"

اِسی سفر میں ایک ذمہ دار پولیس افسر نے سوال کیا "شاہ جی! اجازت ہو تو ایک بات پوچھوں؟"

"ہاں بیٹا! کیوں نہیں۔"

"دوسری جماعتوں کے سیاسی اور مذہبی رہنما آئے دن مختلف شہروں میں آتے رہتے ہیں، مگر حکومت کی طرف سے ہمیں کوئی ایسی ہدایت نہیں ملتی کہ ہم ان کو واچ کریں لیکن جیسے ہی آپ کسی شہر میں پہنچتے ہیں۔ ایک دم سے تاریں ہلنے لگتی ہیں۔ یہ کیوں؟"

آپ نے برجستہ کہا:

"بھائی! جب کوئی ہیجڑا گھر میں آجائے تو کوئی عورت اس سے پردہ نہیں

کرتی، مگر جیسے ہی کوئی مرد آجائے تو تمام گھر میں پردہ پردہ کا شور مچ جاتا ہے۔"

اس پر متعلقہ افسر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

وصیت
مولانا محمد علی جالندھری جو ان دنوں مجلس تحفظ ختم نبوت کے ناظم اعلیٰ تھے، اور شب و روز سفر پر رہتے تھے، جیسے کہ اب بھی ہیں، مولانا کی انتھک مصروفیت دیکھ کر امیر شریعتؒ نے انہیں وصیت کی اور ناراض ہوئے۔

"بھائی محمد علی تم میری ریس نہ کیا کرو، میرے پر اللہ کی خاص رحمت ہے تم زیادہ سے زیادہ پانچ سال اس طرح چلو گے اور پھر ختم ہو جاؤ گے یا کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا ہو جاؤ گے، جبکہ مجھے چالیس برس ہو چکے ہیں سفر کرتے اور میں نے اپنے جسم سے دغا نہیں کی، جس کی وجہ سے اب مر رہا ہوں۔"

سیاسی انتقام
مسلم لیگ کی اندرونی کشمکش پاکستان کے عالمی وقار پر بھی اثر انداز ہوئی۔ یہ وقار ہر آن ہونے والے واقعات کے ساتھ اس قدر اپنا اعتماد کھو بیٹھا کہ اپنی ساری سچائی کے باوجود غیر ممالک میں پاکستان کی تجارتی ساکھ کو بھی نقصان پہنچا۔ محمد علی بوگرہ کے بعد چودھری محمد علی وزیر اعظم بنا دیے گئے۔ نئے وزیر اعظم مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی جماعت سے دلی لگاؤ رکھتے تھے، ان دنوں پاکستان کی خارجہ پالیسی امریکہ اور برطانیہ کے ہاتھوں میں تھی۔ غیر ملکی سامراج تمام امور اپنی مرضی سے حل کر رہا تھا۔ اس طرح جماعت اسلامی اور چودھری محمد علی کا گٹھ جوڑ بڑی آسانی سے سمجھ میں آ رہا تھا۔

حضرت امیر شریعتؒ نے اپنی حالیہ تقریروں میں جماعت اسلامی کے لیڈر کو اس بُری طرح تاڑا کہ چودھری محمد علی نے ۱۰ اگست کو اقتدار پر آتے ہی اس کا انتقام لینا شروع کر دیا۔ چنانچہ ۱۱ ستمبر ۱۹۵۵ء کو حضرت امیر شریعتؒ سے ایک نوٹس کی تعمیل کرائی گئی کہ:

"۱۴ ستمبر کو آپ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ملتان کی عدالت میں حاضر ہوں۔"

مولانا محمد علی جالندھری سے بھی اسی طرح کے نوٹس کی تعمیل کرائی گئی۔

ان احکام کی تعمیل کے سلسلے میں امیر شریعتؒ جب عدالت میں گئے تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے صرف اتنا کہا کہ "آپ اپنی تقریروں کا لہجہ نرم رکھیں" اور بس!

امیر شریعتؒ نے مسکراتے ہوئے یہ حکم سنا اور عدالت سے باہر چلے آئے۔ کاروانِ حریت بدستور چلتا رہا۔ لیکن جولائی ۱۹۵۶ء میں امیر شریعتؒ کو ملتان کی میونسپل حدود میں نظر بند کر دیا گیا۔

اس طرح امیر شریعتؒ کی تمام مذہبی سرگرمیاں کچھ وقت کے لیے رک گئیں۔

یہ نظر بندی امیر شریعتؒ کے لیے کارآمد ثابت ہوئی کہ ان دنوں وہ اپنی بیماری کے علاج میں یکسوئی سے مصروف ہو گئے، لیکن دلِ بیقرار کو چین کہاں۔ دل بیماری میں اور دماغ حق کے راستے میں حائل دیواروں کو توڑنے کی فکر میں رہا۔

ان دنوں مرکزی اور صوبائی سیاست کے گھوڑے سرپٹ دوڑ رہے تھے سکندر مرزا گورنر جنرل بن چکے تھے اور ڈاکٹر خاں صاحب مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ۔ ان دونوں کے درمیان چودھری محمد علی کی وزارت دو خاوندوں کے درمیان بیوی کی طرح وقت گزار رہی تھی۔ اس کشمکش میں دم توڑتی ہوئی تحریک ختم نبوت کی صدائے بازگشت کبھی کبھار امیر شریعتؒ کی تقریروں سے سنائی دیتی رہی۔ اقتدار پسند سیاستدان بھی اس سے غافل نہیں تھے۔ چنانچہ ۱۴۔ اپریل ۱۹۵۶ کو خانیوال (ضلع ملتان) کی ایک تقریر کی بناء پر امیر شریعتؒ کو سیفٹی ایکٹ کی دفعہ ۲۱ کے تحت گرفتار کر لیا گیا، اور اسی روز نوابزادہ عبدالرحیم ڈپٹی مجسٹریٹ ملتان نے تین ہزار روپے کی ضمانت پر آپ کو رہا کر دیا۔

یہ مقدمہ چودھری غلام مرتضیٰ کی عدالت میں ۲۔ جولائی کو شروع ہونا تھا، مگر ملتان میں نظر بندی کے باعث امیر شریعتؒ عدالت میں حاضری سے قاصر رہے۔

یہ مقدمہ ہنوز شروع نہیں ہوا تھا کہ ۲۹۔ جون ۱۹۵۶ء کو سیفٹی ایکٹ کی دفعہ ۲۱ کے تحت دوسری گرفتاری کے وارنٹ بھی آن پہنچے۔ یہ گرفتاری جلال پور پیر والا (ضلع ملتان) میں ۹۔ اور ۱۰۔ مارچ ۱۹۵۶ء کی درمیانی رات کو ایک تقریر کی بناء پر عمل میں آئی۔ یہ مقدمہ

راجہ محمد ایوب کی عدالت میں شروع ہوا۔ امیر شریعتؒ اپنی پیرانہ سالی، بیماری اور جون کے تپتے ہوئے موسم میں مقررہ تاریخ پر احاطۂ عدالت سے باہر جا بیٹھتے اور مشتاقانِ دیددن بھران کے گرد جمع رہتے۔

امیر شریعتؒ کی نظر بندی اور گرفتاریوں کے خلاف سارے پاکستان میں احتجاجی اجتماع ہوئے۔ اخبارات نے نوٹ لکھے۔ جلسوں میں مختلف سیاسی اور مذہبی جماعتوں نے رہائی کا مطالبہ کیا۔

اس دور میں مرکزیہ مجلسِ تحفظ ختمِ نبوت نے امیر شریعتؒ کی سرپرستی میں روزنامہ "نوائے پاکستان" کو از سرِ نو چلانے کا فیصلہ کیا۔ اس موقع پر امیر شریعتؒ نے حسبِ ذیل الفاظ میں اس اخبار کا خیر مقدم کیا۔

> "نوائے پاکستان" جن عزائم و مقاصد کو لے کر اپنا دورِ جدید شروع کر رہا ہے میں ان عزائم و مقاصد کی کامیابی کے لیے بارگاہِ رب العزت میں دعا کرتا ہوں۔
>
> ہمیں ملک کے سیاسی بکھیڑوں میں الجھنے اور پھنسنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے پیشِ نظر صرف ایک ہی موقف ہونا چاہیئے اور وہ حضور ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا تحفظ۔ اس کے علاوہ جو باتیں ملحوظ رکھنی ضروری ہیں۔ وہ پاکستان کی عمومی خدمت اور جمہور المسلمین کو ان گمراہیوں سے نکالنا ہے جو ان کے عقائد و اعمال میں جڑ پکڑ چکی ہیں۔
>
> ان الفاظ کے ساتھ میں "نوائے پاکستان" کی کامیابی کیلئے دعا گو ہوں۔"

یہ ۳۔ جولائی ۱۹۵۶ء کا واقعہ ہے۔

رہائی پابندی کے سرکاری احکام کو لاہور ہائی کورٹ میں اس موقف کے تحت چیلنج کیا گیا۔

اسلامی مملکت کے کسی باشندے کی نقل و حرکت پر پابندی عائد نہیں
کی جاسکتی اور نہ ہی اسے کسی خاص علاقہ میں پابند کیا جاسکتا ہے۔
لہٰذا عدالت عالیہ حکومت کے نام نوٹس جاری کر کے ہر دو رہنماؤں (مولانا
سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا محمد علی جالندھری) کی نقل و حرکت پر سے
پابندی اٹھانے کے احکام جاری کرے۔"

ہائی کورٹ میں اس مقدمے کی پیروی کے لیے میاں محمود علی قصوری ایڈووکیٹ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ مقدمہ ابھی ابتدائی مراحل میں تھا کہ ۱۲۔جولائی ۱۹۵۶ء کے اخبارات میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی۔

"ڈاکٹر خاں صاحب وزیر اعلیٰ مغربی پاکستان نے امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ
بخاری پر عائد کردہ تمام پابندیاں اٹھالیں۔ حکام نے یہ قدم حضرت امیر شریعتؒ
کی خرابیٔ صحت کی بناء پر اٹھایا ہے۔"

لیکن مقدمات بدستور قائم رہے۔

ان دنوں امیر شریعت کی صحت خاصی کمزور ہو چکی تھی۔ رات کو اکثر بے خوابی رہتی۔ بھوک کی کمی، اختلاج قلب اور تبخیر کی بھی شکایت تھی۔ اس موقع پر اکثر احباب صحت کے بارے میں پوچھتے تو بڑی سادگی سے فرماتے:

"بھائی! اب طبیعت ہی نہیں ہے، حال کیا بتاؤں! کل جگر مرادآبادی
کی غزل ان کے بیاض میں پڑھی تو تین شعر یاد ہو گئے تھے۔۔۔"

وہ اٹھتا ہوا اک دھواں اوّل اوّل
وہ بجھتی سی چنگاریاں آخر آخر

قیامت کا طوفاں وہ صحرا میں اوّل
غبارِ رہِ کارواں آخر آخر

چمن میں عنادل کا مسجود اوّل
گیاہِ رہِ گلِ رخاں آخر آخر

امیر شریعت کی صحت مندرجہ بالا اشعار سے واضح ہے۔

امیر شریعت کا ان دنوں لاہور آنے کا ارادہ تھا تاکہ طبّی مشورہ لیا جا سکے لیکن نظر بندی کے علاوہ جلال پور پیروالا اور رخانیوال کے مقدمات راستہ روکے ہوئے تھے۔

مخلوط انتخاب سیاسیات میں جھوٹ بولنا، فریب دینا اور فریب کھانا، کسی قانون کی زد میں نہیں آتا۔ سیاستدانوں کی ساری زندگی انہی پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے گذر جاتی ہے اس راستے میں وادیٔ خارزار بھی ہے اور لالہ وگل کی بزم آرائیاں بھی۔

سیاست میں ضرورت کے لیے حرام کو حلال قرار دے لینا بھی جرم نہیں ہے ۱۹۴۰ء سے پیشتر کے سیاسی موڑ پر نظر ڈالی جائے تو ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ اگر ملکی ضرورت کے باعث نیشنلسٹ مسلمانوں کے لیے درست تھا تو رجعت پسند اور ٹوڈی مسلمانوں کے لیے سم قاتل۔ انگریز حکمران آخرالذکر طبقہ کا پشت پناہ تھا۔ مخلوط انتخاب کے ذریعے ہندو مسلمان اتحاد کی دیواروں کو استوار کرنا ان کے نزدیک سور کے گوشت کو حلال قرار دینے کے مترادف تھا اور ایسا مسلمان مسلم لیگ کے نزدیک بھی گردن زدنی تھا جس نے آزادیٔ وطن کے لیے مخلوط طرز انتخاب کا سلوگن (SALOGAN) دیا۔ تقسیم ملک کے بعد مسٹر حسین شہید سہروردی نے بطور وزیر اعظم پاکستان جب نیشنلسٹ مسلمانوں کے منہ کا جھوٹا نوالہ خود کھانا چاہا اور پاکستان میں مخلوط انتخاب رائج کر لینے میں اپنے کو حق بجانب قرار دیا تو وہ لوگ جن کے نزدیک گزرے ہوئے کل، یہ نعرہ جرم تھا آج وہی سہروردی کے ہمنوا تھے، کیونکہ آج انہیں اس کی ضرورت تھی۔

شہید سہروردی نے یہ نعرہ مشرقی پاکستان کے غیر مسلموں کے ووٹ حاصل کرنے کے لیے لگایا تھا لیکن مغربی پاکستان کی سیاست بالکل جدا تھی۔ ۱۹۵۳ء کی مرزائی اور مسلمان کشمکش نے عوام کے دلوں میں یہ شبہ ڈال دیا کہ ۱۹۵۰ء کے انتخاب میں چونکہ آٹھ مرزائی بری طرح ناکام

رہے تھے، حالانکہ مسلم لیگ نے انہیں اپنا نمائندہ منتخب کیا تھا۔

اب مخلوط انتخاب کے ذریعے انہیں اسمبلی میں لانے کے لیے چور دروازہ کھولا گیا ہے، یہ بحث سارے ملک میں جاری تھی کہ الجزائری رہنماؤں کا ایک وفد علامہ بشیر الابراہیمی کی قیادت میں پاکستان کے دورے پر آیا۔

ملتان کے معزز شہریوں کے علاوہ مجلس تحفظ ختم نبوّت نے بھی انہیں استقبالیہ دیا، اس موقعہ پر حضرت امیر شریعتؒ نے مترجم کے ذریعہ وفد کے لیڈر سے گفتگو کی، اور الجزائر کی آزادی کے لیے لڑنے والے مجاہدین کو خراجِ تحسین پیش کیا، نیز الجزائری رہنماؤں کی درازیٔ عمر کے لیے دعا کی۔

متحدہ ہندوستان میں انگریزی دورِ اقتدار میں غلام ہندوستانیوں پر تشدّد کا ذکر کرتے ہوئے اقوامِ یورپ کی مختلف سیاسی چالوں کا وضاحت سے ذکر کیا، اور قادیانیوں کی غیر ملکی سرگرمیوں سے بھی الجزائری رہنماؤں کو خبردار کیا۔

لاہور میں آمد

حالات کی ناسازگاری، جسمانی کمزوری اور دماغی پریشانی کے باعث امیر شریعتؒ پر ان دنوں فالج کا ایک اور ہلکا سا حملہ ہوا، جس کے اثرات گو دیرپا نہیں تھے تاہم پریشان کن ضرور تھے، اس کے نتیجے میں امیر شریعتؒ نے لاہور آنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ پابندیاں ختم ہوتے ہی اگست کے پہلے پندھواڑے میں بذریعہ کار بغرض علاج لاہور تشریف لے آئے اور بادامی باغ میں حاجی دین محمد کے ہاں ٹھہرے۔

گو بیماری کی وجہ سے بے حد کمزور تھے، مگر زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ملنے والوں کا استقبال خندہ پیشانی سے کرتے۔ اس دوران آپ نے دوستوں سے معذرت کے انداز میں کہا:

"بیماری کے متواتر حملوں اور نحیفی کی وجہ سے اکثر احباب کے خطوط کا جواب نہیں دے سکا، لہٰذا میں ان تمام احباب کا ممنون ہوں جو میری

بیمار پرسی کے لیے خطوط لکھتے رہے۔ ان تمام کو میری صحت کے لیے دعا کرتے رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اسلام کی مزید خدمت کے لیے تندرستی عنایت فرمائے۔"

ملتان کے حکیم عطاء اللہ مریض اور مرض دونوں سے آشنائی کے بعد علاج کے عادی ہیں۔ امیر شریعتؒ سے انہیں دلی لگاؤ تھا۔ حکیم صاحب کی طبیعت کی پاکیزگی کی وجہ سے امیر شریعتؒ بھی ان کے معترف تھے۔ لیکن "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" تو دوستوں کے اصرار پر لاہور آ گئے۔ یہاں سب سے پہلے شفاء الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کے پوتے حکیم نبی جمال سویدا کا علاج شروع کیا ——— ایک ہفتہ علاج سے جب .... افاقہ نہ ہوا، تو ڈاکٹر کرنل محمد ضیاء اللہ کا علاج شروع کیا۔ ایک روز امیر شریعتؒ نے ڈاکٹر سے سوال کیا؛ "آپ کی تشخیص نے مرض سے متعلق کیا فتویٰ دیا ہے؟"

کرنل ضیاء اللہ نے یاس و نا امیدی کے لہجے میں کہا،

"شاہ جی! اب آپ اپنا کوٹہ ختم کر چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دو سو سال زندگی عطا کی تھی، جسے آپ نے پچاس سالوں میں ختم کر لیا۔ اب تو کوشش ہی ہے۔"

مشاطۂ فطرت نے حضرت امیر شریعتؒ کو کچھ اس انداز سے سنوارا تھا کہ وہ جہاں بیٹھ جاتے، بہاریں ان کے قدم لیتیں، کئی انجمنیں ان کے اپنے وجود میں تھیں۔ وہ مسکراتے تو آسمان سے بجلیاں کوندتیں، ان کی پیشانی پر بل آ جاتا، تو سلطنتیں کانپ اٹھتیں۔ ستارے رات بھر قندیلیں لیے ان کی محفل میں بیٹھنا سعادت سمجھتے۔ ویرانوں میں اگر وہ شمع دل فروزاں کرتے، تو پروانے وہاں بھی آ موجود ہوتے ؎

حُسنِ بے پروا کو اپنی بے حجابی کیلئے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن

اہلِ لاہور کو جب اطلاع ہوئی کہ امیرِ شریعتؒ بغرضِ علاج یہاں آئے ہوئے ہیں، تو دن بھر احباب کی آمد و رفت سے ایک میلہ لگا رہتا۔ گو مرض کے لیے یہ ہجوم مفید نہیں تھا، لیکن مریضِ محبّت کے ہاتھوں مجبور تھا کہ دوست اور دشمن کا استقبال کرے۔ آخر ڈاکٹر کے مشورے پر عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت ٹھہرا لیا گیا۔ جیسے جیسے مرض سنبھالا لیتی گئی، مریض آپ سے آپ سنبھلتا چلا گیا۔ حضرت مولانا احمد علیؒ لاہوری روزانہ عصر کے بعد تشریف لاتے اور امیرِ شریعتؒ کے دل پر کافی دیر تک ہاتھ رکھ کر دم کرتے، اس دوران امیرِ شریعتؒ کا گریبان کھلا رہتا۔

نمازِ عصر کے بعد جو محفل لگتی ان میں شیخ حسام الدین، ماسٹر تاج الدین انصاری، مولانا ابوالحسنات مظفر علی شمسی اور ان کے علاوہ شعرائے کرام، ادیب، صحافی اور کاروباری حضرات کا ہجوم بھی رہتا۔

اسی طرح کی ایک مجلس میں مولانا ابوالحسنات نے سوال کیا:

"شاہ جی! آپ کو میٹھا پسند ہے یا نمک؟"

امیرِ شریعتؒ: "جو چیز میرے رب کو پسند ہو۔"

مولانا ابوالحسنات: "رب کو تو پھر میٹھا زیادہ پسند ہے۔"

امیرِ شریعتؒ: "اگر میٹھا پسند ہوتا تو پہاڑ نمک کے نہ بنائے ہوتے۔"

اس پر تمام مجلس میں قہقہہ بلند ہوا۔ ایک دوسری مجلس میں سوال ہوا۔

"پردہ اسلام میں کیوں رائج ہے؟"

امیرِ شریعتؒ نے تھوڑی دیر چپ رہ کر فرمایا:

"میاں بیوی کے درمیان رغبت کو مزید بڑھانے کے لیے پردہ رائج کیا گیا ہے۔ اگر بے حجابی عام رواج پکڑ جاتی تو میاں بیوی کے درمیان محبت کا سلسلہ ہی ختم ہو جاتا۔"

مخدوم محترم حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری (امیرِ شریعتؒ کے مرشد) ان دنوں لاہور ہی میں تشریف فرما تھے، انھیں جب اطلاع ہوئی تو ملنے کے لیے خود تشریف لائے۔ پیر اور

مرید کے مابین کافی دیر محفل رہی۔حضرت لاہوریؒ بھی اس مجلس میں موجود تھے۔امیر شریعتؒ نے دونوں حضرات سے دعا کے لیے درخواست کی،تو حضرت رائےپوری نے فرمایا:"آپ کے لیے دعا نہیں کریں گے شاہ جی!تو اور کس کے لیے کریں گے؟آپ تو ہمارے لیے آخرت کا سرمایہ ہیں"۔یہ سن کر امیر شریعتؒ زاروقطار رونے لگے،اور کافی دیر روتے رہے۔اس دن کی یہ مجلس آنسوؤں کے طوفان میں بہہ گئی۔

شیخوپورہ کے کچھ دوست ملنے آئے تو ان سے گفتگو طویل ہو گئی۔اس دوران حضرت انور شاہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کا ذکر آ گیا،تو امیر شریعتؒ نے رقت انگیز لہجے میں کہا:

"مولانا سید انور شاہ صاحب اپنے دور کے بہت بڑے محسن تھے اور ان کی زندگی اسلاف کی جیتی جاگتی تصویر تھی"۔

اس گفتگو کا رخ مڑ کر جب شیعہ سنی مناقشات کی طرف آیا تو امیر شریعتؒ نے ایک آہ بھر کر کہا:

"قوم کن راستوں پر چل نکلی ہے!جب میں ایسی باتیں سنتا ہوں،تو رات رات بھر سوچتا رہتا ہوں،کہ آخر کیا بنے گا؟کیونکہ اس ملک کا اور خود مسلمانوں کا فائدہ ان کے باہمی اتحاد میں ہے،اور صحیح اسلامی نظریات بھی تبھی ہمہ گیر ہو سکتے ہیں"۔

ایک دن مولانا ابوالحسنات نے تحریک ختم نبوت کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

"شاہ جی!لوگ بھی عجیب ہیں ایسی ایسی غزلیں کہتے ہیں کہ جن کا نہ مطلع درست ہے نہ مقطع۔ایک دوست نے مجھ سے سوال کیا"حضرت!یہ درست ہے کہ عطاءاللہ شاہ نے حکومت سے روپیہ لے کر تحریک ختم نبوت کو ختم کیا ہے"؟تو میں نے غصے میں اس سے کہا:"بیوقوف!تیرے جیسے لوگوں نے تو مجھے ان نیک لوگوں سے برگشتہ کیا ہوا تھا۔جب میں ان کے نزدیک ہوا،تو انہیں

دین کی خدمت کرنے میں بہت مخلص پایا۔ باقی رہی تحریک ختم نبوت، تو وہ میری رہنمائی میں چل رہی تھی۔ اگر کوئی بات ہوتی تو میرے علم میں ہوتی۔ رہی روپیہ لینے کی بات تو مجھے یاد ہے ایک دفعہ سکھر جیل میں شاہ جی کا داماد (سید وکیل احمد شاہ) میرے سامنے انہیں ملنے آیا، اور اس نے گھر کی پریشان حالی کا ذکر کیا تو شاہ جی نے حاجی دین محمد صاحب کی طرف رقعہ لکھا کہ رقعہ حامل ہذا کو دو صد روپیہ قرض دے دیں۔ انشاء اللہ رہا ہو کر آپ کو ادا کر دوں گا۔" ان واقعات کی موجودگی میں میں تمہاری بات پر کیسے یقین کر لوں۔ اس پر معترض بہت شرمسار ہوا۔

مولانا ابوالحسنات کی زبانی یہ سارا کچھ سن کر امیر شریعت رح نے ایک آہ بھری اور فرمایا۔ ؎

"زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں"

اس شعر پر مولانا ابوالحسنات نے مسکراتے ہوئے کہا:

"سبحان اللہ! کیا تعریف ہوئی ہے ہماری"

اس پر محفل کے تمام لوگ بے اختیار ہنس پڑے۔

حفیظ جالندھری

انہی محفلوں میں ایک دن حفیظ جالندھری بھی آ شامل ہوئے، اور دیر تک اپنے اشعار سے امیر شریعت رح کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش میں رہے، لیکن اس روز امیر شریعت کو جس قدر بیزار اور پریشان دیکھا اس سے پیشتر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شکن آلود پیشانی پر غصے کے ہزاروں نقشے ابھر کر بپھرے ہوئے دریا میں موجوں کی طرح طوفان بپا کرنے لگے۔

اصول کے معاملے میں امیر شریعت رح، جب بگڑ جاتے تو دوست کو بھی دشمن بنا لیتے لیکن اخلاق کے بازار میں ان کے ہاں جو سودا تھا، اس کے لیے وہ دونوں میں امتیاز نہیں کرتے تھے۔ مگر حفیظ جالندھری سے اُس روز کی بے اعتنائی حیرت انگیز تھی۔ غصے میں کہا "حفیظ صاحب! آپ

اپنے ارادوں میں نہ پہلے کامیاب ہوئے ہیں، نہ آئندہ انشاءاللہ کامیاب ہوں گے۔ بہتر ہے کہ آپ مجھے اپنی طرف متوجہ نہ کریں۔

امیر شریعتؒ کے یہ مختصر جملے ساری محفل کا مزا کرکرا کر گئے۔ ایسا کیوں ہوا؟ یہ سوال دلوں سے نکل کر زبانوں پر آنے ہی والا تھا مگر حفیظ صاحب اٹھ کر چلے گئے۔

"شاہنامہ اسلام" کی پہلی جلد طبع ہو کر جب بازار میں آئی، تو امیر شریعتؒ ان دنوں تحریک شاتم رسول میں مصروف تھے۔ "تاریخ اسلام" کو پہلی بار منظوم کیا گیا تھا۔ اور انداز بھی خوب تھا، جسے مصنف کے ترنم نے مزید جلا دی تھی۔

امیر شریعتؒ کو شاعر کا یہ طرز تکلم پسند آیا، اور وہ "شاہنامہ اسلام" کے مطالعہ کے لیے مسلم نوجوانوں کو دعوت دینے لگے۔ اس کے دو رد عمل ہوئے، اوّل کتاب مذکور کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا اور مصنف کا نام پنجاب کی فضاؤں میں تیرنے لگا۔ دوسرا یہ کہ امیر شریعتؒ اور حفیظ صاحب کے درمیان قرابت داری کو غنیمت جان کر فرنگی حکمرانوں کے ایجنٹوں نے امیر شریعتؒ کو رام کرنے کے لیے مفید سمجھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ کھلاڑی اپنی بازی میں مات کھا گیا لیکن کوشش تو دلِ ناتواں نے خوب کی۔

مذکورہ بالا واقعات کی ساری عمارت قیاس یا گمان پر نہیں، بلکہ امیر شریعت کے اپنے یقین پر استوار ہے، ورنہ محبّت اور اصول کی دنیا میں پرورش پانے والا انسان ریت کی دیوار پر اپنے دعویٰ کا اعلان نہیں کر سکتا۔

مولانا حبیب الرحمٰن کا انتقال

احباب کی آمدورفت کے باعث مجالس گرم تھیں حاجی دین محمد کا مکان ادیبوں، شاعروں، سیاسی رہناؤں اور مذہبی لوگوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ امیر شریعتؒ بیماری سے نجات کے لیے دل بہلانے میں مصروف تھے۔ اس طرح سے مریض اپنے مرض سے آہستہ آہستہ صحت یاب ہو رہا تھا کہ ۲۔ستمبر ۱۹۵۶ء کو بھارت ریڈیو پر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے انتقال کی خبر سنی۔ امیر شریعتؒ

پریس خبر کا اس تیزی سے اثر ہوا، جیسے پھول پر غیر موسم کا ہوتا ہے اور اس کی تمام پتیاں جھڑ کر گر جاتی ہیں۔

جماعتی زندگی کے علاوہ مولانا حبیب الرحمٰن کو امیرِ شریعت بھائی کہا کرتے تھے، اور یہ رشتہ دونوں حضرات کے گھروں تک جا پہنچا تھا۔

مولانا حبیب الرحمٰن کی موت ایک قافلہ سالار کی موت تھی۔ شیر بیشۂ حریت کاروانِ زندگی کی مہار تھامے جب میدانِ کارزار میں پہنچتا، تو برطانوی سامراج کا دل دہل جاتا۔ ان کی رہنمائی میں مجلسِ احرار نے کئی اہم فیصلے کیے جنہیں تاریخ کبھی نظر انداز نہیں کر سکے گی۔

مولانا کی موت کی خبر سن کر امیرِ شریعت دن بھر خاموش رہے اور کبھی کبھار ایک آہِ سرد کے ساتھ اپنی اس خاموشی کو توڑ کر فرماتے۔

"ایک اچھے رفیق، مونس و غم خوار اور سراپا ایثار ساتھی کی جدائی نے میرے سینے میں ایک اور زخم کا اضافہ کر دیا ہے۔"

ایک غلط خبر

سیاسی راہنماؤں کو اخبارات میں اپنے نام شائع کرانے کی عام بیماری ہے۔ لیکن امیرِ شریعت اخبارات میں بیان دینے سے ہمیشہ اجتناب کرتے، اگر کہیں نامہ نگاروں کے نرغے میں آجاتے، تو انہیں بڑی حکمتِ عملی سے ٹال دیتے، حالانکہ بعض دفعہ ان کی ذات سے متعلق بہت سی غلط سلط خبریں شائع ہوتی رہیں، لیکن وہ انہیں کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ مگر شیخ حسام الدین اور ماسٹر تاج الدین کے عوامی لیگ میں چلے جانے پر بہت سی بے بنیاد خبریں تراشی جانے لگیں، ان دنوں عوامی لیگ پاکستان میں مخلوط انتخاب کی حامی تھی، جس کے باعث تحریک ختمِ نبوت کو نقصان پہنچنے کا احتمال تھا چنانچہ جیسے ہی یہ بے بنیاد خبر اخبارات میں شائع ہوئی کہ:

"امیرِ شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ صاحب بخاری کو وزیرِ اعظم پاکستان جناب حسین شہید سہروردی نے عوامی لیگ میں شمولیت کی دعوت دی ہے۔

اور راولپنڈی روانہ ہونے سے قبل وزیر اعظم نے حضرت شاہ صاحب کو گورنمنٹ ہاؤس میں ملاقات کے لیے بلایا ہے؟

حضرت امیر شریعتؒ کو جب اس خبر کی طرف متوجہ کیا گیا تو فقط اس قدر فرمایا:

"نامعلوم اس اخبار نے میرے متعلق ایسی بے بنیاد خبر کیوں شائع کی، جبکہ میں مدّت ہوئی ان سیاسی بکھیڑوں سے الگ تھلگ ہو چکا ہوں، اور نہ ہی میں اپنی نجی محفلوں میں سیاسی گفتگو کو پسند کرتا ہوں۔ پھر عوامی لیگ! جو کہ مخلوط انتخاب کو پاکستان کی بقا کے لیے بہتر سمجھتی ہے، اور میں اسے مسئلہ ختم نبوّت کے لیے زہرِ قاتل سمجھتا ہوں۔

مقدّمات کی واپسی

مولانا حبیب الرحمٰن کی موت کے صدمے نے امیر شریعتؒ کی طبیعت پر خاصا اثر کیا تھا اس سے ذرا سنبھالا لیا تو تقریباً تین ماہ لاہور میں گذار کر اپنے معالج ڈاکٹر کرنل ضیاء اللہ کی اجازت سے ۱۲۔ نومبر ۱۹۵۶ء کو ملتان واپس چلے گئے۔

ان دنوں بیماری میں قدرے افاقہ تھا اور گھر سے نکل کر سلیمی دواخانہ پر آ بیٹھتے۔ احباب بھی یہیں آجاتے۔ نمازِ مغرب تک محفل جمتی۔

۱۵۔ نومبر ۱۹۵۶ء کو اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ حکومتِ مغربی پاکستان نے حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری پر دائر کردہ تمام مقدّمات واپس لے لیے ہیں، اور اس کے ساتھ ہی دوسری پابندیاں بھی اٹھالی ہیں۔

اس خبر کو پڑھ کر امیر شریعتؒ کو حکومت کے خلاف سخت غصہ آیا اور برہم ہو کر اخبارات کو حسبِ ذیل بیان دیا۔

"حکومت نے صرف میرے مقدمات اور میری پابندیاں اٹھا کر میری سخت توہین کی ہے۔ حکومت کے اس اقدام سے مجھے بڑا صدمہ پہنچا ہے میری پوری زندگی میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ حکومت نے مجھے جیل بھیج

دیا ہو اور میرے ساتھی جیل سے باہر رہیں یا میرے ساتھی تو جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں محبوس ہوں اور میں اکیلا جیل سے رہا ہو جاؤں یہ بات میری جماعت کی تاریخ اور روایات کے خلاف ہے کہ حکومت صرف میرے مقدمات واپس لے لے، اور مجھ پر عائد کردہ پابندیاں اٹھالے لیکن میرے تمام ساتھی طرح طرح کے مقدمات میں جکڑے رہیں۔

یہ کیا مذاق ہے کہ جن تقاریر کی بناء پر ہم سب پر پابندیاں عائد کی گئیں اور مقدمات دائر کیے گئے، انہی تقاریر کی بنا پر جماعت کے رفقاء تو بدستور معتوب رہیں اور صرف مجھے آزاد کر دیا جائے، حکومت کے اس اقدام سے میری جس قدر بے عزتی ہوئی ہے اتنی بے عزتی کبھی نہیں ہوئی۔ اس سے بڑھ کر ستم ظریفی اور کیا ہو سکتی ہے کہ خانیوال کے مقدمے میں ہم سب ایک ہی جرم کی پاداش میں ماخوذ تھے۔ اس کا عنوان تھا، سرکار بنام سید عطاء اللہ شاہ بخاری وغیرہ" لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اس مقدمہ سے صرف مجھے خارج کر دیا گیا اور میرے باقی ساتھیوں کو جُدا جُدا کر کے ان کے خلاف مقدمات دائر کر دیے گئے ہیں۔

ایک مقدمہ کو مختلف مقدمات میں تبدیل کرنے میں اربابِ حکومت کی نیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے"

مولانا ظفر علیخان

۲۷۔ نومبر ۱۹۵۶ء کی یہ خبر جب اخبارات میں آئی کہ مولانا ظفر علی خاں وفات پا گئے ہیں تو امیر شریعت کے دل پر ایک چوٹ اور پڑی، کچھ دیر خاموش رہ کر فرمایا:

"تاریخِ ماضی کی ایک اور دیوار گر گئی!"

خلافت تحریک کے دنوں میں امیر شریعتؒ صرف "زمیندار" اخبار ہی پڑھا کرتے

تھے، اور اسی سے متاثر ہو کر وہ سیاسی میدان میں آ گئے۔ اس تعلق سے امیر شریعتؒ کے دل میں مولانا ظفر علی خاں کے لیے بے پناہ احترام تھا، پھر دونوں ایک ہی ڈگر پر چلنے لگے۔ جیل خانوں کی اکثر راتیں مشترک گزریں۔ اسی محبت اور تعلق کی بناء پر ۱۹۳۴ء کو جب قادیان میں احرار کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا، تو امیر شریعتؒ نے اس کی صدارت کے لیے مولانا ظفر علی خاں کا نام پیش کیا۔ لیکن مولانا حبیب الرحمٰن کی رائے تھی کہ اس کی صدارت امیر شریعتؒ کریں، اس پر خاصی تکرار رہی۔ آخر مولانا حبیب الرحمٰن نے لدھیانہ سے امیر شریعتؒ کے نام پیغام بھیجا کہ:

"میرا حکم ہے کہ قادیاں کانفرنس کی صدارت آپ کریں، بس!

اس حکم پر سر تسلیم خم کر دیا گیا۔ تاریخ کا یہی وہ موڑ ہے، جہاں مولانا ظفر علی خاں مجلس احرار سے علیحدہ ہو گئے، آگے چل کر دونوں رہنما سر راہ ملتے تو رہے، لیکن یہ ملاقات صرف زبان اور نگاہوں کی ہوتی۔ دونوں کے دل رُوٹھے رہے۔ ۱۹۵۳ء میں جب امیر شریعتؒ تحریک ختم نبوّت کے سلسلے میں کراچی جانے سے پیشتر لاہور میں آخری تقریر کرنے دہلی دروازے آئے، تو مولانا ظفر علی خاں کو بھی وہاں لایا گیا۔ ان دنوں مولانا ظفر علی خاں کی صحت جواب دے چکی تھی۔ دونوں ہاتھوں میں رعشہ طاری تھا۔ دونوں رہنما۔۔ آمنے سامنے آئے تو دونوں کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

ایک ہی راستے کے دو مسافر، ایک ہی منزل کے دو راہی، جب انہیں واقعات نے ایک دوسرے سے بیگانہ کر دیا، تو دونوں اپنی اپنی تاریخ بنانے میں مصروف ہو گئے۔ برس ہا برس کے بعد جب دونوں ایک دوسرے سے ملے تو تاریخ مکمل ہو چکی تھی۔ مورخ نے دونوں کے آنسو تاریخ کے دامن میں گرہ دینے کے لیے محفوظ کر لیے۔

مولانا ظفر علی خاں کی موت کی خبر سن کر امیر شریعتؒ نے دل برداشتہ ہو کر کہا:

"۔۔۔ کچھ دوست زندگی میں ساتھ چھوڑ گئے اور کچھ کو موت چاٹ گئی۔ اب میں

تنہا رہ گیا ہوں، دیکھیں اب میری باری کب آتی ہے۔"

امیر شریعتؒ نے یہ فقرے اس انداز سے کہے کہ احباب کی آنکھیں بھی نمناک ہو گئیں۔

یہ سال بھی گذر گیا، اور اس کے واقعات بھی۔ امیر شریعتؒ کی عمر اس سال کے اختتام تک سینسٹھ سال ہو چکی تھی۔ اس دوران کے واقعات تاریخ کی سلسلہ دار زنجیر بنتے جا رہے تھے، اور اس زنجیر کی ایک ایک کڑی دیانتدار مؤرخ کے مستقبل کا ایسا سرمایہ تھی، جس کے ضائع ہو جانے پر تاریخ کے ادھورے رہ جانے کا ڈر ہے۔

حضرت لاہوریؒ کا فتویٰ

مودودی جماعت کی اکثر تحریریں آئینِ اسلام سے انحراف کرتی ہیں۔ اسی طرح کی ایک تحریر "خطبات مودودی" میں درج ہے، جس سے توہینِ کعبہ کا پہلو نکلتا ہے۔ جب مولانا احمد علی صاحبؒ لاہوری نے اس تحریر کا محاسبہ کیا، تو اس جماعت کے کارکن بے قابو ہو کر جواب کی تلاش میں مصروف ہو گئے۔ اتفاق سے انہی دنوں حضرت امیر شریعتؒ کا اردو اور فارسی کلام کا مجموعہ "سواطع الالہام" شائع ہوا تھا۔ اس میں ایک شعر تھا۔ ؎

ز کافِ کعبہ تا کافِ کراچی
سراسر کفر در کفر درونِ کفر

اس شعر کی آمد کا پس منظر ۱۹۵۱ء کا وہ زمانہ ہے، جب پاکستان کی صوبائی اور مرکزی حکومتوں کے درمیان کھینچا تانی اور چپقلش کا سلسلہ جاری تھا۔ حضرت امیر شریعتؒ نے اس غیر آئینی ہانھا پائی کا ذکر احباب کی محفل میں کرتے ہوئے کہا:

"تم ایک پاکستان کو روتے ہو، باقی مسلمان ممالک کا کیا حال ہے، سب کے سب ایک دوسرے سے بدتر ہیں۔ کون سی جگہ ہے، جہاں ملعون انگریز نے اپنا کام نہیں کیا۔ اس نے مسلمانوں کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے، اور آج تو مکہ میں بھی یا امریکہ ہے یا برطانیہ۔ بہرحال ملوکیت ہے، اسلام وہاں بھی نہیں

اور میں تو بلا خوف کہتا ہوں کہ خیبر سے کراچی تک ہر جگہ قانونِ کفر ہی مسلّط ہے
کہلاتے تو سب مسلمان ہیں مگر کہیں انگریز کے ٹوڈی، اور کہیں نمک حرامانِ محمد
(صلی اللہ علیہ وسلّم) ہیں کہ جس محسنِ انسانیّت کی جوتیوں کے صدقے میں ان
عیاشوں کو حکومتیں ملیں، عین وقت پر اسی کو فراموش کر بیٹھے (اور پھر اپنے
مخصوص جلال آمیز انداز سے مندرجہ بالا شعر پڑھا)

اور اس شعر کو خانیوال کے ایک نوزائیدہ وکیل جس کا مودودی جماعت سے تعلق
تھا، اپنے لیڈر کی تحریر کے جواب میں لکھ کر مولانا احمد علی صاحب کی خدمت میں بھیج دیا کہ
مودودی پر تو آپ نے اعتراض کر دیا۔ مگر اس شعر کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ خیانت
یہ کی کہ یہ نہیں بتایا کہ یہ شعر کس کا ہے۔

اس تحریر کے جواب میں حضرت لاہوریؒ نے فرمایا کہ "یہ بھی کوئی مودودی کا چھوٹا بھائی
ہے اور گمراہ ہے" حضرت لاہوری کا یہ جواب اور اپنا سوال دونوں روزنامہ "کوہستان"
لاہور میں شائع کرا دیے۔

امیر شریعتؒ نے جب یہ سارا کچھ پڑھا تو اسی وقت حضرت لاہوریؒ کو حسب ذیل خط لکھا

"مکرمی ومحترمی حضرت مولانا احمد علی صاحب زیدمجدہٗ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

روزنامہ "کوہستان" لاہور میں میں نے دو خط پڑھے ہیں۔ ایک میں میرے
کسی شعر پر اعتراض ہے اور دوسرے میں آپ کا فتویٰ۔ میرے وہم میں
بھی ذم کا یہ پہلو نہیں تھا۔ چونکہ آپ فرماتے ہیں کہ شعر سے ذم کا پہلو نکلتا
ہے، آپ کے ارشاد کے بعد میں اس شعر کی کوئی تاویل کرنا نہیں چاہتا،
اور استغفر اللہ پڑھتا ہوں، آپ بھی میرے حق میں دعا کریں، اللہ تعالےٰ
مجھے معاف کرے۔

ہاں! ایک عرض ہے کہ آپ نے اپنے خط میں مجھے مودودی کا چھوٹا بھائی قرار دیا ہے۔ مولانا! آپ مجھے تقریباً تیس چالیس سال سے جانتے ہیں۔ آپ نے کبھی مجھ کو جھوٹ بولتے دیکھا یا شاید جہاں تک اپنے متعلق مجھے خود یاد پڑتا ہے، جھوٹ بولنے کیلئے کسی کو کہنا مجھ سے کبھی نہیں ہوا آپ نے مجھے مودودی صاحب کا چھوٹا بھائی کیسے کہہ دیا۔

چھوٹے بھائی کا لفظ آپ واپس لے لیجئے۔ شعر میں نے قلمزن کر دیا۔"

محتاج دعا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری

ملتان۔ ۵ جمادی الثانی ۱۳۷۱ھ

اس کے جواب میں حضرت لاہوری نے امیر شریعت کو حسب ذیل خط لکھا۔

"مخدومی و مکرمی!

حامی حق وماحی باطل امام المجاہدین حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب زیدۃ برکاتہم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ کئی دن سے والا نامہ کے شرف سے مشرف ہو چکا تھا۔ بے حد عدیم الفرصت ہونے کے باعث ارسال جواب میں تاخیر ہوئی۔ آپ کی حق پرستی کی آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ نے اس شعر کو جو مفہوم توہین بیت الحرام ہو سکتا تھا، میری گزارش پر اسے اپنے دیوان سے قلمزن کر دیا ہے۔

آپ جیسی بلند پایہ، شہرہ آفاق اور قبول عوام وخواص شخصیت کا اپنے ایک موہوم شعر کو قلمزن کرنے سے اہل حق کے دلوں میں آپ کی عزت نسبتاً زیادہ بڑھ گئی ہے۔ آپ نے اپنے خط میں دوسری چیز یہ تحریر فرمائی ہے کہ میں نے آپ کو مودودی کا چھوٹا بھائی قرار دیا ہے۔ اس شعر سے

قطع نظر کرکے اصلیت یہ ہے کہ آپ کے پاؤں مبارک میں جو جوتا ہے۔ میرے دل میں اس کی اتنی عزت ہے کہ مودودی صاحب کے وجود کی بھی اتنی نہیں ہے، چونکہ مودودی صاحب نے ہمارے تمام اسلاف کی توہین کی ہے، جن میں مفسرین، مجددین، صوفیائے کرام، صحابہ کرام حتّٰی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نہیں چھوڑا۔ اس لیے مجھے اس سے بے حد نفرت ہے۔ خدا اسے اس گمراہی کے گڑھے سے نکالے۔

میں نے آپ کے متعلق جس عقیدت کا اظہار کیا ہے، وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو تادیر سلامت رکھے، اور بدستور سابق حق و صداقت کا جھنڈا آپ کے ہاتھ میں رہے، اور آپ کی جماعت آپ کے جھنڈے کے سائے میں ہمیشہ کامیاب و بامراد رہے۔ آمین یا الٰہ العالمین

احمد علی، امیر انجمن خدام الدین، لاہور

۱۹۔جنوری ۱۹۵۷ء

پولیس کی نگرانی

بیماری کے باعث امیر شریعت اس قابل نہیں رہے تھے کہ پہلے کی طرح سفر کرتے۔ نقاہت نے ہر طرح کی سرگرمیوں سے معذور کر دیا تھا۔ البتہ وہ دوستوں کے اصرار پر کبھی کبھار مقامی جلسوں میں آبیٹھتے تھے۔ چنانچہ اسی طرح کے ایک اجتماع میں جو تحفظ ختم نبوت کے تحت ہوا، تشریف لائے۔ پاؤں میں درد تھا۔ طوہاً و کرہاً جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔ صدارت بھی کی، اور چند منٹ تقریر بھی۔ اس میں کہا:

"عزیزو! اب میرے بس میں وہ جان نہیں رہی کہ تمہیں گھنٹوں بٹھائے رکھوں۔ اب تو چراغ سحر ہوں، اس ٹمٹماتے ہوئے دیے کی لو میں چند گھڑیاں بیٹھ کر اگر تمہیں زندگی کا کوئی نشان مل سکتا ہے تو اسے تلاش کر لو۔

اس حالت میں بھی پولیس میرا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ دن رات چوروں کی طرح

میری نگرانی کرتی رہتی ہے۔ مگر سی آئی ڈی کا ربوہ کی طرف کوئی دھیان نہیں حالانکہ وہاں سے یہ خبریں آ رہی ہیں کہ مرزا محمود نے اپنا سرمایہ ہندوستان منتقل کرنا شروع کر دیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ مرزا محمود کی خواہش کے مطابق اسے ہندوستان ہی بھیج دیا جائے، تاکہ پاکستان کی سالمیت کو کوئی گزند نہ پہنچے۔

جب یہودیوں کو جرمن سے نکالا گیا اور عربوں کو بے خانماں کر کے یہودیوں کو فلسطین میں آباد کیا جانے لگا تو ہم دیوانوں کی جماعت نے اس وقت ہندوستان اور دیگر ممالک اسلامیہ کے مسلمانوں کو خبردار کیا تھا کہ انہیں وہاں آباد ہونے سے روکا جائے۔ ہماری یہ آواز ایک غلام ملک کی جماعت کی آواز تھی اور انگریزی مظالم کا تختۂ مشق جماعت کی پکار تھی، جو نہ اس نے سنی اور نہ ہی کسی دوسرے مسلمان نے، نتیجے میں اب وہاں اسرائیلی حکومت قائم ہے اور وہی یہودی مشرقِ وسطیٰ کے لیے سرطان کا پھوڑا ثابت ہو رہے ہیں۔

اسی طرح آج پھر برملا کہتا ہوں کہ ربوہ کی خبر لو۔ ربوہ کا وجود پاکستان میں اسرائیل سے زیادہ خطرناک ہے۔ تمہیں میری نگرانی تو کرنی آتی ہے، لیکن ربوہ میں مرزا محمود کی اپنی عدالتیں اور اپنا نظامِ حکومت ہے، یہ تمہیں کیوں دکھائی نہیں دیتا؟ میرا وجود جو صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہے، یہ تمہاری نظر میں کھٹکتا ہے اور ربوہ جو پاکستان میں ایک ریاست کی حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے، تمہیں دکھائی ہی نہیں دیتا۔ مملکت در مملکت کا وجود آخر کیوں برداشت کیا جا رہا ہے۔ تمہاری یہ غفلت ایک دن بُرے نتائج پیدا کرے گی۔

صحیح النسب لاہور میں علاج سے مایوس ہو کر ملتان واپسی پر حکیم حنیف اللہ خلف الرشید حکیم عطاء اللہ خان کے زیرِ علاج رہے۔ حکیم حنیف اللہ قرآن کریم اور دوسرے دینی علوم سے فارغ ہیں۔ گھر کے قریب ہونے کی وجہ سے

بھی ان سے قرابت زیادہ رہی ۔ شب و روز انہی کے ہاں بیٹھک رہتی ۔

حکیم حنیف اللہ کا کہنا ہے کہ شاہ جی کی بیماری اس قدر جڑ پکڑ چکی تھی کہ اس کے لیے قیمتی دواؤں کی ضرورت تھی ، جس کا میں متحمل نہیں تھا ۔ شاہ جی سے اس کے پیسے مانگتے ہوئے بھی عار محسوس ہوتی ۔ اسی پریشانی میں تھا کہ ایک رات خواب میں حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی ۔ میں نے دیکھا کہ حضورؐ کے ایک جانب شاہ جی ہیں اور دوسری طرف ایک برقعہ پوش عورت بیٹھی ہے ۔ صبح کی نماز سے فارغ ہو کر اس خواب کی تعبیر تلاش کرنے لگا ۔ مجھے اس فن پر ملکہ ہے ۔

پریشانی اس پر تھی کہ خاتم الانبیاؐ کے دربار میں عورت کون ہو سکتی ہے ؟ آخر تعبیر سے پتہ چلا کہ برقعہ پوش عورت شاہ جی کی بیوی تھی ۔

اس پر میں نے اندازہ لگایا کہ ایک تو شاہ جی کا خاندان (میاں بیوی) عالی نسب سید ہیں ۔ دوسرا یہ کہ مجھے علاج کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔ اس کے بعد میں نے بلا جھجک شاہ جی کا علاج کیا اور قیمتی سے قیمتی دوائیاں استعمال کرائیں ۔

بہاروں میں رہ کر زندگی گزارنے والا انسان جب خزاں کے پیٹے میں آتا ہے ، تو ہر موسم کا نشیب و فراز اس کے جسم کی حرارت کو اکساتا ہے ، مگر اردگرد کے کانٹے اس کی ساری شیخی کو کر کرا کر دیتے ہیں ۔

حضرت امیر شریعتؒ اپنے پیچھے جن راہوں کو چھوڑ کر آئے تھے ، اُن کے ایک ایک موڑ پہ آرزوؤں کے ہزاروں ہجوم ان کے ساتھ تھے ، لیکن جس موڑ پر وہ آج کھڑے ہیں وہاں تمناؤں کے غبارے اُٹھتے نظر آ رہے تھے ۔ مایوسیوں اور نامرادیوں نے انہیں اس بازار کی بیکار جنس بنا دیا تھا ، جس کا اقرار وہ خود اپنے معالج کے سامنے کرتے ہیں ۔

" حکیم صاحب ! میں فالج اور ذیابیطس کا مریض نہیں ہوں ۔ اصل وجہ یہ ہے کہ میری محفلیں اجڑ گئی ہیں ۔ دیکھیئے شاد عظیم آبادی کیا کہہ گئے ہیں ؎

کانٹوں میں گھرا ہوا ہے چاروں طرف سے پھول
پھر بھی کھلا ہی پڑتا ہے کیا خوش مزاج ہے"!

ملکی حالات، حکمران طبقہ سے مایوسی، دوستوں کی بے وفائی، بیماری اور بڑھاپا، ان تمام کے پیشِ نظر امیر شریعتؒ نے اپنی انجمن اپنے گھر سجا لی تھی، اور حسب ذیل تحریریں اس محفل میں نمایاں نظر آتی تھیں۔

۱: حدیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم قال قال رسول اللہ صلی علیہ وسلم
اذا وُسِدَ الْاَمْرُ اِلٰی غَیْرِ اَھْلِہٖ فَانْتَظِرِ السَّاعَۃَ
(جب حکومت نا اہل لوگوں کے سپرد ہو تو قیامت کا انتظار کر۔) (رواہ البخاری)

۲: پیر وارث شاہ کے چند اشعار (پنجابی)

۱۔ بکھا کھنڈ تے کھیر دا ہویا راکھا رنڈا گھلیا ساک کرا دنے نوں
۲۔ اونہاں زہر دے واسطے سد آندا اسگوں آیا سی زہر ودھا ونے نوں
۳۔ جھتیں اپنی زہر سہیڑ یونیں چنگھا چوڑ چپیٹ کرا ونے نوں
۴۔ سر ہوں ڈھک مکوڑیاں کول رکھی دانے گکڑاں پا سکا ونے نوں
۵۔ گدڑ کھیریاں دا جمعدار ہویا اُٹھ چلیا باغ لگا ونے نوں
۶۔ بیڑی کاغذ دی باندر ملاح بنیا اُنہاں گھلیا پور لنگھا ونے نوں
۷۔ راکھا مال دا دھاڑوی رکھیو نے چور سدیا کھوج لگا ونے نوں
۸۔ راکھا جواں دے ڈھیر دا گدھا ہویا انہاں گھلیا حرف لکھا ونے نوں

(ترجمہ) ۱۔ بھوکے آدمی کو چینی اور کھیر کی رکھوالی دے دی، اور جس کی اپنی بیوی فوت ہو چکی تھی اس کو رشتہ ناطہ کرنے کے لیے بھیجا گیا۔

۲۔ جسے زہر کے علاج کے لیے لائے تھے وہ خود زہر ثابت ہوا، گویا یہ کام انہوں نے اپنے ہاتھ سے کیا۔

۳۔ اپنے گھر کی بربادی کے لیے انتظام آپ کیا۔

۴۔ کیڑے مکوڑوں کے پاس سرسوں کا ڈھیر رکھ دیا اور مرغیوں کے سامنے دانے خشک کرنے کے لیے ڈال دیے۔

۵۔ گیدڑ کو خربوزوں پر نگہبان کر دیا اور اونٹ کو کہا کہ تو باغ لگانے جا۔

۶۔ کاغذ کی بیڑی بنا کر بندر کو ملاح بنا دیا اور اندھے سے کہا کہ تم جاؤ اسے کنارے پر چھوڑ آؤ۔

۷۔ خزانے کی نگہداری کے لیے چور کو مقرر کیا اور چوروں سے کہا کہ تم چوروں کی تلاش کرو۔

۸۔ دھان کے ڈھیر پر گدھے کو رکھوالا کر دیا اور نابینے کو خط لکھوانے بھیجا۔

وارث شاہ نے یہ بات خدا جانے اپنے دور کے حاکموں سے کہی ہو یا نہ، لیکن امیر شریعتؒ نے وارث شاہ کے اشعار سے اپنے دور کے حاکموں پر ایسی پھبتی کہی کہ امیر شریعتؒ کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ انہوں نے وارث شاہ کے اشعار کو کیسے وقت پر استعمال کیا کہ پاکستان کے حکمران جوتیوں میں دال بانٹ رہے تھے، اور اپنے اقتدار کی کرسیوں کے لیے وطن عزیز کو رسوا کر رہے تھے۔

جب کوئی دوست گھر آ کر پاکستان کے موجودہ حالات پوچھتا تو امیر شریعتؒ ان تحریروں کی طرف اشارہ کر کے فرماتے۔ "بھائی! یہ پڑھ لو ——— بس یہی کچھ ہو رہا ہے۔"

شیعہ سُنّی فساد

قید سے آزاد ہوتا ہے جب کوئی محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوّت کے بعد برسراقتدار لوگ اتحاد بین المسلمین کو پریشان کرنے کی تجویزیں کرنے لگے۔

شیعہ، اہل سُنّت والجماعت، اہل حدیث، بریلوی یا دیوبندی کا باہم مل بیٹھنا پاکستان کی زندگی میں پہلا واقعہ ہے۔ ۱۹۵۳ء میں یہ تمام فرقے پیغمبر اسلام کی آبرو کے لیے سیسہ

پلائی ہوئی دیوار بن گئے، اور یہ امیر شریعت کے خلوص کی زندہ مثال تھی کہ انہوں نے آگ اور پانی کو ایک جگہ جمع کر دیا تھا۔ لیکن حکومت کے اپنے مستقبل کے لیے یہ اتحاد سُود مند نہیں تھا۔

چنانچہ اگست ۱۹۵۰ء کو مغربی پاکستان کے اکثر شہروں میں شیعہ سُنی فساد ہوئے۔ ان دنوں مرکزی حکومت پر جنرل سکندر مرزا جو عقیدۃً شیعہ تھے، اور مغربی پاکستان میں ڈاکٹر خاں صاحب وزیر اعلیٰ تھے جو سکندر مرزا کے سیاسی مرید تھے، انہوں نے سکندر مرزا کی خوشنودی کے لیے مغربی پاکستان کے تمام ڈپٹی کمشنروں کو ہدایت بھیجی کہ شیعہ فرقہ کو مذہبی آزادی ہے، وہ جہاں مناسب سمجھیں محرم کے لائسنس حاصل کر سکتے ہیں۔ اس حکمنامے کا انکشاف لاہور کے شیعہ رہنما قیصر مصطفےٰ ایڈووکیٹ نے اپنے بیان میں کیا جو ۱۵ ستمبر ۱۹۵۰ء کے اخبارات میں شائع ہوا۔

اس فساد سے امیر شریعت اس قدر متاثر ہوئے کہ اس کا اندازہ حسب ذیل تقریر سے ہوتا ہے جو انہوں نے ۲۷ اگست ۱۹۵۰ء کو ملتان کے قریب ایک بستی (کنڈا سرگانہ) میں کی۔

"ملک کے مختلف حصوں میں شیعہ سنّی فساد کی اطلاع نے مجھے بے حد دکھ پہنچایا ہے۔ مسلمانوں نے معمولی باتوں پر اپنے بھائیوں کا خون بہا دیا اور میری چالیس برس کی اتحاد و اتفاق کی کوششوں کو برباد کر دیا۔

شیعہ، سنی تنازعات کی اصل جڑ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ چوتھے خلیفہ کیوں ہوئے؟ پہلے خلیفہ کیوں نہ بنائے گئے۔ شیعہ سنی تنازعات، تعزیہ وغیرہ کی رسوم ان کے آئمہ یا سلف کا عمل یا قول نہیں ہے۔ یہ ایک رسم ہے، جیسے کہ سنی مسلمانوں میں کئی ایک رسمیں رائج ہو چکی ہیں۔ کل سے یہاں بیٹھا ہوں، لیکن آپ نے مجھے پہلے تقریر کا موقعہ

کیوں نہیں دیا کیا یہ میری بے عزّتی نہیں ؟ مجھ سے پہلے مولانا عبدالستار نے تقریر کی، وہ انصاری ہیں۔ ہمارے ناظم اعلیٰ ارائیں ہیں، اور میں اہل بیت کا فرد ہوں، سید اور ہاشمی ہوں۔ مجھ سے قبل ان لوگوں کو وقت دیا گیا ہے جو ہندوؤں سے مسلمان بنے، کیا یہ آلِ رسول کی توہین نہیں؟ —— (مجمع پر اس وقت سکوت طاری تھا، آپ نے سامعین سے جواب طلب کیا۔ مجمع کے اس سکوت کو، اور اپنے سوالوں کا خود ہی جواب دیتے ہوئے کہا) آخر میں تقریر کرنا میری بے عزّتی نہیں۔ مولانا عبدالستار تقریر کر رہے تھے۔ میں نے کہا، اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو میں تقریر شروع کروں، تو مولانا عبدالستار نے کہا۔ اگر آپ پہلے تقریر کر دیں گے تو آپ کے بعد ہمیں کون پوچھے گا۔ (امیر شریعتؒ نے مجمع سے سوال کیا) کیا یہ عزّت ہے یا بے عزّتی ؟ بعد میں آنا بے عزّتی کی دلیل نہیں۔

معراج کی رات تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت میں نماز ادا کرنا بھی میرے دعوے کی دلیل ہے ان انبیا کرام میں سے حضرت رسول کریم کی عزّت ہے (معاذ اللہ) یا آپ کی بے عزّتی۔

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری نبی ہیں، اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اس نسبت سے چاہیے تو یہ تھا کہ جس طرح نبوّت کا خاتمہ خاندان ہاشم پر ہوا، خلافت کا خاتمہ بھی ہاشمی خاندان پر ہو

اہل سُنّت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ سید الانبیاء پر نبوت ختم ہوئی اور حضرت علیؓ پر خلافت۔ حضرت رسول کریم نبوّت کے خاتم ہوئے اور حضرت علیؓ خلافت کے خاتم۔ اس کے بعد سلطنت اور بادشاہت شروع

ہو گئی۔ بادشاہ اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔

یہ اور بات ہے ایں چونکہ اولادِ علی ہوں، اس لیے خواہش کروں گا کہ میرے ابا کو پہلی خلافت ملتی یا اُس وقت میں ہوتا تو خود اپنے لیے خلافت کی خواہش کرتا، جیسے سرسیّد سے کسی نے پوچھا تھا کہ اس وقت اگر آپ ہوتے تو کیا کرتے؟ تو سرسید نے جواب دیا کہ میں خود خلافت حاصل کرنے کی کوشش کرتا، لیکن اصل بات یہ ہے کہ خاتم خلافت کا اعزاز حضرت علیؓ کو ملنا تھا۔

اگر سب مسلمان اس عقیدے پر متفق ہو جائیں تو اختلاف کیا رہ جاتا ہے۔ یہ تعزیہ اور جلوس تو معمولی باتیں ہیں، یہ کوئی دین نہیں، مسلمانوں کو معمولی باتوں پر توجہ نہ دینی چاہیے لیکن افسوس کہ یہی معمولی باتیں اب خوفناک صورت اختیار کر رہی ہیں اور اب نوبت خون خرابے تک پہنچ گئی ہے۔ آخر میں آپ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

"آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبوّت نہیں۔ حضرت علیؓ کے بعد کوئی خلافت نہیں اور اس جلسے میں میری تقریر کے بعد کوئی تقریر نہیں۔"

ڈاک پر سنسر

۲۷۔ جون ۱۹۵۷ء کو صوبائی گورنر نے کریمنل لاء اینڈ مینجمنٹ ایکٹ (CRIMINAL LAW AND MANAGEMENT ACT) مجریہ ۱۹۰۸ء کی دفعہ ۱۶ کے تحت مجلس احرار کو خلافِ قانون قرار دے دیا۔ اس کے کچھ دنوں بعد حکومت مغربی پاکستان نے حضرت امیر شریعتؒ کی ذاتی ڈاک پر سنسر بٹھا دیا۔ نیز ان کے ٹیلیفون بھی سنے جانے لگے۔ حکومت کی اس حرکت پر مغربی پاکستان اسمبلی کے بجٹ سیشن میں ۴۔ ستمبر ۱۹۵۷ء کو مسلم لیگ پارٹی کے قائد سردار بہادر خان نے نکتہ استحقاق

پیش کرتے ہوئے حکومت سے سوال کیا، جس کے جواب میں وزیراعلیٰ سردار عبدالرشید نے قائد حزبِ اختلاف کو یقین دلایا کہ حکومت سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور دوسرے سیاسی کارکنوں پر سے اس قسم کی پابندیاں جلد دور کر دے گی۔

بیماری کے باوجود کبھی کبھار حلقہ احباب کے اصرار پر ضلع ملتان کے تبلیغی اجتماعات میں شرکت کرتے، لیکن معالج کے اصرار پر یہ سلسلہ بھی منقطع کر دیا گیا۔ جسم ناتواں ہو چکا تھا۔ سفر کرتے بھی تو بادلِ نخواستہ۔ مگر ۱۹۵۸ء کے شروع میں مکمل اجتناب کیا۔ اب لے دے کر حکیم حنیف اللہ کا مطب تھا یا گھر کی چار دیواری۔ نظر کی کمزوری اور جسم کی نقاہت کے باعث راستے میں کئی سہارے لینے پڑتے۔

مجلسِ احرار کا احیاء

۱۹۴۹ء میں سیاسیات سے لاتعلقی کے بعد امیر شریعتؒ نے اپنے کارکنوں سے کہہ دیا تھا کہ تم میں سے اگر کوئی ملکی معاملات میں دلچسپی لینا چاہے تو مسلم لیگ میں شامل ہو جائے۔ اس اعلان کے بعد احرار کارکنوں نے مسلم لیگ میں شامل ہونا شروع کر دیا۔ لیکن لیگی رہنماؤں نے اپنے غیر مخلص ارادوں کے پیش نظر احرار کے خلوص کو مشتبہ نظر سے دیکھا اور ان کے لیے اپنے تمام دروازے بند کر دیے۔ اس عدم تعاون کا نتیجہ یہ ہوا کہ احرار رہنما اپنے فیصلے پر از سر نو غور کرنے پر مجبور ہوئے۔ انہی دنوں شیخ حسام الدین اور ماسٹر تاج الدین عملاً لیگ سے الگ ہو کر اپنے پرانے گھر میں واپسی کے لیے سوچ رہے تھے کہ ۱۰۔ اگست ۱۹۵۸ء کو صوبائی وزیراعلیٰ نواب مظفر علی قزلباش نے مجلس احرار سے تمام پابندیاں اٹھا لینے کا اعلان کر دیا۔

صدر سکندر مرزا کی خواہش

اس سے پیشتر ۹۔ مئی ۱۹۵۸ء کو صدرِ پاکستان میجر جنرل سکندر مرزا ملتان آئے تو انہوں نے حضرت امیر شریعتؒ سے ملاقات کی خواہش کی۔ اس ملاقات کے مہتمم شیعہ رہنما مظفر علی شمسی تھے۔ جب امیر شریعتؒ کو اس کی اطلاع ہوئی کہ گیلانیوں کی دعوت کے موقعہ پر صدر مملکت مجھ سے ملنا چاہتے ہیں اور

اس کے لیے شمسی صاحب امیرِ شریعتؒ کو لینے آئے تو امیرِ شریعتؒ نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا۔

"شمسی! تم میرے عزیز ہو! میں تمہارا حکم نہیں ٹال سکتا، لیکن یہ سوچ لو کہ تم دونوں کی پوزیشن کو خطرے میں ڈال رہے ہو۔

سکندر مرزا ملک کے صدر ہیں۔ اگر وہ فقیر کے جھونپڑے میں آئیں تو یہ ان کی حیثیت کے خلاف ہے، اور اگر میں انہیں ملنے جاؤں تو اپنی عمر بھر کی کمائی برباد کر بیٹھوں گا۔ لہٰذا یہی بہتر ہے کہ میری طرف سے معذرت کر دو۔"

ابھی اس پر بحث ہو رہی تھی کہ لاہور میں ڈاکٹر خان صاحب پر قاتلانہ حملہ کی اطلاع پہنچ گئی اور اس طرح سے یہ کہانی ادھوری رہ گئی۔

مجلسِ احرار کا اجلاس

مجلسِ احرار سے پابندیاں ختم ہوتے ہی ۲۵۔ ستمبر ۱۹۵۸ء کو امیرِ شریعتؒ کے دولت کدہ پر احرار ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا تاکہ جماعت پھر سے سیاسیات میں دخل انداز ہو سکے۔ اس موقعہ پر امیرِ شریعتؒ نے احرار رہنماؤں سے فرمایا۔

"دوستو! آپ سب کو یہ حق ہے کہ جس طرح چاہیں اپنے لیے فیصلہ کریں۔ لیکن اپنی بیماری اور ملک کے موجودہ حالات کے پیشِ نظر میں نے ۱۹۴۷ء میں جو فیصلہ کیا تھا، اب بھی میں اسی پر قائم ہوں۔ میرا جی نہیں چاہتا کہ پھر سے ان بکھیڑوں میں الجھوں۔ لیکن میں آپ حضرات کو نہیں روکتا۔ میری دعائیں بہر حال آپ کے ساتھ ہیں۔ مگر میری ایک ہی خواہش ہے کہ حضورؐ کی نبوّت پر اس وقت جو ڈاکہ پڑ رہا ہے، آپ اس کا خیال رکھیں۔ بس! میری یہی آرزو ہے۔ باقی آپ اپنے معاملات

میں آزاد ہیں۔"

فوجی انقلاب

سیاسی جماعت ہو یا مذہبی، اگر اس کے کارکنوں میں خلوص، دیانت اور محنت کا جذبہ نہیں۔ تو وہ جماعت نہیں ایک بھیڑ ہے۔

۱۹۴۷ء میں جو لوگ مسلم لیگ پر قابض ہوئے، ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی، جن کے ہاں خلوص اور دیانت کا فقدان تھا، ورنہ مسلم لیگ بلا شرکت غیرے پاکستان پر پچاس سال تک حکمران رہ سکتی تھی۔

لوٹ مار، چھینا جھپٹی اور حکومت میں محکموں کی بندر بانٹ نے اس جماعت کے کارکنوں کو اس بری طرح الجھایا کہ نوزائیدہ مملکت کا سانس اکھڑنے لگا۔ مغربی پاکستان میں نواب افتخار حسین آف ممدوٹ اور میاں ممتاز دولتانہ کی جنگ اقتدار سے بڑھ کر مشرقی پاکستان کے مولوی فضل الحق اور حسین شہید سہروردی کی کشمکش نے پاکستان کو ایسے موڑ پر لا کھڑا کیا کہ ملک کی خارجہ پالیسی بھی بازیچۂ اطفال بن کر رہ گئی۔ حکومت کے اندر وزراء کی اپنی کرسیوں کی حفاظت میں جماعتی وفاداریاں روز بروز مشکوک دکھائی دینے لگیں۔ اندریں حالات قریب تھا کہ پاکستان اپنے ایک مسلمان ہمسایہ ملک کی مذہبی کالونی بن جاتا کہ ۲۷ اور ۲۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کی درمیانی رات کو میجر جنرل سکندر مرزا کو حکومت سے الگ کر دیا گیا اور ان کی جگہ ملک کے تمام اختیارات جنرل محمد ایوب خاں نے سنبھال لیے۔ اس فوجی انقلاب سے متعلق حضرت امیر شریعتؒ سے جب ان کے احباب نے سوال کیا تو برجستہ فرمایا ؎

"بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھا لیا
اپنی بلا سے بوم رہے یا ہما بسے"

باقی۔ گیارہ سال پیشتر سے جس طرح جوتیوں میں دال بٹ رہی تھی، اس کا نتیجہ یہی ہونا تھا۔

دُعا کرو یہ فوجی انقلاب پاکستان کے لیے بہتر ہو۔"

احباب کی محفلیں

انسان بھی ایک کھلونا ہے، جب تک اس پر رنگ و روغن کی جلوہ آرائیاں رہتی ہیں، ہر ہاتھ اس کی خریداری کے لیے بڑھتا اور ہر آنکھ اس پر اٹھتی ہے۔ لیکن جیسے ہی اس کا ملمع اترتا ہے، پھر نہ کوئی آنکھ اٹھتی ہے اور نہ کوئی خریدار آتا ہے۔

امیر شریعتؒ جب توانا تھے ا زمانے کی ہوائیں ان سے اٹھکیلیاں کرتیں، بہاریں ان کے قدم لیتیں۔ ان کی آواز کے زیر و بم سے حکومتوں کے عروج و زوال وابستہ رہے، لیکن جب بڑھاپے نے آلیا، تو پھر گلی کے موڑ بھی سہارا نہ دیتے تھے۔ اپنے تیمارداری کو آتے مگر رسماً۔ آہ! زمانہ کس قدر بے وفا ہے، ان دنوں صرف گھر میں محفلیں جمتیں یا شام کے وقت حکیم صاحب کے ہاں۔ اسی طرح کی ایک محفل میں فرمایا۔

"میری دوستی اور دشمنی صرف ایک ہی دفعہ ہوتی ہے (اس پر ایک شعر پڑھا)

سہ
دل نیست کبوتر کہ پرد باز نشیند
از گوشۂ بامے کہ پریدیم پریدیم

مابخیر شما بہ سلامت!

پس اسے کنارہ کشی سمجھیے یا دشمنی۔ میری طرف سے صرف اتنا ہوتا ہے۔ الحمدللہ کہ میں نے آج تک نہ کسی سے متعلق برا سوچا ہے اور نہ ہی بُرا کیا ہے۔ ہاں انگریز اور مرزائی کے متعلق جہاں تک بس چلا بُرا سوچا اور کیا بھی۔"

اس پر مولانا یٰسین نے کہا۔ "یہ تو پھر ضد ہے۔"

امیر شریعتؒ نے فرمایا،

"جاہل! ضد نہیں یہ ایمان ہے۔ حدیث میں کیا پڑھا ہے کہ مومن

ایک سوراخ سے دو دفعہ ڈنگ نہیں کھاتا۔"

انہی دنوں روزنامہ "امروز" (ملتان) کے نامہ نگار نے امیر شریعت سے ملاقات کی۔ اس نے اپنے تاثرات یوں بیان کیے۔

"ڈیڑھ برس پہلے کی بات ہے، مجھ سے امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ پر ایک مصور فیچر تیار کرنے کو کہا گیا۔ میں فوٹو گرافر کو لے کر محلہ "ٹبی شیر خاں" پہنچا۔ شاہ جی کا پتہ معلوم کیا۔ مسجد کے عقب میں ایک کچا سا مکان جس کے باہر لیٹر بکس لگا ہوا تھا۔ گلی کی طرف کھلنے والے کمرہ میں شاہ جی موجود تھے، وہ ان دنوں بیمار تھے۔ خیر و عافیت پوچھ چکا، تو اپنا مدعا بیان کیا شاہ جی ٹال گئے، کہا کہ "اب زندگی کے آخری سانس گن رہا ہوں، اب تو آرام کرنے دو۔ اخبار کے کالم بھرنے کے لیے میرے ماضی کے بخیے ادھیڑتے ہو۔" چند لمحے خاموش رہے، پھر کہا "ایک بات پوچھوں"؟ میں نے کہا، "ضرور، ارشاد فرمائیے" کہنے لگے "یہ جو چلّی ہے اس کا بادشاہ شیخ چلی ہوگا۔ (ان دنوں چلّی کی تباہی کے متعلق اخبارات میں خبریں آرہی تھیں) میں نے محسوس کیا کہ شاہ جی مجھے ادھر اُدھر کی باتوں میں ٹال رہے ہیں۔ اس پر میں نے انہیں پھر اپنے ڈھب کی بات کہہ دی "شاہ جی! آپ کب سے اس کرائے کے مکان میں رہ رہے ہیں"۔ فرمانے لگے "۱۹۴۸ء میں یہاں آگیا تھا اب تک یہیں پڑا ہوں۔" "آپ نے کوئی مکان آلاٹ نہیں کرایا؟ آپ کا کلیم (CLAIM) تو ہے"۔ جواب میں فرمایا۔ "آپ مکان کی الاٹمنٹ کی بات کرتے ہیں، جانے قبر کے لیے چند گز زمین ملے گی یا نہیں؟ ایک دفعہ ایک مرکزی وزیر صاحب مجھ سے ملنے ملتان تشریف لائے۔ انہوں نے بھی فرمایا کہ اگر میں انہیں کہوں تو وہ مجھے مکان

الاٹ کرادیں گے اور ساتھ ہی یہ ارشاد بھی فرما گئے کہ فلاں تاریخ کو فلاں صاحب ملتان سے گزر رہے ہیں، ان سے مل لینا" میں نے پوچھا "پھر شاہ جی! آپ نے ان سے ملاقات کی؟" کہا "نہیں بابو میرے پاس کالی اچکن اور قراقلی ٹوپی نہیں تھی"

"شاہ جی! آپ کو ذیابیطس کی شکایت کب سے ہے؟" جواب دیا "یہ مرض سکھر جیل میں میرے ساتھ آ لگا تھا۔ ابھی تک سنگت نبھا رہا ہے"

"ان دنوں جب کہ آپ اس قدر بیمار ہیں، اور پبلک لائف سے بھی ریٹائر ہو چکے ہیں کبھی دیرینہ رفقاء سے کوئی ملنے آیا؟" جواب میں مسکرائے اور کہا "بیٹا! جب تک یہ کُتیا (زبان) بھونکتی تھی، سارا برصغیر ہند و پاک ارادت مند تھا۔ اس نے بھونکنا چھوڑ دیا ہے تو کسی کو پتہ ہی نہیں رہا کہ میں کہاں ہوں۔ ہاں دیرینہ میں سے ایک آدھ کو چھوڑ باقی میرے ہاں آ ہی جاتے ہیں" پچھلے دنوں ایبٹ آباد سے ایک دوست ملنے آئے۔ انہوں نے ایبٹ آباد جانے پر اصرار کیا، میں نے انکار کر دیا۔ میں نے کہا "شاہ جی! آپ ان کے ہاں چلے جاتے، ایبٹ آباد صحت افزا مقام ہے۔ ملتان کی گرمی میں آپ کیوں تڑپ رہے ہیں؟" جواب دیا "بیٹا! اب عمر کی اس سطح پر آ گیا ہوں کہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ کتنے لوگ میرے ہاں آتے ہیں، ساری عمر لوگوں کی مہمانی میں گذاری، اب میزبان بن کر بھی دیکھنا چاہتا ہوں"۔

میں نے دیکھا کہ شاہ جی اب کھلنے لگے ہیں۔ چنانچہ کاغذ پنسل سنبھال لی تاکہ یادداشت کے لیے کچھ لکھ لوں۔ شاہ جی نے میری تیاری دیکھی تو انہوں نے بات روک لی۔ میں نے ایک اور سوال کر دیا۔ جواب میں کہا "اخبار والوں سے ڈر لگتا ہے۔ آپ لوگ اکثر واقعات مسخ کر دیتے ہیں۔

پھر غلط بیان دوسرے سے منسوب کر دیتے ہیں۔ اس ضمن میں مولانا عبدالمجید سالک مرحوم کا ایک واقعہ بھی سنایا "یعنی ایک دفعہ سالک مرحوم نے یو۔پی کے ایک جلسے کی تقریر میرے نام سے منسوب کر کے اپنے اخبار "انقلاب" میں چھاپ دی۔ حالانکہ میں نے یو۔پی میں کوئی ایسی تقریر نہیں کی تھی۔ جب ان سے اس غلط تقریر کی شکایت کی تو انہوں نے خاطر خواہ جواب نہ دیا۔ اس پر میں نے ۲۵ سال تک سالک صاحب سے بات نہیں کی۔

ایک دن صوفی تبسّم مجھے پطرس بخاری کے ہاں دعوت پر لے گئے پطرس نے مجھے مدعو کیا تھا۔ اس دعوت میں سالک بھی شریک تھے، وہاں ہم دونوں کی صلح کرائی گئی۔ سالک نے میری پیٹھ پر ہاتھ مار کر کہا "آپ نے میرے پچیس برس تباہ کر کے رکھ دیے ہیں"۔

یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے شاہ جی کے چہرے پر غم کی پرچھائیاں پھیل گئیں۔ ایک لمبی سانس لی پھر کہا "سب یارِ کہنہ بچھڑتے جاتے ہیں ایک دن میں بھی ان میں جا ملوں گا"۔

"پطرس بخاری کے مکان پر ہم چاروں ساتھی ماضی کے نسانے دہرا رہے تھے۔ نماز کا وقت ہو گیا تو میں نے پطرس سے کہا "آپ سیّد ہیں۔ قرآن پاک آپ کے گھر میں اترا، آپ بھی نماز پڑھیں تو کتنی بڑی بات ہے"۔ پطرس نے سن کر سالک مرحوم کو آواز دی "سالک اٹھو! شاہ جی ہمیں زبردستی جنّت میں لے جائیں گے۔

شاہ جی نے سالک مرحوم کا ایک اور واقعہ سنایا۔ فرمانے لگے "میں حاجی مولا بخش سمرو کے مکان پر تھا۔ نمازِ مغرب کے بعد دردو میں

مصروف تھا کہ سالک اور مجید لاہوری وہاں پہنچ گئے۔ سالک نے مجھے وظیفہ پڑھتے دیکھ کر یہ شعر پڑھا۔ ؎

بر زبانِ تسبیح در دِل گاؤ خر
ایں چنیں تسبیح کہ دارد اثر

جب درود سے فارغ ہوا تو کہا۔ میں یقیناً تم دونوں کے خیال میں نہیں تھا۔ شاہ جی بیٹھے بیٹھے تھک گئے۔ یوں بھی دن کے گیارہ بج چکے تھے اٹھے اور یہ شعر پڑھا ؎

پرانی صحبتیں یاد آ رہی ہیں
چراغوں کا دھواں دیکھا نہ جائے

اور پھر اندر چلے گئے۔ اس ملاقات کے بعد مجھے شاہ جی سے باتیں کرنے کا چسکا پڑ گیا۔ اب میں تقریباً ہفتہ میں ایک آدھ بار ضرور شاہ جی سے ملنے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ ہر ملاقات میں شاہ جی سے میں نے اخبار کے رپورٹر کی حیثیت سے سوال پوچھے۔ دو چار ملاقاتوں کے بعد میں نے ایک مختصر فیچر لکھ مارا۔ جب وہ شائع ہوا، تو کچھ مخالفوں نے اسے مسخ کر کے اپنے اخبار میں نقل کیا۔ اس فیچر میں راقم نے اپنے ان جذبات کا اظہار کیا تھا۔

جس مجاہد اور خطیبِ اعظم نے ملک کی آزادی کے لیے اتنی لمبی عمر انگریزوں کے خلاف جنگ لڑی، اور ساتھ ساتھ دین کی خدمت بھی کی، وہ کرائے کے مکان میں رہ رہا ہے۔ حکومت اور سوسائٹی نے ان کی خدمات کی قدر نہیں کی۔ شاہ جی ناراض ہو گئے۔ بہر کیف اُن کی ناراضگی عارضی تھی۔ ایک دن فرمانے لگے "بیٹا! میں اپنوں سے ناراض ہوتا ہوں،

تمہاری نیّت پر شک نہیں کرتا، تم نے تو میرے حق میں اچھا نہیں کیا۔" میں نے دیکھا کہ شاہ جی نے مجھے معاف کر دیا تو ملاقاتوں کا سلسلہ پھر شروع کر دیا۔ چنانچہ ایک دن خود ہی فرمانے لگے۔

"ایک دفعہ دہلی جیل میں مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر انصاری اور میں اکٹھے ہو گئے۔ مولانا آزاد چائے کے بڑے رسیا تھے۔ ایک صبح بڑے اہتمام سے چائے تیار کر کے مجھے پلائی۔ میں چائے پی چکا، تو مولانا نے داد طلب نظروں سے پوچھا "شاہ جی چائے کیسے بنی؟" میں نے کہا "حضرت ایک کمی رہ گئی" مولانا ایسے بھنائے جیسے دماغ پر بجلی گری ہو پوچھا "وہ کیا میرے بھائی؟" میں نے کہا "اس میں دو پتّی زعفران کی بھی ہونی چاہیے تھی"۔ "ہاں میرے بھائی! آپ تو اضافے کی بات کرتے ہیں۔ اچھا میرے بھائی! کل آپ کو زعفران پلاؤں گا" چنانچہ دوسرے روز مولانا نے جیل کے ایک ملازم کو پانچ روپے دے کر زعفران منگوایا اور مجھے زعفران پلائی۔

ایک دفعہ مولانا حبیب الرحمٰن کے ہمراہ مولانا آزاد سے ملنے گیا۔ استفادہ کے لیے چند آیات تفسیر کے لیے پیش کیں۔ مولانا نے اپنے انداز میں ان کی تفسیر بیان کی۔ ہم بہت متاثر ہوئے، تو میں نے کہا "مولانا! خدا آپ کو بہت عمر نصیب کرے" مولانا نے کہا "نہیں میرے بھائی! تھوڑی ہو مگر قرینے کی ہو"

ایک دفعہ میں میرٹھ کے جلسے میں تقریر کر رہا تھا۔ پرشوتم داس ٹنڈن صدر کانگریس بھی جلسے میں موجود تھے۔ انہوں نے کہا "شاہ جی! تلاوت قرآن پاک کریں تاکہ آتما کو سکون ہو" پھر میں نے اس جلسے میں ساڑھے آٹھ گھنٹے تقریر

کی صبح قریب آگئی تو یہ شعر پڑھ کر سٹیج سے اتر آیا ؎

شبِ وصال بہت کم ہے آسمان سے کہو
کہ جوڑ دے کوئی ٹکڑا شبِ جدائی کا

ایک دفعہ میں نے لاہور موچی دروازہ کے باہر تقریر کرتے ہوئے کہا "میں حکومت سے کہتا ہوں کہ وہ مفلسی اور بیکاری کے مسئلے کو حل کرے جو حکومتیں اس مسئلہ کو حل نہیں کرتیں، یہ مسئلہ ان حکومتوں کو حل کر دیا کرتا ہے۔" اس تقریر میں یہ بھی کہا کہ "استبداد کی چکی کا دستہ گورے کے ہاتھ میں ہو یا کالے کے ہاتھ میں، چکی وہی رہتی ہے، اور میں اس چکی کو توڑ دینا چاہتا ہوں۔"

۱۹۳۱ء میں میں نے مسئلہ میراث پر ملک بھر میں تقریریں کیں، جن کا ردِ عمل یہ ہوا کہ آریہ سماج وچھو والی شاہ عالم لاہور میں ہندوؤں کے ایک اجتماع میں کماری ودیاوتی نے کھڑے ہو کر وراثت کا مطالبہ کر دیا۔ ڈی اے وی کالج کے پرنسپل چھبیل داس جلسے کے صدر تھے۔ کماری ودیاوتی نے کہا "اگر آپ اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو وراثت میں حصہ نہیں دیں گے تو ہم مسلمان ہو جائیں گی۔

اس پر صدرِ جلسہ نے کہا: "ہمارے لیے یہ مشکل ہے کیونکہ ہم دور جا کر شادیاں کرتے ہیں۔ لہٰذا جائیداد منتقل نہیں ہو سکتی۔" اس پر کماری ودیاوتی نے کہا۔ آپ جگر گوشہ کو بیاہ کر دور بھیج دیتے ہیں، لیکن زمین کے ٹکڑے نہیں منتقل کر سکتے۔"

میری ان تقریروں سے ہندوؤں میں کافی کھلبلی رہی۔ ۳۲-۱۹۳۱ء میں تحریک کشمیر کے دنوں میں میں نے جس مؤثر انداز میں ریاستی عوام کے

لیے کام کیا، اس سے متاثر ہو کر گول میز کانفرنس لندن میں وزیر ہند نے کہا تھا کہ ہندوستان میں ایک ایسی سحر بیان شخصیت موجود ہے جو بیک وقت دو حکومتوں کے نظام کو معطل کر کے رکھ دیتی ہے۔"

"بیٹا! زندگی کے کتنے واقعات ہیں جو تمہیں سناؤں۔ تم جب آجاتے ہو کتابِ زندگی کا ایک ایک ورق سامنے آجاتا ہے۔ اب اتنی ہمت بھی نہیں کہ ان اوراق کو اُلٹوں۔

لندن آنے کی دعوت

ضابطۂ حیات کی طرح اصولِ آدمی بھی ایک آئین ہے۔ جسے انسان احساس کے سانچے میں ڈھالتا ہے، اگر یہ سانچہ ٹوٹ جاتے تو آدمیت داغ دار ہو جاتی ہے۔

۱۹۵۸ء کے آخر میں انٹرنیشنل تبلیغی مشن لندن کے سیکرٹری راؤ شیر علی نے حضرت امیر شریعتؒ اور حضرت مولانا لاہوری کو لندن آنے کی دعوت دی، اور اس کے لیے تمام امکانی سہولتیں بہم پہنچانے کا وعدہ کیا، یہاں تک کہ خود انجمن کے افراد بھی لندن سے دونوں حضرات کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ لیکن حضرت امیر شریعتؒ نے ان حضرات کی درخواست کے جواب میں فرمایا:

"بھائی! اوّل تو میں اپنی صحت کے پیش نظر اس سفر کے قابل نہیں ہوں۔ اگر ہوتا بھی تو جس (انگریز) نے ڈیڑھ سو برس میرے ملک کو غلام رکھا، اس کا خون چوسا، اور جاتی دفعہ فتنہ و فساد کا ایسا تخم چھوڑ گیا کہ برصغیر پاک و ہند کے انسانوں کے مابین کبھی امن قائم ہو ہی نہیں سکتا۔

دوسرا میں نے اپنی زندگی کے قریباً چالیس برس ان کی مخالفت کی ہے اس بنا پر میرا ضمیر اس ملک میں جانے کی اجازت نہیں دیتا۔

اس پر ان لوگوں نے جب مزید اصرار کیا، تو فرمایا:

"بھائی! میں اصول کا آدمی ہوں، اور اسی اصول پر زندگی کے چالیس برس گزارے ہیں۔"

حضرت لاہوریؒ کو جب امیر شریعتؒ کی اس رائے اور فیصلے کا علم ہوا تو انہوں نے بھی اسی قسم کا جواب دیا۔

اراضی کی پیشکش

ملتان کے ڈپٹی کمشنر مسٹر مختار مسعود نے اپنے ایک قریبی دوست کی وساطت سے امیر شریعتؒ سے ملنے کی خواہش کی۔ اس کے امیر شریعتؒ سے بھی گہرے مراسم تھے۔ اس بھروسے پر متعلقہ شخص نے ڈپٹی کمشنر سے وعدہ کر لیا کہ وہ امیر شریعتؒ کو کسی دن ان کے پاس لے آئے گا۔ چنانچہ اس نے امیر شریعت سے ڈپٹی کمشنر کی خواہش کا اظہار کیا تو فرمایا کہ کسی دن چلیں گے۔" آخر اتوار کا دن مقرر ہوا۔ امیر شریعت حسبِ وعدہ ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی پہنچے۔ مسٹر مختار مسعود بڑے خوش ہوئے اور امیر شریعتؒ کی آمد پر اپنے کمرے کو خاص انداز سے آراستہ کیا۔ امیر شریعتؒ جیسے ہی کار سے اترے ڈپٹی کمشنر پذیرائی کے لیے آگے بڑھے۔ کمرے میں بیٹھتے ہی ہمہ اقسام کے مشروبات سامنے لائے گئے۔ لیکن امیر شریعت نے فرمایا:

"بھائی! میرے لیے تو سادہ اور ٹھنڈا پانی منگوا دو۔ بڑی مہربانی ہوگی۔"

ڈپٹی کمشنر نے باصرار کہا "یہ سارا کچھ بھی تو سادہ ہے۔" اس پر امیر شریعتؒ نے کہا:

"اس سادگی پر مجھے غالب کا یہ شعر یاد آگیا ؎

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا!
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

میز مشروبات سے سجا رکھی ہے، ساغر و مینا کا سا سماں باندھ رکھا ہے، اور ابھی یہ سارا کچھ سادہ ہے، سبحان اللہ۔"

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد فرمایا:

"آپ کا حکم نامہ ملا تو سوچا، چلو اسی بہانے اپنا ایک کام ہی کرتا آؤں۔"
اس فقرے سے ڈپٹی کمشنر کو گمان ہوا کہ شاہ جی کوئی ذاتی بات کہنے لگے ہیں چنانچہ بڑی بے تابی سے ڈپٹی کمشنر نے کہا "فرمایئے۔"

امیرِ شریعتؒ نے چند کاغذات نکال کر ان کے سامنے رکھے اور کہا:

"سارے مغربی پاکستان میں تحفظ ختم نبوّت کے دفاتر حکومت نے واگزار کر دیے ہیں، لیکن ملتان کا دفتر ہنوز سربمہر ہے، اگر آپ یہ دفتر کھولنے کی اجازت دے دیں تو میں ممنون ہوں گا۔"

اس کے جواب میں ڈی سی نے کہا، شاہ جی! یہ کام تو صوبائی حکومت کی پالیسی سے تعلق رکھتا ہے۔ البتہ میرے بس میں تو یہ ہے کہ میں آپ کو چھ سات مربعے اراضی دے سکتا ہوں، اور اس میں ٹیوب ویل کا انتظام بھی کرا سکتا ہوں۔"

اس پر امیرِ شریعتؒ مسکرائے، اور فرمایا:

"مختار صاحب! میں اپنی ذات کے لیے حاضر نہیں ہوا۔ باقی رہے آپ کے مربعے اور اس کی پیش کش تو اس کے لیے شکریہ!"

یہ کہا اور وہاں سے چلے آئے ——— یہ اگست ۱۹۵۹ء کی بات ہے۔

دعائے صحت کے لیے

۱۹۶۰ء میں امیرِ شریعتؒ کے معالج حکیم حنیف اللہ نے حج بیت اللہ کا ارادہ کیا، اور اس کے لیے درخواست دی۔ امیرِ شریعتؒ کو جب اس کا علم ہوا تو حکیم صاحب سے کہا:

"جب آپ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر پر حاضر ہوں تو میرا سلام عرض کریں اور میری صحت کے لیے دعا کی درخواست کریں۔"

حکیم حنیف اللہ اس پر خاموش رہے، لیکن امیرِ شریعتؒ نے انہی دنوں ان کے

والد حکیم عطاء اللہ خاں سے اس بات کا ذکر کیا، تو بڑے حکیم صاحب نے کہا:

"شاہ جی! گذشتہ دنوں میں نے آپ کی یہ درخواست خاتم الانبیاءؐ کی خدمت میں پیش کردی ہے"۔

امیر شریعتؒ: (تعجب سے) "وہ کیسے"۔

حکیم صاحب: "مجھے پچھلے دنوں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی ہے۔ میں نے دیکھا کہ سرورِ کائنات کے گرد ایک حلقہ بیٹھا ہے میں بھی اس میں شامل ہوں۔ میں نے حضور کی خدمت میں عرض کیا۔ "سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کی صحت کے لیے دعا فرمائیں"۔ مگر حضور نے دعا کے لیے ہاتھ نہیں اٹھائے، بلکہ ایک کاغذ کی طرف اشارہ کیا، جس پر لفظ "صحت" لکھا تھا"۔

امیر شریعتؒ یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور حکیم حنیف اللہ سے آکر کہا۔

"آپ نے تو میری درخواست حضورؐ کی خدمت میں لے جانے کی حامی نہیں بھری تھی، اگر بڑے حکیم صاحب نے یہ کام کر بھی دیا"۔

یہ کہہ کر تمام واقعہ بیان کر دیا۔

والد صاحب کا خواب سن کر حکیم حنیف اللہ نے اس کا ذکر اپنے استاد حضرت مولانا عبدالرؤف سے کیا، جن سے انہوں نے حدیث اور فقہ پڑھی تھی۔ انہوں نے فرمایا۔

"اس خواب کی یہ تعبیر نہیں جو شاہ جی سمجھے ہیں، بلکہ یہ ہے کہ شاہ جی کو روحانی صحت ہوگی یعنی ان کے وصال کا وقت قریب آگیا ہے"۔ لیکن مصلحتاً امیر شریعتؒ کو یہ تعبیر نہیں بتائی گئی تھی۔

شعر و شاعری

۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۹ء تک امیر شریعت امرتسر میں زیر تعلیم رہے انہی دنوں طبیعت میں شعر و شاعری کا ذوق بھی اُبھرا، اور اس کے لیے مولوی محمد دین جن کا تخلص غریب تھا، کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے ذوق کی تکمیل کرنے لگے۔

اور اپنا تخلص "ندیم" تجویز کیا۔ کبھی کبھار مولوی محمد دین غریب انہیں کوئی مصرعہ دے دیتے کہ اس پر گرہ لگاؤ، چنانچہ ایک دفعہ مصرعہ طرح دیا کہ: ع

وہ آنکھوں میں موجود اور چشم حیراں

اس پر امیر شریعت نے یوں گرہ لگائی ؎

وہ آنکھوں میں موجود اور چشم حیراں
ادھر ڈھونڈتی ہے اُدھر ڈھونڈتی ہے"

اس گرہ پر مولوی محمد دین غریب بہت خوش ہوئے۔

عمر رواں کے ساتھ جب کبھی طبیعت موزوں پاتے، فارسی اور اردو میں شعر کہتے۔ چنانچہ ان کے اردو اور فارسی کلام کا مجموعہ ۱۹۵۵ء میں "سواطع الالہام" کے نام سے شائع ہوا۔

گرتی ہوئی دیوار کی طرح امیر شریعت کی صحت کو بڑے سہارے دیئے جاتے رہے، لیکن پھول اپنی بہاریں [illegible] چکا تھا۔ اب گھر میں محفلیں قائم ہوئیں، احباب صبح و شام جمع رہتے، اور [illegible] شاعری کا دربار لگتا۔ ان محفلوں میں جو لوگ شریک ہوئے ان میں فیض احمد فیض، صوفی تبسم، علامہ لطیف انور گورداسپوری، مولانا عبدالرشید نسیم (جو اخبارات میں علامہ طالوت کے نام سے معروف تھے) عبدالحمید عدم اور ساغر صدیقی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس دوران حکیم صاحب نے ایک دن سوال کیا۔ شاہ جی! ایسا لگتا ہے جیسے آپ قوم سے مایوس ہو چکے ہیں"۔ جواب میں ایک سرد آہ کے ساتھ فرمایا:

"آپ طبیب ہو کر ایسا سوال کرتے ہیں۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں سکرات کا عالم طاری ہو جائے، تو آپ مریض کی زندگی سے مایوس نہیں ہو جائیں گے؟ بس ایسی حال قوم کا ہے، اس سے مایوس نہ ہو جاؤں

تو اور کیا ؟

اگر کوئی ان دنوں گھر آکر پوچھتا: "شاہ جی! کیسی طبیعت ہے"؟ تو جواب میں اکثر یہ دو شعر پڑھتے ؎

نہ جانے لوگ کیوں ہنستے ہیں میرے چاک داماں پر
جنوں میں جیسا ہونا چاہیے ویسا گریباں ہے

یا

بے دلی ہائے تمنّا، کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنّا، کہ نہ دنیا ہے نہ دیں!

ایک نامہ نگار سے! روزنامہ "کوہستان" (ملتان) کا نامہ نگار انہی حالات میں ملاقات کے لیے حاضر ہوا، اور اس نے واپسی پر حسبِ ذیل تاثرات ۸ ستمبر ۱۹۶۰ء کے "کوہستان" میں اس طرح بیان کیے:

"میں شاہ جی کو ملنے ان کے مکان پر پہنچا، تو وہ کسی کام سے باہر گلی میں کھڑے تھے۔ علیک سلیک ہوئی اور ہم بیٹھک میں جا بیٹھے انہوں نے چارپائی کا سہارا لے کر زمین پر دھرنا مار لیا اور میں بھی ان کی تقلید میں اسی طرح بیٹھ گیا۔ بیٹھک میں ایک چارپائی، ایک الماری اور چند کتابیں بکھری پڑی تھیں۔ میں نے شاہ جی سے ان کی صحت کے بارے میں پوچھا، تو کہنے لگے کہ ذیابیطس کے ساتھ فالج کی شکایت زور پکڑ رہی ہے۔ ذیابیطس کی شکایت پہلے بھی تھی، لیکن ۱۹۵۲ء میں جیل گیا تو بیماری زور پکڑ گئی۔ ۱۹۵۶ء سے آج تک اس چارپائی پر پڑا ہوا ہوں۔ پھر کہنے لگے، آج آپ کا اخبار پڑھ رہا تھا۔ ایک خبر تھی "اگر روس نے امریکہ کے کسی حلیف ملک پر راکٹ پھینکا تو روس پر

راکٹوں کی بارش کر دی جائے گی۔" ارے ان کم بختوں سے کوئی پوچھے کہ تم موت کا علاج کر رہے ہو یا زندگی کا علاج کر رہے۔ غالب شاہ جی کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اس کا یہ شعر پڑھا۔

ہاں کھائیو مت فریب ہستی
ہر چند کہیں ہے کہ نہیں ہے

اس کے بعد سر پکڑ کر بیٹھے رہے۔ میں نے بات کرنا چاہی، تو کہنے لگے، دعا کرو قبر کے لیے زمین نصیب ہو جائے، رہنے کے لیے گھر تو نہیں ملا۔ متعدد بار قرعہ اندازی میں حصہ لیا لیکن قرعہ نہیں نکلا۔ ۱۹۴۸ء سے اسی کرایے کے مکان میں رہ رہا ہوں۔ ہندوستان میں دو مکان چھوڑے تھے۔ یہاں آکر کچھ بھی نہیں ملا، اور نہ ہی میں نے کوشش کی ہے۔ کلیم منظور ہو گیا ہے۔ قرعہ اندازی میں کچھ ملا نہیں۔ اب نقد معاوضے کی آس لگائے بیٹھا ہوں شاید مل جائے۔

ایک زمانہ تھا کہ شاہ صاحب کے گرد ہر وقت عقیدتمندوں کا ہجوم رہتا تھا، اب نذرِ بیان ختم ہو گیا تو سب احباب دور ہو گئے ہیں۔ اب صرف وہ دیہاتی ملنے آتے ہیں جو ان کے مرید ہیں اور ان سے گہری عقیدت رکھتے ہیں۔ کچھ احباب ساون کے بادلوں کی طرح چھٹ گئے اور کچھ اللہ کو پیارے ہو گئے جو باقی رہ گئے وہ زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ہو لیے۔ اب شاہ جی اور بڑھاپے کا یارانہ رہ گیا وہ بھی نہ جانے کب ٹوٹ جائے!!

فالج کا دوسرا بڑا حملہ

۲۔ جنوری ۱۹۶۱ء کو فالج کا دوسرا بڑا حملہ ہوا تو اس سے رہی سہی صحت بھی برباد ہو گئی۔ پیشتر کبھی کبھار اگر معالج کے مطب تک چلے بھی جاتے تھے، تو اس حملے نے وہ ہمت بھی چھین لی۔ اب تو گھر کی چار دیواری

کے سوا کوئی ٹھکانہ نہ تھا معالج خود مریض کے ہاں آتے۔ ان دنوں امیر شریعتؒ نے حکیم عطاء اللہ خاں سے کہا:

"آپ کے زیرِ علاج اس لیے نہیں ہوں کہ آپ بڑے قابل حکیم ہیں، بلکہ اس لیے ہوں کہ آپ بہت نیک آدمی ہیں۔ شاید آپ کی نیکی کی وجہ سے میرے گناہوں کا کفارہ ہو جائے۔"

ایسا لگتا ہے کہ امیر شریعتؒ اس حملے کے بعد اپنی روحانیت سے محسوس کر چکے تھے کہ آخری وقت آن پہنچا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے ہر تیمار دار سے کچھ عجیب سی گفتگو کرتے۔ مولانا لسین نے ایک دفعہ کہا "شاہ جی کی بیماری کے دنوں میں بھی چہرے کی سرخی نہیں گئی، ہلکی سی مسکراہٹ سے فرمایا:

"یہ سرخی تو میرے مرنے کے بعد بھی رہے گی۔ یہ ہمارے خاندان کی ریت ہے کہ مرنے کے بعد بھی عارض کی سرخی نہیں جاتی۔"

فالج کا آخری حملہ ۲۰ مارچ ۱۹۶۱ء کو فالج کا تیسرا شدید حملہ ہوا، جس کا اثر زبان اور گلے پر پڑا۔ اس حملے نے تمام احباب کو پریشان کر دیا۔ اکثر شہروں میں تو امیر شریعتؒ کی موت کی خبر بھی مشہور ہو گئی۔ اخبارات کے دفاتر سے ٹیلیفون اور برقی پیغامات کے ذریعے اس خبر کی تحقیق اور دریافت ہونے لگی۔ لیکن چند گھنٹوں کے بعد طبیعت نے فوراً سنبھالا لیا تو احباب کو خیریت کی اطلاع دی گئی۔ لیکن اس حملے سے امیر شریعتؒ کی زبان گفتگو سے عاری ہو گئی، گلا بند ہو چکا تھا، بڑی مشکل سے آواز سمجھ میں آتی تھی، وہ بھی کان منہ سے لگانے پر۔ انہی دنوں لاہور سے دوسرے احباب کے علاوہ شیخ حسام الدین بیمار پرسی کے لیے ملتان آئے تو امیر شریعتؒ نے شیخ صاحب کے کان میں کہا:

"میری زندگی میں مجھے اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ عطاء اللہ یہ زبان بھی تیری

نہیں میری ہے، میں جب چاہوں، اسے چھین بھی سکتا ہوں۔"

ماہنامہ "تبصرہ" کا بخاری نمبر

امیرِ شریعتؒ کے اس شدید حملے کے باعث جہاں ان سے سیاسی اور مذہبی اختلاف رکھنے والوں کو پریشانی ہوئی، وہاں ملک کے اخبارات نے بھی نوٹ لکھے اور امیرِ شریعت کی قومی اور ملّی خدمات کے پیشِ نظر حکومت پاکستان کو ان کی تیمارداری کی طرف متوجہ کیا۔ اس ضمن میں جون ۱۹۶۱ء کو ماہنامہ "تبصرہ" لاہور نے اپنا "بخاری نمبر" نکالا، جس میں برصغیر کے تمام اہلِ قلم نے امیرِ شریعت کو نظم و نثر کے ذریعے خراجِ تحسین ادا کیا، جن میں مولانا غلام رسول مہرؔ، دیوان سنگھ مفتونؔ، مولانا نصر اللہ خاں عزیزؔ، احسان دانشؔ، علامہ لطیفؔ انورؔ، احمد ندیم قاسمی، قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند، حافظ علی بہادر (بمبئی) ان کے علاوہ اس عظیم نمبر کے لیے آندھرا پردیش (بھارت)، کے گورنر لالہ بھیم سین سچر کا خط بھی قابلِ مطالعہ ہے:

راج بھون۔ حیدر آباد، ۹۔ اپریل ۱۹۶۱ء

پیارے شری غلام نبی صاحب جانباز جی آداب عرض،

آپ کا گرامی نامہ ملا، یاد آوری کا شکریہ!

آپ نے شکوہ کیا ہے کہ میں نے آپ کے خط کا جواب نہیں دیا لیکن مجھے تو آپ کا اور کوئی خط ملا ہی نہیں۔ صرف زیرِ جواب خط ہی مجھ تک پہنچا ہے اور اب شاید آپ کے خاص نمبر کے لیے میرا پیغام بعد از وقت ہوگا۔

جہاں تک سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا تعلق ہے، وہ ان چند بے خوف شخصیتوں میں سے ہیں، جن کے لیے میرا دل بے پناہ احترام کے جذبات سے معمور رہا ہے۔

میں جب ان سے پہلی بار متعارف ہوا تھا تو میرا تاثر یہی تھا کہ شاہ جی شمعِ حریّت کے سرفروش پروانے اور جدوجہد آزادی کے جانباز سپاہی ہیں، جرأت

ذہانت اور تبحرِ علمی کے ساتھ ساتھ خدا نے انہیں فصاحت و بلاغت کے
نایاب جوہر سے بھی نوازا ہے۔

جب ہم ان کی تقاریر سنا کرتے تھے تو ہماری دلی آرزو ہوتی کہ شاہ صاحب موتی بکھیر رہے ہیں اور ہم قلب و نظر کو ان سے منور کرتے رہیں۔ وہ سامعین کو مسحور کرنا جانتے تھے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان کی تقریر کب ختم ہو۔ کیونکہ نہ تو شاہ صاحب کے ہاں متنوّع مضامین کی کمی ہوتی اور نہ ان کی جسمانی تھکاوٹ ہی سلسلۂ تقریر میں حائل ہوتی۔ شاہ جی جیسے بہادر انسان جو انسانیّت کی اعلیٰ اقدار کے حامل ہیں، ہمارے دلی احترام کے مستحق ہیں۔

میں صدقِ دل سے دعا گو ہوں کہ خدا شاہ جی کو جو یقیناً ایک ناقابلِ تسخیر شخصیّت کے مالک ہیں، صحتِ کاملہ عطا فرمائے، اور تادیر سلامت رکھے کہ ایسے نادرِ روزگار لوگ بار بار پیدا نہیں ہوتے۔

آپ کا مخلص : بھیم سین سچر"

نشتر ہسپتال

دستِ فطرت انسان کو جب عقلِ کامل سے نواز کر کارگاہِ عالم میں چھوڑتا ہے تو آسمان سے زمین تک کی ہر شئے اس کے قدموں میں ہوتی ہے، پھر کبھی توانا ہو کر انسان ناتوانوں کی بے بسی کا تماشا کرتا ہے اور کبھی خود اپنے زوال کی کہانی گلیوں کے موڑوں پر بیان کرتا پھرتا ہے۔ یہی قانونِ فطرت ہے۔ عروج و زوال کی اس داستان کا مصنّف انسان خود ہی ہے۔

حضرت امیرِ شریعت توانا تھے، جوانی اور صحت ان کی بلائیں لیتی۔ گلے کی حلاوت زبان کا طرزِ تکلّم ہمیشہ ان کے غلام رہے۔ جب وہ غیر ملکی سلطنت کے ظلم و جور کی دھجیاں بکھیرتے اور بغاوت کا علم لے کر پہاڑوں کو اپنے ساتھ آنے کی دعوت دیتے، تو وہ پانی پانی ہو کر ان کے ساتھ بہہ نکلتے۔ سمندروں کو آواز دیتے تو ان کی گہرائیاں ابھر کر سامنے

آجاتیں۔ رات کی سیاہی اور دن کے اجالے انہیں اپنے جلو میں لے کر چلتے، جس کی ہیبت سے ایوانِ برطانیہ لرز جایا کرتے تھے، جب اس کا کام ختم ہوگیا اور اس کے عروج کی پرچھائیاں ڈھلنے لگیں تو فضائیں گنگنائیں، ؎

ڈوبتے سورج کو وقتِ شام دیکھ
حسن والے حسن کا انجام دیکھ

فالج کے اس حملے نے ملک بھر میں تشویش پیدا کر دی اور احباب نے فیصلہ کیا کہ امیر شریعتؒ کو نشتر ہسپتال میں داخل کرا دیا جائے، لیکن امیر شریعتؒ کو جب اس فیصلہ کا پتہ چلا تو فرمایا۔

"آپ لوگ مجھے فاسق اور فاجروں کے ہاتھوں میں سونپ رہے ہیں۔"

وہ اس کے لیے تیار نہیں تھے، مگر اس کے باوجود مارچ کے آخری دنوں انہیں نشتر ہسپتال (ملتان) میں داخل کرا دیا گیا۔ ڈاکٹروں نے اپنی ذمہ داریوں کو پوری طرح نبھایا۔ انہی دنوں صدرِ مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے ہسپتال کے انچارج ڈاکٹر عالمگیر کو ہدایت بھیجی کہ

"حضرت شاہ صاحب کی صحت کا خیال کریں، اور ان کے علاج پر پوری ذمہ داری سے توجہ دیں۔ اگر پاکستان کے باہر سے بھی کسی معالج کی یا دوا کی ضرورت محسوس ہو تو، فوراً درآمد کریں۔ نیز اس کا بل میرے نام گورنمنٹ ہاؤس بھیج دیں۔"

امیر شریعتؒ کے دوسرے بڑے لڑکے سید عطاء المحسن کے علاوہ مولانا زین احمد خاں (یہ مولانا گل شیر کے قریبی عزیز ہیں) اور ایک رضاکار غلام محمد دیکھ بھال کے لیے ان دنوں ہسپتال میں رہے، یہاں ہر روز مغربی پاکستان سے آنے والے تیمارداروں کا ہجوم رہتا۔

بیماری کے دنوں امیر شریعتؒ اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی ہمیشہ کھڑی رکھتے۔

بعض دوستوں نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا:

"میں نے تمام عمر توحید پر وعظ کیا ہے، اور عمر کے آخری حصے میں بھی اس تصور کو قائم رکھنا چاہتا ہوں۔"

ہسپتال میں امیر شریعت کی دیکھ بھال کے انچارج ڈاکٹر بشیر احمد نے ایک دن ایسا ٹیکہ لگا دیا، جس کے باعث نبضیں ڈوبنے لگیں، دل بیٹھنے لگا۔ بڑھتے بڑھتے یہ تکلیف اس حد تک بڑھی کہ امیر شریعتؒ کو اپنی موت کا گمان ہونے لگا، اور انھوں نے اپنے خادم مولانا زرین احمد خاں سے فرمایا:

"اس ٹیکے سے میرا کام ہو چکا ہے، لہٰذا آپ گواہ رہیں ــــ (یہ کہہ کر آپ نے تین دفعہ کلمہ شہادت تین دفعہ 'لانبی بعدی' کی حدیث پڑھی، اور اس کا ترجمہ کیا) نیز فرمایا تمام دوستوں سے میرا اسلام کہنا اور کہنا کہ دین کا کام بہر حال کرتے رہیں۔"

یہ تکلیف نمازِ عصر سے شروع ہو کر ساری رات رہی، لیکن ہسپتال کے انچارج کو اس واقعہ کی اطلاع رات ایک بجے دی گئی، جیسے ہی انھوں نے آکر امیر شریعتؒ کی حالت دیکھی کہ چہرے کی رنگت سیاہ پڑ چکی ہے اور پاؤں پر ورم آگیا ہے تو انھوں نے زور سے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا، اور غصے میں کہا جب یہ حالت تھی تو مجھے کیوں اطلاع نہ دی اس پر دونوں ڈاکٹروں کے درمیان انگریزی میں کافی دیر تلخ کلامی رہی، جس کا مفہوم یہ تھا کہ امیر شریعت کو یہ ٹیکہ کیوں لگایا گیا؟ آخری رات اڑھائی بجے دوسرا ٹیکہ لگایا تو صبح ہونے تک طبیعت سنبھلی۔

کچھ دنوں بعد ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ شاہ جی تھوڑی دیر کے لیے اپنے کمرے سے باہر تفریح کیا کریں، اس ہدایت پر بڑی مشکل سے آمادہ ہوئے، حالانکہ چل نہیں سکتے تھے، لیکن جیسے ہی صحن میں ٹہلنے لگے۔ گردن اونچی کر لی اور چھاتی تان کر فرمایا۔

"عمر بھر دشمنوں کے سامنے سر اونچا کر کے چلتا رہا ہوں لیکن آج اگر

دشمنوں کو پتہ چل گیا کہ میں بیماری کے باعث کمزور ہو گیا ہوں، تو وہ خوش
ہوں گے، اس لیے نقاہت کے باوجود میں چھاتی تان کر رکھنا چاہتا
ہوں تاکہ دشمن سمجھے کہ بخاری ابھی زندہ ہے۔"

ہسپتال میں بعض اوقات کافی دیر تک بیہوشی رہتی، لیکن تیمارداروں اور خادموں
کو تاکید تھی، کہ مجھے نماز کا وقت اور رُخ بتا دیا کریں۔"

ذیابطیس کی وجہ سے کثرتِ بول کا عارضہ تھا، مگر اس کے باوجود وضو کر کے نماز
پڑھتے رہے یا پھر کبھی کبھار تیمّم کر لیتے، مگر نماز نہیں چھوڑی۔ البتہ خادموں کو رکعتیں
بتانی پڑتی تھیں۔

ہسپتال میں مولانا یٰسین نے سوال کیا: "شاہ جی! حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی
عمر اس وقت اسّی نوّے سال کے قریب ہے اور حضرت لاہوری کی عمر بھی آپ سے زیادہ
ہے، لیکن آپ بہت جلد کمزور ہو گئے ہیں۔ جواب میں فرمایا:

"بھائی! ان لوگوں کے گھر آباد ہیں اور میں اپنا گھر اجڑا ہوا دیکھ رہا
ہوں، یہی صدمہ مجھے موت کے قریب کر رہا ہے۔"

اپریل کے آخری دن تھے کہ سید سبط حسن (سابق ایڈیٹر ہفت روزہ لیل و نہار
لاہور) بمعہ چند احباب کے عیادت کے لیے ہسپتال آئے۔ تعارف کے بعد ایک نوجوان
نے کہا: "شاہ جی! میرا نام ذوالفقار علی ہے اور میں پطرس بخاری کا بھائی ہوں۔" امیرِ شریعتؒ
یہ نام سنتے ہی بے اختیار رونے لگے، اور اس قدر روئے کہ تمام محفل ان کے ساتھ رونے
لگ پڑی۔ سید سبط حسن کی بیوی نے اپنا تعارف کرایا تو وہ بھی امیرِ شریعتؒ کے کسی
دوست کی لڑکی نکلی۔ اس پردہ بچی بے اختیار امیرِ شریعت سے لپٹ گئی۔ آخر یہ محفل
شعر و شاعری میں منتقل ہو گئی۔

مارچ کے کچھ دن سے مئی کا ابتدائی حصہ گذار کر امیرِ شریعت نشتر ہسپتال سے

واپس گھر آ گئے، لیکن بیماری سے کوئی افاقہ نہ ہوا۔

دُعائے صحت نشتر ہسپتال سے واپسی کے بعد ملک بھر میں مایوسی پھیل گئی۔ دلوں میں کئی قسم کے وسوسے ابھرے۔ برصغیر کا عظیم خطیب کروڑوں انسانوں کے دلوں کا حکمران زندگی کے اس موڑ پر آن پہنچا، جہاں زندگی مستعار ملتی ہے، لیکن موت سے کوئی سودا نہیں کیا جا سکتا۔ اس مقام پر پاکستان کے اخبارات نے امیرِ شریعت کی صحت پر عوام اور حکومت دونوں کو متوجہ کیا۔ مساجد میں دعائیں مانگی گئیں۔ بھارت کے مسلمانوں نے بھی امیرِ شریعتؒ کی صحت کے لیے دعائیں مانگیں۔ ان دنوں کے اخبارات کے اقتباس حسبِ ذیل ہیں۔

> "بہر نوا استخلاصِ وطن کے عظیم کارنامے کی انجام دہی سے عہدہ برآ ہونے والوں میں مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری ایک ممتاز مقام کے حامل خطیب ہیں۔ ان کی سیاست اور ان کے کام میں غلطیوں کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ اور پھر انبیاء کے سوا کون ہے جو غلطیوں سے مبرّا ہو، لیکن شاہ جی کی جرأت، قربانی، ایثار اور اسلام دوستی سے انکار ممکن نہیں اور ان کی ساحرانہ خطابت نے باطل کے خلاف لڑنے کا جو ولولہ ملّتِ اسلامیہ میں پیدا کیا، اس کی قدر افزائی شرطِ نجات کے مترادف ہے۔
>
> برصغیر کے یہ خطیب ایک عرصے سے علیل ہیں۔ مرض بھی ایسا ہے جو اعضاء ہی کو شل نہیں کرتا، اعصاب، ذہن اور دل کو بھی ماؤف کر سکتا ہے۔ پچھلے دنوں سے مرض میں شدید اضافہ ہوا ہے۔ ہم سب کو اپنے خالقِ حقیقی سے اس عظیم انسان کی زندگی کی بھیک مانگنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ انہیں عمرِ خضر عطا فرمائے۔"

ہفت روزہ "المنبر" لائل پور

"یہ خبر کئی ماہ سے عوامی حلقوں کی پریشانی کا موجب بنی ہوئی ہے کہ امیرِ شریعتؒ حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری سخت بیمار ہیں ان کی زبان میں جس کی سحر طرازی کی کبھی — زمانے میں دھوم تھی، لکنت پیدا ہو چکی ہے، اور ایسا لگتا ہے جیسے خدانخواستہ یہ چراغ آخر شب میں چند لمحوں کا مہمان ہو۔

حضرت شاہ صاحب کے سیاسی نظریات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن اتنی بات تو ان کے دشمن بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ ان کی ذات جدوجہدِ آزادی کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے، انہوں نے اپنے طرزِ فکر کے مطابق ملک کو آزاد کرانے کے لیے ایک عمر قید و بند میں بسر کی اور اس راستے میں ہر مصیبت کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔ قادیانیت کے خلاف ان کا جہاد باللسان تو بالخصوص اُمت پر ایک عظیم احسان ہے! ایسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ پاکستانی قوم کا فرض ہے کہ وہ بیماری کے زمانے میں اس بطلِ جلیل کے علاج معالجے کے لیے ہر طرح کے ذرائع و وسائل فراہم کرے۔ بعد میں کفِ افسوس ملنے سے کیا فائدہ؟ اب وقت ہے کہ حکومت اور شاہ جی کے معتقدین اور ملک کے عوامی حلقے اپنا فرض ادا کریں ؎

ہمارے بعد اندھیرا رہے گا محفل میں
بہت چراغ جلاؤ گے روشنی کے لیے"

روزنامہ "امروز" لاہور

"امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی علالت کے تازہ حالات نے جذبات کی دنیا میں ایک طلاطم بپا کر دیا ہے، ان پر فالج کا ایسا حملہ ہوا

کہ ان کی قوت گویائی متاثر ہو چکی ہے۔ مگر یہ خیال ہوتا ہے کہ اس بلبل ہزار داستان کی یہ قوت تو سیاسی کشمکش نے پہلے ہی چھین لی تھی، یا دوسرے الفاظ میں مفلوج کر دی تھی۔

انڈو پاکستان کے وہ بہترین خطیب ہیں۔ کاش زندگی میں پھر ان کی تقریر ہو اور اس میں کبھی زار و قطار روئیں اور کبھی بے اختیار ہنسیں۔

قرآن حکیم میں موسیٰ علیہ السلام کی دعا ہے۔ اے اللہ! میری زبان کھول دے، تا کہ لوگ میری بات سمجھ لیں۔

معلوم نہیں حضرت شاہ صاحب نے کبھی یہ دعا مانگی تھی یا نہیں۔ مگر اللہ نے ان کی زبان میں یہ طاقت ضرور عطا فرمائی تھی کہ دشمنوں کا مجمع بھی تقریر سن کر رام ہو جاتا تھا۔ پاک و ہند کی آزادی کے لیے ان کے طوفانی دورے اور ان کی خطیبانہ فتوحات تاریخ کے صفحات میں زریں حروف سے لکھنے کے قابل ہیں۔

کلام میں عجیب سحر تھا۔ جہاں چاہتے رُلا دیتے، جہاں چاہتے ہنسا دیتے، اکثر اوقات ان کی تقریر کا سلسلہ مؤذن کے نعرۂ تکبیر پر ہی ختم ہوتا تھا۔ لیکن مجال ہے کہ ہزارہا حاضرین میں سے کوئی اٹھ جائے یا اونگھ جائے۔

ایسا عدیم المثال خطیب پاکستان میں خاموش زندگی گزار رہا ہے۔ حضرت شاہ صاحب کے ہم جیسے عقیدتمندوں اور رفیقوں کے لیے یہی حقیقت کافی دردناک ہے کہ ان کے مرض میں کوئی افاقہ نہیں ہوا، اور وہ ہسپتال سے مایوس واپس آ گئے ہیں۔

آؤ! ہم دل کی گہرائیوں سے دعا مانگیں کہ اے پروردگار! اپنے

حبیب کے صدقے میں حضرت شاہ صاحب کو صحت عطا فرما اور ہماری یہ حسرت پوری کر دے کہ ایک بار پھر ان کی خطابت سے ملّت میں نئی زندگی آ جائے۔

روزنامہ "انجام" کراچی

پھر لاہور میں

حالات سے پریشان ہو کر جون کے ابتدائی ہفتہ میں امیرِ شریعت کو پھر لاہور میں لایا گیا۔ اب کے وہ مالکانِ سلطان فونڈری کے ہاں ماڈل ٹاؤن بلاک بی۔ کوٹھی نمبر ۲۷، میں ٹھہرائے گئے۔ لاہور میں ان کے علاج کے لیے دو الگ الگ بورڈ تجویز ہوئے۔ میڈیکل بورڈ ڈاکٹر کرنل ضیاء اللہ اور ڈاکٹر محمد یوسف پر مشتمل تھا، جبکہ اطباء کے بورڈ میں حسب ذیل لوگ شامل تھے، حکیم محمد حسن قرشی، حکیم نیر واسطی، حکیم نبی احمد سویدا (پوتا حکیم اجمل خاں)، حکیم شیدائی اور حکیم محمد اسمٰعیل جگرانواں والے۔

یہ سب معالج مشورے سے علاج کرتے رہے، ان دنوں امیرِ شریعتؒ کی تیمارداری کے لیے ان کا لڑکا سید عطاء المحسن پاس رہا، کبھی کبھار امیرِ شریعتؒ کے حرمِ محترم اور دوسرے بچے بھی آتے رہے۔

امیرِ شریعتؒ ۱۹۲۱ء میں پہلی دفعہ لاہور انجانے عالم دین کی حیثیت سے آئے تھے اور ۱۹۶۱ء میں جب آخری بار لاہور لائے گئے تو سارا لاہور ان کو دیکھنے اُمڈ آیا، اور کیوں نہ آتا جبکہ امیرِ شریعتؒ نے لاہور کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ جوانی کی بہاروں سے موت کی پرچھائیں تک وہ انہی کے لیے سارا کچھ کہتے سنتے رہے۔ اہلِ لاہور نے بھی امیرِ شریعتؒ سے محبت، رفاقت اور عداوت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی بنابریں امیرِ شریعتؒ اہلِ لاہور کو کوفہ کہا کرتے تھے۔

اِن دنوں ماڈل ٹاؤن کی اس کوٹھی میں عوام کے علاوہ سیاسی رہنماؤں، صحافیوں، ادیبوں، شاعروں اور کاروباری لوگوں کی آمد آمد سے شب و روز ایک بھیڑ لگی رہتی۔ امیرِ شریعت سب کو پہچانتے تھے، لیکن بات نہیں کر سکتے تھے، لوگ آتے، اُدھ منٹ چارپائی کے

نزدیک کھڑے ہو کر زیارت کرتے اور چلے جاتے ۔ فارسی کے مشہور شاعر علامہ محمد حسین عرشی امرتسری بھی انہی دنوں امیر شریعت کو ملنے آئے مگر حالات کو دیکھ کر بے اختیار کہہ اٹھے

؎ برق در ابر آسودہ بستر شدہ
شعلۂ جوالہ خاکستر شدہ

نماز ان حالات میں بھی نماز سے غافل نہ رہتے ۔ یہ ذات باری تعالیٰ کی ان پر خاص نوازش تھی ۔ حالانکہ بول نہیں سکتے تھے، لیکن عین نماز کے وقت اگر کوئی آس پاس نہ بھی ہوتا تو کسی چیز سے زمین پر کھڑکا کر دیتے تھے ۔ اس آواز سے اہل خانہ فوراً حاضر ہوتے تو امیر شریعت ہاتھ کے اشارے سے لوٹا نماز کے لیے کہتے ، اور نماز باجماعت ہوتی ۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ نماز کے دوران ان پر بیہوشی طاری ہو جاتی اور ان کے صاحبزادے عطاء المحسن انہیں دوبارہ نماز لوٹانے کو کہتے ۔

انہی دنوں کا ذکر ہے کہ سرگودھا کے مفتی محمد شفیع امیر شریعت سے ملنے آئے تو کوٹھی کے مالک مولانا محمد اکرم (مالک سلطان فونڈری) نے مفتی صاحب سے ، گزارش کی :

" حضرت ! یہ فرمائیے کہ شاہ جی اس حالت میں نماز پڑھتے ہیں ، اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ یہ نماز میں بے ہوش ہو جاتے ہیں ۔ عزیزم عطاء المحسن شاہ جی پر زور دیتے ہیں کہ وہ اپنی نماز لوٹائیں ۔"

اس پر مفتی صاحب نے فرمایا :

" نہ میرے عزیز ! شاہ جی کی بے ہوشی کی نمازیں ہماری ہوشمندی کی نمازوں سے ہزار درجہ بہتر ہیں ۔"

اس کے بعد پھر کبھی انہیں نماز لوٹانے کو نہیں کہا گیا ۔

مولانا خیر محمد جالندھری ملنے آئے تو دوران گفتگو ان کے منہ سے مولانا مفتی محمد حسن کی موت کی خبر نکل گئی ، اور یہ بات امیر شریعت نے بھی سن لی ، حالانکہ وہ کافی فاصلے پر بیٹھے

باتیں کر رہے تھے، ان کو اشارے سے بلایا، اور کاغذ پنسل مانگی، اس پر لکھا "یہ میرے استاد تھے"، اور پھر بے اختیار رونے لگ پڑے اور کافی دیر روتے رہے۔

اس طرح کے لیل و نہار میں قریباً ڈیڑھ ماہ لاہور میں گزار کر امیر شریعتؒ کے حرم محترم کے ارشاد پر امیر شریعتؒ کو جولائی کے آخری دنوں میں واپس ملتان لایا گیا، اور ڈاکٹر کرنل ضیاء اللہ کی تجویز کردہ ادویات کا استعمال ہوتا رہا، لیکن مرض مریض پر اس قدر غالب آ چکا تھا کہ ڈاکٹروں اور حکما کے تمام نسخے بیکار ہو گئے۔ اس طرح سے عقل انسانی جب اپنی رائے پر مات کھا چکی تو قدرت کے فیصلے کا انتظار ہونے لگا۔

ماضی کی پچاس سالہ تاریخ کا معمار، افواج آزادئ وطن کا سپہ سالار، جس کی گھن گرج میں شیروں کا سا وقار، گفتار میں بجلی کا سا کردار، ارادوں میں پہاڑوں کی سی پختگی، مقدروں میں سیاروں کا جلوہ اور جذبات میں سمندروں کے طوفان لے کر سلطنتوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جانے والا آج چارپائی پر بے حس و حرکت پڑا اپنے خالق کے فیصلے کا منتظر ہے۔

انتقال

لاہور سے ملتان پہنچنے کے پچیس (۲۵) روز بعد رات اڑھائی بجے اچانک طبیعت خراب ہو گئی اور سانس اکھڑنے لگی، ہچکی شروع ہو گئی، گھر میں پریشانی بڑھی اور موت کے سائے ناچنے لگے۔ یہی منحوس خبر صبح گاہی ملتان بھر میں لے اڑی کہ امیر شریعتؒ انتقال کر گئے۔ تمام شہر آخری دیدار کو ان کے گھر آن پہنچا، لیکن ہنوز گل و بلبل کا رشتہ قائم تھا، اور امیر شریعتؒ آخری سانس گن رہے تھے۔ حکیم عطاء اللہ خاں اور ان کے بیٹے بھی اپنی آخری پونجی آزمانے کو آ موجود ہوئے، لیکن وہ بھی اپنے آنسوؤں میں الجھ کر رہ گئے۔ امیر شریعتؒ اس وقت بے ہوشی کے عالم میں تھے اور سانس رُک رُک کر آ رہی تھی، سورج غم آلود چہرے سے تمام دن اس ماتم میں شریک رہا، وہ اپنے ڈھلتے سائے کو کل کے ماتم میں شرکت کے لیے چھوڑ کر مغرب کی چادر میں جا چھپا۔ شفق نے لالہ گوں کا سا لباس پہن لیا، مؤذن مغرب کی اذان کیلئے اٹھا ہی تھا کہ چھ بج کر پچپن منٹ پر برصغیر کا عظیم

خطیب زندگی کے قریباً ۸۲ برس گزار کر اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون؛ سہ

"ادا کر کے قرض اپنی خدمات کا — سحر دم وہ جاگا ہوا رات کا
اَبد کے نگر کو روانہ ہوا — مکمّل سفر کا فسانہ ہوا" (عدم)

موت کی خبر ریڈیو پاکستان نے یہ خبر رات پونے آٹھ بجے نشر کی۔ لیکن جہاں دل کی تاریں پیوست تھیں، وہاں صبح سے اضطراب تھا۔ الاسلکی کی تصدیق نے دل کی دھڑکنوں کی رفتار مزید تیز کر دی۔ عشّاق ہجوم در ہجوم محبوب کے آخری دیدار کو آنسوؤں کا نذرانہ لے کر گھروں سے نکل کھڑے ہوئے۔ کراچی سے پشاور تک کے لوگ، قصبات سے دیہات تک کے عوام جنازے میں شرکت کے لیے آن پہنچے۔

جنازہ ۲۲ راگست نمازِ ظہر کے بعد امیرِ شریعت کا جنازہ اٹھانے کا اعلان تھا۔ اس دن کا آفتاب اپنے ساتھ تاریخ کا ایسا المیہ لے کر طلوع ہوا، کہ نہ صرف سلطنتیں ہی اس کے غم میں ڈوب گئیں، بلکہ جراٴتِ انسانی اور قوّتِ ایمانی کا چراغ بھی ہمیشہ کے لیے گُل ہو گیا۔

اقلیمِ خطابت کا فرمانروا اپنی تمام رعنائیاں سمیٹ کر جہانِ بے مروّت سے رُخ موڑ چکا تھا۔ وقت کے نشیب و فراز جس کے قدموں کی چاپ کے منتظر رہتے، آج اس کی روح قریب کھڑی اپنے مہمانوں کی منتظر تھی۔ دھوپ کے سائے مکانوں کی دیواروں سے اتر کر گلی اور بازاروں کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے۔

کراچی سے پشاور تک کے لوگ ریل گاڑیوں اور ہوائی جہازوں کے ذریعے جنازے میں شرکت کے لیے تیز رفتاری سے ملتان پہنچ رہے تھے۔ دیہاتیوں کی ٹولیاں اپنے مرشد کے جنازے کے لیے پہنچ رہی تھیں۔ تانگے، لاریاں، سائیکل بھی مصروف تھے، کہ ان پر انسانوں کا گلہ نہ رہ جائے کہ وہ وقت کے عظیم انسان کی آخری رسم میں شامل نہ ہو سکے۔

نمازِ ظہر کے بعد جب اس مردِ درویش کا جنازہ محلہ ٹبی شیر خاں سے اٹھایا گیا۔ تو دو لاکھ انسانوں کا سمندر اس کے گرد ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ جنازے کے ساتھ لمبے لمبے بانس باندھ دیئے گئے، تاکہ کوئی ہاتھ اس سعادت سے محروم نہ رہ جائے، تاہم ہزاروں سوگواروں کو یہ شکایت رہی۔

جنازہ جیسے جیسے اپنی منزل کی طرف بڑھتا گیا، ہجوم در ہجوم لوگ اس میں شامل ہوتے گئے۔ کچہری روڈ سے گزرتا ہوا یہ ماتمی جلوس چار بجے کے قریب ایمرسن کالج کی گراؤنڈ میں پہنچا اور جنازہ کی صفیں درست ہونے لگیں۔ تاریخ ماضی اپنی شہادت لے کر آن پہنچی۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ کی نمازِ جنازہ کے بعد اس کے دامن میں امیرِ شریعت (رحمۃ اللہ علیہ) کی نمازِ جنازہ کا دوسرا واقعہ تھا۔ ورنہ اس سے پیشتر اس قدر ہجوم کسی درویش کے جنازہ میں نہیں دیکھا گیا۔

نمازِ عصر سے ذرا پہلے حضرت امیرِ شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی نمازِ جنازہ ان کے فرزندِ اکبر سید عطاء المنعم شاہ بخاری نے پڑھائی۔

آخری آرام گاہ

ملتان کو اس کے بڑھاپے نے اسے اپنی تاریخ کی یادداشتوں سے بھی محروم کر دیا ہے، ہاں اس قدر یاد پڑتا ہے کہ اس شہر کا تاریخی قلعہ جسے آج قاسم باغ کا نام دیا جا رہا ہے، صدیوں پیشتر راجہ داہر نے تعمیر کیا تھا، اور آج یہ قلعہ اہلِ ملتان کی عظیم تفریح گاہ ہے۔ دن کے اجالے اور رات کے اندھیرے ہی جانتے ہیں کہ تاریخ کے اس بوسیدہ دامن پر کیا گزری اور کیا بیتی — کاش! گرتی ہوئی دیواروں کے منہ میں زبان ہوتی اور وہ چیخ چیخ کر اپنی بے بسی کا ماتم کرتیں، لیکن بے سرا در لاوارث عمارات اپنی غیرت اپنے معماروں کے ساتھ ہی رخصت کر چکی ہیں، گو اس کے سینے پر حضرت پیر بہاؤالحقؒ اور حضرت شاہ رکن عالم (رحمۃ اللہ علیہ) کے مزارات مرجع خلائق ہیں،

گر اس اندھیر نگری میں نیکی اپنا منہ چھپائے ایک طرف بیٹھ گئی تاکہ غارت گری کے اسباب مہیا کرنے میں زمانہ حجاب محسوس نہ کرے۔

حضرت امیر شریعتؒ رحمۃ اللہ علیہ کی آخری آرام گاہ کا سوال جب احباب کے سامنے آیا تو کمشنر ملتان بی۔اے۔قریشی نے اطلاع دی کہ رات گورنر مغربی پاکستان نواب امیر محمد خاں نے مجھے ہدایت کی ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی تدفین کے لیے جو جگہ طلب کی جائے، اس سے انکار نہ کریں، اس پر احباب کی رائے ٹھہری کہ حضرت امیر شریعتؒ کی آخری آرام گاہ کے لیے قلعہ سے بہتر کوئی جگہ نہیں اور اپنے اس فیصلے سے کمشنر ملتان کو آگاہ کر دیا، اور انہوں نے ایک گھنٹے کے اندر متعلقہ کاغذات مکمل کر کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے ہاتھ بھیج دیے۔ البتہ ایک شرط عائد کر دی کہ حضرت شاہ صاحب کے علاوہ دوسری کوئی قبر وہاں نہیں بنے گی۔ مگر جیسے ہی حضرت امیر شریعتؒ کے حرم محترم کو اس کی اطلاع ہوئی انہوں نے اس شرط کے علاوہ بھی امیر شریعتؒ کو قلعہ میں دفن کرنے کی مخالفت کی نیز فرمایا:

"جو شخص عمر بھر حکومت کے کسی اعزاز کا احسان مند نہیں ہوا، اسے حکومت کی اجازت سے حاصل کردہ جگہ پر دفن کر کے اس کی روح کو صدمہ پہنچانا بہتر نہیں۔"

اس بنا پر نماز جنازہ سے فراغت کے بعد حضرت امیر شریعتؒ رحمۃ اللہ علیہ کا جسدِ خاکی دو لاکھ سے زائد انسانوں کے کندھوں پر اپنی آخری آرام گاہ کی طرف روانہ ہوا۔ چند قدموں کا فاصلہ طے کر کے بھاگری قبرستان کے ابتدائی کونے پر (میونسپل کمیٹی کے دیے ہوئے وسیع خطۂ اراضی کو امیر شریعتؒ کا خاندانی قبرستان قرار دے کر) سورج کی آخری کرنوں کو کھپتے دیکھتے لاکھوں انسانوں کے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی سینکڑوں من مٹی تلے لحد میں اتار دیا گیا۔

محمدؐ کی سیرت کا پیغامبر
خدا کے سندیسے سناتا ہوا
بڑی منزلیں کر گئے طے علم کی
بڑی دیر چلتا چلاتا ہوا
نہایت اہم سوچ میں کھو گیا
گھڑی دو گھڑی کے لیے سو گیا
(علامہ)

مغل فرمانرواؤں کے زوال کے ساتھ ۱۷۰۸ء کو جب ہندوستان کے تخت پر فرنگی عروج انگڑائیاں لینے لگا، اور آہستہ آہستہ یہ سورج وقت کے تمام ستاروں کو مات دے کر اپنی چمک کے سنگھاسن پر آبیٹھا تو شیخ و برہمن کی تسبیح کے تمام دانے ٹوٹ کر اس کے قدموں میں آن گرے۔ ہندوستان کا تختِ طاؤس اور کوہِ نور ہیرے کی چمک دونوں غلامی کی زنجیر میں جکڑے گئے۔ یونین جیک کی اڑانیں لال قلعے کی چھت پر چڑھ کر گنگا و جمنا کے پوتر پانیوں میں زہر گھولنے لگیں، مسجد کی اذانیں کلیساؤں کی آوازیں میں دب کر رہ گئیں۔ ایوانِ فرنگی کا ایک ایک قانون حجازی قافلے کے نقشِ پا پر اپنی نئی عمارات استوار کرنے لگا تو ایمان کی ایک نگاہ اٹھی، جس نے خونِ جگر کی آمیزش سے اس قدر آنسو بہائے کہ سارا ہندوستان رو پڑا، اور یہ آنسو حضرت شاہ ولی اللہ کے آنسو تھے۔ انہی آنسوؤں سے پھر، ۱۸۵۷ء کے بعد کبھی محمود الحسن نے جنم لیا، اور کبھی قاسم نانوتوی کی پیدائش ہوئی۔ عبیداللہ سندھی اور حسین احمد مدنیؒ بھی اسی کوکھ کے لعل تھے۔ محمد علی جوہرؒ، ابوالکلام آزادؒ، ظفر علی خان، مفتی کفایت اللہ اور احمد سعید بھی اس قافلے میں شامل ہوتے گئے، تا آنکہ اس زنجیر کی آخری کڑی حضرت امیرِ شریعتؒ (سید عطاء اللہ شاہ بخاری) رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ یہ زنجیر ایک ایک کڑی سمیت ۲۱ اگست ۱۹۶۱ء شام چھ بجکر پچپن منٹ کو اپنی تاریخ مکمل کر گئی۔ ع

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اخبارات

۲۲۔ اگست صبح کے اخبارات جب پاکستانی عوام کے ہاتھوں میں پہنچے تو ان کے صفحۂ اوّل پر سیاہ حاشیے تھے ملکی صحافت نے قافلہ ہائے حریت کے بہادر سپوت کو آخری خراجِ عقیدت پیش کیا اور ملک کے قلم کاروں نے امیر شریعتؒ کی موت کو ملکی اور ملّی نقصان قرار دے کر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

روزنامہ "جنگ" کراچی

"حق یہ ہے کہ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری پاک و ہند کی ایک عظیم شخصیت تھے۔ قوم ایک مخلص رہنما سے محروم ہو گئی، لیکن ان کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی۔ انہوں نے قوم کو آزاد کرانے اور ملک کو ترقی کے منازل تک پہنچانے کے لیے جو کام کیا ہے وہ دوسروں کے لیے مشعلِ ہدایت کا کام دے گا۔"

روزنامہ "امروز" لاہور

"وہ شعلہ نوا خطیب اٹھ گیا جس نے ربع صدی تک سپاہِ آزادی کا دل گرمائے اور حوصلہ بڑھائے رکھا۔ دنیائے خطابت کو اس پر ناز تھا اور اس کی یہ صلاحیت ملک و ملّت کی خدمت کے لیے وقف رہی، لیکن وہ صرف خطیب ہی نہیں تھا، عمل کا دھنی بھی تھا۔"

روزنامہ "کوہستان" لاہور

"سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے فرنگی استبداد کے خلاف اس وقت علمِ بغاوت بلند

کیا تھا جب سلطنتِ برطانیہ پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا اور آزادی کی خواہش ایک دیوانے کا خواب سمجھی جاتی تھی۔

ہمیں شاہ صاحب کے طریق کار سے اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن کوئی بھی ان کی عظمت سے انکار نہیں کر سکتا۔ آنے والی نسلیں جب برصغیر پاک و ہند کی آزادی کے بکھرے ہوئے اوراق اکٹھا کریں گی تو اس وقت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو فراموش نہیں کر سکیں گی۔"

روزنامہ "وفاق" لائلپور

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات ایک روایات کے انجام کا اعلان ہے۔ وہ روایات کی پیداوار تھے، جس میں گرمیٔ آواز کے ساتھ آدمی اور آدمی کے درمیان رشتہ گردانا جاتا تھا انسانی رشتے کے اس تصور نے خطابت کو جنم دیا، جسے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہندی مسلمانوں کے ایک بھرپور دور میں پیدا ہوئے تھے۔ اس دور میں قدآور رہنماؤں کے ہوتے ہوئے انہوں نے اس طرح ایک منفرد مقام پیدا کیا کہ مسلمانوں کی مذہبی زندگی کو سیاسی زندگی سے مربوط کرنے کی کوشش کی اور خطابت کو طریقِ اظہار کے طور پر اپنایا، جو مسلمانوں کی مذہبی زندگی اور سیاسی زندگی دونوں میں ایک مقبول اور مؤثر طریقِ اظہار کا مرتبہ رکھتی تھی۔"

روزنامہ "عوام" لائلپور

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات ایک بڑا ملّی صدمہ ہے آج ہر پاکستانی کو محسوس ہو رہا ہے کہ شاہ جی کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے، وہ کبھی پُر نہیں ہو سکے گا ؎

وہ لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیئے
ڈھونڈا تھا آسماں نے جنہیں خاک چھان کر

ہفت روزہ "لیل و نہار" لاہور

"مرحوم جب یہ کہتے کہ میری تین چوتھائی زندگی ریل میں اور ایک چوتھائی جیل میں گزری تو حقیقت بھی یہی ہوتی تھی، وہ محض ایک سیاسی رہنما نہ تھے، ایک مکمل شخصیت تھے۔ مجاہد بھی اور رند بھی۔ جس طرح لاکھوں کے مجمع میں گرجتے اسی طرح احباب کی محفل میں چہکتے۔ بذلہ سنجی اور خوش گفتاری سے ہر ایک کا دل مٹھی میں رکھتے۔ شعر و ادب کا مذاق نہایت پاکیزہ رکھتے تھے۔ محبت و مروت، اخلاص، ایثار، رواداری اور دوست داری کا پیکر تھے، اور یہ صفات اب نایاب ہوتی جارہی ہیں۔

ہفت روزہ "اقدام" لاہور

"سید عطاء اللہ شاہ بخاری اردو اور پنجابی کے بے مثل خطیب تھے، انہوں نے اپنی فصاحت اور بلاغت، خطابت اور علم کلام کی توپوں کے دہانے انگریز شاہی قلعے پر مرکوز کیے تھے انہیں اختلافِ عقیدہ کے علاوہ احمدیوں (مرزائیوں) سے غیر فانی کد کی بڑی وجہ یہ تھی کہ بانیٔ سلسلہ نے انگریزی سلطنت کو ابر رحمت قرار دے رکھا تھا۔ اس وجہ سے انگریزی استعمار اور احمدیت (مرزائیت) دو ایسے نشانے تھے جن پر شاہ صاحب نے ہمیشہ گولہ باری جاری رکھی اور دونوں کو خاصہ نقصان پہنچایا۔"

ہفت روزہ "ایشیا" لاہور

"قیام پاکستان کے بعد شاہ صاحب عملاً سیاست سے کنارہ کش ہو گئے تھے لیکن تحریک ختم نبوت کے دوران وہ پھر اسلام کی آبرو بچانے کے لیے میدان میں اتر آئے شاہ صاحب ایسی جامع کمال شخصیتیں روز روز پیدا نہیں ہوتیں۔ افسوس ہے کہ پرانے بادہ کش ایک ایک

کر کے اس محفلِ ہستی سے اٹھتے جاتے ہیں، اور کوئی ان کی جگہ پر کرنے والا نظر نہیں آتا۔

ہفت روزہ "خدام الدین" لاہور

۲۱-اگست ۱۹۶۱ء کو یہ جگر خراش خبر سارے ملک نے انتہائی رنج و قلق سے سنی کہ ملک کے مایۂ ناز فرزند بطلِ جلیل، مجاہدِ اعظم، جنگِ آزادی کے شیر دل رہنما، محب و محبوب اولیاء اللہ شمع ختمِ نبوت کا پروانہ امیرِ شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون"

ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور

"شاہ صاحب اپنی ذات میں ایک انجمن اور ایک ادارہ تھے۔ ان کی موت تنہا ایک شخص کی موت نہیں، ایک عہد، ایک دور اور ایک جماعت کی موت ہے، جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت مضطرب دل لے کر آئے تھے اور یہ آواز برصغیر پاک و ہند اور عالمِ اسلام کے ہر سانحہ میں بے اختیار بلند ہوتی تھی"

پنجاب یونیورسٹی کا اردو مجلّہ "محور" ستمبر ۱۹۶۱ء

اک دیا اور بجھا.......

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات اس دور کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ المیہ اس لیے کہ نئی نسل یہ تو جانتی ہے کہ برک نے برطانوی پارلیمنٹ میں کیا کچھ کہا۔ انہیں یہ تو معلوم ہے کہ روم میں انطونی نے کس طرح اپنی خطابت سے بروٹس کے اقتدار کا تختہ الٹ دیا، مگر وہ یہ نہیں جانتی کہ شاہ صاحب نمازِ عشا کے بعد تقریر شروع کرتے تھے اور ہزاروں سامعین رات بھر بیٹھنے کے بعد فجر کی نماز ان کی امامت میں پڑھا کرتے تھے، ان کی خطابت کا سحر راہ چلتے لوگوں کو کھینچ

کر جلسہ گاہ میں لے آیا کرتا تھا۔ یہ آواز کا جادو اس لیے تاریخی حیثیت اختیار نہ کر سکا کہ انطونی کی طرح انہیں کوئی شکسپیر نہ ملا، اور پھر اس لیے بھی کہ بعد میں ان کا سیاسی مسلک انہیں مسلم لیگ سے دور لے گیا، اور وہ تحریکِ حصولِ پاکستان سے کٹ گئے۔ وہ غلط راستے پر تھے یا نہیں، مگر اس اختلاف کے باوجود ان کی دیانت، خلوص اور بے غرضی شبہ سے بالاتر تھی۔

ان کی درویشی اہلِ بصیرت کے لیے آج بھی چراغِ راہ ہے۔"

ہفت روزہ "لاہور"۔ لاہور (مرزائیت کا ترجمان)

"سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات دراصل سابق علاقہ پنجاب کے دعوامی نفسیات کے ماہر ایک ایسے شعلہ بیان مقرر کی وفات ہے، جس کا بدل شاید ہی پیدا ہو سکے۔"

ماہنامہ "تبصرہ" لاہور

۲۱ اگست کی شام تاریخ عالم کا ایک مستقل عنوان بن گئی، جب حضرت امیر شریعت (رحمۃ اللہ علیہ) نے اس جہانِ فانی کی بے اعتنائیوں سے اکتا کر عالم جاودانی کی راہ لی، اور اپنے گریبان کی پریشان دھجیاں لیے اس سفر پر چل دیے جہاں نہ کوئی موڑ آتا ہے اور نہ ہی کوئی منزل کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس راہ کی ہر شے ان کے لیے اجنبی ہو گی۔ لیکن شاہ جی کسی کے لیے غیر نہیں ہوں گے، وہ اس جہان کی بھی ہر مخلوق کے لیے جانے پہچانے ہیں۔ پروردگارِ عالم کے حضور حاضری سے پیشتر یقیناً وہ سب کا سلام لیں گے، اور خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام شاہ جی کی روح پاک کو فرشتوں کے دوش پر حوضِ کوثر پر بلائیں گے، تاکہ زندگی کے طویل سفر کی تھکان سے دل کو تسکین ہو سکے۔ ایسے لوگوں سے ایسا ہی سلوک ہوتا ہے۔ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۝ (ہم ان کے اعمال کا بہت اچھا بدلہ دیں گے)

تعزیّت

صدرِ پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوّب خاں

"سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات حسرتِ آیات پر مجھے بے حد صدمہ ہوا ہے شاہ صاحب جنگِ آزادی کے زبردست مجاہد تھے۔ قدرت نے آپ کو علم و فصاحت کی نعمتیں ودیعت کی تھیں۔ موت نے ہم سے ایک عظیم شخصیّت چھین لی ہے۔"

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

"یہ بڑی غمناک خبر ہے۔ آج مسلمان ایک بہت بڑی شخصیّت سے محروم ہو گئے ہیں۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اپنے وقت کے بہت بڑے خطیب تھے، بلکہ یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ وہ اپنے وقت کے سب سے بڑے خطیب تھے، ان کی وفات نے ایک بہت بڑی جگہ خالی کر دی ہے۔"

شیخ حسام الدّین

امیرِ شریعت کی خطابت نے چالیس برس تک برِّ صغیر کے عوام کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص متحرک کیا۔ ان کے اندر لڑنے اور ملک کو آزاد کرانے کا جذبہ پیدا کرنے میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔ آج ان کی موت سے جو جگہ خالی ہوئی ہے وہ صدیوں پر نہیں ہو سکے گی۔

مولانا غلام رسُول مہر

سید عطاء اللہ شاہ بخاری اسلام اور آزادی کے عظیم مجاہد تھے۔ ان کی پوری زندگی پُر خلوص

قربانیوں کا ایک مرقع ہے کہ خود ان کے بلند ہمت رفیقوں میں ان کی مثال شاید ہی ملے۔"

احمد ندیم قاسمی

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے انتقال کے ساتھ برصغیر پاک و ہند کی تحریک آزادی کا وہ زندگی افروز اور دلآویز باب ختم ہو گیا، جس میں آزادی کی خاطر جسمانی اور روحانی صعوبتیں سہنا عبادت کا درجہ اختیار کر گیا تھا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا وجود گرامی اس مقدس جدوجہد کا مجسم نشان تھا۔

مولانا داؤد غزنوی

"شاہ صاحب بہادر سپاہی، مخلص دوست اور انتھک ورکر تھے۔ ان کی موت سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے، اس کے پر ہونے کا اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

مولانا مظہر علی اظہر

امیر شریعت نے اپنی زندگی میں ہی اس قاہر و جابر استعمار کا خاتمہ پاک و ہند کی سرزمین میں دیکھ لیا، جو اس کی جنگِ آزادی کا مطمعِ نظر تھا، وہ جس عزم کو لے کر ۱۹۱۹ء میں میدانِ عمل میں آیا تھا، اس نے ۱۹۴۷ء میں بحکمِ الٰہی اسے کامیاب دیکھا۔ اللہ تعالیٰ اس بطلِ حریت کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

مولانا احتشام الحق

"مجھے شاہ صاحب کی وفات سے بے حد رنج ہوا ہے۔ ان کی موت برصغیر پاک و ہند بلکہ سارے عالمِ اسلام کے مسلمانوں کے لیے نقصانِ عظیم ہے۔

★

مولانا مفتی محمد شفیع (کراچی)

مولانا کی وفات سے علماء کی صف میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ عرصہ تک پر نہ ہو سکے گا۔ ہم آپ کے غم میں پورے طور پر شریک ہیں۔"

تاج الدین انصاری

"چالیس برس تک جس کی شعلہ نوائیوں نے مسلمانوں کو گرمایا، وہ آج ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ یہ صرف ایک خطیب، ایک عالم، ایک دوست اور ایک بزرگ کی موت ہی نہیں، بلکہ ایک دور، ایک تاریخ کی موت ہے۔"

سید مظفر علی شمسی

مسلمانوں کے ہر مکتبِ خیال کو حضرت شاہ صاحب کی موت نے رنج پہنچایا ہے، اور اس عظیم شخصیت کے اٹھ جانے سے جو خلا پیدا ہوا ہے، وہ صدیوں تک پر نہ ہو سکے گا۔"

مولانا کوثر نیازی

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے سیاسی نظریات سے اختلاف ممکن ہے، لیکن اس بات سے کوئی شدید سے شدید مخالف بھی انکار نہیں کر سکتا کہ برصغیر پاک و ہند کی جدوجہد آزادی کی تاریخ میں ان کی زندگی ایک روشن باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے جانے سے خطابت، سیاست اور مذہب کی دنیا میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے، جسے قحط الرجال کے اس دور میں پر کرنا ناممکن ہے۔

لباس، خوراک اور عادات

انسان، انسان سے راہِ حیات پر سفر کے دوران رائے میں ہی اختلاف نہیں کرتا بلکہ اس کی ہر ادا اور پسند جداگانہ ہے۔ اس چوراہے پر انسان اپنے ذوق کا تنہا مالک ہے۔ اسی طرح حضرت امیر شریعت (رحمۃ اللہ علیہ) نے بحیثیت انسان اپنی انفرادیت کو قائم رکھا۔

لباس اوائل جوانی میں جب آپ بہار سے پنجاب آئے تو تنگ موری کی بہاری طرز کی شرعی شلوار، گھٹنوں تک گول آستین کا لمبا کرتہ، سبز رنگ کی پگڑی اور پاؤں میں سرخ بہاری قسم کی جوتی پہن رکھی تھی، پھر جیسے جیسے پنجابی طرزِ تمدن قبول کرتے گئے لباس میں تبدیلی آتی گئی، اسی طرح کبھی تہبند اور کبھی کھدر کی شلوار پہنتے۔ طالب علمی کے زمانے میں سر پر لنگی اور کھدر کا نیلے رنگ کا تہبند عام استعمال کرتے تھے۔ آگے چل کر کھلی آستین کا کھدر کا لمبا کرتہ عموماً شتری رنگ کا پہنتے تھے۔ اس نسبت سے اس زمانے کا کھدر اس قدر مقبول ہوا کہ بخاری کھدر کے نام سے مشہور ہو گیا۔ موسم سرما میں کھدر کا لمبا شیروانی نما کوٹ، اس پر کبھی کبھار کابلی گرم عبا پہنتے، سر پر اتاترک طرز کی ٹوپی پہنتے۔

احرار کانفرنسوں میں شمولیت کے وقت سیاہی مائل سرخ رنگ کا کرتہ پہنتے جو احرار رضاکاروں کا امتیازی نشان تھا۔

ابتداء (۱۹۲۱ء) میں ہاتھ میں موٹا ڈنڈا رکھتے تھے، اس نسبت سے ایک عرصے تک عوام میں "بخاری ڈنڈے والا" مشہور رہے، لیکن جب چودھری افضل حق رحمۃ اللہ علیہ نے پنجاب اسمبلی سے مسلمانوں کے لیے تلوار رکھنے کا عام قانون منظور کرایا تو امیر شریعت نے ڈنڈے کی بجائے تلوار پکڑ لی۔ ۱۹۳۰ء میں جب مجلس احرار نے اپنے رضاکاروں کے لیے کلہاڑی کو اپنا جماعتی نشان قرار دیا تو دمِ واپسیں سے کچھ عرصہ پیشتر تک ہاتھ میں کلہاڑی

رکھتے رہے۔ زندگی کے آخری دنوں میں بید کا کھونٹا بطورِ سہارا رکھے رہے۔

خوراک گھر ہوتے تو عموماً چنے کی دال کو دوسرے کھانوں پر ترجیح دیتے۔ سفر کے دوران خوراک میزبان کی مرضی پر چھوڑ دیتے، سفارش پر کبھی کھانا نہیں پکوایا۔ سادے چاول زیادہ مرغوب تھے، لیکن دردِ گردہ کے باعث بہت کم استعمال کرتے تھے۔ بعض دیہاتوں میں پیاز اور باسی روٹی نمکین لسّی کے ساتھ بھی پسند کرتے، لیکن جسم بلغمی ہونے کے باعث لسی ان کے لیے نقصان دہ تھی۔ اسی لیے گائے کے گوشت سے ہمیشہ اجتناب رہا۔ مرغّن غذاؤں سے نفرت نہیں تھی لیکن پسند نہیں کرتے تھے، میزبان کو اکثر اس پر ڈانٹ دیا کرتے تھے۔

جلسوں یا کانفرنسوں کے موقعہ پر صرف ایک کھانا پکانے کی تاکید کرتے۔

سبزیوں میں شلجم، سرسوں کا ساگ اور گھیا شوق سے کھاتے۔ میٹھی اشیاء خاص کر حلوہ مرغوب نہیں تھا، فرمایا کرتے، یہ مولویوں کے منہ پر سیمنٹ کا کام دیتا ہے۔ یعنی حلوہ خور مولویوں کے منہ سے حق بات نہیں نکل سکتی۔

پھلوں میں آم سے زیادہ محبّت تھی، اور خربوزہ بہت کم کھاتے تھے۔ امیرِ شریعت کی رائے میں خربوزہ کے بکثرت استعمال سے گلے پر برا اثر پڑتا ہے، جب کبھی آواز دب جاتی تو کچا امرود یا امرود کے پتّے اُبال کر ان کا پانی استعمال کرتے۔

عادات انسانی عادات قبر تک پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ لیکن حضرت امیرِ شریعتؒ کو اپنی قوّتِ ارادی (WILL POWER) کی وجہ سے اپنی عادات پر خاصا قابو تھا لیکن عام عادات جو ان کی جزوِ زندگی بن چکی تھیں، ان کے ہاتھوں مجبور تھے۔ مثلاً جیل میں ہوں یا ریل میں، نمازِ صبح سے پیشتر چائے بغیر دودھ کے ضرور پیتے۔ چنانچہ چائے کا سامان (سٹوو، مٹی کا تیل، بہترین چائے کی پتی، چینی، نمک، فنجان اور ایک چھوٹا چمچ) سفری بکس میں ہمیشہ ساتھ رہتا۔ کبھی کبھار شہروں میں اگر اچھی چائے نایاب ہو جاتی، تو دیہاتوں کے سفر میں اس کی تلاش کرتے جو اکثر مل جاتی۔

یوں تو ہر نماز کے بعد وظیفہ کرتے، لیکن نماز فجر کے بعد قریباً ایک گھنٹہ اس کے لیے الگ بیٹھتے۔ پان کھانے کی سخت عادت ہوگئی تھی، لیکن بغیر تمباکو کے کھاتے، بازار میں چلتے پھرتے نہیں۔ گھر میں یا تقریر سے پیشتر اس کا سامان بھی چائے کی طرح کبھی الگ نہیں ہوا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد قیلولہ کرتے اور نماز عصر تک سوتے۔

تقریر کی رات کھانا نہیں کھاتے تھے بلکہ نماز عصر کے بعد چائے کے دسترخوان پر بیٹھتے تو اس کے ساتھ نمک پارے یا کوئی دوسری نمکین شے استعمال کرتے اگر تقریر کا ارادہ نہ ہو، تو سرِ شام کھانا کھا کر سو جاتے۔ پھر لاکھ کوشش کرو، تقریر پر آمادہ نہیں ہوتے تھے، اس رات نماز عشا بھی دیر سے پڑھتے۔

حضرت امیر شریعت (رحمۃ اللہ علیہ) کا دل نہ جانے خالق کائنات نے کس مٹی سے بنایا تھا کہ اس کے کسی گوشے میں نفرت کا شائبہ تک نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر جاندار سے محبت کرتے۔ خصوصاً خوبصورت انسان ہو کہ حیوان ان کی نگاہِ کرم کا مرکز ہوتا تھا۔ ایک دفعہ کسی گاؤں سے تانگے پر ریلوے اسٹیشن تک آنا تھا، اس کے گھوڑے پر جو نظر پڑی کہ گردن لانبی، چوڑے سم، فربہ بدن، دم زمین تک، بس پھر کیا تھا، تمام راستہ کوچوان سے اس گھوڑے کی نسل پر گفتگو کرتے رہے۔ چھ میل کا فاصلہ طے کر کے منزل پر پہنچے تو گھوڑے کا منہ چوما تھپکی لگائی، اور کوچوان کو کرائے کے علاوہ پانچ روپے زائد دیے کہ گھوڑے کو دانہ کھلا دے۔

ایک زمانہ میں کبوتروں سے بھی عشق ہوا، لیکن اس کی عمر مختصر رہی۔ اس دور میں تکمیل شوق کے لیے افغانستان سے راس کماری تک اچھی نسل کے کبوتر حضرت امیر شریعت کو تحفے میں ملے، لیکن جب ان سے تائب ہوئے تو نشان تک مٹا دیا۔

عمر کے آخری حصے میں گھر میں مرغیاں بھی رکھیں۔ اچھے شعر کی داد دینے میں بخیل نہیں تھے۔ حالانکہ خود اردو اور فارسی کے بہترین شاعر تھے، ندیم تخلص کرتے تھے، شاعر عموماً دوسرے شاعر کے کلام پر داد دینے میں فراخ دل نہیں ہوتا، لیکن حضرت امیر شریعتؒ کی عالی

حوصلگی پر متحدہ ہندوستان کے اکثر معروف شعرا انہیں اپنا کلام سنانے میں فخر محسوس کرتے، اور جس شعر پر امیر شریعت داد دیتے وہ اردو ادب میں سند بن جاتا تھا ——— زندگی بھر انگریز اور مرزائی کے علاوہ کسی کو اپنا ذاتی دشمن نہیں سمجھا، اور اگر اصولی طور پر کسی سے بگاڑ ہو گیا تو پھر اس میں منافقت نہیں ہوتی تھی۔ دشمن دشمن ہے اور دوست دوست۔ دوست کے عیب کی پردہ دری گناہ سمجھتے۔ آنکھوں دیکھتے اور کانوں سن کر بھی مسکرا دیتے، ہزار اختلاف کے باوجود اگر کوئی گھر آجاتا تو ایسا برتاؤ کرتے کہ اس پر اختلاف کا گمان تک نہ گزرتا۔

تصویر اور آواز

۱۹۳۰ء میں پہلی مرتبہ حضرت امیر شریعتؒ کی تصویر اخبارات میں شائع ہوئی۔ بمبئی کانگرس میں مس سروجنی نائیڈو کی تقریر سن رہے تھے کہ کیمرے کی آنکھ نے انہیں غافل پا کر چوری کر لیا۔ اور پھر یہی تصویر متحدہ ہندوستان کے ہفتہ وار انگریزی اخبار "بمبئی کرانیکل" اور روزنامہ "امرت بازار پتریکا" میں شائع ہوئی۔ دوسری تصویر "ڈمڈم" کے جیل خانہ میں کشمیر کے کیپٹن عبدالرشید کے ساتھ ان کے اصرار پر بنگالی نوجوانوں نے اتاری، جو ملاقات کے لیے آئے تھے۔

امیر شریعتؒ بذاتِ خود تصویر کے خلاف تھے، اس کے باوجود ان کی تصویریں گاہے بگاہے دیکھنے میں آئیں۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ ان میں ان کی رضا شامل نہ تھی۔ ۱۹۳۵ء میں ملتان کے مشہور عکاس چودھری بشیر احمد نے چوک حسین آگاہی میں جب اپنا نگار خانہ ترتیب دیا تو کسی بہانے حضرت امیر شریعتؒ کو وہاں لے گیا۔ چودھری بشیر احمد کے والد ڈاکٹر رحیم بخش مرحوم کی تصویر وہاں آویزاں تھی۔ مرحوم اگرچہ حضرت امیر شریعتؒ کے مرید نہیں تھے، پھر بھی انہیں حضرت امیر شریعتؒ سے بڑی عقیدت تھی، حضرت امیر شریعتؒ کی نظر بے اختیار ان پر جا پڑی، اور دیر تک تصویر کو دیکھتے رہے۔ اس موقعہ پر کیمرہ مین نے بڑی حکمت سے کیمرہ کو تصویر کی پناہ میں رکھ کر وقت کا تعین کر دیا تھا۔ اچانک ٹک کی آواز پر امیر شریعت چونک پڑے، اور بڑی حیرت سے پوچھا "یہ کیا"، آخر انہیں پتہ

چل گیا کہ میری تصویر اتار لی گئی ہے اس پر سخت ناراض ہوگئے، اور فوٹو گرافر سے وعدہ لیا، یا تو اسے ضائع کر دینا، یا عام نہ کرنا۔ لیکن اس کے باوجود یہ تصویر راقم کے ہاتھ آگئی، اور یہ وہی تصویر ہے جو اخبارات میں عام شائع ہوتی رہتی ہے۔ اس پر حضرت امیر شریعت جب کبھی فوٹو گرافر سے ملتے تو اسے "میرے آذر" کہہ کر پکارتے۔

۱۹۵۷ء میں راقم نے روزنامہ "آزاد" کے لیے حضرت امیر شریعتؒ کی تصویر بنانا چاہی لیکن انہیں پتہ چل گیا اور اس قدر بگڑے کہ دو سال تک راقم سے بات نہیں کی۔

۱۹۴۲ء یا ۱۹۴۴ء میں مظفر گڑھ کے ڈپٹی کمشنر مسٹر مسعود (موجودہ ایڈمنسٹریٹر محکمہ اوقاف) کی خواہش پر مولانا مجاہد الحسینی نے ایک اجتماع میں ٹیپ ریکارڈ لگا دیا تاکہ امیر شریعت کی تقریر ریکارڈ کی جا سکے۔ اس جلسے کی صدارت بھی ڈپٹی کمشنر ہی کر رہے تھے اور ٹیپ ریکارڈ بھی انہی کا تھا۔ ان دنوں مسٹر مسعود شاید واحد آدمی تھے جن کے پاس یہ آلہ تھا۔ مسٹر مسعود باوجود سرکاری گزیٹڈ آفیسر ہونے کے ہمیشہ کھدر پوش رہے اور ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ امیر شریعتؒ نے ہمیشہ ان سے محبت کی۔

تقریر کے دوسرے دن انہوں نے امیر شریعتؒ کو چائے پر بلایا، اور دوسرے کمرے میں تقریر کا ریکارڈ لگا دیا۔ امیر شریعتؒ نے اپنی آواز پہچان لی اور بڑے حیران ہوئے، جب انہیں اس نئی ایجاد کا علم ہوا تو اسے بڑا پسند کیا۔ اس پر جھوم کر کہا:

"آج میں نے اپنی تقریر سنی ہے، میں بہت اچھا بول لیتا ہوں"۔

یہ کہہ کر استغفر اللہ پڑھا اور رونے لگ گئے۔

عقیدہ سیاسی اختلاف کے علاوہ مذہبی عقاید میں بھی امیر شریعتؒ سے اختلاف کیا گیا ان کے جذبۂ توحید کے پیش نظر ان پر غیر مقلد ہونے کا الزام بھی لگایا گیا۔ مگر اس میں کوئی حقیقت نہ تھی۔ وہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مقلد تھے۔ ابتداً میں حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی (رحمۃ اللہ علیہ) کے مرید ہوئے۔ ان کے انتقال پر

حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری (رحمۃ اللہ علیہ) کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا اور تادمِ واپسیں حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر رہے۔

اس واضح حقیقت کے باوجود برصغیر کے مخصوص عوام نے انہیں ایک طرف اگر اپنا سیاسی حریف خیال کیا، تو دوسری طرف صحیح عقیدے پر بھی یقین نہیں کیا۔ عوام کی انہی باتوں پر حضرت امیر شریعتؒ نے فرمایا تھا۔

"ایک وقت آئے گا کہ تم ہماری قبروں پر آکر روؤ گے اور کہو گے کہ تمہیں لوگ سچے تھے۔"

*****

***

سرزمینِ ملتان سے!

اے شہنشاہوں کی بستی اولیاؤں کے دیار
ہر خزاں کے دور میں قائم رہی تیری بہار
تو شہیدوں کی ہے مٹی تو امانت دار ہے
آج پھر پہلو میں تیرے ہے عطاء اللہ شاہ
ہاں کہ وہ باغی رہا برطانوی سرکار کا
ہے یہی دار و رسن نے آزمایا تھا جسے
یہ خزانہ دفن کرتے ہیں تمہاری خاک میں
یہ امانت قوم کی اور سیّد احرار ہے
دیکھنا ضائع نہ ہو جائے وطن کا بانکپن
قبر کی مٹی سے کہہ دو، لحد کو آواز دو

ذرّے ذرّے پر ہے تیرے رحمتِ پروردگار
تیرے دامن میں ہیں اب بھی نیک بندوں کے مزار
تیری اک تاریخ ہے ادر نیرا اک کردار ہے
جو امیرِ وقت تھا ڈرتے تھے جس سے کجکلاہ
وہ محافظ تھا وقارِ احمدِ مختار کا
آئینِ افرنگ نے باغی بنایا تھا جسے
تاکہ یہ محفوظ رہ جائے زمینِ پاک میں
حشر تک ہے تجھ میں یہ تو اس کی چوکیدار ہے
داغ تک آنے نہ پائے اور نہ ہو میلا کفن
با ادب آئیں فرشتے روک دیں حشرات کو

پاک رہنا چاہیے محشر تلک تیرا ضمیر
سو رہا ہے تیرے دامن میں شریعت کا امیرؒ

(جانباز مرزا)